خُطَبات

حکیمُ الاُمّت

اِدارۂ تالیفاتِ اشرفیہ
چوک فوارہ ملتان پاکستان فون: 4540513-4519240

بسلسلہ خطبات حکیم الامت جلد-۱۲

محاسن اسلام

(جدید ایڈیشن)

حکیم الامت مجدد الملت

حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہٗ

عنوانات

قاری محمد ادریس ہوشیارپوری

تصحیح و تزئین

صوفی محمد اقبال قریشی مدظلہ

تخریج احادیث

مولانا زاہد محمود قاسمی

ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ
چوک فوارہ ملتان پاکستان
(061-4540513-4519240)

محاسن اسلام

تاریخ اشاعت..............رمضان المبارک ۱۴۳۰ھ
ناشر............ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان
طباعت............سلامت اقبال پریس ملتان

انتباہ

اس کتاب کی کاپی رائٹ کے جملہ حقوق محفوظ ہیں
کسی بھی طریقہ سے اس کی اشاعت غیر قانونی ہے

قانونی مشیر
قیصر احمد خان
(ایڈووکیٹ ہائی کورٹ ملتان)

قارئین سے گذارش

ادارہ کی حتی الامکان کوشش ہوتی ہے کہ پروف ریڈنگ معیاری ہو۔ الحمدللہ اس کام کیلئے ادارہ میں علماء کی ایک جماعت موجود رہتی ہے۔ پھر بھی کوئی غلطی نظر آئے تو برائے مہربانی مطلع فرما کر ممنون فرمائیں تاکہ آئندہ اشاعت میں درست ہو سکے۔ جزاکم اللہ

ملنے کے پتے

ادارہ تالیفات اشرفیہ......چوک فوارہ......ملتان
دارالاشاعت......اردو بازار......کراچی
ادارہ اسلامیات......انارکلی......لاہور
مکتبہ دارالاخلاص......قصہ خوانی بازار......پشاور
مکتبہ سید احمد شہید......اردو بازار......لاہور
مکتبہ رحمانیہ......اردو بازار......لاہور

119-121- HALLIWELL ROAD
BOLTON BL1 3NE. (U.K.)

ISLAMIC EDUCATIONAL TRUST U.K
(ISLAMIC BOOKS CENTERE

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله وكفى وسلام على عباده الذين اصطفى

عرض ناشر

خطبات حکیم الامت جلد نمبر ۱۲ ”محاسن اسلام“ جدید اشاعت سے مزین آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

اللہ کے فضل و کرم اور اپنے اکابرین کی دعاؤں کے طفیل کافی عرصہ سے خطبات کی اشاعت کا ادارہ کو شرف حاصل ہو رہا ہے۔ بہت سے بزرگوں کی تمنا تھی کہ ان کی احادیث مبارکہ کی تخریج ہو جائے۔ ادارہ کی درخواست پر محترم جناب مولانا زاہد محمود صاحب نے یہ کام سرانجام دیا اور اس کے ساتھ ہی ہم حضرت صوفی محمد اقبال قریشی صاحب مدظلہ کے مشکور ہیں کہ اُنہوں نے فارسی اشعار اور عربی عبارات کا ترجمہ اور اس کے ساتھ ساتھ تصحیح بھی کر دی۔

اللہ تعالیٰ اس خدمت کو قبول فرمائے آمین

احقر: محمد اسحٰق عفی عنہ

صفر المظفر ۱۴۲۸ھ بمطابق فروری 2007ء

اجمالی فہرست

الاتمام لنعمة الاسلام (۱)

اَلْیَوْمَ یَئِسَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ دِیْنِکُمْ فَلَا
تَخْشَوْھُمْ وَاخْشَوْنِ ؕ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ
دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ
الْاِسْلَامَ دِیْنًا ؕ

الاتمام لنعمة الاسلام (۲)

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ
نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ؕ

الاتمام لنعمة الاسلام (۳)

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ
نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ؕ

محاسن اسلام

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ

احسان الاسلام

بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ
فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ
وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ

الدوام علی الاسلام

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا
تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ

الاسلام الحقیقی

قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ
لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

فہرست عنوانات

الاتمام لنعمة الاسلام (۱)	۱۱	تبلیغ اور سوال	۴۴
امتنان نعمت	۱۲	بھلے بُرے میں تمیز	۵۱
دین کی ناقدری	۱۴	آداب تبلیغ	۵۲
ترقی مطلوب	۱۶	تبلیغ میں دو نیتیں	۵۸
مذاق کا بگاڑ	۱۸	قانون اسلام کی رعایت	۵۸
محافظتِ دین	۱۸	مفاسدِ چندہ	۶۱
مسلم کی داخلی قوت	۲۰	ترجمہ وتفسیر آیت	۶۴
قوت اسلام	۲۱	حاصل آیت	۷۴
کید نفس	۲۳	الاتمام لنعمة الاسلام (۲)	۷۵
صرف ہمت	۲۴	پسندیدہ نعمت	۷۶
بزرگی کے معنی	۲۵	اقسام نعمت	۷۷
شیوخِ محققین کی وصیت	۲۶	دینی نعمت میں کمال	۷۹
جوش وہوش	۲۸	نعمت اسلام	۷۹
روحانی قوت	۳۱	امر بالمعروف	۸۰
اصل علاج	۳۲	طرز نصیحت	۸۳
اہل کفر کو کفر سے مناسبت	۳۳	اقسام نصیحت	۸۵
اسلام اور تلوار	۳۵	خلوصِ نیت	۸۸
محبت اسلام	۳۶	اخلاص اور شہرت	۹۱
نورِ اسلام	۳۹	کارِ پاکاں	۹۴
اسلام کی ادنے جھلک	۴۱	مبالغہ فی النصیحت	۹۹
مسلمان اور حقوق انسانی	۴۲	ثمرہ بر عدم نظر	۱۰۰

عملی نمونہ ۱۰۱
طریق باطن میں ترتیب ۱۰۳
مقتدایان اسلام ۱۰۳
اپنی اصلاح کی فکر ۱۰۴
تبلیغ میں بے فکری ۱۱۰
اجزائے اسلام ۱۱۳
فوائد توحید ۱۱۴
برکات تقدیر ۱۱۵
بزرگوں کی شانیں ۱۲۱
اپنا ہی غم ۱۲۲
الاتمام لنعمة الاسلام (۳) ۱۲۴
عمومی غلطی ۱۲۵
مقصود احکام شریعت ۱۲۶
حقیقت علم ۱۳۱
آثار منصوریت ۱۳۴
بددین عقلاء ۱۳۶
مطلوب اہل باطل ۱۳۹
دین اور مصالح عقلیہ ۱۴۱
فلاسفہ کی بدفہمی ۱۴۲
علاج فلاسفہ ۱۴۶
دلائل عقلیہ کی بے بسی ۱۴۷
امام رازی کا فرمان ۱۴۸
طالب علم اور سالک ۱۴۹
عوام کے لئے جواب ۱۵۱
مذہب عشق ۱۵۴
جاہل صوفیاء ۱۵۷
حیات عشاق ۱۵۹
فلسفی اور سالک کی غلطی ۱۶۰
حقیقت بلاء ونعمت ۱۶۲
اہل طریق کی غلطی کی تفصیل ۱۶۴
تہذیب اخلاق ۱۷۰
دقائق شریعت ۱۷۱
محاسن معاملہ ومعاشرت ۱۷۳
شریعت وغیر شریعت میں فرق ۱۷۷
محاسن نکاح ۱۷۷
رسوم تفاخر ۱۷۸
شادی وغمی میں اسوۂ رسول اکرم ﷺ ۱۷۹
محاسن الاسلام ۱۸۴
فضیلت اسلام اور تقسیم فضیلت ۱۸۵
تفسیر آیت کریمہ ۱۸۷
مغفرت کبائر بلا عذاب ۱۸۸
مغفرت کبائر بلا عذاب پر شبہ کا جواب نمبر 1 ۱۸۹
جواب نمبر 2 ۱۹۱
جواب نمبر 3 ۱۹۲
جواب نمبر۴ ۱۹۵
شان نزول سے نصوص عامہ کی تخصیص ۱۹۶
گناہ سے ناامیدی اور نیکی سے امید ۱۹۷
کفر سے بڑا جرم ۱۹۹

محدود کفر پر غیر محدود عذاب شبہ کا جواب	۲۰۰
جواب ۲ جزا و سزا میں نیت کا دخل	۲۰۱
اتلاف حقوق الٰہی کی سزا جواب ۳	۲۰۲
نعمت اسلام کی ناقدری	۲۰۲
نعمت اسلام پر شکر	۲۰۳
تدبیر حسن خاتمہ	۲۰۴
دعاء بعد طعام میں شکر اسلام کی تعلیم	۲۰۴
حب جاہ کی حقیقت	۲۰۶
شکر کے معنی	۲۰۷
منافع اسلام	۲۰۸
تکمیل اسلام	۲۰۹
کتابی علم	۲۱۳
خوشامد کی خرابی	۲۱۷
ضرورت صحبت	۲۱۸
نور فہم	۲۲۶
قلبی دولت	۲۲۷
تبلیغ اسلام	۲۳۱
شفقت اولیاء اللہ	۲۳۲
تدبیر تبلیغ	۲۳۷
تعلیم اسلام کی خوبی	۲۳۹
توحید کی خوبی	۲۴۱
شعبہ معبودیت کعبہ	۲۴۵
حکمت استقبال قبلہ	۲۴۹
تقبیل حجر	۲۵۱
تکمیل توحید	۲۵۳
نماز کی خوبی	۲۵۵
زکوٰۃ کی خوبی	۲۵۶
حج کی خوبی	۲۵۶
حسن معاملہ	۲۵۸
حسن معاشرت	۲۵۸
جرأت اعتراض	۲۶۲
حقانیت اسلام	۲۶۲
سبب مشروعیت جہاد	۲۶۳
اختتام	۲۶۵
احسان الاسلام	۲۶۶
مسلک اہلسنت	۲۶۸
حضور قلب کی حقیقت	۲۶۹
حضور قلب اختیاری ہے	۲۷۰
حق تعالیٰ کی رعایتیں	۲۷۱
دین اور معاش	۲۷۴
ضرورت علماء	۲۷۵
خدا کو بندہ سے تعلق	۲۷۶
روح دنیا	۲۷۷
معرفت و محبت	۲۷۷
اثر معرفت و محبت	۲۸۰
عارفین کے نزدیک حقیقت موت	۲۸۲
کمال نظر معرفت	۲۸۴
غلط دعویٰ پر رد	۲۸۷

دنیوی بڑائی کی خرابی ۲۹۰
دین کی بڑائی کی خرابی ۲۹۱
حقیقت اسلام ۲۹۳
آزادی کے غلط معنی ۲۹۵
خود بینی و خود رائی ۲۹۶
لطائف آیت ۲۹۷
الدوام علی الاسلام والاعتصام بالانعام ۳۰۰
دستور العمل ۳۰۱
کفر عملی ۳۰۳
ضرورت علم کلام ۳۰۴
تدقیقات سے احتراز ۳۰۶
علوم کشفیہ کا مطالعہ ۳۰۸
علوم کشفیہ اور تصوف ۳۱۰
علماء کی احتیاط ۳۱۰
معمولات اور مجہولات ۳۱۳
بحث اور تسلی ۳۱۵
جواب جاہلاں ۳۱۸
تسہیل و تکمیل عمل ۳۲۴
لذت پریشانی ۳۲۸
تفویض پر مداومت ۳۳۳
عوام کی بے فکری ۳۳۹
تفویض معتبر ۳۳۹
معنی تفویض ۳۴۱
تدبیر مشروع ۳۴۵
الاسلام الحقیقی ۳۴۷
حکم اظہار مشرب ۳۴۸
ہمارے دعوئ اسلام کی حقیقت ۳۴۹
منافقین اور اسلام ۳۵۰
خشیت صحابہؓ ۳۵۲
باوجود وعدہ کے خوف ۳۵۴
کسی کو کافر کہنا ۳۵۶
فتویٰ کفر میں احتیاط ۳۵۷
کافر بنانا یا بتانا ۳۵۸
ضعیف ترین ایمان ۳۶۰
تخصیص رحمت ۳۶۱
تعدد ذرائع مغفرت ۳۶۲
اختلاف مسائل کی حقیقت ۳۶۳
فرقہ ناجیہ ۳۶۴
مسئلہ وحدۃ الوجود ۳۶۸
درجات وحدۃ الوجود ۳۷۳
صاحب حال کی خطا ۳۷۴
اہل حال کا احترام ۳۷۵
اہل حال کی نقالی ۳۷۶
صاحب حال معذور ہے ۳۷۸
کمال اسلام مطلوب ہے ۳۷۹
اسلام کامل کی تعریف ۳۸۰
اسلام کامل کے اجزاء ۳۸۲

کمال اسلام کے بارے میں تفصیل	۳۸۲
احکام تمدن ومعاشرت اور مولوی حضرات	۳۸۴
مسئلہ تشبہ	۳۸۵
احکام شرع اور مصالح دنیوی	۳۸۶
اسلام کے نادان دوست	۳۹۰
ارکان اسلام کی فلاسفی	۳۹۰
مصالح شرعیہ حکمت ہیں نہ کہ علت	۳۹۲
قانون الٰہی کے سامنے حجت	۳۹۳
تکوینیات میں حق تعالیٰ کا تصرف	۳۹۴
آیت کی بلاغت	۳۹۵
حق تعالیٰ کی تصرف کی حقیقت	۳۹۶
تصرف انسانی کی حقیقت	۳۹۷
اسباب کی حقیقت	۳۹۸
خوارق اور اسباب	۴۰۰
دوام ترتب تاثیر کی حقیقت	۴۰۱
تشریعیات میں حق تعالیٰ کا تصرف	۴۰۲
فلاسفہ کی سوچ	۴۰۳
اہل توحید کا فکر	۴۰۵
حق تعالیٰ اور بندے میں تعلق	۴۰۸
نماز پنجگانہ کی حکمت	۴۰۹
بناء احکام اور مصلحت	۴۱۰
مغیبات اور عقل نارسا	۴۱۱

عقل سے کام لینے کا صحیح طریقہ	۴۱۲
عجائبات قدرت	۴۱۳
عقل پرستوں کی بے عقلی	۴۱۴
تکرار مشاہدے کا اثر	۴۱۵
قوت عقل کی حد	۴۱۶
مومن کا کام	۴۱۷
آیت میں لفظ محیای ومماتی کا نکتہ	۴۱۹
معیار اسلام کامل	۴۲۰
آج کا تمدن اور ہمارا مذاق	۴۲۲
اخلاق ذمیمہ کے دنیوی نتائج	۴۲۳
مصلحین قوم کی حالت	۴۲۴
خرابی کی جڑ	۴۲۵
توضیح انقیاد	۴۲۶
رائے کی شریعت	۴۲۸
شریعت حقہ	۴۳۰
اتباع شریعت کی پہچان	۴۳۱
لفظ رب العلمین کا نکتہ	۴۳۲
لفظ لاشریک لہٗ کی حکمت	۴۳۵
اول مسلم کا مطلب	۴۳۶
اصلی دولت	۴۳۶
نسخہ برائے معالجہ	۴۳۸
پرہیز	۴۳۹
التماس از جانب کاتب وعظ ہٰذا	۴۴۰

◆

الاتمام لنعمۃ الاسلام

(۱)

یہ وعظ قصبہ ریواڑی میں مولوی عبدالرحیم صاحب کے مکان پر کرسی پر بیٹھ کر بروز بدھ ۲۰ شوال ۱۳۴۱ھ کو ارشاد فرمایا۔

تین گھنٹے ۲۵ منٹ تک بیان جاری رہا۔

سامعین کی تعداد تقریباً ایک ہزار تھی۔

مولوی اطہر علی صاحب سلہٹی رحمہ اللہ نے اسے قلمبند فرمایا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدلله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرورِ انفسنا ومن سيأت اعمالنا من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادى له' ونشهد ان لا اله الا الله وحده' لا شريك له' ونشهد ان سيدنا ومولنا محمدًا عبده ورسوله صلى الله تعالى عليه والهٖ واصحابه وبارک وسلم. امابعد.

فاعوذ بالله من الشيطن الرجيم. بسم الله الرحمن الرحيم.

اليوم يئس الذين كفروا من دينكم فلا تخشوهم واخشون اليوم اكملت لكم دينكم واتممت عليكم نعمتى ورضيت لكم الاسلام ديناً فمن اضطر فى مخمصة غير متجانف لاثم فان الله غفوررحيم.

(المائده آیت نمبر ۳)

ترجمہ: آج کے دن ناامید ہوگئے کافرلوگ تمہارے دین سے پس ان سے مت ڈرنا اور مجھ سے ڈرتے رہنا۔ آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنا انعام تمام کر دیا اور میں نے اسلام کو تمہارا دین بننے کیلئے پسند کیا۔

امتنان نعمت:

یہ ایک لمبی آیت کا ایک ٹکڑا ہے۔ اس میں حق سبحانہٗ وتعالی نے ایک نعمت پر امتنان ظاہر فرمایا ہے اور جس نعمت پر امتنان ظاہر فرمایا ہے وہ نعمت بھی اتنی بڑی ہے کہ اس کی برابر کوئی نعمت نہیں ہے۔ سب نعمتیں اس کے مقابلہ میں ماند اور ہیچ ہیں۔ اس بڑی نعمت پر اس لئے آگاہ کیا تاکہ اس پر مطلع ہو کر ہم اس کے حقوق ادا کریں۔ اور متنبہ ہو کر اس پر عمل کرنا شروع کریں۔ کیونکہ نعمت کا حق ہے اس کا شکر ادا کرنا۔ اور شکر یہی ہے کہ اس نعمت کے متعلق منعم کے حکم کا امتثال کیا جائے' جو وہ کہے اس پر عمل کیا جائے۔ مثلاً مال ایک نعمت ہے اس کا حق یہ ہے کہ غرباء پر احسان کرے یتامی ومساکین کی دستگیری کرے کہ منعم کا یہی حکم ہے۔ اسی طرح ہاتھ پاؤں نعمت ہیں۔ ان کا حق یہ ہے کہ دوسرے کی اعانت کرے۔ نیک کاموں میں ان کو لگاوے۔ غرض ہر نعمت کا ایک حق ہوتا ہے

پھر جیسی نعمت ہوتی ہے ویسا ہی اس کا حق ہوتا ہے۔ تو جو نعمت سب سے بڑی ہوگی اس کا حق بھی بڑا ہوگا' اور جب اس کا حق ادا کرنے میں کوتاہی ہوگی' اس وقت اس کوتاہی پر متنبہ کرنا بھی ضروری ہوگا۔ یعنی جب اس کی طرف التفات نہ کیا جاوے تو متوجہ کر کے التفات کرایا جاوے گا۔ چنانچہ اس آیت میں حق سبحانہٗ تعالیٰ نے ایک نعمت کو بیان فرمایا ہے جس کا حق ادا کرنے میں ہم سے کوتاہی ہو رہی ہے' کسی کو اس کی طرف توجہ ہی نہیں الا ماشاء اللہ۔ اور یہ تو بڑی بات ہے کہ اس کا حق ادا کریں۔ ستم یہ ہے کہ اس کا نعمت ہونا بھی معلوم نہیں۔ دلیل اس کی کہ لوگ اس کو نعمت بھی نہیں سمجھتے' یہ ہے کہ ہر چیز کیلئے کچھ لوازم ہوتے ہیں' یہ ایک مقدمہ ہے۔ دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ لازم کے منتفی ہونے سے ملزوم بھی منتفی ہو جاتا ہے۔ مثلاً آگ کیلئے گرمی لازم ہے۔ جہاں آگ ہوگی' اسکے آس پاس گرمی بھی ہوگی۔ اب اگر کہیں آگ ہونے کا دعویٰ کیا جاوے اور گرمی نہ ہو تو یہ سمجھا جاوے گا کہ وہاں آگ ہی نہیں ہے۔ اسی طرح ہر لازم و ملزوم میں یہ بات لازم ہے کہ جہاں ملزوم ہوگا لازم بھی ضرور ہوگا' اور اگر لازم نہ پایا جائے گا تو معلوم ہوگا کہ ملزوم بھی نہیں ہے۔

جب یہ قاعدہ سمجھ لیا تو اب سمجھئے کہ اس آیت میں جو نعمت مذکور ہے اس کو نعمت سمجھنے کے بھی کچھ لوازم ہیں۔ اگر وہ ہمارے اندر موجود نہیں تو ملزوم بھی نہیں۔ یعنی یوں کہیں گے کہ اس نعمت کو نعمت ہی نہ سمجھا' اگر نعمت سمجھتے تو اس کے لوازم بھی ضرور پائے جاتے۔ دیکھئے اگر ایک شخص کے پاس بہت بڑا قیمتی ایک کپڑا ہو' اور وہ اس کو زمین پر بچھا کر بیٹھ جاتا ہو' گھسیٹتا پھرتا ہو' نہ اس کے میلا ہونے کا خیال کرتا ہے' نہ پھٹ جانے کی پرواہ کرتا ہے' جہاں چاہتا ہے ڈال دیتا ہے' تو اس موقع پر سب یہی کہیں گے کہ اس نے اس کپڑے کی قدر نہیں کی۔ اس نے اس کو قیمتی ہی نہیں سمجھا' کیونکہ اگر اس کی نظر میں قدر ہوتی تو اس کی نگہداشت کرتا' ہر جگہ نہ پھینکتا۔ اگر قیمتی سمجھتا تو موقع کا لحاظ کرتا' بے موقع جگہ سے اس کی حفاظت کرتا' جب حفاظت نہ کی تو سمجھ جاوے گا کہ اس کو قیمتی ہی نہیں سمجھا گیا۔ غرض اسی طرح ہر لازم و ملزوم میں یہ قانون ہے کہ انتفائے لازم سے ملزوم منتفی ہو جاتا ہے۔

ایسے ہی یہاں بھی ایک بڑی نعمت ہے جو اس آیت میں مذکور ہے' اس نعمت کا نام اسلام ہے' اور اس نعمت کا دوسرا نام بطور لقب کے نعمت ہے' چنانچہ فرماتے ہیں۔ **الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا۔** آج کے دن تمہارے لئے میں نے تمہارے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنا انعام تام کر دیا اور میں نے اسلام کو تمہارا دین بننے کیلئے پسند کیا۔ اس میں اول تو تصریح ہے نعمت ہونے کی' پھر نام لے کر بتلا دیا کہ وہ نعمت کیا ہے' وہ اسلام

ہے۔ کسی استنباط اور استدلال کی بھی حاجت نہیں رہی۔ بلکہ حق تعالے نے تصریح کر دی اس کے نعمت ہونے پر۔ یعنی بعض جگہ تو ایسا ہوتا ہے کہ کسی چیز کا نعمت ہونا استدلال سے ثابت کیا جاتا ہے۔ یہاں اس کی ضرورت نہیں کیونکہ نص میں خود مصرح ہے کہ وہ نعمت ہے۔ اور یہ بھی بتلا دیا کہ وہ نعمت کیا ہے؟ اسلام ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اسلام کا نعمت ہونا ظاہر فرمایا ہے اور اس نعمت اسلام پر احسان و امتنان کو ظاہر فرمایا ہے۔

دین کی ناقدری:

جب اس نعمت کی تعیین ہوگئی تو اب اس دعویٰ کو سمجھئے جو میں نے ابھی کہا تھا کہ اس کی طرف کسی کا التفات ہی نہیں الا ماشاء اللہ۔ لوگ اس کو نعمت ہی نہیں سمجھتے۔ اب میں اس کو ثابت کرتا ہوں۔ ہر شخص سمجھ لے اور ذرا اپنے قلب کو ٹٹول کر دیکھ لے کہ اس کو اور نعمتوں کی برابر کون نعمت سمجھتا ہے۔ دیکھئے کھانا کھا کر شکر کرتے ہیں۔ خدایا تیرا شکر ہے تو نے ہم کو کھانا کھلایا۔ پانی پی کر شکر کرتے ہیں الٰہی تیرا شکر ہے، کہیں سفر سے آتے ہیں تو سفر کی مشقت و کلفت کو یاد کر کے اور گھر کے عیش و راحت کو دیکھ کر کہتے ہیں الٰہی تیرا شکر ہے۔ کوئی مقدمہ دائر ہوا اور اس میں جرمانہ یا سزا یا قید کا اندیشہ ہو، پھر اس سے رہائی مل جاوے، بری ہو جاویں تو کہتے ہیں الٰہی تیرا شکر ہے۔ مگر کسی نے کبھی یہ بھی کہا کہ الٰہی تیرا شکر ہے کہ ہم مسلمان ہیں، ہم نعمت اسلام سے نوازے گئے ہیں۔ اگر ہم اس کو نعمت سمجھتے تو جیسے اور نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہیں اس کا بھی شکر ادا کرنا چاہیے تھا، بلکہ سب سے زیادہ کرنا چاہیے تھا، کیونکہ دین و دنیا کی ساری بہبودی اسی کی بدولت ہے۔ مگر یہاں ایک مرتبہ بھی زبان پر نہیں آتا کہ الٰہی تیرا شکر ہے۔ اور مستقلاً تو کیا شکر کرتے، دوسری نعمتوں کے ساتھ منضم کر کے بھی اس پر شکر نہیں کرتے۔ حالانکہ شارع علیہ السلام نے اس کا اس قدر اہتمام کیا ہے کہ اگر تم سے مستقلاً اسکا شکر ادا نہ ہو سکے تو دوسری نعمتوں ہی کے ساتھ ملا کر کر لیا کرو۔ چنانچہ کھانے کے ساتھ حکم ہے کہ کھانے پر شکر کرتے وقت نعمت اسلام کا بھی شکر ادا کرو۔ کھانے کے بعد جو دعاء آئی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں۔ **الحمد لله الذی اطعمنا وسقانا وجعلنا من المسلمین،** (سنن الترمذی ۳۳۹۶) یعنی تمام حمد اس ذات کیلئے ہے جس نے ہم کو کھانے کو دیا، پینے کو دیا، اور ہمیں مسلمان بنایا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں تعلیم دی ہے کہ کھانے پینے کے ساتھ اس کو بھی بڑھا دو۔ **وجعلنا من المسلمین** اور ہمیں مسلمان بنایا۔ مگر نہایت افسوس کی بات ہے کہ ہم اس نعمت کے ساتھ اس قدر بے اعتنائی اور لاپروائی کرتے ہیں کہ اس وقت بھی نعمت اسلام پر شکر نہیں کرتے۔ بس

بجائے اس دعاء کے اتنا کہہ دیتے ہیں اللہ تیرا شکر ہے۔ ایک صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین تھے ان کے قلوب میں دین کی کس قدر وقعت تھی۔ وہ ہم جیسے نہ تھے' اور ان کے قلوب میں قدر ہونے کی دو وجہ تھیں' ایک تو یہ کہ ان کا ادراک سلیم تھا وہ حضرات سلیم الفہم تھے بھلے برے کو تمیز کر سکتے تھے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اسلام کے قبل کی حالت اور بعد اسلام لانے کے جو حالت ہوئی' دونوں کا موازنہ کیا تھا۔ تو اپنی حالت ماضیہ اور موجودہ کے اندر انہوں نے بہت بڑا فرق محسوس کیا کہ پہلی حالت ظلمت تھی' دوسری حالت نور تھی۔ پہلے تاریکی میں تھے اب نور سے منور ہو گئے۔ وہ ظلمت کفر ہے اور یہ نور ایمان ہے۔ چنانچہ قرآن شریف میں کئی جگہ اللہ تعالیٰ نے کفر کو ظلمت سے اور ایمان کو نور سے تعبیر فرمایا ہے۔ یخرجھم من الظلمت الی النور. انہیں کفر کے اندھیروں سے نکال کر نور ہدایت کی طرف لاتے ہیں۔ اور واقعی حقیقت میں بھی ایسا ہی ہے۔ مگر اس کا ادراک انہیں کو ہوتا ہے' جنہوں نے مختلف حالتوں کو دیکھا ہے۔ ہمیں اس کی قدر نہیں ہمارے قلوب میں اس کی وقعت نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ہم کو تو دین مفت مل گیا ہے' ہم کو اس کے حاصل کرنے میں نہ کوئی مشقت کرنا پڑی ہے نہ کوئی ایذا پہنچی ہے۔ آباؤ اجداد سے میراث پہنچ گئی۔ پھر جیسے باپ دادا کی میراث کی کچھ قدر نہیں ہوتی کیونکہ مفت ہاتھ آ جاتی ہے' ایسے ہی اس کی بھی قدر نہیں۔ مشہور ہے کہ ایک شخص ادھوڑی کا جوتہ دوشالہ سے صاف کر رہا تھا۔ کسی نے کہا کہ یہ کیا حماقت ہے' اتنا تو قیمتی دوشالہ جس کے آگے ادھوڑی کے جوتے کی کیا حقیقت ہے' اس سے جوتا جھاڑتے ہو' کہنے لگا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ دوشالہ تو میرے باپ کی کمائی کا ہے جو ورثہ مجھ کو ملا ہے' اور جوتا میری کمائی کا ہے صاحبو! وہی حالت ہماری ہے کہ ہم دوشالہ سے جوتی کو جھاڑ رہے ہیں۔ دوشالہ دین ہے اور ادھوڑی کا جوتا دنیا ہے۔ ہم دین کو دنیا کیلئے برباد کر رہے ہیں۔ دین کی کچھ وقعت ہمارے دل کے اندر نہیں ہے۔ بس جیسے یہ شخص دوشالہ سے جوتا جھاڑ رہا تھا ایسے ہم بھی دین سے دنیا جھاڑ رہے ہیں۔ یعنی دین کے ذریعہ سے دنیا حاصل کر رہے ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہم دین کو کوئی چیز نہیں سمجھتے ہیں۔ پھر اس حالت کے اعتبار سے ہم میں دو قسم کے لوگ ہیں۔ بعض تو ایسے ہیں کہ اپنے کو دنیا دار سمجھتے ہیں۔ وہ تو دین کو دنیا پر فدا کرتے ہی ہیں دین رہے یا نہ رہے اس کی پرواہ نہیں۔ دنیا ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ یہ لوگ تو دین کی کھلم کھلا مخالفت کرتے ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ نہیں کہ یہ لوگ بے نفس ہیں کہ بدنامی سے نہیں ڈرتے' برا بھلا سننے سے نہیں گھبراتے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی ان کو بزرگ ہی نہیں سمجھتا۔ متقیوں میں شمار ہی نہیں ہوتے کوئی بات خلاف شرع کرنے سے ان کی بدنامی ہی نہ

ہوگی۔ کیونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ یہ تو عیاش بدمعاش ہیں ہی۔ اور ایک وہ ہیں کہ ظاہر میں متقی اور دیندار مانے جاتے ہیں' یہ وہ ہیں جو بظاہر دنیا کو دین پر فدا کرتے ہیں۔ ظاہراً تو مقتدائے دین ہیں' بڑے علماء و صلحاء میں سے سمجھے جاتے ہیں۔ مگر یہ مرض ان میں بھی ہے کہ جہاں دین و دنیا جمع ہوتے ہیں' وہاں دنیا کو دین پر ترجیح دیتے ہیں۔ مگر کس خوبصورتی سے کہ ایک برجستہ تاویل کر کے اس دنیا کو بھی برنگ دین ظاہر کرتے ہیں۔ نعوذ باللہ۔ گویا وہی حالت ہے **یخادعون اللہ والذین امنوا وما یخدعون الا انفسھم وما یشعرون.** وہ لوگ دھوکہ دیتے ہیں اللہ کو اور ایمان والوں کو حالانکہ وہ اپنے آپ کو دھوکہ دیتے ہیں اور شعور نہیں رکھتے۔

جب گناہ کریں گے' تو غلط تاویل کر کے اور اگر غلط فتویٰ کسی اثر سے دیں گے تو اس کی بھی توجیہ کریں گے' حالانکہ اس تاویل اور فتویٰ کا غلط ہونا اور اس کا بطلان ان کو بھی معلوم ہے۔ مگر پھر واہیات خرافات تاویلیں اس لئے کرتے ہیں تاکہ وہ تاویلیں وقت پر آڑ ہو سکیں اور کوئی بددینی نہ کھلے۔ ان کے تقویٰ میں دھبہ نہ لگے۔ غرض یہ بھی دین کو دنیا کے تابع بناتے ہیں۔ بہرحال دونوں حالت میں دین کی بیقدری ہوئی خواہ دین کی کھلم کھلا مخالفت کی جائے یا دنیا کو برنگ دین بنایا جائے۔ بہرصورت وہی مثال ہوئی کہ دوشالہ سے ادھوڑی کے جوتہ کو جھاڑ لیا۔

ترقی مطلوب:

تعجب ہے کہ مسلمان دنیوی نعمتوں کو دین پر ترجیح دیتے ہیں' اور صرف بیقدری ہی نہیں اس سے بڑھ کر غضب یہ ہے کہ اس سے اعراض اور تنگی ظاہر کرتے ہیں۔ کبھی کھلم کھلا اور کبھی کسی پردہ میں اس سے نفرت ظاہر کرتے ہیں۔ چنانچہ لکھنؤ میں ایک کمیٹی ہوئی جس میں اس پر بحث تھی کہ مسلمانوں کے تنزل کا سبب کیا ہے؟۔ میں اس وقت لکھنؤ میں تھا' ایک شخص میرے پاس آیا کرتے تھے' وہ اس مجمع میں موجود تھے' انہوں نے مجھ سے کہا کہ اس کمیٹی کا آخری فیصلہ یہ ہوا کہ خود اسلام ہی سبب ہے تنزل کا' جب تک اسلام باقی ہے' اس وقت تک ہم ترقی کر نہیں سکتے۔ یہی مانع ترقی ہے۔ خدا جانے یہ لوگ ترقی کس کو سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک ترقی کا ذریعہ وہ ہے' جس سے مال وجاہ بڑھے۔ اگر مال وجاہ حاصل ہے تو ترقی حاصل ہے ورنہ نہیں' حالانکہ حقیقت کو دیکھنا چاہیے کہ درحقیقت ترقی کس کا نام ہے۔ آیا ہر ترقی کو ترقی کہتے ہیں یا اس میں نافع و ضار کا بھی فرق ہے۔ کیونکہ بالاتفاق بعض ترقی نافع ہوتی ہے اور بعض ضرر پہنچاتی ہے۔ تو کون سی ترقی مطلوب ہے.. صرف ترقی نافع یا کہ نافع و ضار میں کچھ فرق نہیں غالباً ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ترقی نافع ہی مطلوب

ہے۔ اور جو ترقی مضر ہو اس کو کوئی ترقی نہیں کہہ سکتا۔ تو اب دیکھنا چاہیے کہ آیا مال وجاہ دین کے برابر نافع ہے یا نہیں۔ مطلق مال وجاہ کے نافع ہونے سے مجھ کو انکار نہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ دین کے برابر بھی ان کا نفع ہے یا نہیں۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے کسی کو اشرفیاں ملی تھیں تو اس نے ان کو تھیلی میں بھر لیا۔ آگے چل کر خوبصورت کوڑیاں ملیں تو اس نے اشرفیوں کو پھینک کر کوڑیوں سے تھیلی بھر لی۔ تو گو ایک درجہ میں کوڑیاں بھی نافع ہیں، مگر کیا اس درجہ نافع ہیں کہ اشرفیوں کو ضائع کرنے کے بعد ان کو بھرا جائے۔ اسی طرح مال وجاہ ضرور نافع ہیں مگر اس درجہ نافع نہیں کہ اسلام ضائع ہونے کے بعد بھی ان کا نفع معتدبہ ہو۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ مال اور جاہ کا نفع تو دنیا ہی میں ہے، اور دین کا نفع دنیا اور آخرت دونوں میں ہے۔ آخرت میں تو دین کا نافع ہونا مسلم ہے، باقی دنیا میں بھی یہ مال وجاہ سے زیادہ نافع ہے۔ ان شاء اللہ میں اس کو ثابت کردوں گا۔ لیکن اس سے قطع نظر بھی ظاہر ہے کہ عالم دنیا عالم آخرت کے مقابلہ میں کوئی چیز نہیں۔ لہٰذا نفع اخروی کے مقابلہ میں نفع دنیوی بھی کوئی چیز نہیں۔ دونوں عالموں کی مثال ایک حدیث میں مذکور ہے حدیث یہ ہے کہ اگر ایک انگلی سمندر میں ڈالی جاوے تو اس میں کچھ پانی سمندر کا لگ جائے گا۔ سو جو نسبت اس انگلی میں لگ جانے والے پانی کو سمندر کے پانی کے ساتھ ہے، یہی نسبت دنیا کو آخرت کے ساتھ ہے۔ ظاہر ہے کہ اس پانی کو سمندر کے پانی سے کیا نسبت ہے؟ اب آخرت میں اگر ترک دین کی وجہ سے نفع نہ ہو، بلکہ ضرر ہونے لگے تو وہ مال کیا نفع دے سکتا ہے۔ پس جب مال دین کے مقابلہ میں نافع نہیں۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ ہر ترقی مطلوب نہیں بلکہ بعض ترقی مضر بھی ہوتی ہے اور ترقی مضر کو ترقی نہیں کہہ سکتے۔ اگر ہر ترقی اور ہر زیادتی مطلوب ہو تو کسی کے اگر زخم ہو یا کوئی پھوڑا دنبل نکل آئے اس کو بھی ترقی سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ پھوڑے کی جگہ میں ورم تو ضرور ہوتا ہے۔ سو یہ بھی ترقی ہی ہوئی۔ پس چاہیے کہ پھوڑے اور دنبل کو ترقی سمجھ کر علاج نہ کرے۔ ڈاکٹر کو آپریشن نہ کرنے دے کہ واہ اتنا بڑا تو پھوڑا ہے میرے بدن میں کس قدر ترقی ہوئی ہے۔ آپریشن سے تنزل ہو جائے گا۔ بدن گھٹ جائے گا۔ کیوں صاحب! ورم کو تو کوئی بھی ترقی نہیں سمجھتا حالانکہ اس میں بھی زیادت ہے اور درہم کی کثرت کو ہر شخص ترقی سمجھتا ہے۔ گو اس میں ضرر بھی ہو وجہ فرق کیا ہے؟ یہ درہم و دینار تو آخر کار ورم ہی ہو جاوے گا کہ جیسے اس ورم کی وجہ سے ضرر اور تکلیف پہنچتی ہے اس درہم کی بدولت بھی آخرت میں قسم قسم کی مصیبتیں اٹھانا پڑیں گی۔ معلوم ہوا کہ ہر ترقی مطلوب نہیں، بلکہ صرف وہ ترقی مطلوب ہے جو دین کو مضر نہ ہو اور وہ ترقی مطلوب ہے جو اپنے سے زیادہ نافع چیز کے لیے مضر نہ ہو ورنہ وہ مطلوب تو کیا ہوتی مضر ہوگی۔

مذاق کا بگاڑ:

اور لکھنؤ کی کمیٹی میں جو یہ پاس ہوا تھا کہ اسلام سبب تنزل کا ہے' اس کا منشاء ترقی کی حقیقت سے ناواقف ہونا تھا۔ کیا ان جاہلوں نے بھی ڈاکہ زنی اور چوری کو بھی ترقی سمجھا ہے؟ اگر یہ نہیں تو پھر ذرا وہ عقلاً ثابت کر دیں کہ چوری اور ڈاکہ میں اور سود اور رشوت اور قمار بازی میں کیا فرق ہے۔ اور اس کی کیا وجہ ہے کہ آپ نے حکومت پر کبھی اعتراض نہ کیا کہ تم نے چوری اور ڈاکہ کو ممنوع قرار دے کر ترقی کو روک دیا' اور اسلام پر بلا دلیل یہ اعتراض کیا جاتا ہے۔ حالانکہ اسلام نے بھی انہیں کاموں سے روکا ہے' جو چوری اور ڈاکہ کی مثل ہیں۔ مگر تماشہ ہے کہ پھر بھی بعض لوگ احکام شریعت کو مانع ترقی اسلام سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ایک تعلیم یافتہ نے ایک جلسہ میں بیان کیا تھا کہ اسلام کو ترقی نہ ہونے کا سبب نماز ہے۔ اگر اسلام میں نماز نہ ہوتی تو اس دین کی بڑی ترقی ہوتی۔ کیونکہ جب کوئی مسمان ہونا چاہتا ہے تو جب پہلے ہی اس کو بتلا دیا جاوے گا کہ پانچ وقت کی نماز تیری گردن پر رکھی جائے گی۔ وہ گھبرا اٹھے گا کہ یہ مجھ سے کیونکر ادا ہوں گی۔ بس اس سے وہ متوحش ہو کر اسلام لانے سے اعراض کرتا ہے۔ اگر سب مولوی لوگ جمع ہو کر اسلام سے نماز کو نکال دیں تو بہت ہی اچھا ہوتا کہ اسلام کو ترقی ہو۔ استغفر اللہ گویا شریعت مولویوں کی بنائی ہوئی ہے۔ غرض اس طرح خود مسلمانوں کا مذاق بگڑ گیا ہے۔ سعدیؒ فرماتے ہیں۔

ہر کس از دست غیر نالہ کند   سعدی از دست خویشتن فریاد

ہر شخص دست غیر سے نالاں ہے اور سعدیؒ اپنے ہاتھ سے یعنی ہر شخص عوام کی شکایت کرتا ہے مگر مجھے علماء سے شکایت ہے۔

محافظتِ دین:

غیروں کا ضرر پہنچانا تو الگ رہا ہم تو خود ہی اسلام کو ضرر پہنچا رہے ہیں۔ خود مسمان ہی اسلام کی جڑ کو کھوکھلا کر رہے ہیں۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی درخت کسی باغ میں لگا ہوا ہو اور باغ کا مالی اس کی خدمت نہیں کرتا۔ پانی نہیں دیتا' کبھی اس کی خبر گیری نہیں کرتا کہ دفعۃً کسی بھینسے نے آ کر دھکا دے کر درخت کو گرا دیا' تو یہاں بھینسے کی شکایت نہیں کی جائے گی کہ اس نے ٹکر مار کر گرا دیا بلکہ خطا اس مالی کی ہے۔ حقیقت میں درخت کو مالی نے گرایا ہے' بھینسے نے نہیں گرایا ہے۔ اس نے پانی نہ دے کر اس کی جڑ کمزور کر دی' ورنہ اس کی جڑ تو اتنی پکی تھی۔ **كشجرة طيبة**

اصلها ثابت وفرعها فی السماء (کلمہ طیبہ کی مثال) پاکیزہ درخت (کھجور) کی ہے جسکی جڑیں زمین پر ہیں اور اسکی شاخیں آسمان میں ہیں۔ وہ تو اتنا بڑا مضبوط درخت تھا کہ

ہر کہ با فولاد بازو پنجہ کرد　　ساعد سیمین خود را رنجہ کرد

مگر مالی نے پانی نہ دے کر اس کی جڑ کو ایسا کمزور کر دیا کہ ذرا سے ہوا کے جھونکے سے گر پڑا یا کسی کا ہاتھ لگا اور گر گیا۔ جب اس کی یہ حالت ہے کہ ذرا سے اشارہ سے گر پڑتا ہے' پھر بھینسے کی ٹکر تو بڑی چیز ہے۔ صاحبو! یہی حال ہم نے اپنے اسلام کا کر رکھا ہے۔ یاد رکھو جب کبھی اسلام کو ضرر پہنچا ہے اہل اسلام ہی کے ہاتھ سے پہنچا ہے۔ ورنہ یہ دین ایسا ہے کہ اس کو کوئی قوت کمزور نہیں کر سکتی۔ اگر اہل اسلام اس دین کو ضرر نہ پہنچاتے تو کبھی اس دین کو ضرر نہ پہنچتا۔ کیونکہ خدا اس کا محافظ ہے۔ مگر محافظت کے یہ معنی نہیں کہ تم اس کو ضائع کرو۔ تب بھی محفوظ رہے گا بلکہ **انا له لحافظون** (بیشک ہم ہی اس کے محافظ ہیں) کے معنی یہ ہیں کہ اگر تم اس کا دھیان رکھو' اس پر عمل کرو اور محافظت کرو اللہ تعالیٰ اس کو قائم رکھیں گے' ضائع نہ ہونے دیں گے۔ اگر کوئی کہے کہ جب ہماری محافظت کی بھی ضرورت ہے تو اللہ میاں کی محافظت کیا چیز ہوئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ عقیدہ ثابت ہے کہ آپ کا کوئی فعل بھی بغیر ان کی تائید کے نہیں ہو سکتا۔ جب یہ مقدمہ ذہن نشین ہو گیا تو اب سمجھئے کہ آپکا یہ فعل خاص یعنی محافظت دین بھی ان کی تائید کی محتاج ہے۔ تو ان کی محافظت تمہاری محافظت کی محتاج نہیں' بلکہ تمہاری محافظت خود ان کی محافظت کی محتاج ہے۔ مگر عادۃ اللہ یہی ہے کہ انکی محتاج الیہ محافظت کا ظہور تمہاری محتاج محافظت کے بعد ہوتا ہے۔ اگرچہ تاثیر اس کی پہلے ہوتی ہے پس **انا له' لحافظون** (بیشک ہم ہی اس کے محافظ ہیں) کے معنی یہ ہیں کہ تم اس کام کو کرو یعنی محافظت کرو جس میں تم انکی تائید کے محتاج ہو۔ حق تعالیٰ اپنی عنایت سے تمہاری محافظت کو بار آور کر دیں گے جس سے ان کی محافظت کا ظہور ہو جائے گا جیسے حق تعالیٰ نے قرآن کی حفاظت کی ہے۔ اس کے بھی یہ معنی نہیں کہ اب کسی کو حفظ کی ضرورت نہیں رہی بلکہ انکی محافظت کے یہ معنی ہیں کہ ہم کو حفظ کرنے کا حکم فرمایا' سامان مہیا فرما دیا' جس سے ہم اس کیلئے کوشش کرتے ہیں وہ ہماری سعی کو پورا فرما دیتے ہیں۔ اگر انکی طرف سے مدد نہ ہو تو قرآن کبھی بھی یاد نہ ہو۔ چنانچہ بہت سے لڑکے حفظ کرنا چاہتے ہیں مگر نہیں ہوتا۔ ایسے ہی بہت سے بڑے آدمی جوان پوری عمر کے بہت چاہتے ہیں کہ حفظ کریں مگر نہیں ہوتا۔ کسی کو فرصت نہیں ملتی۔ کسی کے پاس مال جمع نہیں ہوتا۔ اور اس کے مقابل بعض کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔ اب اگر کوئی آدمی حافظ ہو جاوے تو یہ کہیں گے کہ اس نے کوشش کی تھی'

حق تعالیٰ نے اس کو کامیاب کر دیا۔ خوب سمجھ لو۔ اور اس کے نظائر دیکھئے۔ مثلاً کھیتی کرنا ہے تو کیا اس میں بندہ کو کچھ کرنا نہیں پڑتا، کہ نہ زمین کو کھودتا ہو نہ دانہ ڈالتا ہو نہ حفاظت کرتا ہو۔ نہیں بلکہ بندہ کو بھی بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ ہل چلانا، زمین کھودنا، پانی سینچنا، پہرہ دینا۔ وغیرہ وغیرہ۔ مگر کہو پھر اللہ میاں کو کیا کرنا پڑا۔ جواب یہ ہے کہ ہم نے مانا تم نے سب کچھ کیا، زمین کو تیار کیا، پانی سینچا، دانا بھی ڈالا، مگر کیا اس دانہ سے بال نکالنا تمہاری قدرت میں تھا؟ ہرگز نہیں۔ اسی لئے فرماتے ہیں۔ **افرأیتم ماتحرثون ءانتم تزرعونه ام نحن الزارعون ' لونشاء لجعلنا حطاما فظلتم تفکھون.** کہ تم جو کھیتی کرتے ہو، کیا تم اس کو زمین سے نکالتے ہو یا ہم؟ زمین سے نکالنا تمہارا کام نہیں ہے وہ خدا کا کام ہے۔ تو جیسے کھیتی کرنے میں نہ سب کام خدا کے حوالے کر دیتے ہو، اور نہ کوشش چھوڑتے ہو، بلکہ اس میں سعی تمہاری ہوتی ہے، باقی کامیاب ہونا نہ ہونا خدا کے اختیار میں ہے۔ اسی طرح دین کی محافظت کی بھی یہی صورت ہے کہ ہم کو حکم کیا محافظت کا پس ہم اس کی حفاظت کریں، کوشش کریں پھر اللہ تعالیٰ اسکو پورا فرمائیں گے۔ کیونکہ وعدہ کیا ہے۔ **انا له لحافظون** یعنی اللہ تعالیٰ اس محافظت کی تکمیل کریں گے۔

مسلم کی داخلی قوت:

اب سمجھئے دین کی محافظت دو طرح سے ہے۔ ایک بیرونی حملوں کو روکنا، اور دوسرے خود اندرونی آثار اور بناؤں کو مستحکم کرنا۔ لوگوں نے محافظت کے صرف یہ معنی سمجھے ہیں کہ اوروں سے لڑنے لگے۔ یعنی بیرونی حملوں کو روکنا شروع کر دیا، اور اس کو کافی سمجھ لیا۔ حضرت! بیرونی حملہ کو روکنے سے زیادہ اہتمام اندرونی آثار کا کرنا چاہئے، کیونکہ محافظت کیلئے دونوں جزء کی ضرورت ہے۔ ایک بیرونی حملہ سے بچانا، دوسرے اندرونی حالت کو مکمل کرنا۔ اگر اندرونی حالت بالکل خراب ہو تو محافظت ہو ہی نہیں سکتی۔ دیکھو اگر کوئی بادشاہ ہو اور وہ ساری فوج کو موقوف کر دے۔ لڑائی کے ساز و سامان کو برباد کر دے، سارے خزانے لٹا دے، آگ لگا دے۔ اب اگر کوئی غنیم آ جاوے اور بادشاہ لڑائی کے لئے آمادہ ہو جائے کیا وہ ظفریاب ہو سکتا ہے؟ بلکہ وہ حالت ہو گی۔

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

جب فوج نہیں، خزانہ نہیں، سامان حرب نہیں تو کیا خاک اپنے ملک کی محافظت کرے گا؟ تو ایسی حالت میں محافظت کے کیا معنی ہوں گے۔ بس یہ معنی ہوں گے کہ نویت ان احافظ ملکی۔ کہ میں محافظت ملکی کی نیت باندھتا ہوں۔ محافظت تو اس سے ہو چکی۔ اب بتلائیے کہ یہ بادشاہ

اپنے ملک کی حفاظت کیوں نہ کر سکا؟ صرف اسی وجہ سے کہ اس نے اندرونی قوت کو بالکل تباہ اور مضمحل کر دیا تھا۔ اس حالت میں وہ بیرونی حملہ کو کیسے روک سکتا ہے؟ یہی حالت ہماری ہے کہ ہم محافظت اسلام کیلئے محض بیرونی حملوں کو دفع کرنا چاہتے ہیں۔ اور اپنی حالت کی تکمیل نہیں کرتے۔ افسوس ہے کہ اس وقت فتنہ ارتداد سے مسلمانوں کی گو ایک آنکھ تو کھلی' یعنی بیرونی حملوں کا کچھ انسداد کیا ہے' مگر ایک اب بھی بند رہ گئی یعنی اندرونی حالت درست کرنا' وہی کانے کے کانے ہی رہے۔ پوری طرح ہوش اب بھی نہیں آیا۔ حضرات! مکرر کہتا ہوں کہ اندرونی محافظت کی زیادہ ضرورت ہے' اپنے اسلام کو راسخ کرنا' شریعت کا متبع ہونا' یہ اندرونی محافظت ہے۔

صاحبو! کامل مسلمان بن جاؤ۔ احکام شریعت کی پورے طور سے پابندی کرو۔ یہی نہیں کہ غیروں سے لڑنے لگو' بلکہ میں کہتا ہوں کہ خواہ لڑو مت' مگر اپنی حالت کو درست کر لو۔ صاحبو! ہر شے کا ایک اثر ہوا کرتا ہے۔ اسلام کامل کا بھی ایک اثر ہے۔ واللہ جو کام خارجی قوت سے نہیں ہوتا' وہ داخلی قوت سے ہو جاتا ہے۔ اگر داخلی قوت پکی ہو جاوے تو خارجی قوت کی زیادہ ضرورت ہی نہ رہے۔ پہلے زمانہ میں لوگ ہمارے بزرگوں کو دیکھ کر ان کے اعمال' ان کی طرز معاشرت کو دیکھ کر اسلام میں داخل ہوتے تھے۔ کوئی زور یا زبردستی سے مسلمان نہیں ہوتے تھے۔ مگر اب ہمارے اعمال خراب' اخلاق خراب' معاشرت گندی' معاملات خراب۔ اگر کوئی مسلمان ہونا چاہے تو ہماری کیا چیز دیکھ کر ہو؟۔

قوت اسلام:

اور اس مقام پر ایک تنبیہ کی ضرورت ہے۔ وہ یہ کہ اکثر مقررین کی زبان پر یہ جملہ آتا ہے کہ اسلام ضعیف ہو گیا۔ شاید کوئی میرے کلام کو بھی اسی پر محمول کر لے۔ سو خوب سمجھ لو کہ اسلام کے دو درجے ہیں۔ ایک اسلام کی ذات اور حقیقت اور ایک اہل اسلام کی صفت اور حالت۔ سو میں یہ نہیں کہتا کہ اسلام اپنی حقیقت کے درجہ میں مختل ہو گیا۔ ہرگز نہیں وہ تو اب بھی اپنی اسی آب و تاب پر ہے۔ اس کی تو یہ حالت ہے۔

ہنوز آں ابر رحمت درفشاں ست　　خم و خمخانہ بامہر و نشان ست

اب بھی وہ ابر رحمت درخشاں ہے۔ خم اور خمخانہ اور مہر و نشان کے ساتھ موجود ہے۔

بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ ہمارا اسلام ضعیف ہو گیا ہے۔ یعنی ہماری اسلامی حالت مختل ہو گئی۔ باقی یہ جو آجکل لیکچراروں کی زبان پر ہے کہ اسلام ضعیف ہو گیا' جس کا مفہوم قرائن سے یہ ہے کہ وہ اپنی ذات میں ضعیف ہو گیا۔ سو یہ بالکل غلط ہے۔ وہ ہرگز ضعیف نہیں ہے' وہ اپنی ذات میں

کامل مکمل ہے اور کبھی اس میں ضعف نہیں آ سکتا۔ اسلام اس وقت ضعیف ہو سکتا ہے کہ نعوذ باللہ خدا ضعیف ہو جاوے۔ خداوند کریم کے ہوتے ہوئے اسلام کبھی ضعیف نہیں ہو سکتا۔ یہ غلط محاورہ زبان پر چڑھا ہوا ہے کہ آج کل اسلام ضعیف ہے۔ ہم پوچھتے ہیں کہ ضعف اسلام کے کیا معنی؟ اگر مراد یہ ہے کہ اسلام جو قانون الٰہی ہے وہ ضعیف ہو گیا۔ تو یہ بالکل غلط ہے۔ اور اگر یہ معنی ہیں کہ وہ اسلام جو ہماری ایک خاص صفت ہے وہ ضعیف ہو گیا۔ ہم جو ایک صفت کے ساتھ متصف تھے اس میں کمی آ گئی تو مسلم ہے۔ مگر پھر سیدھی بات یوں کیوں نہ کہو کہ آج کل ہم کمزور ہیں' اسلام میں ایسا لفظ کیوں کہو۔ جس سے غلط معنی کا شبہ پڑتا ہے' یوں کیوں کہتے ہو کہ اسلام ضعیف ہو گیا۔ اس میں تو دھبہ آتا ہے اسلام پر۔ ناظرین شبہ میں پڑتے ہیں' وہ اس کا مطلب یہ سمجھیں گے کہ بس مذہب اسلام ہی ضعیف ہو گیا ہے' ایسے موہم الفاظ کو چھوڑنا چاہیے۔ الغرض ہم لوگوں نے ضعف کو اسلام کی طرف منسوب کر رکھا ہے۔ حیرت کی بات ہے کس قدر کبر ہے کیا ٹھکانہ ہے کبر کا کہ اپنی کوتاہی کو بھی اسلام پر ڈالا۔ وہی حال ہے کہ

حملہ برخود میکنی اے سادہ مرد ہمچو آں شیرے کہ برخود حملہ کرد

اے سادہ لوح شخص تو اپنے اوپر خود حملہ کرتا ہے جیسا کہ اس شیر نے خود اپنے اوپر حملہ کیا تھا۔

ہماری وہی مثال ہے جیسے ایک حبشی کو راستہ میں ایک آئینہ پڑا ہوا ملا۔ آپ نے اس میں اپنی حسین صورت کو ملاحظہ فرمایا۔ ان کی صورت جیسی ہوتی ہے سب کو معلوم ہے۔ آئینہ میں جب اپنی بری صورت دکھائی دی تو جھنجھلا کر آئینہ کو پتھر پر دے مارا اور کہا ایسی بھدی صورت کا تھا جبھی تو کوئی راستہ میں پھینک گیا تو جیسے اس حبشی نے اپنی بدصورتی کو آئینہ کی طرف منسوب کیا ایسے ہی ہم بھی اپنے ضعف اور اپنی کمزوریوں کو اسلام پر ڈالتے ہیں۔ اسی طرح کسی احمق بڈھے کی حکایت ہے کہ اس کا لڑکا روٹی کھا رہا تھا۔ اتفاق سے ایک ٹکڑا لوٹے میں گر گیا اس نے جو جھانک کر دیکھا تو اپنی صورت نظر آئی۔ وہ اسے کسی دوسرے بچے کی شکل سمجھا وہ بچہ تھا یہ نہ سمجھا کہ یہ میرا ہی ظل وعکس ہے۔ رو کر کہنے لگا کہ ابا اس بچہ نے میرا ٹکڑا چھین لیا۔ اب وہ بڈھے صاحب اٹھے کہ تو ہٹ میں آتا ہوں' تو کمزور ہے۔ تو اس سے چھین نہیں سکتا۔ میں چھین دوں گا۔ آپ نے جو جھانک کر دیکھا تو حضور کو اپنی شکل نظر آئی کہنے لگا لعنت ہے اتنی لمبی ڈاڑھی کو اور بچے کا ٹکڑا چھینتے ہوئے کچھ شرم بھی آئی؟ تف ہے تیری اس صورت پر۔ سب کچھ کہہ دیا اور احمق کو یہ خبر نہیں کہ اپنے ہی کو کہہ رہا ہوں اور جو کچھ تو کہہ رہا ہے وہ تیرے ہی اوپر برس رہا ہے۔ نیز ہماری بعینہ وہی مثال ہے۔ جیسے

میرے ایک عزیز مجھ سے بیان کرتے تھے کہ ایک عورت اپنے بچہ کو پاخانہ پھرا کر کپڑے سے پونچھ کر چاند دیکھنے کھڑی ہوئی وہ دن چاندرات کا تھا۔ وہ بھی ناک پر انگلی رکھ کر دیکھنے لگی تو پاخانہ کی بو آئی کیونکہ جلدی میں کچھ پاخانہ انگلی میں لگ گیا تھا۔ تو کہتی کیا ہے کہ اوئی اب کے چاند سڑا ہوا کیوں نکلا۔ تو اس الو کی پٹھی کو یہ خبر نہیں تھی کہ چاند تو سڑا ہوا نہیں ہے تو ہی خود سڑی ہوئی ہے۔ مگر اس نے اپنے متعلق تو ایسا احتمال نہ کیا چاند پر خاک ڈالنے چلی۔ اسی طرح ہم چاند پر خاک ڈالنا چاہتے ہیں تو اپنے ضعف کو اسلام پر لگاتے ہیں۔

کید نفس:

صاحبو! اسلام ضعیف نہیں ہوا بلکہ ہم خود ضعیف ہو گئے ہیں مگر اپنے ضعف کو جو ہم اپنی طرف منسوب نہیں کرتے بلکہ اسلام کی طرف منسوب کرتے ہیں اس میں نفس کا ایک کید خفی ہے' وہ یہ کہ اگر ضعف کو اپنی طرف منسوب کریں تو اس ضعف کا تدارک کرنا پڑتا ہے' اور اس کا تدارک یہ تھا کہ ہم اسلام میں پکے ہوتے' اور اس میں خود کو بہت سے کام کرنا پڑتے ہیں۔ اب ضعف اسلام کی طرف منسوب کر دیا تاکہ کچھ نہ کرنا پڑے کہ بس جو کچھ ضعف ہے اسلام میں ہی ہے۔ ہم پر ضعف کا کوئی اثر نہیں' کوئی شکایت یا کوتاہی ہم میں ہے ہی نہیں' تاکہ اس کا تدارک کرنا پڑے' اسی لئے خدمت اسلام کو ایسے لوگ کھڑے ہو جاتے ہیں' جن کے عقائد تک صحیح نہیں اور اعمال کا تو کیا ذکر بھلا ایسے لوگ اسلام کی کیا خدمت کر سکتے ہیں؟ اور ان کی خدمت سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ جب خود تمہارے ہی عقائد درست نہیں پھر دوسروں کو صحیح عقائد کی طرف کیوں بلاتے ہو؟ اور اگر اپنے غلط عقائد کی طرف بلاتے ہو تو ایسے غلط تو اس کے بھی ہیں۔ پھر وہ تمہارا کہنا کیوں مانے؟۔ اسی طرح بعض مبلغین کے اعمال کی یہ حالت ہے کہ نہ نماز ہے نہ روزہ نہ حلال حرام کی پرواہ ہے نہ معاملات اچھے ہیں نہ معاشرت ٹھیک ہے' ان کی حاست کو دیکھ کر کوئی ان کو مسمان بھی نہیں کہہ سکتا۔ پہلے تو دنیا دار مسمانوں کی یہ حاست تھی کہ نماز پڑھتے' روزہ رکھتے' زکوۃ دیتے' حج ادا کرتے' حلال حرام کی جانچ کرتے تھے' احکام شرعیہ کے ذرا برابر خدف نہ کرتے تھے۔ اب یہ حالت ہو گئی۔ بقول اکبر ؎

نہ نماز ہے نہ روزہ نہ زکوۃ ہے نہ حج ہے   تو خوشی پھر اسکی کیا ہے کوئی جنٹ کوئی جج ہے

اول اول جب کالج کھولے گئے تو لوگوں نے کہا تھا کہ اب اسلام کو بڑی ترقی ہوگی۔ کیونکہ مسلمانوں کو حکومت کے عہدے ملیں گے اور جج کلکٹر' ڈپٹی وغیرہ نماز پڑھنے آویں گے۔ مسجد کے

دروازے پر گاڑی کھڑی ہوگی۔ لوگ پوچھیں گے کہ یہ گاڑی کس کی ہے؟ ملازم کہے گا ڈپٹی صاحب کی ہے۔ کہیں بگھی کھڑی ہے کس کی ہے؟ جنٹ صاحب کی ہے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ نماز کیلئے مسجد میں تو کیا آتے۔ امتحان پاس کرکے خود نماز کے پاس بھی نہیں پھٹکتے۔ (لطیفہ جتنے پاس ہوتے گئے اتنے ہی دور ہوتے گئے) ہاں ڈگری ملنے اور امتحان میں پاس ہونے سے پہلے بعضے بعضے نماز پڑھتے رہتے ہیں۔ اور جہاں مقصود حاصل ہوا پھر کہاں کی نماز کدھر کا روزہ؟ گویا اب خدا کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ جیسے بعض طالب علم امتحان کے زمانہ میں یاعلیم یاعلیم بہت پڑھا کرتے ہیں اور جب امتحان گزر گیا پھر اس کی خبر ہی نہیں' گویا اب خدا کی ضرورت نہیں رہی۔ ہمارے یہاں ایک نوجوان شخص خوشحال گھرانے کا تھا بہت نیک بخت نمازی تہجد گزار' روزے بھی رکھتا تھا' عشرہ اخیرہ میں اعتکاف بھی کرتا تھا' خدا تعالی سے دعائیں بھی گڑگڑا کر مانگتا تھا۔ اس کا ایک تایا تھا بڑا جاہل' وہ کہنے لگا ارے ہاتھ پھیلا پھیلا کر کیا مانگتا ہے؟ تجھے کس بات کی کمی ہے۔ کھانے کو موجود ہے' پہننے کو موجود ہے تجھے کس چیز کا گھاٹا ہے غضب ہے بعض لوگ اتنے بدعقیدہ ہیں' الہی توبہ۔ اور اس سے بڑھ کر یہ غضب ہے کہ بعضے پیر پرست کہتے ہیں کہ جو کچھ مانگنا ہو بڑے پیر سے مانگو۔ اور اللہ کی نسبت کہتے ہیں کہ میاں ان سے کیا مانگنا' ان کا تو یہ کام ہے اس سے لیا اس کو دیا اس سے لیا دوسرے کو دیا۔ خدا کی پناہ خدا کی پناہ۔ اللہ تعالی کی عظمت اور وقعت قلب میں بالکل ہی نہیں' جو منہ میں آیا بک دیا۔ نہ اس کی پرواہ ہے کہ اس بات سے ہمارا ایمان جاتا ہے۔ نہ اس کا خیال ہے کہ یہ الفاظ کفر کے ہیں۔ حالانکہ خدا تعالی کی عظمت سب سے زیادہ ہونا چاہیے تھی۔

صرف ہمت:

مگر میں اب دیکھتا ہوں کہ سب سے زیادہ تو کیا ہوتی' برابر بھی نہیں۔ بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تو کچھ عظمت دلوں میں ہے بھی۔ مگر حق جل شانہ' کی عظمت تو بالکل دلوں سے جاتی رہی۔ جبھی تو ہماری وہ حالت ہوگئی کہ ہمارے اسلام کو دیکھ کر لوگوں کو اسلام لانے سے عار آتی ہے۔ جیسے ایک مجوسی کا قصہ مولانا رومیؒ نے لکھا ہے کہ کسی نے اس سے کہا تھا کہ مسلمان ہوجاؤ' اس نے کہا کیسا مسلمان ہوں' تم جیسا یا بایزید جیسا۔ اگر یہ مراد ہے کہ تم جیسا مسلمان ہوجاؤں تو تم سے تو میں ہی اچھا ہوں اور بایزید جیسا میں ہو نہیں سکتا۔ گو اس کا یہ کہنا کہ ایسے مسلمانوں سے تو ہم ہی اچھے۔ بالکل غلط ہے کیونکہ باغی سے غیر باغی ہر حالت میں اچھا ہے۔

کفر بغاوت ہے اور اسلام اطاعت ہے۔ غرض باغی خواہ چور ہو یا زانی ہو باغی سے بدرجہا افضل ہے خواہ وہ کیسا ہی مہذب اور عقل کا پتلا ہو۔ تمہیں کیا معلوم ہے کہ بغاوت اور اطاعت میں کیا فرق ہے۔ بادشاہ سے پوچھو کہ اس کی نظر میں کون اچھا ہے۔ باغی یا مطیع؟ اور کس کی وقعت اس کے قلب میں ہے اور کس سے نفرت ہے۔ حضرت بغاوت وہ چیز ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے سارے کمالات گرد ہو جاتے ہیں۔ اور اطاعت وہ چیز ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے سارے جرائم خفیف ہو جاتے ہیں۔ مگر خفیف کے معنی بالکل ہیچ اور معمولی اور ہلکا نہ سمجھے گا بلکہ یہ خفیف بمقابلہ بغاوت کے ہے۔ ورنہ یہ بھی فی نفسہ ثقیل و شدید ہے۔ دیکھو اگر کوئی چوری کرے تو بادشاہ اسے سزا دے گا۔ مثلاً سات برس جیل میں مشقتیں اٹھانی پڑیں گی مگر اس مدت کے بعد پھر رہائی ملے گی، اور کسی وقت بادشاہ کو خوش کر کے کسی عہدہ پر بھی پہنچ سکتا ہے۔ اور باغی اگر ہاتھ آوے گا تو یا تو قتل کیا جاوے گا، یا کم از کم دائم الحبس سے ادھر تو رہے ہی گا نہیں کبھی اسکی رہائی نہ ہوگی، اسی طرح کوئی مسلمان گنہگار ہو تو وہ خاص مدت تک دوزخ میں رہ کر پھر جنت میں چلا جاوے گا مگر کفار کو کبھی رہائی نہ ہوگی۔ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے دوزخ ان کا ٹھکانہ ہے۔ **في نار جهنم خالدين فيها ابداً.** (دوزخ کی آگ میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے) تو اس لئے اس مجوسی کا یہ کہنا کہ اس سے تو ہم ہی اچھے ہیں یقیناً غلط تھا۔ مگر میرا مقصود اس حکایت سے یہ ہے کہ ہماری حالت ایسی کیوں ہے جس پر ایک کافر نے یہ کہہ دیا کہ تم سے تو ہم ہی اچھے ہیں۔ صاحب ہماری حالت دیکھ کر اس گبر کو مسلمان ہونے سے عار آئی۔ اس کا یہ کہنا کہ بایزید جیسا مسلمان ہوا نہیں جاتا۔ یہ کہنا بھی اس کا غلط تھا۔ کیونکہ اگر بایزید جیسا ہونا محال ہے پھر وہ کیسے ہوئے وہ کوئی نبی تو نہ تھے ان کے پاس وحی تو آتی نہ تھی۔ بس انہوں نے ذرا توجہ کی اور نفس کی مخالفت کی، مجاہدے کئے بایزید ہو گئے۔ تم بھی اگر توجہ کرو گے ذرا ہمت سے کام لوگے بایزید ہو سکتے ہو، ورنہ با حذف ہو کر یزید ہو جاؤ گے جو ترکیب بایزید نے کی تھی تم بھی کرو بایزید ہو جاؤ گے۔ وہ ترکیب کیا ہے، اس کا نام ہے ہمت۔ ہمت سے کام لو اوامر کو بجالاؤ، منہیات سے برطرف رہو۔

بزرگی کے معنی:

اگر کوئی کہے ہمیں تمام رات جاگنے کی ہمت تو ہے نہیں۔ یہ تو مشکل کام ہے۔ سو اس کا شرط

لازم ہونا ہی غلط بات ہے۔ رات بھر جاگنے کو کون کہتا ہے۔ خربوزے اور تربوز چھوڑنے کو کس نے کہا' اناج غلہ چھوڑ دینے کو بزرگی کس نے کہا' اس کو بزرگی نہیں کہتے۔ بزرگی کے معنی ہیں خدا کے اوامر کا امتثال کرنا' اور منہیات کو چھوڑنا۔ کھانا پینا چھوڑنے کو کون کہتا ہے خوب کھاؤ پیو۔ بایزید کو نوافل پڑھنے کی ہمت تھی' ان کے قوی قوی تھے وہ زیادہ مجاہدے کر سکتے تھے اسلئے کئے۔ اور ہم کو صرف فرائض واجبات وسنن ادا کرنے کی ہمت ہے کیونکہ ہمارے قوی کمزور ہیں۔ تو ہمارے لئے یہی کافی ہے۔ اگر کوئی کہے کہ صاحب ہم کو تو سب فرائض کی بھی قدرت نہیں چار وقت کی تو قدرت ہے۔ فجر۔ ظہر۔ عصر۔ مغرب' باقی عشاء کی طاقت نہیں ہے نیند سے مغلوب ہو جاتے ہیں تو وہ غلط کہتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ تو فرماوے کہ تم کو قدرت ہے اور تم خدا کی بات کو غلط کرنا چاہتے ہو۔ رہا یہ کہ حق تعالیٰ نے کہاں فرمایا ہے۔ سنئے ارشاد فرماتے ہیں۔ **لایکلف اللہ نفسا الا وسعھا** کہ اللہ تعالیٰ نے وسعت وطاقت سے زیادہ کسی کو کسی حکم کا مکلف نہیں فرمایا۔ معلوم ہوا کہ جملہ اوامر شرعیہ داخل قدرت بشریہ ہیں اور انہی میں سے عشاء کی نماز بھی ہے۔ تو قرآن سے معلوم ہوا کہ یہ سب داخل قدرت ہے اور یہ شخص کہتا ہے کہ مجھے قدرت نہیں جھوٹا ہے۔ یا کسی نے کہا تھا کہ صبح کو تو آنکھ نہیں کھلتی اور آنکھ کھلنا اختیار میں نہیں' اول تو ہم اس عذر کو مانتے ہیں کیونکہ تجربہ ہے اگر اس شخص کو جو کہ یہ کہتا ہے کہ صبح کو آنکھ نہیں کھلتی۔ ریل پر جانا ہو تو کیسا جلدی سے چار بجے اٹھ کر اسٹیشن پر پہنچتا ہے۔ اگر سویرے اٹھنا اختیار اور قدرت میں نہیں تو آج کیسے اٹھ بیٹھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بات دل کو لگی ہوئی تھی۔ اس لئے آنکھ کھل گئی۔ اور نماز دل کو لگی ہوئی نہیں اس لئے آنکھ نہیں کھلتی۔ ورنہ ممکن نہیں کہ صبح ہو اور آنکھ نہ کھلے۔ مگر خیر ہم نے آپ کے اس عذر کو بھی مانا۔ مگر کیا یہ بھی قدرت سے خارج ہے کہ سورج نکلنے کے بعد ہی فوراً پڑھ لو قضا ہی سہی۔ تو پھر صبح کی نماز وسعت سے کہاں خارج ہوئی۔

بہر حال اپنی وسعت کے موافق کرتے رہو جو تم سے بن پڑے کئے جاؤ۔ یہ کون کہتا ہے کہ وسعت سے زائد کرو۔

شیوخِ محققین کی وصیت:

بلکہ شیوخ محققین کی اس بارہ میں وصیت ہے کہ طالب کو اس کی ہمت سے زیادہ بتلانا ہی نہ چاہیے۔ عارف شیرازی فرماتے ہیں۔

خستگان راچو طلب باشدو ہمت نبود   گرتو بیدادکنی شرط مروت نبود

کمزوروں کو جب طلب ہو اور قوت نہ ہو تو انکی قوت سے زیادہ کام لینا ظلم ہے جو شرط مرّوت کے خلاف ہے۔

اور مولاناؒ فرماتے ہیں۔

چار پارا قدر طاقت بار نہ   برضیفاں قدر ہمت کار نہ

چوپایوں پر انکی طاقت کے موافق بوجھ رکھ۔ کمزوروں سے طاقت کے موافق کام لو۔ اور فرماتے ہیں۔

طفل راگرنان دہی برجائے شیر   طفل مسکین راازاں نان مردہ گیر

شیر خوار بچہ کو اگر دودھ کی جگہ روٹی دینے لگے تو وہ غریب اس روٹی سے مرہی جائے گا۔

اور فرماتے ہیں۔

غرض اس طریق میں ہر شخص کو اس کی طاقت کے موافق کام دیا جاتا ہے۔ تو اب اگر یہ طریق اختیار کروگے تو بایزید سے بھی افضل ہو سکتے ہو۔ باوجود کم محنت کرنے کے۔ تو اس گبر کا یہ کہنا کہ بایزید جیسا ہونا محال ہے یہ بھی ٹھیک نہیں۔ یہ تو قصہ تھا' باقی مقصود میرا اس قصہ سے یہ ہے کہ ہماری حالت ایسی ہوگئی کہ اس کو دیکھ کر دوسروں کو اسلام لانے سے عار آتی ہے۔ بلکہ اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ بعضے مسلمان قوم کی مجموعی حالت کو دیکھ کر اسلام کو بے وقعت سمجھنے لگے۔ ہمارے وطن کا ایک قصہ ہے کہ ایک انگریز میرے پاس مسلمان ہونے کو آیا وہ کسی عہدہ پر تھا۔ آپ کو مسلمان ہونے کا جوش اٹھا۔ نوکری چھوڑ کر مسلمان ہونے کو آئے۔ آجکل لوگوں میں یہ بھی ایک دستور ہوگیا ہے کہ ذرا سی بات پر نوکری چھوڑ دیتے ہیں۔ خدا جانے نوکری ان کو کیا کہتی ہے۔ کیا نوکری اللہ اللہ کرنے کو منع کرتی ہے۔ خیر یہ تو ایک کم سمجھ کا واقعہ تھا۔ ایک سمجھدار کا قصہ بیان کرتا ہوں۔ ایک مولوی صاحب کانپور کے ایک مدرسہ میں تھے۔ پڑھتے بھی تھے اور ایک رئیس زادہ کے جو اس مدرسہ میں پڑھتا تھا۔ اتالیق تنخواہ دار بھی تھے۔ انہوں نے ایک دفعہ ایک خواب دیکھا کہ حشر برپا ہے حساب کتاب ہو رہا ہے۔ اس خواب میں اپنی ایک بری حالت معلوم ہوئی۔ وہ خواب سے بہت پریشان ہوئے اور مجھ سے کہنے لگے کہ اگر آپ کہیں تو نوکری چھوڑ دوں۔ خدا جانے اس کو خواب کی برائی سے کیا تعلق تھا' نہ معلوم نوکری چھوڑنے میں کیا رکھا ہے' اس سے کیا مل جاتا ہے۔ لوگ نوکری چھوڑنے کو اور متعلقین سے بے پرواہ ہو جانے کو بڑی بزرگی سمجھتے ہیں۔ جب میں نے منع کیا تو رک گئے میں ایک مرتبہ میرٹھ اپنی اہل خانہ کا علاج کرانے

کے واسطے گیا۔ وہاں پر ایک عورت مجھ سے مرید ہونے کو آئی۔ تو اس کو دوسری عورتوں نے کہا کہ تو ان سے مرید مت ہو بلکہ ہمارے پیر سے مرید ہونا وہ بڑے بزرگ ہیں، پچاس برس سے بیوی سے بات تک نہیں کی اور یہ تو علاج کیلئے بیوی کو ساتھ ساتھ لئے پھرتے ہیں۔ وہ عورت فہیم تھی کہنے لگی اس کی یہ رائے تھی کہ اس سے تو مرید ہونا جائز نہیں کیونکہ پچاس برس تک بیوی سے نہ بولنا اس کے تو یہ معنی ہوئے کہ وہ پچاس برس سے گناہ میں مبتلا ہے کیونکہ بیوی کے حقوق ادا کرنا واجب ہے تو جو اتنا بڑا گنہگار رہو اس سے مرید ہونا کہاں جائز ہے۔ بعض لوگوں کے نزدیک اناج نہ کھانا بڑی بزرگی ہے۔ چنانچہ بعض دوکاندار پیر ایسے دیکھے گئے ہیں جن کی یہ کرامت مشہور ہے کہ وہ اناج نہیں کھاتے۔ افسوس ان لوگوں نے حلال کو چھوڑ کر حرام کو اختیار کیا ہے۔ کیونکہ انہوں نے اناج کھانا (جو کہ حلال تھا) اس لئے چھوڑا تا کہ شہرت حاصل ہو (جس کی طلب حرام ہے) کہ لوگ یوں کہیں کہ یہ بڑے بزرگ ہیں کچھ کھاتے ہی نہیں۔

جوش و ہوش:

غرض آج کل جہاں بزرگی کا جوش اٹھا یا بی بی کو چھوڑا یا نوکری چھوڑ دی۔ میاں اطاعت وہ چیز ہے کہ سلطنت کے ساتھ بھی ہو سکتی ہے۔ اور اگر کسی نے سلطنت کو چھوڑا ہے تو وہ غلبہ حال اور جوش میں چھوڑا ہے۔ اور جوش کی حالت حجت نہیں ہوتی بلکہ ہوش کی حالت حجت ہوتی ہے۔ پھر جوش میں بھی ان کو ہی ترک علائق کی اجازت تھی۔ تم کو اجازت نہیں۔ تمہارے لئے ملازمت چھوڑنا جائز نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ قوی القلب تھے سلطنت کو چھوڑ کر پچھتائے نہیں۔ تم ان کی کیا ریس کرتے ہو کہ آج نوکری چھوڑ دی کل کو پچھتانے لگو کہ ہائے اب کیسے گزر ہوگی۔ ہم نے یہ کیا بے وقوفی کی۔ حضرت ابراہیم بن ادہمؒ جب سلطنت چھوڑ کر نکلے تو یہ حالت تھی۔

لنگکے زیر و لنگکے بالا نے غم دزد و نے غم کالا
ایک چادر اوپر ایک چادر نیچے نہ ڈاکو کا ڈر نہ چور کا کھٹکا

مگر اس قدر مستغنی تھے کہ حال سلطنت میں بھی اتنے مستغنی نہ تھے۔ جب سلطنت چھوڑ کر گئے تو ایک کنویں میں وضو کرنے کیلئے ڈول ڈالا اس کو جو کھینچا تو بڑا وزنی معلوم ہوا۔ جب نکال کر دیکھا اور دراہم سے بھرا ہوا ہے۔ اس کو الٹ دیا اور پھر ڈالا تو سونا بھرا ہوا آیا۔ اس کو بھی الٹ کر پھر کھینچا تو جواہر سے لبریز تھا رونے لگے اور جناب باری میں عرض کیا کہ آپ میرا امتحان لیتے ہیں۔

امتحان کے لائق تو نہیں لیکن میرے قلب میں اگر ان کی قدر ہوتی تو سلطنت ہی کیوں چھوڑتا۔ میرا امتحان نہ لیجئے۔ اپنی رحمت کے صدقہ مجھے پانی دے دیجئے' مجھے وضو کرنا ہے' نماز کا وقت تنگ ہوا جاتا ہے۔ دیکھو ان کا دل کتنا قوی تھا۔ اور اب تو یہ حال ہے کہ اگر نوکری بھی چھوڑی تو اس لالچ میں چھوڑتے ہیں کہ اس سے زیادہ ملے اور لوگ بزرگ سمجھ کر بدیئے تحفے زیدہ دیں۔ چنانچہ ایک بیرسٹر کا قصہ ہے کہ اس نے ان تحریکات میں نوکری چھوڑی اور ایک انجمن کا صدر ہوگیا۔ بس ہزاروں روپے اس بہانہ سے کما لئے اور ساتھ کے ساتھ نیک نام بھی ہوگئے کہ ایسے خادم اسلام ہیں کہ بیرسٹری چھوڑ کر انجمن کی خدمت کیلیے تیار ہوگئے۔ سبحان اللہ دین کا بہت ہی خیل ہے۔ یہ حقیقت تھی ان کے اسباب معاش چھوڑنے کی۔ مگر حقیقت شناس اس حالت میں بھی پرکھ لیتے ہیں۔ پرکھنے پر سرسید کی ایک بات یاد آئی۔ گو ہم ان کے مخالف ہیں مگر انصاف یہ ہے کہ جیسے ان کے عیوب کو ہم ظاہر کرتے ہیں ویسے ہی اگر ان میں کوئی خوبی ہو تو اس کو بھی ظاہر کردینا چاہیے۔

عیب مے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو   نفی حکمت مکن از بہردں عامی چند

عیب تو سب بیان کردیئے اب اسکی خوبیاں بھی بیان کرو چند عامی لوگوں سے ہر ایک سے حکمت کی نفی نہ کرو۔

(قرآن شریف کا بھی یہی طرز ہے فرماتے ہیں **یسئلونک عن الخمر والمیسر قل فیھما اثم کبیر ومنافع للناس**. اے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آپ سے سوال اور جوئے کے بارے میں پوچھتے ہیں آپ فرمائیں کہ ان دونوں میں گناہ بہت بڑا ہے اور لوگوں کا نفع کم ہے

اور فرماتے ہیں' **ومن اھل الکتاب من ان تامنہ بقطار یودہ الیک ومنھم من ان تامنہ بدینا رلا یودہ الیک الامادمت علیہ قائماً**.(۱۲ ظ) غرض سرسید امور دنیا میں بڑے عاقل اور مسلمانوں کے محب اور بہت خیر خواہ تھے۔ گو وہ محبت بوجہ دین کی کمی کے ناداں دوست کی سی محبت ہوگئی تھی۔ بس ان میں قلت دین کا عیب ضرور تھا' لیکن بہت سی خوبیاں بھی تھیں گو اس عیب نے سب خوبیوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ غرض ان سے کسی نے کہا کہ فلاں مقام پر ایک بزرگ ہیں ان سے آپ ملئے وہ بڑے متوکل شخص ہیں۔ اس نے کہا ہاں میں بھی ان کو جانتا ہوں' یہ بھی ایک دنیا کمانے کی ترکیب ہے کہ لوگ ہم کو متوکل سمجھ کر زیادہ ہدایا تحائف پیش کریں گے۔ خیر ان کا حال تو معلوم نہیں کہ وہ کس لئے بیٹھے تھے۔ لیکن بہت سے لوگ واقعی اس کو ترکیب طلب دنیا ہی کی سمجھتے ہیں۔ بہتوں نے اس کو حصول دنیا کا ایک ذریعہ بنا رکھا ہے تو ایسے لوگوں کو ضرورت ہی کیا نوکری

چھوڑنے کی۔ کیونکہ چھوڑ کر بھی دنیادار ہی رہے۔ اس سے تو نہ چھوڑنا ہی اچھا ہے کہ جھوٹے دعوے سے تو بچیں۔ الغرض سلف کے قلوب قوی تھے۔ وہ چھوڑ کر گھبراتے نہ تھے۔ ان کیلئے ملازمت چھوڑ دینا بجا تھا۔ اور ہم ضعیف ہیں ہمارے قلوب بھی ضعیف ہیں۔ آج ہم اگر ملازمت سے استعفاء دیں توکل کو پچھتانے لگیں۔ اس لئے ہمارے لئے ملازمت چھوڑ دینا بے جا ہے۔ ہم کو چاہیے کہ جب اس کا جوش اٹھے اس وقت ہوش سے کام لیں۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ کسی مقتداء کی رائے پر عمل کریں جو وہ کہے اسی کو اختیار کریں۔ اپنی رائے کو اس میں اصلاً دخل نہ دیں کیونکہ مریض کی بدبختی ہے علاج میں اپنی رائے پر عمل کرنا۔ اور خوش قسمت ہے وہ مریض جو اپنے کو طبیب کے حوالے کردے اور اس کے کہنے کے موافق عمل کرے۔ غرض وہ عہدہ دار انگریز نوکری چھوڑ کر آیا تھا اس کے چند شبہات تھے وہ کہتا تھا کہ اگر وہ شبہے رفع ہوجاویں تو میں مسلمان ہوجاؤں گا۔ جب وہ تھانہ بھون آیا تو اتفاق سے میں اس زمانے میں مکان پر نہ تھا۔ اس انگریز کی قصبہ میں ایک جنٹلمین صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ انہوں نے اس انگریز سے سوال کیا کہ تم مسلمان ہوکر کیا کروگے جہاں پہلے سے دس بدمعاش ہیں۔ وہاں تم بھی ایک اور بڑھ جاؤ گے۔ اب گیارہ ہوجاویں گے۔ استغفر اللہ استغفر اللہ گویا ان کے نزدیک اسلام نام بدمعاشی کا ہے۔ افسوس کس قدر شنیع کلمہ ہے۔ پھر لوگ کہتے ہیں کہ مولوی مسلمانوں کو کافر بناتے ہیں۔ ارے ظالمو! مولویوں کی کیا خطا ہے۔ جب تم خود ہی کافر بنتے ہو۔ اب اگر کوئی مولوی ایسی بیہودہ باتوں پر تم کو کافر کہہ دے تو اس بے چارے کی کیا خطا؟ وہ کیا کرے مولویوں کا کافر بنانا بالکل ایسا ہے جیسے ایک رئیس نے اپنے مہمان کو مخنث بنایا تھا یعنی مخنث وہ خود بنا تھا۔ رئیس نے اسی کے لوازم ظاہر کردیئے۔ قصہ یہ ہے کہ ایک رئیس کے پاس ایک جاہل شخص گیا۔ وہاں کچھ اور مہذب بھی تھے جنہوں نے کچھ دیر تک باتیں کیں۔ جاتے وقت ایک نے کہا کہ میں جناب سے اب مرخص ہوتا ہوں۔ اس اناڑی نے بھی اس لفظ کو سنا آپ نے اس کو یاد کرلیا کہ جاتے وقت یوں کہا کرتے ہیں۔ اب آپ کے رخصت کا وقت آیا تو فرماتے ہیں کہ صاحب اب میں مخنث ہوتا ہوں۔ اس نے کہا اپنی چیز ہے آپ کو اختیار ہے۔ چاہے رکھئے چاہے الگ کردیجئے۔ بتلایئے اس صورت میں اگر وہ اناڑی یہ کہنے لگے کہ واہ صاحب تم نے تو مجھے ہیجڑا ہی بنا دیا۔ تو اس رئیس کی کیا خطاء؟ تم تو خود اپنی زبان سے مخنث بن گئے اس نے کہاں بنایا۔ اسی طرح مولوی صاحب کسی کو کافر نہیں بناتے۔ لوگ خود کافر بنتے ہیں، مولوی لوگ بتلا دیتے ہیں، بلکہ وہ تو مسلمان بناتے ہیں۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ بس حکم کردیتے ہیں انت مسلم کہ تم

مسلمان ہو۔ بلکہ مسلمان بنانے سے مراد یہ ہے کہ اسلام کا امر کرتے ہیں، بس بنانے کے یہ معنی ہیں۔ سو اس معنی ہیں وہ کسی کو کافر نہیں بناتے یعنی کسی کو کفر کا امر نہیں کرتے۔ البتہ اگر کوئی کافر ہو گیا ہو تو اس پر حکم لگا دیتے ہیں کہ **کفرت انت** کہ تم کافر ہو گئے **فتب الی اللہ وجدد اسلامک** خدا سے توبہ کرو اور اسلام و نکاح کی تجدید کرو۔ غرض وہ کافر ہونے کو ظاہر کر دیتے ہیں، اور اس کے متعلق احکام کا امر کرتے ہیں کہ اس وقت تم کو ایسا کرنا چاہیے۔ حاصل یہ کہ وہ کافر بناتے نہیں (نون سے) بلکہ بتاتے ہیں (تا سے)۔ ایک نقطہ کا فرق ہے۔

روحانی قوت:

میں تنبیہ سے پہلے اس کو بیان کر رہا تھا کہ اسلام کی حفاظت ایک اندرونی ہے ایک بیرونی۔ اور زیادہ اہم اول ہے۔ اگر ہم اس کا اہتمام کر لیں۔ تو اغیار خود پست ہو جائیں اور بدون اس کے محض دوسری قسم میں کوشش کرنا ایسا ہے جیسے اپنے پاس ہتھیار نہیں، خزانہ نہیں پھر دشمن کا مقابلہ۔ میں تلوار بندوق توپ کمان کو ہتھیار نہیں کہتا۔ بلکہ ہتھیار سے مراد یہ ہے کہ ہمارے پاس اعمال نہیں ہیں۔ ہمارے اعمال، اخلاق، معاشرت بالکل گندے ہیں۔ اگر ہمارے یہ ہتھیار تیز ہوں تو دوسرا کبھی حملہ نہ کر سکے۔ اس کو لڑنے کی ہمت ہی نہ ہو گی۔ خدا کی قسم کہ ہمارا اسلام کامل ہوتا۔ (اعمال ٹھیک ہوتے تو کسی کو کبھی ہمت بھی نہ ہوتی کسی مسلمان کی طرف نظر اٹھانے کی، کبھی اس کا وسوسہ بھی ان کے دل میں نہ آتا۔ بس اس لئے میں کہتا ہوں کہ اس کی تم کو زیادہ ضرورت نہیں کہ کسی سے لڑو بھڑو۔ اس کی طرف التفات ہی نہ کرو۔ ہاں تم ایسے بن جاؤ کہ ان کو تمہارے مقابلہ کی ہمت ہی نہ رہے۔ اگر تم اپنے اعمال ٹھیک کر لو گے شریعت کے پورے متبع ہو جاؤ گے، معاشرت، معاملات، اخلاق کو درست کر لو گے، تو وہ کسی مسلمان کو تو کیا مرتد بناتے ادھر رخ کرنے کی بھی ہمت نہ ہو گی۔ غرض اول اندرونی محافظت کرو اس کی زیادہ ضرورت ہے۔ صاحبو! ہم کو اس روحانی محافظت کی ضرورت ہے۔ خارجی تدابیر کی زیادہ ضرورت نہیں۔ یاد رکھو کہ یہ روحانی طاقت بہت بڑی پہرہ دار ہے۔ چنانچہ کانپور میں میرے ایک دوست تھے۔ ان کے پڑوس میں ایک عیسائی رہتا تھا۔ وہ ان کو عیسائی بننے کی ترغیب دیتا تھا، مگر ان پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ وہ ہیڈ کانسٹیبل تھے طرح طرح سے ان کو سمجھاتا۔ نصرانیت کے فوائد بتلاتا کہ اگر عیسائی ہو گئے تو تمہاری بڑی وقعت ہو گی، وقار ہو گا، مگر یہاں وہی ہنوز روز اول تھا۔ آخر اس نے ایک دن باتوں باتوں میں پوچھا کہ تم کسی بزرگ سے مرید ہو۔ انہوں نے جواب دیا کہ میں کسی سے مرید تو ہوں نہیں۔ البتہ حضرت مولانا

گنگوہی سے حسن عقیدت رکھتا ہوں۔ ان سے مجھے محبت ہے وہ کہتے تھے کہ جس روز سے اس کو معلوم ہوا کہ میں مولانا گنگوہی کا معتقد ہوں، اس روز سے اس کو مایوسی ہوگئی۔ پھر اس نے کبھی مجھ کو عیسائیت کی ترغیب نہیں دی۔ بس وہ حالت ہوگئی۔ **الیوم یئس الذین کفروا من دینکم** آج کے روز کافر لوگ تمہارے دین سے مایوس ہوگئے۔ الآیۃ دیکھئے حالانکہ پولیس کے غوائل کے سبب ان کا اسلام خود کامل نہ تھا۔ مگر ایک کامل الاسلام سے ان کو تعلق تھا۔ صرف اس تعلق کی وجہ سے مخالف ان سے مایوس ہوگیا اور سمجھ گیا کہ ان کو عیسائی بنانا مشکل ہے۔ بس صرف ایک کامل الاسلام کے ساتھ تعلق کا یہ اثر ہے۔ پھر اگر کوئی خود کامل الاسلام بن جاوے نماز روزہ ادا کرے، زکوٰۃ دے، حلال حرام کا خیال رکھے، ہر کام دین کے موافق کرے کوئی بات خلاف شرع اس سے صادر نہ ہو تو دوسرا شخص دیکھتے ہی سمجھ لے گا کہ یہ کامل الاسلام ہے۔ پورا مذہبی شخص ہے۔ اس کے دندان آز اس کی طرف کبھی تیز نہ ہوں گے بلکہ کند ہو جاویں گے۔ پکے مسلمان پر کبھی کسی کافر کو بہکانے کی ہمت نہ ہوگی۔ اس کو کبھی نہیں چھیڑے گا بلکہ کوسوں الگ رہے گا۔

اصل علاج:

ہم کو خود اپنی حالت کی فکر نہیں۔ سراپا امراض میں مبتلا ہیں۔ لیکن اس کا علاج نہیں کرتے۔ اب اگر علاج کی فکر ہوئی تو کیا کیا دوسرے سے لڑائی بھڑائی شروع کردی۔ غرض جو اصل علاج تھا (یعنی اپنے اعمال کی اصلاح)۔ اس کو تو پس پشت ڈال دیا اور جو حقیقت میں علاج نہیں اس کے درپے ہوگئے۔ ہماری وہ حالت ہوگئی جس کو مولانا ایک کنیز کے بارے میں فرماتے ہیں۔

ہرچہ کردند از علاج و از دوا　　　رنج افزوں گشت وحاجت ناروا

جو کچھ علاج اور دوا کی مگر اس سے مرض میں اضافہ ہوا اور حاجت پوری نہ ہوئی۔

پھر آگے اس کی وجہ بتلاتے ہیں۔

بے خبر بودند از حال درون　　　**استعیذ اللہ مما یفترون**

وہ لوگ اندرونی حالت (باطنی) سے بے خبر ہیں اور جو کچھ غلط بیانی کرتے ہیں اس سے میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں

اور اسی کو طبیب الٰہی نے کہا تھا۔

گفت ہر دارو کہ ایشاں کردہ اند　　　آں عمارت نیست ویراں کردہ اند

کسی نے کہا انہوں نے جو بھی دوا کی وہ آباد کرنا نہیں ہے انہوں نے ویرانی کرنا ہے۔

تو جیسے وہاں جتنی دوائیں کی گئیں وہ سب ناکافی تھیں۔ اسی طرح ہم بھی صدہا علاج کرتے ہیں مگر ایک بھی کارآمد نہیں' کیونکہ جو اصلی علاج ہے اس کی خبر ہی نہیں۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے کہ اصل علاج سے غافل ہیں اور جو علاج نہیں ہے اس میں مشغول ہیں۔ اس وقت اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ہماری عادت یہ ہوگئی ہے کہ ہم کو اپنے گھر کی بات تو ناپسند ہے اور غیروں کے گھر کی بات پسند ہے بس جو غیروں کو کرتے دیکھا وہی خود کرنے لگتے ہیں۔ اول تو کچھ کریں گے ہی نہیں اور جو کریں گے بھی تو غیروں کو دیکھ کر۔ جو وہ کریں یہ بھی وہی کریں گے سو یہ تو ان کا پورا اتباع ہوگیا۔ مثلاً تبلیغ اسلام ہی کا کام ہے اول تو کسی کو اس کا خیال ہی نہ تھا' ہوش ہی نہ تھا مدہوش پڑے تھے۔ اب جو دوسری قوم کی سعی دیکھی تو ہوش ہوا۔ اور اشاعت اسلام کی سعی کرنے لگے۔ مگر اس چال سے چلے جو دوسری قوم نے چلی تھی۔

اہل کفر کو کفر سے مناسبت:

صاحبو! اس طرح سے ہر بات میں دوسری قوم کا اتباع۔ اس کے تو معنی یہ ہوئے کہ ہمارے مذہب میں ہمارے اسلام میں کام کرنے کا کوئی طریق ہی نہیں۔ نعوذ باللہ کس قدر غلط خیال ہے؟ پھر نتیجہ یہ ہے کہ جو کچھ ہم دوسروں سے لیتے ہیں' ہم کو اس میں کامیابی نہیں ہوتی اور ان کو ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ تدابیر ان کیلئے ہی مناسب ہیں۔ ہمارے لئے بالکل مناسب نہیں۔ کیونکہ وہ مذہب باطل ہے۔ اس کی تعلیم بھی باطل ہے' وہ اہل باطل ہیں ان کی تدابیر بھی باطل ہیں۔ باطل کو باطل ہی سے مناسبت ہے اس لئے ان کا کام بن جاتا ہے۔ اور ہمارا مذہب حق ہے' ہم اہل حق ہیں ہم کو تدبیر باطل کافی نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا ان میں ہمیں ناکامی ہوتی ہے۔ پس اہل حق کو تدابیر بھی حق ہی کرنا چاہئیں۔ حق کو باطل سے مناسبت کیسے ہو۔ حق کو حق ہی سے مناسبت ہوتی ہے۔ اور باطل کو باطل سے۔ یاد رکھو تدابیر اہل کفر سراسر دنیا ہیں۔ مسلمانوں کو وہ تدبیریں راس نہیں آسکتیں۔ اور کفار کا دنیا سے تناسب نقل سے ثابت ہے۔ چنانچہ قرآن شریف میں ہے۔ قال **ومن کفر فامتعہ قلیلا ثم اضطرہ الی عذاب النار۔** اور جو شخص کفر کرے تو اسے تھوڑے روز آرام پہنچاؤں گا پھر اس کو کشاں کشاں دوزخ میں پہنچاؤں گا جو برا ٹھکانا ہے۔

یہ ابراہیم علیہ السلام کے قصہ میں ہے' اس سے اوپر یہ ارشاد ہے۔ **واذا بتلی ابراھیم ربہ بکلمات فاتمھن قال انی جاعلک للناس اماماً** کہ حق تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو چند احکام میں آزمایا' اور جب اس میں پورے اتر گئے تو خطاب فرمایا کہ میں تم کو لوگوں کا امام اور

مقتداء بناؤں گا۔ **قال ومن ذریتی** ابراہیم علیہ السلام نے کہا اور میری اولاد میں سے بھی بعض کو امام اور پیشوا بنایئے۔ **قال لا ینال عهدی الظلمین.** ارشاد ہوا کہ امامت ظالم کافر کو نہیں مل سکتی یعنی ذریت میں سے۔ پھر مناسبت مقام سے درمیان میں خانہ کعبہ کا ذکر فرمایا ہے۔ **واذجعلنا البیت مثابة للناس وامناً.** کہ ہم نے خانہ کعبہ کو مقام امن اور لوگوں کا مرجع فی العبادت بنا دیا۔ **واتخذوا من مقام ابراهیم مصلیٰ** الآیۃ اس کے آگے ہے **واذقال ابراهیم رب اجعل هذا بلداً اٰمناً** کہ یا اللہ اس مقام کو امن والا شہر کردے **وارزق اهله من الثمرات** اور اس کے رہنے والوں کو پھل بھی دے۔ **من اٰمن منهم بالله والیوم الاٰخر.** جو اللہ پر اور قیامت پر ایمان لاوے۔ آپ نے ثمرات دنیوی کو دینی امامت پر قیاس کیا وہاں حکم ہوا تھا **لا ینال عهدی الظلمین** کہ کافر ظالم کو امامت اور نبوت نہیں مل سکتی۔ آپ نے اس پر قیاس کیا کہ شاید نعمت دنیوی بھی کافر کو نہ ملے اس لئے دعا میں **من اٰمن منهم بالله والیوم الاٰخر** (ان میں سے جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لائے) کی قید لگا دی تا کہ بے ادبی کا احتمال نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے جواب دیا **ومن کفر فامتعه قلیلاً ثم اضطره الیٰ عذاب النار وبئس المصیر.** عام مفسرین نے تو اس کی اور تفسیر کی ہے۔ مگر حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی نے تفسیر مظہری میں ایک عجیب تفسیر کی ہے۔ عام مفسرین نے تو یہ تفسیر کی ہے کہ یہ معمول ہے ارزق مقدر کا یعنی **وارزق من کفر** کہ میں کافر کو بھی رزق دوں گا۔ آگے اس کی تفصیل ہے **فامتعه قلیلا ثم اضطره الیٰ عذاب النار** (پس ایسے شخص کو تھوڑے روز تو خوب آرام برتاؤں گا پھر اس کو کشاں کشاں عذاب میں پہنچاؤں گا) اس تفسیر کے موافق گویا من کفر پر جملہ ختم ہو گیا۔ **فامتعه قلیلا** (پس اس کو تھوڑے روز آرام پہنچاؤں گا) الخ. لگ جملہ ہے۔ اور قاضی ثناء اللہ صاحب نے کہا ہے کہ من مبتدا ہے اور **فامتعه** خبر ہے یا یوں کہو کہ من شرطیہ ہے اور امتعه اس کی جزا ہے۔ خواہ من کو مبتدا مانو یا شرطیہ، اور امتعه کو خبر بنا ؤ یا جزا دونوں جائز ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہ جملہ مستقلہ ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ جو کفر کرے گا اس کو دنیا سے متمتع کروں گا' اور قلیلاً قید واقعی ہے۔ **کما قال تعالیٰ قل متاع الدنیا قلیل.** (آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمادیں کہ دنیا کا ساز و سامان بہت کم ہے) اب اس پر ایک سوال ہوتا ہے کہ اس تقریر کا تو حاصل یہ ہوا کہ جو کفر کرے گا اسی کو متاع حاصل ہوگی تو کیا کفر سبب تمتع کا ہے؟ قاضی صاحب نے اس کا جواب دیا ہے۔ کہ دنیا کو مؤمن سے کم مناسبت ہے اور کافر سے زیادہ مناسبت ہے۔ یہ ایسی بات ہے جیسے ارشاد ہے

الخبیثت للخبیثین والخبیثون للخبیثت (گندی عورتیں گندے مردوں کے لائق ہوتی ہیں اور گندے مرد گندی عورتوں کے لائق) کہ خبیث کو خبیث ہی ملا کرتا ہے۔ دنیا خسیس ہے اور کفار بھی خسیس ہیں۔ لہٰذا ان میں باہم تناسب ہے۔ اور مومن شریف ہے اور دنیا خسیس ہے' لہٰذا ان میں باہم تناسب نہیں ہے۔ میں نے اسی تفسیر پر دعویٰ کیا تھا کہ کفر کا دنیا سے تناسب نقل سے ثابت ہے۔ اس لئے تدابیر باطلہ کفار کیلئے مفید ہیں۔ بخلاف اہل اسلام کے ان کیلئے تو وہی تدابیر نافع ہوں گی جو اسلام کے مناسب ہیں' وہ تدابیر کیا ہیں وہ وہ ہیں جو اللہ میاں نے بیان فرمائی ہیں جن کو میں نے اب بیان کیا ہے کہ اپنی اصلاح کرو' اخلاق کو درست کرو' عقائد و اعمال کو سنوارو' اس سے فائدہ یہ ہوگا کہ دوسرے کو تمہارے بہکانے کی طمع نہ ہوگی' دست درازی کی ہمت نہ ہوگی۔ یہ تو اپنا ذاتی فائدہ ہے اپنے نفس کی حفاظت ہے' آگے دوسرا درجہ اشاعت اسلام کا ہے اس سے بھی اس میں کامیابی ہوگی۔ کیونکہ اسکا حسن ایسا ہے کہ دوسروں کے دل بھی کھینچتا ہے۔ اگر تمہارے اندر اسلام کے پورے اوصاف پائے جائیں گے۔ اسکے انوار و برکات تم میں جمع ہو جائیں' تو دوسری قومیں خود ہی اسکے اندر آ جائیں گی۔ زیادہ بولنے کی بھی ضرورت نہیں رہے گی۔

اسلام اور تلوار:

یہ جو مشہور ہے کہ اسلام بزور شمشیر پھیلا ہے' جس سے مراد مخالفین کی یہ ہے کہ خود اس میں کشش نہیں' بالکل غلط ہے۔ اس دعویٰ کو خود قرآن رد کرتا ہے۔ فرماتے ہیں۔ **لا اکراہ فی الدین** دین میں کوئی جبر نہیں۔ قرآن تو جبر کی مخالفت کرتا ہے۔ تو کیا بھلا مسلمان قرآن کے خلاف کریں گے اور جبراً مسلمان بنائیں گے ہرگز نہیں۔ خصوصاً صحابہ جو اپنے جان و مال کو اس پر فدا کر چکے حیرت کی بات ہے کہ وہ اس کے خلاف کریں۔ پس سمجھ لو کہ اسلام ہرگز بزور شمشیر نہیں پھیلا بلکہ اس کے کمال ذاتی کو دیکھ کر لوگ خود بخود چلے آئے ہیں۔ اس کی تحقیق بہت آسان ہے وہ یہ کہ اسلام کے قوانین کو دیکھ لو اس سے اندازہ ہو جائے گا کہ بزور شمشیر پھیلا ہے یا نہیں۔ اسلام میں اشاعت اسلام کا قانون یہ ہے کہ جب کسی قوم پر حملہ کرو۔ اول ان پر اسلام پیش کرو کہ ایمان لے آؤ اگر وہ ایمان لے آویں' تو وہ تمہارے بھائی ہیں' تم ان کے بھائی ہو' کوئی فرق نہیں' سب برابر ہو۔ اور اگر یہ نہیں کرتے اور اسلام نہیں لاتے تو ان سے کہا جائے گا جزیہ دو تاکہ ہم کو اطمینان ہو جاوے کہ تم ہماری اطاعت کرو گے' سرتابی نہ کرو گے۔ اصل مقصود تو اطاعت ہے۔ جزیہ اس کی علامت ہے۔ یعنی جزیہ سے معلوم ہو جائے گا کہ تم ہمارے زیر اثر رہو گے' سرکشی اور بدامنی نہ

پھیلاؤ گے۔ اگر وہ یہ مان لیں تو اس صورت میں بھی تمہاری اولاد کی طرح ہیں۔ جیسے تم اپنی اولاد کی حفاظت کرتے ہو ایسے ہی ان کی جان و مال کی حفاظت بھی تم پر لازم ہوگئی۔ اور اس حالت میں دیکھو ان کیلئے کس قدر آزادی ہے کہ اپنے دینی احکام کو ان پر جاری نہ کرو بلکہ ان کو ان کے مذہب پر چلنے دو۔ کچھ تعرض مت کرو۔ مثلاً شراب پینا اسلام میں حرام ہے مگر ان کے یہاں جائز ہے تو حکم ہے کہ ان کو شراب پینے سے مت روکو اس کی بیع و فروخت کرنے دو۔ یہ مثلاً نکاح ہے کہ ہمارے یہاں کچھ شرائط ہیں تو ان کو اس پر مجبور نہ کرو کہ ہمارے جیسا نکاح کریں۔ بلکہ جیسا ان کے یہاں رواج ہے ویسا ہی کر دو۔ غرض اگر اسلام نہ لاویں تو اس ہیئت کے ساتھ جزیہ کا حکم ہے اور اگر جزیہ بھی نہ دیں تو اس وقت ان کو کمزور کرنے کیلئے نہ کہ مسلمان بنانے کیلئے شمشیر کا حکم ہے کیونکہ اب معلوم ہوگیا کہ بڑی سرکش قوم ہے کسی بات کو مانتے ہی نہیں لہٰذا تلوار سے ان کی گردنیں پست کر دو۔ اگر اسلام تلوار سے پھیلا ہوتا تو اول ہی حکم تلوار کا ہوتا۔ تیسرے درجہ میں نہ ہوتا۔ مگر یہاں تو پہلے اسلام پیش کرنا ہے۔ دوسرے درجہ میں جزیہ کا حکم سنا دینا۔ تیسرے درجہ میں تلوار کا حکم ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام اکراہ شمشیر سے نہیں پھیلا اور ایک باریک بات قابل غور ہے وہ یہ کہ اگر اسلام تلوار سے پھیلا ہوتا تو گویا لوگوں کو زبردستی سے مسلمان بنایا گیا ہے۔ اور جبر کا اثر بدن پر ہوتا ہے قلب پر نہیں ہوتا۔ اگر لوگ کراہتہً مسلمان ہوئے ہوتے تو ان کی یہ حالت ہونی چاہیے تھی کہ زبان سے تو اپنے آپ کو مسلمان بتلاتے اور دل سے اسلام سے ان کو نفرت ہوتی لوگوں کے سامنے نماز روزہ کر لیتے، پیچھے نہ کرتے، مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام کا اثر قلوب پر ہے اور جو نیا مسلمان ہوتا ہے وہ اکثر پرانے مسلمان سے بھی اچھا ہوتا ہے۔ وہ پرانے مسلمان سے زیادہ احکام کا پابند اور زیادہ خائف اور زیادہ خاضع بالخصوص جو اس وقت مسلمان ہوتے ہیں ان کی حالت پرانے مسلمانوں سے بہت ہی اچھی نظر آتی ہے۔ بشرطیکہ کچھ علم احکام اسلام کا حاصل کر لیں لوگ کہتے ہیں کہ اسلام تنزل پر ہے اس کی غلطی میں نے ظاہر کر دی ہے کہ درحقیقت خود ہماری حالت تنزل پر ہے نہ کہ اسلام۔ وہ تو کامل مکمل ہے۔ اس کو تنزل کبھی نہیں ہو سکتا۔

محبت اسلام:

مگر جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اسلام تنزل پر ہے وہ دیکھ لیں کہ ہم اس حالت میں بھی دیکھتے ہیں کہ ہر سال ہزاروں آدمی مسلمان ہوتے ہیں اور یہ نہیں کہ صرف غرباء ہی اسلام لاتے ہوں (جس سے یہ شبہ ہو کہ میاں اسے کھانے کمانے کو نہیں ملتا تھا اس لئے مسلمان ہوگیا) بلکہ بہت

سے ان میں متمول بھی ہوتے ہیں، صاحب جائیداد ہوتے ہیں، صاحب حشم خدم بھی ہوتے ہیں، بلکہ بہت سے مالدار مسلمان ہو کر مال سے دست بردار ہو جاتے ہیں۔ پہلے بہت ناز و نعم میں رہے اور اسلام لانے کے بعد قسم قسم کی تکالیف اٹھاتے ہیں۔ نہ کھانے کو ہے، نہ پہننے کو، نہ رہنے کو کوئی جگہ ہے، دردر بھٹکتے پھرتے ہیں، اور پھر ان تکالیف کو زبان پر بھی نہیں لاتے۔ بتلایئے یہاں جبر کس نے کیا۔ کیا جبر کی یہ صورتیں ہوتی ہیں؟۔ جبر کی تو یہ حالت ہوتی ہے کہ پہلی محبت بھی جاتی رہتی ہے بلکہ بجائے محبت کے عداوت ہو جاتی ہے۔ غرض اس زمانہ میں کسی کا اسلام لانا محاسن اسلامیہ کے کمال کی قوی دلیل ہے۔ کیوں کہ اب کسی پر کون جبر کرتا ہے؟ کون جہاد کرتا ہے؟۔ مگر یہ بات بڑے افسوس کی ہے کہ آج کل جو کوئی بے چارہ مسلمان ہوتا ہے ہم لوگ اسکی خبر گیری نہیں کرتے۔ اسکی کوئی خدمت نہیں کرتے حالانکہ دنیا میں جتنی متمدن قومیں ہیں وہ سب اپنا مذہب قبول کرنے والے کی خدمت کرتے ہیں، ہر طرح سے اس کو راحت پہنچاتے ہیں جان سے بھی، مال سے بھی۔ اور ایک ہم ہیں کہ ہم اس کیلئے دو روپیہ بھی خرچ نہیں کرتے، بعض میں تو وسعت ہی نہیں لیکن اگر کسی میں وسعت بھی ہے وہ بھی نہیں دیتا۔ اور ہمارے نہ دینے کی دو وجہیں ہیں ایک اچھی ایک بری۔ بری وجہ تو یہ ہے کہ ہم میں ہمدردی نہیں ہے۔ اگر ہمدردی ہوتی تو ضرور ایسے شخص کی اعانت کرتے یہ تو بری وجہ ہے۔ اور اچھی وجہ یہ ہے کہ اگر کوئی اسلام لایا تو اس نے ہم پر کیا احسان کیا۔ ہمارا کون سا کام کر دیا، جو ہم اس کی خدمت کریں اگر مسلمان ہوئے ہیں تو اپنی خیر منانے کیلئے نہ کہ ہمارے لئے۔ دیکھو جو لوگ کوئی سرکاری امتحان دیتے ہیں، ان کو سرکار سے کچھ انعام نہیں ملتا۔ بلکہ وہ خود ہی ہزاروں مشقتیں اٹھاتے ہیں، کہیں نجی طور پر ماسٹر رکھتے ہیں۔ اس کو الگ روپیہ دینا پڑتا ہے ان کے نخرے برداشت کرنا پڑتے ہیں، راتوں مطالعہ کیلئے جاگنا پڑتا ہے۔ پھر فیس داخل کرتے ہیں تب جا کر امتحان کی منظوری ہوتی ہے۔ پاس ہونا تو الگ رہا۔ اسی طرح اسلام جب نجات آخرت کا طریقہ ہے اس کو ہم نے مفت بتلا دیا تو یہ بھی ہمارا بڑا احسان ہے، ان کا کیا احسان ہے۔ بس وہ ہمارا احسان مانیں۔ ہمیں نذرانہ دیں۔ یہ کیسی الٹی بات ہے کہ ایک تو ہم احسان کریں پھر ان کی خدمت بھی ہم پر واجب کی جاوے۔ مگر خیر یہ تو نکتے ہیں جو کسی کے ذہن میں بھی نہیں ہوتے۔ اصل سبب وہی بے تعلقی بے دردی ہے۔ تمہارے ان نکتوں میں وہ بے چارہ تو برباد ہو گیا۔ اس نے تو گھر بار چھوڑا، بال بچوں نے بھی اس کو اس حال سے نکال دیا کہ کوئی چیز اس کے پاس نہیں کھانے پینے کو کچھ نہیں۔ اتنے پیسے نہیں کہ

دوسری جگہ جا کر کسی کے ہاتھ پر مسلمان ہی ہو جائے۔ ریل کا کرایہ نہیں ہے مگر دل میں ایک تیر لگا ہوا ہے وہ کہاں بیٹھنے دے بیچارہ پیدل ہی چل پڑا' کہیں فاقے گزرے' کہیں پیر میں چھالے پڑ گئے۔ غرض بیسیوں مصیبتیں اٹھا کر مسمان ہونے کو کسی شہر میں آیا۔ اب مسلمان کے نخرے دیکھئے کہ وہ خدمت اور خاطر مدارات تو کیا کرتے۔ اب تو بعض لوگ الٹا روکتے ہیں کہ جاؤ میاں ہم مسلمان نہیں کریں گے' یہ وقت اسلام لانے کا نہیں ہے۔ اگر ہم تم کو مسلمان کریں گے تو ہندو مسلم اتحاد میں خلل پڑے گا۔ ہمارا اتفاق بگڑ جاوے گا۔ بھائی اتحاد کیوں بگڑتا' آخر ہمیشہ سے دونوں قومیں بستی آئی ہیں اور ہر ایک اپنے اپنے مذہب کی خدمت کرتا رہا ہے کبھی لڑائی جھگڑا نہ ہوا۔ بلکہ پرانے لوگوں میں اتحاد زیادہ تھا۔ ہر شخص اپنے پڑوسی کی زیادہ ہمدردی کرتا تھا۔ اس کو راحت پہنچاتا تھا۔ مگر اب دونوں قوموں کی نئی امت میں چھری کٹار چلنے لگے وہ اس کے مارنے کی فکر میں ہے۔ یہ اس کا گلا کاٹنے کو آمادہ ہے۔ پرانے لوگوں میں دعوی نہ تھا مگر کام کرتے تھے۔ زبان سے اتحاد و اتفاق نہیں رٹتے تھے' مگر دل میں محبت موانست تھی۔ اور اب زبان سے تو بڑے لمبے چوڑے دعوے کئے جاتے ہیں اور دل میں کچھ نہیں۔ انجمنیں قائم ہوں گی اور قوانین بہت سے ایجاد کریں گے مگر عمل ایک پر نہیں۔ چنانچہ انہیں قوانین وضوابط میں سے ایک ضابطہ یہ بھی ہے کہ اب کسی ہندو کو مسلمان نہ کرو' اس سے اتحاد بگڑے گا' ہندو بھائی ناراض ہو جائیں گے۔ افسوس ہے کہ ہندوؤں کی ناراضی کا تو خیال ہو۔ مگر اللہ میاں کی ناراضی کی پرواہ نہ ہوئی۔ انہوں نے تو انکار کر دیا مگر اس کو کہاں صبر ہو' اس کے دل میں تو ایک ایسا نشتر لگا ہے کہ اس کو دن رات چین نہیں ہے۔ مارا مارا پھرتا ہے۔ ایک جگہ مطلب حاصل نہ ہوا دوسری جگہ گیا۔ آخر کوئی اللہ کا بندہ ایسا بھی مل گیا۔ جس نے ان مصالح کی پرواہ بھی نہ کی بلکہ ان مصالح کو سل بٹہ سے خوب پیس دیا' اور اس کو مسلمان کیا۔ اب جو مسلمان ہوا تو بے چارے کے پاس کھانے کو نہیں' پہننے کو نہیں۔ انہوں نے کہا ہم ایک رقعہ لکھ دیں گے۔ تم مسلمانوں کے پاس لے جانا' وہ تمہاری مدد کریں گے۔ اب وہ بیچارہ کاغذ لے کر در در مارا پھرتا ہے مگر کوئی نہیں پوچھتا۔ فاقے گزرتے ہیں طرح طرح کی تکلیفیں گزرتی ہیں۔ کیوں صاحب اگر اس کے دل میں محبت اسلام نہ ہوتی تو وہ اتنی تکالیف کیوں اٹھاتا کیا کسی کو مصائب اٹھانے میں بھی مزا آتا ہے' ہرگز نہیں۔ معلوم ہوا اس کے دل میں اسلام کی محبت ہے۔ اسلام کے محاسن اس کے دل میں جم گئے ہیں۔ اس لئے سب کلفتیں گوارا ہیں۔ اور وہ ایسا پختہ ہے کہ پرانے مسمان بھی اس کی حالت دیکھ کر شرماتے ہیں۔

میں جب کانپور میں تھا ایک روز ایک نوجوان نہایت خوبصورت جس کے چہرے سے آثار خشوع نمایاں تھے۔ میرے پاس آ کر بیٹھا۔ میں نے پوچھا آپ کس لئے آئے ہیں۔ کہنے لگا مسلمان ہونے کو آیا ہوں مجھے مسلمان کر لیجئے۔ میں نے کہا بسم اللہ آیئے چنانچہ وہ مسلمان ہو گیا۔ مسلمان ہوتے ہی اس کی یہ حالت ہو گئی کہ یوں معلوم ہوتا تھا کہ خدا کا عاشق ہے۔ وہ انوار و برکات اس کو نصیب ہوئے کہ ہر وقت روتا تھا۔ سوائے رونے کے کوئی کام نہ تھا۔ مگر افلاس کا رونا نہیں' فقر و فاقہ کی وجہ سے نہیں روتا تھا۔ بلکہ اخلاص کا روتا تھا۔ خدا تعالیٰ کے جوش محبت میں روتا تھا۔ اس کو پڑھنے کے واسطے ایک سپارہ اور ایک رسالہ راہ نجات میں نے دیدیا۔ بس اب یہ حال تھا کہ سپارہ پڑھ رہا ہے اور رو رہا ہے۔ راہ نجات سامنے ہے' اور آنسو جاری ہیں اور جو کھانا کپڑا کہیں سے مل جاتا تو وہ اوروں کو دے دیتا اپنے واسطے کوئی ذخیرہ نہیں رکھتا تھا' اور اس سے بڑھ کر تعجب یہ کہ ایک دفعہ اس نے آٹھ دن کے روزے پے در پے بدون افطار کے رکھے۔ تین چار روز کے بعد میں نے اس کو بہت لاغر دیکھا۔ کیونکہ وہ بہت ضعیف تھا۔ کبھی اس نے مشقت اٹھائی نہ تھی۔ ہمیشہ ناز و نعم میں رہا تھا اسلئے لاغر ہو گیا۔ میں نے پوچھا کہ تم اتنے لاغر کیوں ہوتے جا رہے ہو' کہنے لگا کہ میں نے آٹھ دن کا ایک روزہ رکھ لیا ہے۔ میں نے کہا ایسا روزہ ہماری شریعت میں جائز نہیں ہے۔ اگر روزہ رکھنے کو جی چاہے تو ایسا کرو کہ ایک دن کا روزہ رکھو' اور اگلے دن مت رکھو۔ پھر اس سے اگلے روز رکھ لیا۔ غرض ایک روز کھانا اور ایک روز روزہ رکھنا یہ سب سے بہتر ہے۔ اس کو صوم داؤدی کہتے ہیں۔ پھر اس کو مولانا شاہ فضل الرحمن صاحبؒ گنج مرادآبادی کی زیارت کا شوق ہوا۔ وہاں پیدل گیا' سواری نہ کی۔ حالانکہ بہت نازک تھے کبھی چلنے کی اسے عادت ہی نہ تھی مگر مولانا کی ملاقات کو پیدل گیا۔ یہ خیال ہوا کہ سوار ہو کر جانا کہیں ادب کے خلاف نہ ہو۔ بیچارہ کے پاؤں میں چھالے پڑ گئے مگر اس کو برداشت کیا اور سوار نہ ہوا۔ پھر اس کو شوق حج کا ہوا اور بھوپال چلا گیا۔ یہاں تک تو مجھے اس کا حال معلوم ہے آگے کی خبر نہیں کہ مکہ پہنچا یا نہیں۔ فرمایئے اگر اسلام بزور شمشیر پھیلا ہے۔ تو یہاں اس کو کون سی تلوار نے مجبور کیا تھا؟ کس نے اس کو اتنے مصائب کا مکلف کیا تھا؟ اپنے عیش و عشرت کو چھوڑ کر اس نے کیوں اتنی تکالیف کو اختیار کیا ہے۔

نورِ اسلام:

اگر کشش اسلام نہیں تو کیا ہے۔ آخر کس چیز کو دیکھ کر اس نے سارے تنعمات پر خاک ڈالی۔ کس چیز نے اس کو بے چین کیا۔ اگر حسن اسلام اس کا سبب نہیں تو اور کیا ہے؟ مگر وہ حسن افعال

شنیعہ سے مستور ہو گیا۔ ورنہ اگر ہماری حالت اچھی ہوتی ہم پورے مسلمان ہوتے تو لوگ ہماری طرف خود ہی آتے۔ ہمیں دعوت اسلام کی بھی ضرورت نہ ہوتی اور نہ لڑائی جھگڑے کی نوبت آتی۔ میں بعض دفعہ سفر کرتا ہوں اور اپنے دوست احباب بھی ساتھ ہوتے ہیں۔ تو ان سے باتیں کرتا ہوں' جس میں ہر طرح کی باتیں ہوتی ہیں۔ کھانے پینے کی بھی قصے کہانیاں بھی ہوتے ہیں اور مسائل تصوف کی بھی کبھی تحقیق ہوتی ہے۔ غرض ہر قسم کی باتیں دنیا کی بھی دین کی بھی' صرف علوم ومعارف ہی کا تذکرہ نہیں ہوتا۔ مگر کفار پر اس کا اثر دیکھتا ہوں کہ جتنے آدمی آس پاس ہوتے ہیں سب ادھر متوجہ ہو جاتے ہیں' اچھی طرح کان لگا کر سنتے ہیں اور جب اتر جاتا ہوں تو وہی لوگ کہتے ہیں (جن کے ساتھ نہ جان پہچان تھی نہ کبھی ملاقات ہوئی) کہ میاں ان کو کہاں لے چلے ان کی وجہ سے تو یہاں نور برس رہا تھا' سارے کمرہ میں اجالا ہو گیا تھا۔ آخر یہاں کون چیز ان کے قلوب کو کھینچتی تھی۔ میں انہیں کچھ لپٹتا نہیں نہ میں نے ان کی طرف کچھ توجہ کی۔ اگر یہ نور اسلام نہیں تو اور کیا ہے؟ اسلام کی یہ خوبی ہے کہ وہ از خود کشش کرتا ہے۔ اسلام ایسا دلکش ہے کہ غیر کو بھی اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ میں بقسم کہتا ہوں کہ اگر ہم اپنی حالت درست کر لیں تو اسلام کی خوبیاں اس طرح ظاہر ہوں کہ جس کا بیان نہیں ہو سکتا۔ پس اپنی اصلاح سے علاوہ اپنی اندرونی حفاظت کے دوسروں کے جذب کا بھی نفع ہوگا۔ صاحبو! اگر اندرونی محافظت ہو گئی تو پھر بیرونی حملوں کی فکر نہ رہے گی۔ اس لئے مبلغ کو چاہیے کہ دو باتیں اپنے اندر پیدا کر لے بس کافی ہے۔ ایک یہ کہ طمع نہ کرے حرص اور طمع بہت بری چیز ہے' دوسری یہ کہ اپنی حالت اچھی کر لے' اپنے کو شرع کے مطابق بنائے۔ ہر کام کو خدا کے خوف سے کرے اور یہ دیکھے کہ یہ شریعت کے موافق ہے۔ یا نہیں۔ اس سے خداوند کریم ناراض تو نہ ہوں گے۔ دوسروں کو جذب کرنے پر ایک قصہ یاد آ گیا۔ ایک مرتبہ میں سہارنپور جا رہا تھا' اس گاڑی میں کچھ ہندو آریہ انگریزی خواں بھی تھے' میں اپنے احباب سے معمولی باتیں کر رہا تھا۔ میرے رفقاء نے بیان کیا کہ یہ ہندو آپس میں کہہ رہے تھے۔ معلوم نہیں کہ دیکھو ان کی باتوں کی طرف دل کیوں کھنچتا ہے تو دوسرا کہتا ہے کہ میاں سچے ہونے کی یہی نشانی ہے' یہ لوگ سچے ہیں' اس لئے ادھر دل کھنچتا چلا جاتا ہے۔ اب فرمائیے کہ نہ میں نے ان سے باتیں کیں نہ میں ان کے ساتھ کوئی خاص اخلاق سے پیش آیا تھا کہ یہ خیال ہوتا کہ اخلاق سے مسخر ہو گئے ہوں گے۔ پھر ان کو کس چیز نے مسخر کیا اگر اس کا سبب حسن اسلام نہیں تو اور کیا ہے۔ صاحبو! یہ وہی اسلام کی کشش ہے وہی اسلام کا نور ہے۔ اسلام کی تو وہ شان ہے۔

زفرق تابقدم ہر کجا کہ مینگرم　　کرشمہ دامن میکشد کہ جا اینجا است

سر سے قدم تک جس جگہ دیکھتا ہوں کرشمہ دامن دل کو کھینچتا ہے کہ یہی جگہ محبوب کی ہے۔ اسلام اول سے آخر تک نور ہی نور ہے۔ اس کی جس ادا کو دیکھو دلکش ہے، جس حکم کو دیکھو دلربا ہے۔

اسلام کی ادنیٰ جھلک:

اسی قصہ کا بقیہ یہ ہے کہ میں اس مرتبہ سہانپور جا رہا تھا۔ اس وقت مجھے لکھنؤ جانا تھا۔ جب میں تھانہ بھون کے اسٹیشن پر ریل میں سوار ہوا تو ایک مولوی صاحب نووارد اسی گاڑی سے اترے، وہ اس وقت دہلی سے مجھ سے ملنے کیلئے آئے تھے مجھ کو اطلاع کی میں نے کہا اب تو میں سفر میں جا رہا ہوں۔ اگر تمہارا جی چاہے تو سہانپور تک چلو، وہاں تک باتیں ہوتی رہیں گی۔ ٹکٹ لے لو۔ وقت کم رہ گیا تھا ٹکٹ نہیں مل سکا۔ انہوں نے گارڈ سے کہہ دیا اور سوار ہو گئے، جب نانوتہ کا اسٹیشن آیا، یہ تھانہ بھون سے آگے ہے، میں نے ان سے کہا کہ اب گارڈ کے پاس جاؤ، اور اسے پیسہ دے کر رسید لے لو اور آگے کا ٹکٹ لے لو جب وہ گارڈ کے پاس گئے تو اس نے کہا کہ تھانہ بھون تک کا ہم نے معاف کر دیا اور نانوتہ سے سہانپور تک کا ٹکٹ دلوا دیا۔ جب میرے پاس آئے اور یہ قصہ بیان کیا۔ میں نے کہا یہ تو ناجائز ہے۔ گارڈ گاڑی کا مالک نہیں وہ خود مولوی تھے، مگر اس وقت ان کو خیال نہ ہوا۔ اور افسوس تو یہ ہے کہ آج کل بعضے بعضے اہل علم عمداً بلا کرایہ ریل میں سفر کرنے کو جائز سمجھتے ہیں۔ مجھے تو اس کو نقل کرتے ہوئے بھی شرم آتی ہے کہ ایسے کھلم کھلا ناجائز فتوے دینے لگے۔ غرض میں نے کہا گارڈ کے معاف کرنے سے معاف نہیں ہوا کیونکہ گارڈ مالک نہیں ہے بلکہ ریلوے کمپنی کا نوکر ہے اس کو معاف کرنے کا حق نہیں ہے۔ تمہارے ذمہ اتنے پیسے قرض ہیں جو شرعاً واجب الادا ہیں۔ مگر اب یہ تو امید نہیں کہ گارڈ سے رسید مل سکے۔ تم یہ کرو کہ بعد میں ایک ٹکٹ اتنے داموں کا خرید لو اور اس کو تلف کر دو۔ اس طرح محکمہ میں کرایہ پہنچ جائے گا۔ اس وقت ایک انگریزی خواں ہندو آریہ اس گاڑی میں تھا جو بڑا لیکچرار تھا وہ اول سے آخر تک اس واقعہ کو دیکھ رہا تھا میری تقریر سن کر بے ساختہ جوش میں آ کر کہنے لگا کہ جناب میں اپنی اخلاقی کمزوری بیان کرتا ہوں کہ جب ان سے گارڈ نے کہا کہ نانوتہ تک کا کرایہ ہم نے معاف کیا، اس وقت میں بہت خوش ہوا کہ ایک غریب آدمی کا کام بن گیا۔ مگر اب معلوم ہوا کہ میں بے ایمانی پر خوش ہوا تھا، دغا بازی پر مجھے مسرت ہوئی تھی۔ واقعی بات وہی ہے جو آپ نے فرمائی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ تو ایک چھوٹی سی بات تھی، یہ تو اسلام کی ادنیٰ جھلک ہے۔ اگر اہل انصاف ہمارے پاس چند روز رہیں تو ان کو

اسلام کی بڑی بڑی خوبیاں معلوم ہوں گی۔

دیکھئے ایک چھوٹی سی بات ہے کہ میرے پاس بہت سے خطوط ایسے آتے ہیں کہ ان کی ٹکٹوں پر مہر نہیں ہوتی۔ بالکل سالم ہوتے ہیں' کوئی دھبہ ان پر نہیں ہوتا۔ ان سے دوبارہ کام لینا بہت آسان تھا۔ کسی کو پتہ بھی نہ لگتا۔ مگر چونکہ شریعت میں یہ جائز نہیں اس لئے میں اکثر خط پڑھنے سے پہلے ان ٹکٹوں کو چاک کر دیتا ہوں پھر خط پڑھتا ہوں کیونکہ یہ دراصل رسید ہے ان پیسوں کی جن کو دے کر ہم نے محکمہ ڈاک سے اپنا کام لینا چاہا ہے۔ حقیقت میں یہ اجرت ہے یعنی پیشگی ادا کردہ محصول کی رسید ہے جیسے ریل کا ٹکٹ۔ تو اب دوبارہ اس سے نفع اٹھانا جائز نہیں' کیونکہ جتنے کام کی یہ رسید تھی اتنا کام تو آپ نے ڈاک سے لے لیا ہے اب اگر دوسرا کام لینا ہو تو دوسرا ٹکٹ خریدنا پڑے گا اس سے نفع لینا حرام ہو گا۔ تو ایسا بہت ہوتا ہے کہ بعض خطوط کے ٹکٹ مہر سے بالکل سالم ہوتے ہیں اور خطوط میرے پاس اکثر ایسے وقت آتے ہیں کہ سوائے خدا کے کسی کو علم نہیں ہوتا اور اگر کوئی میرے پاس دوستوں میں سے ہوا بھی تب بھی کیا میری ڈاک کو کوئی جھانکتا ہے کہ دیکھوں کون سا ٹکٹ سالم ہے اور کونسا نہیں۔

پس میں اگر ان ٹکٹوں سے کام لینا چاہتا تو اچھی طرح لے سکتا تھا۔ مگر میں الحمدللہ ان کو اول ہی پھاڑ دیتا ہوں۔ تو یہاں ہم کو کس چیز نے مجبور کیا۔ صرف اسلام نے مجبور کیا۔ ورنہ ہم کو کوئی قوت روکنے والی نہ تھی۔ اس وقت نہ کوئی پولیس تھی نہ کوئی پہرہ تھا۔ غرض اسلام کا ہر پہلو نہایت مکمل ہے جس نے اسلام کو مکمل کیا اور اس کو کامل طور پر سمجھا ہے۔ ممکن نہیں کہ اس کے احکام میں گڑبڑ کرے ممکن نہیں کہ ایک شخص ریل میں پندرہ سیر کی جگہ سولہ سیر لے جائے اور بلا کرایہ سفر کرنا تو الگ رہا۔ اور جب تک کسی کے دل میں اسلام نے گھر نہ کیا ہو اسلام سے پوری محبت نہ ہوئی ہو اس وقت تک یہ حال ہوتا ہے کہ پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر تو بڑے لمبے چوڑے لیکچر دیتے ہیں اور عمل ایک پر نہیں۔ تقریر خوب رونق دار ہے اور عمل میں اندھیرا۔

مسلمان اور حقوق انسانی:

حضرت اسلام ایسی چیز ہے کہ مسلمان انسانی حقوق تو کیا ضائع کرتا وہ تو حیوانات پر بھی رحم کرتا ہے۔ ایک بزرگ کا قصہ ہے کہ انہوں نے سفر میں ایک دکاندار سے شکر خریدی اور کپڑے میں باندھ لی۔ گھر جا کر کھولا تو اس میں ایک چیونٹی نظر آئی یہ دیکھ کر آپ کو بے حد قلق ہوا کہ نہ معلوم بیچاری اپنے کس کس عزیز سے الگ ہوئی ہوگی' اس کا دل ان کی جدائی سے تڑپتا ہو گا۔ آخر اسی طرح کپڑا باندھ کر

پھر سفر کر کے جہاں سے شکر لائے تھے وہیں لا کر اسی دکان پر کپڑا کھولا اور چیونٹی کو اس کے مستقر پر پہنچایا۔ تو دیکھئے اتنی ہمدردی۔ یہ اثر ہے تعلیم اسلام کا کہ انسان تو انسان حیوان پر بھی اسلام ہمدردی کرتا ہے۔ اتنا رحم ہے اسلام میں کہ حیوانات کے بھی حقوق مقرر کیے ہیں۔ ان پر بھی ظلم وستم کو جائز نہیں رکھا۔ اس کے متعلق بھی بہت سے احکام ہیں۔ چنانچہ اس میں کتابیں لکھی گئی ہیں۔ میں نے بھی ایک رسالہ لکھا ہے اس کا نام ہے ارشاد الہائم فی حقوق البہائم۔ اس میں بتلایا ہے کہ حیوانات کے حقوق کیا ہیں اور کیا برتاؤ ان سے کرنا چاہیے۔ اور ہر حکم حدیث سے ثابت کیا ہے اپنی طرف سے نہیں لکھا۔ تو جس اسلام نے جانور پر بھی رحم کیا ہے' کیا وہ انسان پر رحم نہ کریگا۔ ضرور کریگا۔ اب اگر کسی حکم میں کسی کو جبر وتشدد کا شبہ ہو تو چونکہ وہ ایسے اسلام کے حکم سے ہوا ہے جس میں اتنا رحم ہے تو وہ واقع میں جبر وتشدد نہیں ہے ضرور اس میں کوئی عظیم مصلحت ہوگی۔ مگر حقیقت میں جس کی وجہ سے وہ جبر عین رحمت ومصلحت ہے اس وقت وہ مصلحت اسی کو مقتضی ہے اس کو ہر شخص اپنے معاملات میں غور کر کے سمجھ سکتا ہے کہ بعض دفعہ ہم ضرورت کی وجہ سے اولاد تک کے ساتھ سختی کرتے ہیں اور مجبوراً کرنا پڑتی ہے بدون اس کے کام نہیں چلتا۔ یعنی دوسرے کی اصلاح بدوں اس کے نہیں ہوتی۔

چنانچہ میں جب کسی پر ظاہراً تشدد کرتا ہوں مجبور ہو کر کرنا پڑتا ہے' مگر ساتھ ہی دل پگھلا جاتا ہے' جگر ٹکڑے ٹکڑے ہوا جاتا ہے۔ مگر کیا کروں ضرورت شرعی ہوتی ہے۔ اس لئے تشدد کرنا پڑتا ہے اور اس کا حکم شرعی ہونا دلائل سے ثابت ہوتا ہے نصوص اس کیلئے موجود ہیں۔ تو واقع میں یہ سختی رحم کے خلاف نہیں ہے کیونکہ ہر چیز کا موقع ہے' رحم کی جگہ رحم کرنا پڑتا ہے اور سختی کی جگہ سختی۔ بلکہ سختی کی جگہ رحم کرنا خود بے رحمی ہے' جیسے کسی کے دنبل ہو جس میں نشتر کی ضرورت ہے۔ مگر ڈاکٹر رحم کی وجہ سے نشتر نہیں دیتا بلکہ مرہم پٹی کیے جاتا ہے۔ تو کیا اس کو رحم کہا جائے گا۔ ہرگز نہیں۔ تو معلوم ہوا کہ مطلق تشدد بے رحمی نہیں ہے۔ اگر مطلق تشدد بے رحمی ہو تو نعوذ باللہ نعوذ باللہ کیا اللہ میاں کو بے رحم کوئی کہہ سکے گا' کیونکہ وہ تو کروڑوں کو مارتے ہیں' ہلاک کرتے ہیں' بیمار کر دیتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ بعض جگہ تشدد بھی رحم کے خلاف نہیں۔ اگر اس کو نہیں مانتے تو یا تو خدا تعالےٰ کو رحیم نہ کہو گے یا ان کو محیی وممیت نہ کہو گے' مارنا مطلقاً خلاف رحم ہے تو اللہ میاں تو روزانہ بلکہ ہر وقت مارتے رہتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ تشدد مطلقاً رحم کے خلاف نہیں' بلکہ وہ تشدد بوجہ حکمتوں کے درحقیقت رحم ہی ہے۔ اگر وہ حکمتیں تفصیلاً سمجھ میں نہ آویں تو اتنا مجملاً سمجھ لو کہ وہ حکیم اور رحیم ہیں۔ اس لئے ان کا تشدد حکمت اور رحم کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ پس اب کفار کا مسلمانوں کو بوجہ جہاد اور ذبح حیوانات

کے بے رحم کہنا غلط ہوگیا۔ اگر ہمارے قلوب میں رحم نہ ہوتا تو جانور اور چیونٹی پر اتنا کیوں رحم کرتے جس کا اوپر ذکر آچکا ہے۔ آخر یہ رحم نہیں تو اور کیا ہے کہ ایک چیونٹی کی پریشانی دیکھ کر بے چین ہوجاویں۔ غرض اسلام کی یہ تعلیم ہے کہ ہر چیز سے ہمدردی کرو۔ دنیا بھر میں کوئی خوبی ایسی نہیں ہے جو اسلام میں نہ پائی جاتی ہو۔ اگر ہمارا اسلام کامل ہو اور یہ سب خوبیاں ہمارے اندر مشاہد ہوں، پھر ہم خود ہی اوروں کو کشش کرلیں بلانے اور دعوت دینے کی بھی چنداں ضرورت نہ رہے۔ مگر اب تو ہماری یہ حالت ہے کہ تقریر تو لمبی چوڑی کرنے کو تیار ہیں اور کام خاک بھی نہیں کرتے۔ حالانکہ اس سے کچھ نہیں ہوتا۔ خوب کہا ہے کسی نے کام کرنا چاہیے۔ دعویٰ اور لاف زنی چھوڑنا چاہیے۔ مگر اب کام کچھ نہیں۔ فقط نام ہی نام ہوتا ہے۔

کارکن کاربگذار ازگفتار　　کاندرین راہ کار باید کار

عمل کرو اور دعویٰ کو ترک کرو اس طریق میں عمل اور کام ہی کی ضرورت ہے۔

تبلیغ اور سوال:

چنانچہ جابجا انجمنیں بھی ہیں۔ جن میں ایک صدر ہے۔ ایک سیکرٹری ہے۔ کوئی ناظم ہے اور کوئی کیا خاک بلا ہے۔ سو ان لوگوں سے کام کچھ نہیں ہوتا۔ البتہ سب سے پہلے چندہ مانگنے کو تیار ہیں۔ حالانکہ اس طرح چندہ مانگنے سے ہم کو روکا گیا ہے۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہے **ام تسئلهم خرجا فخراج ربك خير**۔ کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ آمدنی چاہتے ہیں تو آمدنی تو آپ کے رب کے پاس سب سے بہتر ہے۔ الآیۃ اور دوسرے حضرات انبیاء علیہم السلام کا ارشاد ہے **لا اسئلكم عليه اجرا** کہ ہمیں تبلیغ کے معاوضہ میں مال نہیں چاہیے۔ ہم تم سے روپے پیسے نہیں مانگتے ہیں اور جہاں مال لینے کا حکم ہے مثلاً ارشاد ہے **خذ من اموالهم صدقة تطهرهم وتزكيهم بها وصل عليهم ان صلوتك سكن لهم** یعنی ان کے مال سے صدقہ لے لیجئے انہیں کے تزکیہ اور تطہیر کے لئے یعنی اس میں آپ کا کوئی نفع نہیں ہے تو اگر کسی کو **خذ من اموالهم** الآیۃ سے شبہ چندہ کا ہو۔ تو اس کا شان نزول دیکھ لیجئے۔ اسی سے معلوم ہوجائے گا کہ غزوہ تبوک میں بعضوں سے کوتاہی ہوگئی تھی۔ جب ان کی توبہ قبول ہوئی تو انہوں نے کچھ مال حاضر کرکے اس کے قبول کی درخواست کی۔ اس پر یہ ارشاد ہوا سو اس سے چندہ مانگنے کا کیا تعلق یہاں اخذ اور کہاں سوال اس کے معنی تو یہ ہیں کہ اگر وہ خود لاویں تو لے لو انکار نہ کرو، اور سوال یہ ہے کہ مانگ کر لوگوں سے روپیہ جمع کیا جاوے سو دونوں میں زمین و آسمان کا

فرق ہے۔ اگر کوئی بطیب خاطر کوئی چیز لاوے تو لے لو تو **خذ من اموالھم** سے چندہ مانگنا کیسے نکلا اللہ میاں نے تو خذ فرمایا ہے اسئل تو نہیں فرمایا۔ اور چندہ تو سوال ہے نہ کہ اخذ اگر اسئل فرماتے تو تمہارا مدعا حاصل ہو جاتا۔ مگر سوال کے متعلق تو یہ آیا ہے **وان تومنوا وتتقوا یؤتکم اجورکم ولا یسئلکم اموالکم** اگر تم ایمان لاؤ اور خدا سے ڈرو تو اپنے پاس سے اجر دیں گے اور تم سے تمہارا مال نہیں مانگیں گے بے فکر رہو۔ آگے فرماتے ہیں۔ **ان یسئلکموھا فیحفکم تبخلوا ویخرج اضغانکم** کیونکہ اگر تم سے اصرار کے ساتھ مانگا جائے تو تم بخل کرنے لگو۔ واقعی یہ خدا ہی کا کلام ہے۔ کیونکہ وہ تو تمہارے رگ پٹھے سے واقف ہیں۔ میں تو کہتا ہوں اگر یہ رسول کا بھی کلام محض رائے سے ہوتا۔ تو اس میں اتنی گہری گہری باتیں نہ ہوتیں۔ فرماتے ہیں ہم تم سے کیا مانگتے **ان یسئلکموھا فیحفکم** (اگر تم سے اصرار سے مانگا جائے تو بخل کرنے لگو) دیکھئے یہاں سوال میں **فیحفکم** (پس تم بخل کرو) بڑھایا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سوال میں عادۃً احفاء ہوتا ہے چنانچہ مانگنا اسی کو کہتے ہیں جس میں دوسرے کو لپٹ جائے، اور شریعت میں یہ حرام ہے۔ تو فرماتے ہیں کہ اگر ہم مانگنے لگیں تو تم بخل کرنے لگو گے، اور تمہاری دلی کدورت ظاہر ہو جائے گی۔ ضغینہ کے اصل معنی کینہ کے ہیں یہاں مراد کدورت ہے یعنی انفاق میں جو دل پر تنگی ہوتی ہے، وہ ظاہر ہو جائے گی۔ اس لئے ہم تم سے سوال نہیں کرتے۔ اگر سوال کریں تو یہ خرابیاں ہوں گی۔ یہ حاصل ہے آیت کا ہاں انفاق فی سبیل اللہ کی فضیلت بیان کر دینا اور بات ہے، یہ سوال میں داخل نہیں، اس لئے ہم اس کو نصوص میں جا بجا بتلا چکے ہیں اگر کسی کو ثواب لینا ہو لے لے اسی کو فرماتے ہیں **ھا انتم ھؤلاء تدعون لتنفقوا فی سبیل اللہ** ہم بے شک تمہیں اس طرف بلاتے ہیں کہ خرچ کرو اللہ کے راستہ میں، اس میں تمہارا ہی نفع ہے۔ مگر مانگتے کب ہیں ہم تو تم سے ایک کوڑی بھی نہیں مانگتے۔ البتہ خرچ کا راستہ بتلائے دیتے ہیں۔

اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک تو کسی سے کہا کہ دس روپے لاؤ، یہ تو سوال ہے اور ایک یہ کہ کسی کو رائے دی کہ میاں دس روپیہ سے فلاں چیز لے لو گے تو نفع ہوگا مشورہ ہے اپنے لئے کچھ نہیں مانگتے، بلکہ خود اس کے نفع کی ایک صورت بتلا دی۔ ان دونوں باتوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ تو فرماتے ہیں کہ نصوص میں اس کی ترغیب تو ہے کہ خرچ کرو۔ اگر خرچ کرو گے تو اس کا ثواب یہ ہے **کمثل حبۃ انبتت سبع سنابل فی کل سنبلۃ مائۃ حبۃ واللہ یضعف لمن یشاء** (جیسے ایک دانے کی حالت جس سے سات بالیں جسمیں ہر بال کے اندر سو دانے ہوں) ایک دو اور سات سو لو بلکہ اس سے بھی زیادہ۔

خود کہ یابد ایں چنیں بازار را   کہ بیک گل میخری گلزار را

تمہیں ایسا بازار کہاں مل سکتا ہے کہ ایک گل کے بدلے چمن ہی خریدے۔

اور فرماتے ہیں

نیم جاں بستاند وصد جاں دہد   انچہ درد ہمت نیاید آں دہد

فانی اور حقیر جان لیتے ہیں اور اس کے بدلہ میں باقی جان عطا کرتے ہیں جو خواب وخیال نہیں ہوتا وہ عطا کرتے ہیں۔

یہ ایک تجارت سکھلائی تھی کہ اگر اس پر عمل کروگے بڑے منافع حاصل ہوں گے مگر تم کنجوس تجارت میں بھی کنجوسی کرتے ہو۔ اس کا خمیازہ تم ہی بھگتو گے' ہمارا کیا نقصان ہم نے تو تمہارے نفع کی ایک بات بتلائی تھی۔ نہیں مانتے مت مانو ایسی تیسی میں جاؤ۔ اسی کو ارشاد فرماتے ہیں **فمنکم من یبخل ومن یبخل فانما یبخل عن نفسہ** (پس تم میں سے جو شخص بخل کرتا ہے وہ اپنے لئے ہی بخل کرتا ہے) یعنی اس بخل سے خدا کا کچھ ضرر نہیں تمہارا ہی ضرر ہے **واللہ الغنی وانتم الفقراء** خدا غنی ہے اس کو کسی کی پرواہ نہیں۔ ہاں تم محتاج ہو۔ تمہاری حاجت ہی کو دیکھ کر یہ رائے دی گئی تھی کہ اللہ کے راستہ میں دوگے تو مالا مال ہو جاؤ گے۔ نہیں مانتے تو تمہارا ہی نقصان ہے ہمارا کیا بگڑا۔ اس آیت کی یہ تقریر ایک عالم صاحب نے سن کر بہت خوشی ظاہر کی اور دعائیں دیں اور کہا آج اس کا مطلب سمجھا ہوں۔ پہلے تو بڑے تردد میں تھا کہ اس میں آیت میں یہ کیسا تعارض ہے کہ اول آیت میں تو سوال کی نفی معلوم ہوتی ہے اور آخر میں خود سوال ہے۔ اب معلوم ہوا کوئی تعارض نہیں کیونکہ دوسری آیت میں سوال نہیں ہے بلکہ ترغیب ہے۔ انفاق فی سبیل اللہ کی اور پہلی آیت میں نفی ہے۔ سوال کی اس تقریر سے سب اشکالات حل ہو گئے۔ مگر ایک شبہ رہ گیا تھا وہ یہ کہ اگر ہم خرچ نہ کریں تو دین کا سب کام چوپٹ ہو جاوے یہ مدارس کیسے قائم رہیں اور مسجدوں کی خدمت کون کرے۔ اگر ہم خرچ نہ کریں تو رفتہ رفتہ دنیا سے دین رخصت ہو جاوے تو اس اعتبار سے ہم محتاج الیہ ٹھہرے۔ اس ناز کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ ہاں بے شک بظاہر تمہاری ہی مدد سے یہ کام چلتے ہیں اگر روپیہ نہ ہو تو مثلاً مدرسے قائم نہ رہیں۔ روپیہ کی اور دینے والے کی تو واقعی ضرورت ہے۔ مگر خاص تمہاری ذات شریف کی خدا کو حاجت نہیں۔ اگر تم اس کام کو چھوڑ دوگے تو اللہ تعالیٰ دوسری قوم کو بدل دیں گے کہ بجائے تمہارے وہ اس دینی خدمت کو کرے گی۔ اسی مضمون کو فرماتے ہیں **وان تتولوا ایستبدل قوماً غیرکم ثم لا یکونوا امثالکم.** مطلب یہ ہے کہ واقعی دین کا

کام خرچ کرنے سے چلتا ہے' مگر وہ خرچ کرنا تم پر موقوف نہیں۔ سبحان اللہ کیا بلاغت ہے یستبدل میں اشارہ ہے اس طرف کہ یہ خرچ کرنا تمہارا ایک عہدہ ہے تم مالک نہیں ہو۔

خزانچی کو بادشاہ کے حکم سے روپیہ دینا اس کا عہدہ ہے وہ خزانے کا مالک نہیں بلکہ مالک بادشاہ ہی ہے۔ اگر خزانچی بادشاہ کے کہنے پر روپیہ نہ دیوے تو مالک اس عہدہ دار کو بدلنے پر قادر ہے۔ اس طرح سے کہ فوراً کان پکڑ کر نکال دیا جاوے گا اور اس کے قائم مقام دوسرے کو خزانچی بنادیں گے۔ اسی طرح اگر تم خرچ نہیں کرتے تو اللہ تعالیٰ دوسری امت پیدا کردیں گے کہ وہ فی سبیل اللہ خرچ کرے گی اور دینی خدمات کو انجام دے گی یہ بھی شبہ رفع ہوگیا۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہ لوگ سب سے پہلے چندہ مانگتے ہیں اور کام کچھ نہیں کرتے۔ اس طرح چندہ کو بھی بے اثر کردیا کہ ہر بات میں لاؤ چندہ۔ پھر اس کے مصرف کی کچھ پرواہ نہیں کہ حلال طریقہ سے خرچ ہوتا ہے یا حرام طریقے سے اور کہاں صرف کرنا جائز ہے کہاں حرام اسکی ذرہ پرواہ ہی نہیں۔ نیز لینے میں یہ نہیں دیکھتے کہ کسی یتیم کا تو حق نہیں آگیا' کسی نابالغ کا مال تو نہیں آگیا۔ بس جس طرح آگیا لے لیا۔ دہ دردہ ہے اس میں جو بھی کود پڑے ناپاک نہیں ہوتا۔ پھر چندہ کرنے میں نہ آبرو کا خیال ہوتا ہے نہ عزت کی نگہداشت' خواہ کتنی ہی ذلت ہو مگر چندہ ضرور ملے۔ تھانہ بھون کے اسٹیشن پر ایک مسجد بنی ہے جب اس کا کام شروع ہوا' تو ہمارے پاس کل آٹھ روپے تھے۔ وہاں ایک مولوی صاحب تھے پرانی رو کے انہوں نے پوچھا کہ مسجد کیلئے کتنے روپے جمع ہوئے۔ لوگوں نے کہا کہ آٹھ روپے' کہنے لگے آٹھ روپے اور مسجد کا کام شروع کرادیا' انہوں نے بڑا تعجب کیا اور یہ کہا کہ جب تک دو ہزار روپے جمع نہ ہوں تعمیر کو ہاتھ نہ لگانا۔ آٹھ روپے سے بھی بھلا مسجد تیار ہوا کرتی ہے مجھے یہ قصہ معلوم ہوا تو میں نے کہا کہ آپ نے اللہ میاں کو اپنے اوپر قیاس کیا ہے' خدا کے پاس تو سارے خزانے ہیں۔ اس کے یہاں روپیہ کی کیا کمی ہے ولله خزائن السموات والارض (اور آسمانوں اور زمینوں میں اللہ ہی کے خزانے ہیں) میں نے ناظم تعمیر سے کہا کہ تم بنیاد کھدواؤ اور کسی کا کہنا مت مانو۔ تم اللہ کا نام لے کر کھدواؤ' اللہ میاں ہی اس کو بھی سامان سے بھر دیں گے۔ ان مولوی صاحب نے کہا کہ میاں لڑکے ہو کچھ سمجھتے نہیں۔ میں نے کہا کہ جب لڑکوں سے کام چل جائے تو بڈھوں کو بولنے کی ضرورت نہیں' اور واقعی ان کے اعتبار سے تو ہم لڑکے ہی تھے۔ جیسے ایک بڈھے سفید ریش والے سے میں نے پوچھا تھا آپ کون ہیں' کہا میں فلاں صاحب کا لڑکا ہوں' تو اگرچہ یہ خود بھی بڈھے تھے مگر اپنے باپ کے اعتبار سے تو لڑکے ہی تھے۔

ایسے ہی ہم بھی ان کے اعتبار سے لڑکے ہی تھے، جب یہ آٹھ روپے خرچ ہو گئے اور روپیہ نہ رہا تو میں نے ناظم سے کہہ دیا تھا کہ کسی سے چندہ مت مانگنا۔ وہ کہتے تھے کہ یہ حال ہو گیا کہ میں بازار کو کسی کام کو جا رہا ہوں اور لوگ پکار رہے ہیں کہ میاں فلاں صاحب ذرا ادھر آیئے میں کہتا بھائی مجھے کام کو جانا ہے۔ وہ کہتے ابھی ذرا ٹھہرو تو پھر وہ خود آتے اور کوئی دو روپیہ اور کوئی چار روپیہ دے جاتا۔ غرض لوگ بلا بلا کر روپیہ دیتے تھے۔ اس زمانہ میں بیگم بھوپال کے صاحبزادہ بیمار تھے اور اس قدر پریشان تھیں کہ ڈاک تک نہ دیکھتی تھیں۔ اس حالت میں میں نے ناظم سے کہہ دیا کہ تم ان کے پاس لکھ دو کہ یہاں ایک مسجد بن رہی ہے ایک کار خیر ہے، اگر آپ اس میں حصہ لینا چاہیں تو لے سکتی ہیں۔ میں آپ سے چندہ نہیں مانگتا۔ صرف اس لئے اطلاع کر دی کہ شاید علم ہونے پر پھر آپ کو خیال ہو کہ مجھے کیوں نہ اطلاع کی گئی اس کار خیر میں مجھے کیوں نہ شریک کیا گیا۔ انہوں نے فوراً جواب دیا کہ تعمیر مسجد میں کتنے روپے خرچ ہوں گے۔ تخمینہ کر کے اطلاع کیجئے۔ ہمارے دوستوں نے کہا کہ کچھ زیادہ لکھ دیجئے کیونکہ اگر کہیں خرچ زیادہ ہو گیا تو زیادہ روپے کی ضرورت ہو گی اور تعمیر کا کام ایسا ہی ہے کہ کبھی بڑھ جاتا ہے۔ میں نے کہا نہیں جی اللہ میاں کے یہاں کچھ کمی نہیں ہے۔ اگر بعد میں ضرورت ہو گی تو وہ پھر دوسرا انتظام کر دیں گے۔ غرض ان کو صحیح تخمینہ کی بلا کم و بیش اطلاع کی گئی، روپیہ آ گیا۔ اتفاق سے کام بڑھ گیا اور روپے کی اور ضرورت پڑی۔ میں نے ناظم سے کہا کہ ایک خط اور لکھ دو بیگم صاحبہ کو۔ اور اس کا یہ مضمون ہو کہ جو روپیہ آپ نے بھیجا تھا وہ تو سب لگ گیا، اور اتفاق سے کام بڑھ گیا ہے۔ آپ کو یہ اطلاع اس لئے نہیں کی جاتی ہے کہ آپ خواہ مخواہ اس کی تکمیل ہی کریں۔ بلکہ اس لئے کی جاتی ہے کہ بعد میں آپ کو ناگواری نہ ہو کہ مجھے کیوں نہیں اطلاع کی۔ آپ سے چندہ کی درخواست نہیں کی جاتی۔ آپ اگر آزادی سے دینا چاہیں دے دیں۔ چنانچہ خط پہنچتے ہی فوراً روپیہ آ گیا۔ اس واقعہ سے لوگ حیرت میں پڑ گئے کہ ایسے استغناء کے ساتھ لکھا گیا تھا اور پھر بہت جلد کامیابی ہو گئی۔ میں نے کہا کہ میاں یہ سنت انبیاء کی برکت ہے وہ بھی کسی سے چندہ نہیں مانگتے تھے۔ ہم نے اس پر ہی عمل کیا ہے، اس کی برکت سے خدا نے کام پورا کر دیا سو **الحمد للہ** ہم کسی سے چندہ نہیں مانگتے۔ اور خود تو کیا مانگتے ہمیں تو اگر کوئی از خود بھی دے اس سے یہ کہتے ہوئے بھی عار آتی ہے کہ ہم آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں، جیسا عام طور پر لوگ چندہ دینے والے کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ میں لطیفہ کے طور پر کہا کرتا ہوں کہ جو شخص شکریہ ادا کرتا ہے تو بزبان حال اقرار کرتا ہے کہ ہم تمہارا روپیہ کھا جائیں گے ورنہ شکریہ کاہے کا ہے۔ انہوں نے تم پر کیا احسان کیا جو

تم ان کا شکریہ ادا کرتے ہو۔ دینے والوں نے اپنی منفعت اور اپنی بھلائی کے واسطے دیا تو ہمیں تو نہیں دیا بلکہ برعکس وہ ہمارا شکریہ ادا کریں تو زیبا ہے۔ کیونکہ ہم نے ان کے روپے کی حفاظت کی اور موقع پر خرچ کیا اور ایک پیسہ نہیں لیا۔ سو ہم شکریہ کے مستحق ہیں۔ غور کر لیا جاوے کہ انہوں نے ہم پر زیادہ احسان کیا یا ہم نے۔ حقیقت میں ہم ہی نے احسان کیا کہ امانت کا بار اٹھایا' احتیاط سے صرف کیا۔ اس لئے ہم شکریہ کیوں ادا کریں۔ مگر ان شکریہ والوں نے شکریہ میں ایک لطیفہ بنا رکھا ہے۔ یعنی وہ لوگ یوں کہتے ہیں کہ ہم آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں یعنی چھوٹی سی شکر جو گویا شکر کی بی بی ہے شکر ادا نہیں کرتے نہ معلوم یہ شکریہ کون سا لغت ہے نہ عربی نہ فارسی۔ یہ اس میں یا کیسی ہے۔ ہمارے استاذ مولانا عبدالعلی صاحب جو کہ اس وقت دہلی مدرسہ عبدالرب میں پڑھاتے ہیں فرماتے تھے کہ الف لام اس وقت پانچ قسم کا ہے گو طالب علموں کو چار ہی قسمیں معلوم ہیں۔ یعنی جنسی' استغراقی' عہد ذہنی' عہد خارجی مگر ایک پانچواں اور بھی ہے وہ الف لام نیچریت کا ہے۔ ان کے یہاں ہر بات پر الف لام آتا ہے القلاں افلاں۔ تو جیسے وہ الف لام نیچریت کا ہے غالباً ایسے ہی یہ یا بھی نیچریت ہی کی سی ہے یا کہ یہ مؤنث ہے شکر کا۔

مونث کے اوپر یاد آیا۔ ایک گنوار دہلی گیا تھا۔ دکان پر نان رکھے ہوئے تھے اس نے پوچھا کہ اس کا کیا نام ہے۔ دکاندار نے کہا نان کہنے لگا یہ نان کئے پیسے کو ملتا ہے کہا دو پیسے کو۔ اسی جگہ چھوٹے چھوٹے نان بھی رکھے تھے' کہنے لگا اور یہ ننیاں کتنے کو ملتی ہیں۔ اس نے نان کی تانیث نانیاں بنائی' تو گویا یہ بی بی ہے بڑے نان کی۔ اسی طرح یہ لوگ شکر کو شکریہ کہتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ ہم چندہ لینے کو منع نہیں کرتے۔ چندہ کی ترغیب دینا برا نہیں ہے۔ ہم تو مانگنے کو منع کرتے ہیں اور اس کو ذلت سمجھتے ہیں' شاید کوئی کہے کہ پھر بات ہی کیا ہوئی کہ چندہ کو منع نہیں کرتے ہیں اور مانگنے کو منع کرتے ہیں۔ دونوں میں فرق ہی کیا ہے۔ جواب یہ ہے کہ دونوں میں بہت فرق ہے۔ چنانچہ اس فرق کو ابھی ایک آیت سے ظاہر کر چکا ہوں' کہ سوال کا اور حکم ہے ترغیب کا اور حکم ہے۔ دونوں میں نہایت لطیف فرق ہے۔ سوال میں تو اللہ تعالیٰ نے **فیحفکم** (پس تم بخل کرنے لگو) بڑھایا ہے جس سے معلوم ہوا کہ اس میں عادۃً جبر ہوتا ہے دینے والوں پر۔ کیونکہ سوال میں لگنا لپٹنا ہوتا ہے' اور ترغیب میں جبر نہیں ہوتا۔ دوسرے سوال میں ذلت ہوتی ہے اور ترغیب میں استغناء۔ سائل معطی کی نظر میں حقیر اور خوار ہوتا ہے اور ترغیب دینے والا ذیجاہ اور ممتاز رہتا ہے۔ اس کی وقعت اور عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے کیونکہ وہ مستغنی ہوتا ہے۔ بس ایک دفعہ کہہ دیا کہ یہاں فلاں کام ہوگا' مسجد

بنے گی، مدرسہ قائم کیا جاوے گا۔ کسی کو سعادت لینا ہو ہزار دفعہ ہاتھ جوڑ کر روپیہ لادے، لے لیا جاوے گا، اور اگر اس کار خیر میں حصہ نہیں لیتے مت لو۔ تمہارا ہی نفع نقصان ہے ہمارا کچھ نہیں۔

میں ایک مرتبہ ریاست رامپور گیا تھا۔ وہاں ایک مدرسہ کا جلسہ تھا۔ ایک مولوی صاحب نے مجھ سے پہلے تقریر کی۔ دوران تقریر میں چندہ کی تحریک کیلئے یہ کہا کہ اسوقت اسلام کی مثال اور اس کی حالت اس بیوہ عورت کی طرح ہوگئی ہے جس کا کوئی خبر گیر نہیں۔ خاوند مرگیا ہے، اب نہ کھانے کو ہے نہ پینے کو، نہ رہنے سہنے کو چاروں طرف دیکھ رہی ہے کہ میرا بھی کوئی خبر گیراں ہے۔ تو ایسے وقت میں اس کی مالی خدمت کرنا بے حد ضروری ہے مجھے یہ مثال بہت بری معلوم ہوئی۔ ان کے بعد جب میں کھڑا ہوا تو میں نے اس کا رد کیا کہ اسلام بادشاہ ہے، وہ کسی کا محتاج نہیں ہے بلکہ سب اسی کے محتاج ہیں۔

منت منہ کہ خدمت سلطان ہمیکنی　　منت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت

یہ احسان مت جتاؤ کہ بادشاہ کی خدمت کرتا ہوں اس کا احسان مانو کہ اس نے تم جیسے کو خدمت میں رکھ لیا ہے۔

اس میں نہ مسکنت ہے نہ ذلت ہے وہ بادشاہ ہے اس کا تو یہ حال ہے۔

ہنوز آں ابر رحمت درفشاں ست　　خم وخمخانہ بامہر ونشان ست

اب بھی وہ ابر رحمت درخشاں ہے خم اور خمخانہ مہر ونشان کے ساتھ موجود ہے۔

اس میں کچھ نقص نہیں۔ دین جیسا تھا ویسا ہی ہے۔ ہاں یہ کہو کہ ہم مسلمان اسلام کو چھوڑ کر بیوہ عورت کی طرح ہوگئے کہ ہمارا کوئی پرسان حال نہیں۔ اسلام پر جمتے تو خدا تعالیٰ ہمارا ناصر وحامی ہوتا۔ اب کوئی بھی نہیں۔ پھر میں نے تحریک چندہ کیلئے یہ کہا اگر تمہاری بے پرواہی سے اسلام دنیا سے گم ہوجاوے تو فقط مولویوں ہی سے پوچھ نہ ہوگی بلکہ عوام سے بھی مواخذہ ہوگا کیونکہ جس کا جو کام ہے اس سے اسی کی پرسش ہوگی۔ مولوی سے تو اس کی پوچھ ہوگی کہ تم نے تعلیمی خدمت نہیں کی اور عوام سے یہ کہا جاوے گا کہ تم نے ان کی مالی خدمت کیوں نہ کی کیونکہ ننگے بھوکے رہ کر کوئی پڑھا نہیں سکتا۔ تو تنہا ہمیں پر مصیبت نہ آئے گی بلکہ سب پر مصیبت ہوگی۔ جیسے مولویوں کی گرفت ہوگی عوام کی بھی گرفت ہوگی۔ اب خواہ مالی خدمت کرو یا نہ کرو، یہ سن کر پٹھانوں کو جوش اٹھا کہا ہاں جی اسلام بیوہ کیوں ہوتا وہ تو بادشاہ ہے اور چھنا چھن روپیہ برسنا شروع ہوا۔ پھر ان مولوی صاحب کو بھی اپنی غلطی معلوم ہوگئی۔ میں کہتا ہوں بخدا اگر ساری دنیا کافر ہوجاوے جب بھی

اسلام میں کچھ فرق نہیں آ سکتا۔ بلکہ جیسا ہے ویسا ہی رہے گا۔ اور کیوں فرق ہو آخر اسلام کس کا نام ہے احکام خداوندی کا۔ خدا حاکم ہے اور اسلام اس کا قانون ہے۔ تو جب تک حاکم میں قوت ہے اس وقت تک اس کے قانون واحکام میں ضعف نہیں آ سکتا۔ اسی طرح جب تک خدا موجود ہے اس وقت تک اسلام ضعیف نہیں ہو سکتا۔ اور ظاہر ہے کہ خدا ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ لہٰذا اسلام بھی ہمیشہ قوی رہے گا۔ اس میں ذرہ برابر ضعف نہیں آ سکتا۔ اسلام کو رانڈ بیوہ کہنا نہایت بے ادبی ہے۔ مسلمان کو اس سے بڑی عار آنا چاہیے۔

بھلے بُرے میں تمیز:

اسی طرح پچھلے دنوں اس مضمون کے لیکچر ہوا کرتے تھے کہ اسلام بغیر دوسری اقوام کی امداد کے زندہ نہیں رہ سکتا' افسوس ان لوگوں کو یہ لفظ منہ سے نکالتے ہوئے شرم وغیرت نہ آئی' ڈوب نہ مرے انہوں نے ہی قوم کو برباد کیا ہے ساری خرابی انہیں کی بدولت ہو رہی ہے۔ بھلا ہم اور دوسروں کے محتاج ہوں۔ افسوس اب تک ان لوگوں نے یہی نہیں سمجھا کہ ہم کیا ہیں' اگر یہ سمجھتے تو کبھی ایسا لفظ زبان پر نہ لاتے۔ مگر سمجھتے کیسے؟ کیونکہ اس کے سمجھنے کیلئے تو بصیرت کی ضرورت ہے۔ اس کے فہم کیلئے نور چاہیے جب وہ نور نہیں پھر کیسے سمجھیں' بھلے برے کی تمیز کریں۔ ہماری وہ مثال ہے کہ ایک معشوق حسین ہمارے پاس موجود ہے۔ ہم اس کو نہیں دیکھتے کیونکہ وہ اندھیرے میں کھڑا ہے اور ہمارے پاس روشنی نہیں نور نہیں اس لئے وہ ہم کو نظر نہیں آتا۔ اگر نور ہوتا تو اس کو دیکھ کر یہ کہتے ہیں۔

زفرق تابقدم ہر کجا کہ مینگرم   کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجاست

سر سے قدم تک جس جگہ دیکھتا ہوں کرشمہ دامن دل کو کھینچتا ہے کہ یہی جگہ محبوب کی ہے۔

مگر وہ نور نہیں لہٰذا دوسرے زشت منظر کو تک رہے ہیں۔ اسی طرح اپنے کو نہ دیکھ کر اپنے کو دوسری قوم کا محتاج سمجھ لیا۔ صاحبو! اسلام کو ظاہری قوت کی ضرورت نہیں۔ اسلام روپیہ پیسہ کا محتاج نہیں۔ اسلام کی اشاعت وترقی کیلئے صرف دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک تو ہر شخص اپنے اعمال کو ٹھیک کرے۔ پورا متبع شریعت بن جائے اور اعمال میں اتفاق بھی آ گیا اور دوسرے یہ کہ غیر قوموں کے کانوں میں اس کی خوبیاں ڈالتا رہے۔ لڑائی جھگڑا نہ کرے نرمی سے ان کو سمجھاتا رہے جس کو حق تعالیٰ نے فرمایا ہے **ادع الی سبیل ربک بالحکمة والموعظة الحسنة وجادلھم بالتی ھی احسن.** (آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کی راہ کی طرف علم اور اچھی نصیحتوں کے ذریعہ سے بلائے اور انکے ساتھ اچھے طریقے سے بحث کیجئے) افسوس اس وقت ہماری حالت بالکل خراب

ہوگئی۔ ہمارا بالکل کایا پلٹ ہوگیا' ہمارا کوئی کام اعتدال سے نہیں ہوتا۔ بس وہی حال ہے۔

چوں گرسنہ میشوی سگ میشوی   چونکہ خوردی تندو بدرگ میشوی

جب بھوکا ہوتا ہے کتے کی طرح بن جاتا ہے جب شکم سیر ہوتا ہے ظالم اور سخت مزاج ہوجاتا ہے۔ یعنی یہ حالت ہے کہ اگر بھوکے ہیں تو اور قسم کی بلا میں مبتلا ہیں اور پیٹ بھرے ہیں تو اور قسم کی بلا میں مبتلا ہیں۔ اور یہ حالت ہے۔

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی   تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

یا تو ہم غفلت میں پڑے سو رہے تھے یا اٹھے تو کبھی دوسروں کے ساتھ لڑائی بھڑائی کرنے لگے۔ اور کبھی ان کی خوشامد کرنے لگے۔ ہماری وہی مثال ہے کہ اونٹ رے اونٹ تیری کوئی کل سیدھی ہے۔ پہلے تو یہ تھا کہ ہندوؤں کے خلاف کچھ نہ بولو اتحاد میں خلل پڑے گا۔ اتحاد ہی کو قبلہ و کعبہ بنا رکھا تھا چاہے اسلام ٹوٹے مگر اتحاد نہ ٹوٹے۔ افسوس ان کو تو اتحاد کا خیال تھا' ہر وقت اتحاد کی دھن تھی اور ان کو اس کی ذرا بھی پرواہ نہ تھی۔ بلکہ اس اتفاق ہی کی حالت میں وہ ان کی جڑ کاٹ رہے تھے مگر ان کو خبر بھی نہیں ہوئی اور یا اب خبر ہوئی تو لڑنا بھڑنا شروع کر دیا۔ بھائی لڑنے کے بھی کچھ شرائط و حدود ہیں جب وہ نہیں پھر کیا لڑائی۔ طریقہ کے بغیر لڑنا' بجز فساد کے کچھ نہیں۔ بس ہمیں تو یہ طریقہ بتلایا گیا ہے اور وہی ہم کو اختیار کرنا چاہیے یعنی **ادع الی سبیل ربک بالحکمة والموعظة الحسنة وحادلهم بالتی هی احسن. ان ربک هو اعلم بمن ضل عن سبیله وهو اعلم بالمهتدین. وان عاقبتم فعاقبوا بمثل ما عوقبتم به ولئن صبرتم لهو خیر للصٰبرین. واصبر وما صبرک الا بالله ولا تحزن علیهم ولا تک فی ضیق مما یمکرون. ان الله مع الذین اتقوا والذین هم محسنون.** (آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کی راہ کی طرف علم اور اچھی نصیحتوں کے ذریعہ سے بلایئے اور انکے ساتھ اچھے طریقے سے بحث کیجئے۔ آپ کا رب خوب جانتا ہے اس شخص کو بھی جو اسکے رستہ سے گم ہوا اور وہی راہ چلنے والوں کو بھی خوب جانتا ہے اور اگر بدلہ لینے لگو تو اتنا ہی بدلہ لو جتنا تمہارے ساتھ برتاؤ کیا گیا اور اگر صبر کرو تو وہ صبر کرنے والوں کے حق میں بہت ہی اچھی بات ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم صبر کیجئے اور آپ کا صبر کرنا خاص خدا تعالیٰ ہی کی توفیق سے ہے اور ان پر غم نہ کیجئے اور جو کچھ یہ تدبیریں کیا کرتے ہیں اس سے تنگ دل نہ ہوجایئے۔ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو پرہیزگار ہوتے ہیں اور جو نیک کردار ہوتے ہیں۔)

آداب تبلیغ:

اس میں پورے آداب' تبلیغ کے مذکور ہیں' حق تعالیٰ نے اس میں شرائط و آداب تبلیغ کو

مفصل طور پر بیان فرمادیا ہے۔ چنانچہ اول تو امر ہے **ادع الی سبیل ربک بالحکمة والموعظة الحسنة** (آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کی راہ کی طرف علم اور اچھی نصیحتوں کے ذریعہ سے بلایئے) سبحان اللہ کیا فصاحت ہے ایک ہی آیت میں سب فرقوں کی اصلاح فرماتے ہیں۔ چنانچہ بعض تو وہ لوگ ہیں کہ دعوت کو ضروری نہیں سمجھتے ہیں اور بعض وہ ہیں کہ ضروری تو سمجھتے ہیں مگر جنگ وجدال کرنے لگتے ہیں۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے دونوں کی اصلاح فرمائی ہے کہ دعوت تو کرنا چاہیے وہ تو ضروری ہے' اس میں فرقہ اول کی اصلاح ہوگئی۔ آگے فرماتے ہیں کہ دعوت تو ہو مگر ایک خاص طریقہ سے۔ آگے وہ طریقہ بتلاتے ہیں کہ طریقہ دعوت کا یہ ہے کہ حکمت اور موعظت حسنہ کے ساتھ لوگوں کو بلاؤ۔ نرمی سے سمجھاتے رہو۔ یہاں پر اللہ تعالیٰ نے دو باتوں کا امر فرمایا ہے۔ ایک حکمت دوسرے موعظت حسنہ۔

اول یہ سمجھو کہ ان دونوں میں فرق کیا ہے۔ سو حکمت تو کہتے ہیں علم کو' اور موعظت حسنہ کہتے ہیں ترغیب وترہیب وترقیق قلب کو یعنی ان کو علمی مضامین سے بلاؤ۔ مضامین علمیہ ان کے کانوں میں ڈالتے جاؤ اور ان مضامین کو ترغیب وترہیب سے موثر بناؤ۔ اسی کو فرماتے ہیں کہ حکمت وموعظت حسنہ کے ساتھ بلاؤ اور یہ حکمت مقابل ہے مناظرہ وجدال کا گو وہ بھی علمی مباحث سے ہوتا ہے مگر وہ حکمت نہیں بلکہ حکمت اثبات مدعا کا نام ہے۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ ایک تو ہوتا ہے اثبات مدعا اور ایک جواب ہوتا ہے نقیض مدعا کا۔ یعنی ایک تو ہے اپنے دعویٰ کو ثابت کرنا' دوسرے معترض کے اعتراض کا جواب دینا' اس کے خدشات کو دفع کرنا' تو حکمت تو اثبات مدعا ہے اور جواب دینا نقیض مدعا کا یہ جدال ہے۔ تو اصل مفید چیز تو دعوت کرنا ہے حکمت کے ساتھ' لیکن اس میں اگر کبھی جدال واقع ہو جاوے' تو اس کے بھی خاص طریقے ہیں۔ سو آگے ان طریقوں سے خصم کے اعتراض دفع کرنے کی تاکید ہے۔

غرض دعوت الی الاسلام کیلئے حکمت تو لازم ہے۔ بلا حکمت کے دعوت ہوتی ہی نہیں۔ باقی جدال لازم نہیں یہ ضروری نہیں کہ جہاں دعوت ہو وہاں جدال بھی ہو۔ تو مطلب یہ ہے کہ دعوت میں مضامین علمی بیان کرو۔ فوائد علمیہ سناتے جاؤ۔ اپنے دعوے کو دلائل علمیہ وعقلیہ سے ثابت کرو اس کی خوبی اس کے محاسن بیان کرو لیکن اگر اس میں کوئی دوسرا اعتراض کرے کوئی نقض وارد کرے تو اس وقت ضرورت ہوگی مباحثہ کی۔ تو اس وقت مباحثہ کرو مگر احسن طریقہ سے اسی کو فرماتے ہیں **وجادلهم بالتی هی احسن** (اور ان کے ساتھ اچھے طریقے سے بحث کیجئے)

یعنی اس طرح جواب دو کہ کسی کی دل آزاری نہ ہو، لعن وطعن نہ ہو، خشونت نہ ہو۔ کسی پر طعن نہ کرو، کسی کو ملامت نہ کرو، کسی کی ہجو نہ ہو۔ ایسے مباحثہ حسنہ سے مخاطب کو رنج و ملال نہ ہوگا بلکہ وہ اثر پذیر ہوگا۔ یعنی مضامین کے بیان میں کبھی خشونت ہو جاتی ہے، کبھی غصہ اور تیزی کے لہجہ سے بیان کیا جاتا ہے۔ اس کی ممانعت فرماتے ہیں کہ ایسے طریق اختیار نہ کرو جس سے مخاطب بھڑک اٹھے، اس کے بدن میں آگ لگ جائے۔ سو ایک تقریر تو مقام کی یہ ہوئی۔

دوسری تقریر یہ ہے کہ موعظت بھی ایک مستقل طریق ہے۔ تو اس وقت حاصل مقام کا یہ ہوگا کہ اگر مخاطب میں علمی قابلیت دیکھو اس کے اندر سمجھ کا مادہ ہو تو وہاں حکمت کے ساتھ بلاؤ، اس کو مضامین علمیہ سناؤ اور اگر استعداد علمی نہ ہو تو موعظت سے کام لو۔ کیونکہ وعظ کیلئے چنداں ذہین فہیم ہونے کی ضرورت نہیں۔ وعظ کا اکثر مضمون عام فہم ہوتا ہے، کیونکہ موعظہ حسنہ اس کو کہتے ہیں، جس سے قلب میں نرمی پیدا ہو، رقت طاری ہو، تو معنی یہ ہوئے کہ جنت کی ترغیب دو۔ دوزخ سے ترہیب کرو، نعمائے جنت و آسائش و راحت بہشت کو بیان کرو، اس سے رغبت پیدا ہوگی۔ اور دوزخ کے ورکات اور تکالیف وعذاب سے ڈراتے رہو اور اس کے بعد بھی اگر کوئی شبہ کرے تو اس کیلئے حکم ہے **جادلهم بالتی هی احسن** کہ ان سے مجادلہ کرو احسن طریقہ سے، جس کی تفسیر اوپر گذر چکی۔

آگے **ان ربک هو اعلم** (بے شک آپ کا پروردگار خوب جانتا ہے) بڑھا کر مجموعہ میں ایک باریک بات بتلا دی وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جو یہ طرز تعلیم فرمایا ہے کہ ان کو حکمت اور موعظت حسنہ کے ساتھ بلاؤ یعنی نرمی سے سمجھاؤ۔ کوئی خشونت نہ ہو، درشتی نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ طرز وہی اختیار کرسکتا ہے جس کے اندر شفقت ہو۔ اگر وہ شفیق نہیں تو اس کو منت سماجت کی کیا پڑی؟ دیکھو جب استاذ شفیق ہوتا ہے تو چاہتا ہے کہ کسی طرح یہ پڑھ لے۔ طرح طرح سے اس کو سمجھاتا ہے، کبھی پیسہ دیتا ہے، کبھی مٹھائی کھلاتا ہے، پیار کرتا ہے، چمکارتا ہے کہ میاں تمہارا ہی فائدہ ہے۔ سبق پڑھو دیکھو اگر پڑھو گے تو درجات ملیں گے۔ تو اس طریق کی تعلیم فرمانا گویا شفقت کا حکم فرمانا ہے مگر اس حکم شفقت میں ایک اشکال بھی تھا وہ یہ کہ شفقت کی وجہ سے جس طرح ابتدائے تعلیم میں نرمی اختیار کرتا ہے ایسے ہی انتہا میں ناکامی سے رنج بھی زیادہ ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر کسی بچے کے ساتھ محنت اور جان کاہی کی جاوے اور پھر بھی ناکامی ہو تو بڑا رنج ہوتا ہے کہ ہائے ہماری ساری محنت برباد گئی، خاک ہی میں مل گئی۔ پھر رنجیدہ ہو کر کام سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ اس لئے اس اشکال کے عملی علاج کیلئے آگے **ان ربک هو اعلم** (بے شک آپ کا پروردگار خوب جانتا ہے) میں اس شفقت کو اعتدال پر لانے کا

طریقہ بتلاتے ہیں۔ اور وہ طریقہ ایک مراقبہ ہے واقعی اخلاق کی میزان سوائے خدا کے کسی نے نہیں بتائی ان کی تعلیم میں افراط تفریط نہیں ہے بالکل اعتدال ہی اعتدال ہے۔ کیونکہ افراط بھی مضر ہے اور تفریط بھی۔ چنانچہ اگر حد سے زیادہ شفقت ہو تو یہ بھی مضر۔ کیونکہ اس سے آخر کو بددل ہو جاوے گا اور کام بھی چھوڑ بیٹھے گا' اور اگر تفریط ہے یہ بھی مضر کیونکہ شفقت کی تعلیم کا اور اثر ہوتا ہے اور بے شفقت کا اور اثر۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر اس کی ایک میزان بتادی تاکہ کسی جانب میں کمی بیشی نہ ہو۔ دونوں پہلو برابر رہیں۔ چنانچہ اول فرماتے ہیں **ادع الیٰ سبیل ربک بالحکمة والموعظة الحسنة** (آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کی راہ کی طرف علم اور نصیحت کی باتوں سے بلائیے) اس میں تو شفقت کے ساتھ تعلیم کا امر ہے کیونکہ اگر ابتداء میں شفقت نہ ہو تو ایسی تعلیم کم نفع دے گی اور اس کے بعد افراط فی الشفقت کی ممانعت ہے' اس کیلئے یہ مراقبہ بتلاتے ہیں کہ **ان ربک ھو اعلم بمن ضل عن سبیلہ وھو اعلم بالمھتدین** (بیشک آپ کا پروردگار خوب جانتا ہے اس شخص کو جو اپنے رستہ سے گم ہوا اور وہی راہ چلنے والوں کو بھی خوب جانتا ہے)۔ گویا اس کے معنی یہ ہیں کہ **لا تحزن علیھم ان لم یومنوا** (اگر وہ ایمان نہ لائیں تو ان پر غم نہ کریں) یعنی آپ کا فرض منصبی تو دعوت کرنا ہے وہ آپ نے کردی اب اگر وہ ایمان نہیں لاتے آپ کی دعوت کو قبول نہیں کرتے تو آپ غمگین نہ ہوں' کیونکہ ایمان لانا یا نہ لانا یہ تو خدا کے قبضہ قدرت میں ہے۔ آپ کے اختیار میں نہیں' پھر آپ غمگین کیوں ہیں؟

اس مضمون کے استحضار سے غلو فی الشفقت نہ ہوگا جو کہ مضر ہے اور اس کے مضر ہونے کا ایک راز ہے وہ یہ کہ شفقت سے حزن ہوگا' اور حزن کا خاصہ یہ ہے کہ اس سے قلب ضعیف ہو جاتا ہے اور بددل ہو کر آدمی کام چھوڑ دیتا ہے کہ اتنا تو سر مارا اور پھر بھی ناکامی ہوئی چھوڑو اور اس قصہ ہی کو الگ کرو اس سے کیا فائدہ؟ تو شدت شفقت کی وجہ سے یہ بات ہوگی اور اس سے سلسلہ تبلیغ کا بند ہو جائے گا۔ اس لئے غلو کا بھی علاج کردیا۔ خلاصہ یہ کہ مسلم کی تبلیغ کا کام شفقت سے ہوتا ہے۔ مگر شفقت سے تبلیغ کی صرف تکمیل ہوتی ہے یہ خود بنفسہ مقصود نہیں' بلکہ اصل مقصود تبلیغ ہے۔ اگر شفقت سے تبلیغ ہی جاتی رہے تو شفقت کی ایسی تیسی' ایسی شفقت سے کیا فائدہ؟ کیا اس کو لے کر چاٹیں گے۔ اس کے بعد اس میں ایک اور شبہ رہا وہ یہ کہ ساری دنیا تو مہذب نہیں جو اس طریق کو مان لیں دنیا میں سب قسم کے لوگ ہیں اگر مبلغ سے کوئی لڑنے لگے مار پٹائی ہونے لگے تو کیا کریں؟ اس کیلئے فرماتے ہیں **وان عاقبتم فعاقبوا بمثل ما عوقبتم بہ۔** (اور اگر بدلہ لینے

لگو تو اتنا ہی بدلہ لو جتنا تمہارے ساتھ برتاؤ کیا گیا) سبحان اللہ دیکھئے اس میں کیسی بلاغت ہے کہ حضورؐ کو مخاطب نہیں بنایا۔ جس میں بتلا دیا کہ آپؐ کو تو تبلیغ میں اس کی نوبت ہی نہ آوے گی کہ آپ سے تبلیغ میں کوئی لڑے جھگڑے یا آپؐ اس کا بدلہ لیں۔ آپؐ کے ساتھ حق تعالیٰ کی اعانت خاصہ ہے۔ ہاں اگر تابعین اور ان کے خدام ان کے غلاموں کو یہ بات پیش آجاوے تو ممکن ہے اس لئے تمہیں مخاطب بنا کر کہتے ہیں کہ جتنی تکلیف کسی سے تمہیں ہوئی ہو اتنی ہی اس کو دیجیو' زیادتی نہ کرنا **ولئن صبرتم لهو خير للصابرين.** (اور اگر صبر کرو تو وہ صبر کرنے والوں کے حق میں بہت اچھی بات ہے) سبحان اللہ واقعی یہ خدا کا کلام ہے اگر مخلوق کا کلام ہوتا تو وہ صبر کو مقدم کرتا اور معاقبہ کو موخر کرتا۔ مگر خدا تعالیٰ نے صبر کو مقدم نہ کیا اس میں بندہ کی حاجت کی رعایت ہے کیونکہ بشریت کا خاصہ یہ ہے کہ اگر کوئی غصہ میں بھڑک رہا ہو اس وقت اس کی موافقت کرنے سے غصہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے اور مخالفت کی جائے تو وہ اور زیادہ گرم ہو جاتا ہے بالکل آگ ہو جاتا ہے مثلاً کسی کو آپ نے لڑتے دیکھا اور اس سے کہا کہ تو بھی اس کے چار دھول لگا دے یہ کہتے ہی وہ ٹھنڈا ہو جائے گا اور اگر تم نے یوں کہا کہ کیا نامعقول حرکت ہے کیوں لڑ رہے ہو صبر و تحمل سے رہنا چاہیے۔ تو وہ ایک تو اس پر وانت پیس رہا تھا اب آپ کی طرف بھی گھورنے لگے گا۔ کہ سبحان اللہ کچھ سمجھے نہ سمجھائے یوں ہی صبر و تحمل کی ہانکنے لگے تو اللہ میاں نے مخاطب کی رعایت کی کہ اگر کوئی تم سے لڑے بھڑے تو پھر اس کے چار جوتے لگا دو۔ اب یہ سن کر جب ذرا جی ٹھنڈا ہو گیا تو آگے فرماتے ہیں کہ اگر صبر کرو تو وہ بہت ہی اچھا ہے۔ پھر آگے حضورؐ کو خاص طور پر صبر کا خطاب ہے **واصبر وما صبرک الا باللہ** (آپؐ صبر کیجئے اور آپؐ کا صبر کرنا خاص اللہ ہی کی توفیق سے ہے) کہ آپ تو بالضرور صبر کریں یہ اور صبر ہے جس کا حضورؐ سے خطاب ہو رہا ہے اور اس سے پہلے **ولئن صبرتم لهو خير للصابرين** (اور اگر صبر کرو تو وہ صبر کرنے والوں کے حق میں بہت اچھی بات ہے) میں اور صبر مراد تھا یعنی آپؐ کو جو رنج ہوتا تھا ان کے برا بھلا کہنے سے۔ **واصبر** میں تو اس پر صبر کرنا مراد ہے۔ **ولئن صبرتم** میں لڑائی بھڑائی نہ کرنا اور بدلہ نہ لینا مراد ہے اور اس **واصبر** کے بڑھانے میں ایک دوسرا نکتہ بھی ہے وہ یہ کہ مسلمانو سمجھو صبر جس کیلئے تم کو مشورہ دیا گیا ہے **ولئن صبرتم** (اور اگر صبر کرو) میں یہ وہ چیز ہے کہ حضورؐ کو بھی باوجودیکہ آپؐ اعلیٰ درجہ کے اخلاق پر ہیں اس کا حکم ہوا کہ صبر کیجئے۔ پھر تم کس شمار میں ہو؟ تو اس سے مخاطبین کو صبر سہل ہو جائے گا۔ اس سے آگے ایک اور مرض کا علاج فرماتے ہیں۔ وہ مرض یہ ہے کہ صبر سے دعویٰ پیدا

نہ ہو جائے کہ صابر ہیں، کہ ہم نے ایسے موقع پر صبر کیا ہم بڑے کامل ہیں۔ اس کا اسی طرح ازالہ فرماتے ہیں کہ حضورؐ کو خطاب فرماتے ہیں **وما صبرک الا باللہ** (اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا صبر کرنا خاص اللہ ہی کی توفیق سے ہے) جس میں آپؐ کے خادموں کو سنانا ہے کہ میاں کیا دعویٰ کر سکتے ہو، تم بے چارے کیا چیز ہو۔ خود رسول کا صبر بھی جب واقع ہوگا وہ بھی خدا ہی کی توفیق سے ہوگا پھر تمہارا ان کے سامنے دعویٰ کرنے کا کیا منہ ہے؟ تم ہو کیا چیز ان کے کمال کے سامنے تمہارا کمال معدوم ہے، ان کے صبر کے مقابلہ میں تمہارا صبر کچھ حقیقت نہیں رکھتا جب ان کا صبر بھی بغیر توفیق مولیٰ نہیں ہو سکتا۔ پھر تم کیا دعویٰ کر سکتے ہو؟

آگے فرماتے ہیں **ولا تک فی ضیق مما یمکرون** (اور جو کچھ یہ تدبیریں کرتے ہیں اس سے تنگ دل نہ ہو جایئے) کہ ناکامی ہو تو دل میں تنگی نہ ہونا چاہیے۔ آگے اس تنگی کو رفع کرنے کیلئے مراقبہ بتلاتے ہیں، اگر یہ مراقبہ پیش نظر رہے تو کبھی تنگی نہ ہوگی۔ پس فرماتے ہیں **ان اللہ مع الذین اتقوا والذین ہم محسنون** یعنی یہ سوچو کہ مقصود تبلیغ سے کیا ہے، کیا دوسروں کو خاص مسلمان بنانا مقصود ہے اگر کسی کو یہ مقصود ہوگا تو اگر ایک بھی کافر رہے گا تو رنج ہوگا۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تبلیغ سے خاص یہ مقصود نہیں کہ آپ کی حسب دلخواہ مراد پوری ہو جایا کرے کہ سب کے سب ولی اور ابدال بن جاویں بلکہ مقصود تبلیغ سے خدا تعالیٰ کا قرب اور معیت حاصل کرنا ہے اگر وہ تم کو حاصل ہو جاوے تو خواہ ساری عمر میں ایک بھی مسلمان نہ ہو ایک جگہ بھی کامیابی نہ ہو کچھ حرج نہیں اور اگر یہ نہیں تو ساری دنیا کی اصلاح سے تمہارا کیا نفع ہوا اس کو فرماتے ہیں **ان اللہ مع الذین اتقوا والذین ہم محسنون** یعنی اللہ تعالیٰ تو متقین اور محسنین کے ساتھ ہے۔ اگر تقویٰ اور احسان حاصل ہے چنانچہ تبلیغ کی بجا آوری سے یہ حاصل ہو گیا تو معیت خدا نصیب ہو گئی، اور یہی کافی ہے اب اور کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ اب خواہ کوئی بگڑے یا سنورے تم کو اس کی پرواہ نہیں ہونا چاہیے۔ **فمن شاء فلیو من ومن شاء فلیکفر** یہ احکام ہیں اسلام کے اور یہ آداب ہیں تبلیغ کے۔ صاحبو! افسوس ہے کہ عرصہ سے ہم اتنی بڑی چیزوں کو چھوڑ بیٹھے ہیں کہ نہ اپنے اسلام کی تکمیل کی فکر ہے نہ دوسروں تک تبلیغ اسلام کی فکر ہے۔ لوگ چونکہ اس سے غافل ہیں اس لئے اس وقت اس کے متعلق بیان کیا گیا کیونکہ حلوانہ تنہا بباید خورد۔ بس اب اپنی بھی تکمیل کرو اور تبلیغ بھی کرو اور اس طرح کرو جیسے قرآن میں ہے نو مسلموں اور کافروں کو نرمی سے سمجھاؤ، کسی سے لڑو بھڑو مت، مناظرہ مروجہ مت کرو کہ یہ آداب تبلیغ کے خلاف ہے اور اس سے نفع بھی نہیں ہوتا۔ تجربہ ہو چکا ہے۔ حتیٰ کہ اسکا غیر قوموں نے

بھی تجربہ کر لیا ہے وہ بھی اب مناظروں سے کنارہ کش ہونے لگے بس اسلامی مضامین کان میں ڈالے جاؤ۔ بار بار اسلام کی خوبیاں سناتے رہو یہی طرز قرآن کا ہے۔ چنانچہ جا بجا فرماتے ہیں **صرفنا الایات صرفنا فی ہذا القران وامثالہا.** یعنی بار بار مضامین کو دہراتے ہیں۔ اگر ہم لوگ اس طرز کو اختیار کریں یعنی وقتاً فوقتاً احکام پہنچاتے رہیں تو انشاء اللہ بہت نفع ہو اور اگر نفع نہ بھی ہو ہمارا کیا بگڑا۔ ہم نے تو اپنا فرض اتار دیا، جو کام ہمارے ذمہ تھا وہ ادا کر دیا۔ اب نفع ہو یا نہ ہو وہ جانیں اور ان کا کام۔

تبلیغ میں دو نیتیں:

ہمیں اس سے کیا بحث۔ قرآن مجید میں حکایت ہے **واذ قالت امۃ منہم لم تعظون قوما ن اللہ مہلکم او معذبہم عذاباً شدیداً** ( ) کہ اصحاب السبت میں سے ایک جماعت نے دوسری جماعت سے کہا کہ تم ایسی جماعت کو کیوں نصیحت کرتے ہو جن کو خدا تعالیٰ ہلاک کرنے والے ہیں یا جن پر عذاب شدید نازل فرمانے والے ہیں ایسے لوگوں کو خطاب کرنے سے کیا فائدہ؟ **قالوا معذرۃ الی ربکم ولعلہم یتقون.** انہوں نے کہا کہ صاحب ہم اسلئے نصیحت کرتے ہیں تا کہ تمہارے رب کے ایک عذر ہو خدا کے نزدیک کہ یا اللہ ہم نے تو کہا تھا انہوں نے مانا نہیں، جو ہمارا کام تھا وہ ہم نے ادا کر دیا تھا ایک تو یہ بات ہے اور دوسرا فائدہ یہ ہے کہ **لعلہم یتقون** کہ ممکن ہے یہ لوگ ڈریں، شاید ان میں سے کسی کو ہدایت ہو جاوے۔ کیونکہ نرمی کے ساتھ سمجھانے سے امید تو ہے انکے ایمان کی مایوسی کی کوئی وجہ نہیں یہ حکایت ہے۔ بس یہی دو نیتیں آپ بھی تبلیغ میں رکھئے ایک معذرت عند اللہ اور دوسری ان کے ایمان لانے کی توقع۔ جن میں سے پہلا مقصود تو قطعی الحصول ہے ان شاء اللہ تعالیٰ اور دوسرا محتمل و متوقع ہے۔ بس تم انکو اسلامی محاسن سناتے رہو ان شاء اللہ بہت کچھ اصلاح کی امید ہے اور اس سے بہت اصلاح ہوئی ہے۔

قانون اسلام کی رعایت:

چنانچہ اس کا ایک واقعہ یاد آ گیا جس سے ان محاسن کا اندازہ ہوتا ہے وہ یہ کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے یہاں فارس کا ایک شہزادہ گرفتار ہو کر آیا تھا آپؓ نے اس پر اسلام پیش کیا اس نے قبول نہ کیا، پھر آپؓ نے فرمایا تو مطیع ہو کر رہنا ہوگا اس نے اس سے بھی انکار کیا۔ آپؓ نے فرمایا تو پھر اب قتل کیلئے تیار ہو جاؤ۔ چنانچہ آپؓ نے قتل کا حکم دیا۔ اس نے کہا اب تو میں مارا ہی جاتا ہوں میری ایک تمنا ہے اسے تو پورا کر دو فرمایا کہو۔ کہا پانی پینا چاہتا ہوں۔ آپؓ نے کہا بہت اچھا۔ پانی

لایا گیا وہ پیالہ منہ کے پاس لے گیا اور پھر اس کو ہٹا لیا۔ آپؓ نے فرمایا پیتا کیوں نہیں؟ کہا مجھے اطمینان نہیں کہ مجھے پانی پینے کی بھی مہلت ملے گی شاید درمیان ہی میں قتل کر دیا جاؤں۔ حضرت عمرؓ کو عمر بھر میں کسی نے دھوکہ نہیں دیا سوائے اس شخص کے۔ آپؓ نے فرمایا کہ تو پانی پی لے ڈرمت۔ کہا مجھے اطمینان نہیں۔ آپؓ کہہ دیجئے کہ جب تک تو یہ پانی نہ پی چکے گا اس وقت تک تجھے قتل نہ کیا جاوے گا۔ جب مجھے اطمینان ہوگا۔ آپؓ نے یہی بات کہہ دی۔ اس نے یہ شرارت کی کہ جھٹ سے پانی گرا دیا اور کہا اب مجھے قتل کرو کیسے کرتے ہو؟ اس کو یہ اطمینان ہوگیا کہ آپؓ یہ تو فرما ہی چکے ہیں کہ جب تک یہ پانی نہ پی چکے گا اس وقت تک تجھے قتل نہ کیا جاوے گا اور اب پانی کا پینا محال ہوگیا ہے۔ تو اب تحقق شرط متعذر ہوگیا تو مشروط بھی متعذر ہوگیا، اب مجھے کیسے قتل کریں گے؟ آپؓ نے فرمایا کہ جا تجھے آزاد کیا گیا۔ آزاد ہوتے ہی اس نے کہا **اشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ واشھد ان محمدًا عبدہ ورسولہ** (میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں وہ ایک ہے اس کا کوئی شریک نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ بیشک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور اسکے رسول ہیں) اور مسلمان ہوگیا۔ جب اس سے پوچھا گیا تو اس نے کہا کہ اگر میں اس وقت جب کہ آپ نے مجھ پر اسلام پیش کیا تھا مسلمان ہو جاتا تو لوگ سمجھتے کہ تلوار کے خوف سے مسلمان ہوا ہے اس لئے پہلے میں نے آپ کو بے دست و پا کر دیا کہ میرے اوپر کسی طرح آپ کا زور نہیں چل سکتا۔ اب بخوشی مسلمان ہوتا ہوں۔ دیکھا آپ نے اسلام کی تعلیم کو کہ اس کو اس تعلیم وفائے عہد پر اتنا بھروسہ تھا کہ امن دینے کے بعد امیر المومنین ہرگز بدعہدی نہ کریں گے وعدہ کر کے خلاف وعدہ کبھی نہ کریں گے جبھی تو اس نے یہ تدبیر کی۔ اس کو پورا اعتماد تھا کہ مسلمان عہد کر کے ہرگز اس کے خلاف نہیں کرتے۔ یہ ٹھکانہ ہے اسلامی قانون کا کہ اس میں رعایت کی کچھ حد ہی نہیں۔ حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا گیا کہ اگر ایک کافر نے قتال میں میرا ہاتھ قطع کر دیا ہو۔ پھر جب میں نے اس پر قابو پایا اور مارنے کیلئے تلوار اٹھائی تو اس نے **لا الہ الا اللہ** کہہ دیا، اب اس حالت میں اس کو قتل کروں یا نہیں۔ فرمایا ہرگز نہیں۔ اب اس کو مارنا جائز نہیں اس وقت اگر اس کو مارو گے تو تم اس جیسے ہو جاؤ گے اور وہ تم جیسا یعنی اسلام لانے سے پہلے وہ کافر تھا کندہ جہنم تھا اور تم مسلمان جنتی تھے۔ اب اگر اس کو قتل کرو گے تو تم دوزخی ہو جاؤ گے اور وہ جنتی کیوں کہ وہ ایمان لے آیا۔ اب اس کا دم حرام ہوگیا ہے وہ بہشتی ہوگیا ہے۔ دیکھا آپ نے اسلام کا ایسا قانون ہے کہ جب تم لشکر

کفار پر چڑھائی کرو اور ان پر قابو پا جاؤ اور وہ لا الہ الا اللہ کہہ دیں خواہ محض جان بچانے کیلئے ہی کہیں اور تم کو قرآن سے معلوم بھی ہو جائے کہ محض دھوکے سے لا الہ الا اللہ کہہ رہے ہیں جب بھی حکم ہے کہ ان کو چھوڑ دو قتل مت کرو ورنہ گنہگار ہو گے۔ کوئی کسی مذہب میں بھی اتنی رعایت دکھا سکتا ہے ظاہر ہے کہ دشمن دیرینہ سال ہا سال کا دشمن صرف ایک لفظ سے معاً دوست نہیں ہو سکتا۔ خصوصاً جب کہ قرآن سے یہ بھی معلوم ہو کہ یہ کلمہ محض دھوکہ دینے کو کہا گیا ہے مگر اسلام کو اپنے کلمہ کی قوت پر کچھ تو بھروسہ ہے جو اس کی زبان سے نکلتے ہی دشمن کو چھوڑ دینے اور دوست بنانے کا حکم ہے۔ اس میں عملاً یہ بتلا دیا گیا کہ اسلام کو ظاہری تدابیر کی ضرورت نہیں' اس کی قوت خود بہت کامل ہے کسی کے دھوکہ کی اس کو پرواہ نہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اپنے ذاتی انوار و برکات کی وجہ سے پھیلا ہے' اس کی ادائیں ہی ایسی دلکش ہیں کہ قلوب کو کھینچ لیتی ہیں۔ اس کے محاسن کو دیکھ کر لوگ خود بخود مسلمان ہوتے رہے' کسی نے زور زبردستی نہیں کی۔ پس ثابت ہو گیا کہ اسلام بزور شمشیر نہیں پھیلا بلکہ اپنے حسن و خوبی سے پھیلا ہے اور وہ اب بھی علیٰ حالہ باقی ہے۔

ہنوز آں ابر رحمت درفشان ست   خم و خمخانہ بامہر و نشان ست

اب بھی وہ ابر رحمت درفشاں ہے خم و خمخانہ مہر و نشان کے ساتھ موجود ہے۔

جس مذہب نے اتنی بڑی سپر دشمن کے ہاتھ میں دے رکھی ہو کہ زبان سے ایک کلمہ کہنے پر فوراً چھوڑ دیئے جاؤ گے کیا وہ مذہب بجبر پھیل سکتا ہے؟۔ جبر کی اس میں گنجائش ہی کہاں ہے۔ ہر کافر تقیہ کر کے کلمہ پڑھ کر قتل سے بچ سکتا ہے اور پھر قدرت کے وقت اپنے مذہب سابق پر عود کر سکتا ہے۔ آخر اس کی کیا وجہ کہ جن لوگوں نے بقول معترضین کے جبراً اسلام کو قبول کیا تھا وہ ساری عمر کو اس جبر کے پابند کیوں ہو گئے۔ موقع پا کر آزاد ہو کر پھر اپنے پہلے مذہب پر کیوں نہ چلے گئے؟ کچھ نہیں یہ محض خیال ہی خیال ہے۔ درحقیقت اسلام کا حسن ہی ایسا ہے کہ اس کی جھلک دیکھنے کے بعد نہ ماننا دشوار ہے۔ میں نے جو اس آریہ لیکچرار کا قصہ بیان کیا ہے کہ اس نے اپنے اخلاق کی کمزوری اور اسلام کی خوبی کو خود ہی تسلیم کیا' یہ اس کی زبان سے کس نے کہلوایا؟ اسلام ہی کی تعلیم نے۔ اسی واسطے میں کہتا ہوں کہ کفار کے سامنے اسلام کی خوبیاں بیان کرو جنگ و جدال و بحث مباحثہ کی ضرورت نہیں کیا اس کے محاسن کم ہیں جو ان کو چھوڑ کر جنگ و جدال میں مشغول ہوں۔ اسکے حسن ہی کے بیان کرنے سے فرصت نہیں مل سکتی۔ پھر لڑائی جھگڑے کی فرصت کب مل سکتی ہے۔ مگر ہماری خود آنکھیں نہیں ہیں۔ اس لئے وہ محاسن خود ہم کو نظر نہیں آتے تو دوسروں کے سامنے کیا پیش کرتے۔

اب ہماری ایسی مثال ہوگئی جیسے ایک نہایت حسین جمیل عورت ہے جس کی نظیر دنیا میں نہیں۔ مگر اس کا شوہر اندھا ہے، وہ بے چاری حسرت سے رو رہی ہے کہ ہائے مجھ میں تو یہ حسن و جمال اور اس کا کوئی قدر دان نہیں۔ وہ یہ بھی کہتی ہے کہ غیر تو کیا سمجھیں اور کیا قدر دانی کریں گے غیر کیلئے تو نظر بھی حلال نہیں، وہ تو دیکھ بھی نہیں سکتے خود شوہر جس کے لئے دیکھنا حلال تھا وہی اندھا ہے اور اندھا بھی ایسا کہ جس کو بالکل حس ہی نہیں۔ کیونکہ بعضے اندھے بھی کسی طریقہ سے حسن کا پتہ لگا لیتے ہیں۔ مثلاً جس کی آواز اچھی ہو تو سمجھتے ہیں کہ یہ بڑا حسین ہے خواہ وہ بالکل ہی بدصورت ہو، چیچک رو ہو۔ مشہور ہے کہ ایک اندھے نے کہا یہ شہر بڑا اچھا ہے، کسی نے پوچھا کہ تجھے کیسے معلوم ہوا، اچھے برے کو تو کیا جانے۔ کہا اس کی سڑک ہموار ہے، عمارات چکنی چکنی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ شہر بھی اچھا ہے۔ اسی طرح اندھے سمجھتے ہیں کہ جس کی آواز اچھی ہو وہ خود بھی اچھا ہے مگر ہم ایسے اندھے ہیں کہ ہم کو اسلام کی خوبیاں کسی طرح بھی نظر نہیں آتیں ورنہ اس کا حسن تو ایسا تھا۔

دامان نگہ تنگ گل حسن تو بسیار
گل چین بہار تو زداماں گلہ دار

نگاہ کا دامن تنگ ہے اور تیرے پھول کثرت سے ہیں اس لئے تیری بہار کا حسن گل چین اپنی تنگی داماں کا گلہ رکھتا ہے۔

گلستان میں ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک شخص کے ایک لڑکی تھی بہت بدصورت اور داماد اندھا تھا۔ اتفاق سے ایک آنکھ بنانے والا وارد ہو گیا لوگوں نے کہا کہ اپنے داماد کا علاج کیوں نہیں کرا لیتے۔ کہنے لگا اگر وہ اچھا ہو گیا تو میری لڑکی کو ضرور طلاق دے دے گا۔ تو اگر ہمارا اسلام بدشکل ہوتا تو دیکھنے والوں کی آنکھیں بننے سے ڈر لگنا بھی تعجب نہ تھا۔ مگر اسلام تو ایسا حسین ہے جس کے برابر دنیا میں کوئی حسین نہیں مگر اس کا قدر دان کوئی نہیں اس کے حسن کی کسی کو خبر بھی نہیں اور غیر تو کیا جانتے خود مسلمان بھی نہیں جانتے۔

مفاسدِ چندہ:

بس اب تو یہ رہ گیا ہے کہ کوئی صاحب لیکچر دینے کو کھڑے ہو گئے صدقات کے کچھ فضائل یاد کر لئے اور لمبی چوڑی تقریر کر کے غریبوں سے روپیہ وصول کر لیا۔ کوئی ان سے پوچھے کہ تم نے کیا دیا آخر تم کو بھی کچھ دینا چاہیے یا اوروں سے ہی لوٹ کھسوٹ لینا سیکھ لیا ہے اور خود ایک پیسہ بھی داخل کرنا نہیں جانتے۔ عارف شیرازی ایسے ہی لوگوں کے بارے میں فرماتے ہیں، جو اوروں سے تو کہنے کو موجود ہوں اور خود کنارہ کش۔

واعظان کیں جلوہ بر محراب و منبر میکنند   چوں بخلوت میر سند این کار دیگر میکنند
مشکلے دارم ز دانشمند مجلس باز پرس   توبہ فرمایان چرا خود توبہ کمتر میکنند

واعظ حضرات جو محراب و منبر پر رونق افروز ہو کر اعمال صالحہ کی تلقین کرتے ہیں مگر جب خود خلوت میں پہنچتے ہیں دوسرے کام کرتے ہیں مشکل یہ درپیش ہے کہ کسی عقل مند سے پوچھو کہ دوسروں کو توبہ کی تلقین کرنے والے خود توبہ کیوں نہیں کرتے۔

دوسرے کو تو کہتے ہیں کہ ایک پیسہ دو گے تو سات سو پیسے میں گے۔ کیوں مولانا اور کیوں لیڈر و کیا اس انفاق میں کچھ تخصیص بھی ہے غرباء کی کہ خیر خیرات غرباء ہی کے ذمہ ہے آپ کی جیب سے کبھی ایک پیسہ کیوں نہیں نکلتا؟ ہاں ایک اعتبار سے البتہ تخصیص ہے یعنی مال کے حلال ہونے کے اعتبار سے کہ حلال مال غرباء ہی کا ہے اور ان کا مال ایسا نہیں ہے۔ ایک مولوی صاحب وعظ میں صدقہ کی فضیلت بیان کر رہے تھے کہ اس کی یوں فضیلت آئی ہے اور یوں ثواب آیا ہے۔ وعظ کہہ کر جب گھر آئے تو دیکھا کہ عورت سر سے پیر تک ننگی بیٹھی ہے اس نے سب زیورات صدقہ کر دیئے۔ آپ نے پوچھا آج ننگی کیسی ہو زیورات کہاں گئے۔ کہا اجی میں نے سب کو صدقہ دے دیا۔ تم وعظ میں کہہ بھی رہے تھے کہ صدقہ کی یہ فضیلت ہے یہ ثواب ہے۔ کہنے لگے بے وقوف وعظ ہم نے لینے کے واسطے کہا تھا یا دینے کیلئے۔ ہاں جی مولانا کا یہی احسان ہے کہ راستہ بتلا کر سارا مال لے لیا ورنہ ہمارا مال کون لیتا اور ثواب کیسے ہوتا لاحول ولا قوۃ لوگوں میں کچھ حس ہی نہیں ہیں۔ خدا کیلئے تبلیغ میں تو کبھی چندہ کا نام ہی نہ لو۔ لوگ اس سے بہت گھبرا گئے ہیں۔ ان کے خیالات خراب ہو گئے ہیں کیونکہ بہت لوگ انجمنوں اور مساجد کے نام سے چندہ لے کر کھا گئے اس سے لوگ بدظن ہو گئے ہیں۔ ہر جگہ چندہ ہر جگہ چندہ لیکچر ختم ہونے نہیں پاتا کہ چندہ لاؤ۔

اکبر مرحوم نے خوب کہا ہے۔   در پس ہر لیکچر آخر چندہ ایست
انہوں نے ترمیم کی ہے مولانا کے اس شعر میں۔   در پس ہر گریہ آخر خندہ ایست
انہوں نے اس کو اس طرح بنایا۔   در پس ہر لیکچر آخر چندہ ایست
اور دوسرا مصرعہ اصل شعر کا یہ تھا۔   مرد آخر بیں مبارک بندہ ایست
اس کو میں نے یوں بنایا   مرد اخور بیں مبارک بندہ ایست

انہوں نے مجھ سے خود کہا کہ ہم نے علماء کے تو ایسے وعظ بہت سنے جن میں چندہ نہیں مانگا گیا۔ مگر لیکچر ایک بھی ایسا نہیں سنا کہ جس کے بعد چندا نہ ہوا ہو۔ دوسرے ایک فرق اور بھی ہے کہ مولوی تو

بے چارے چندہ میں چار پیسے بھی لے لیتے ہیں اور وہ چار سو پر بھی خوش نہیں ہوتے۔ اس کے علاوہ اگر مولوی لے کر کھالیں تو ان کے گلے سے نکال بھی سکتے ہیں اور یہاں تو لینا کیا معنی وہ تمہارے ہاتھ کو بھی چبالیں۔

بس ان مفاسد کے ہوتے ہوئے اس چندہ کی مد کو حذف کردو اور اگر کام کرنا ہو تو میرے نزدیک بجائے عام چندہ جمع کرنے کے اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ ایک ایک شخص ہی ایک ایک مبلغ کی تنخواہ مقرر کردے اور اپنے متعلق انتظام رکھے اور جن کو زیادہ وسعت نہ ہو وہ دو دو چار چار دس دس پانچ پانچ ہم خیال اور ہم مشرب مل کر ایک مبلغ کا خرچ برداشت کرلیں اور کسی عالم کو مبلغ مقرر کرلیں اپنے ہی متعلق حساب کتاب رکھیں' پھر نہ خیانت کا ڈر ہے نہ غبن کا خوف البتہ مبلغ کسی عالم کی رائے سے منتخب کرلیں' اس میں خودرائی نہ کریں' کسی عالم سے پوچھ لیں کہ ہمارے پاس سرمایہ موجود ہے۔ آپ بتلائیے کون مبلغ اس کام کے لائق ہے۔ آپ تجویز کردیجئے۔ ہم خود اس کا خرچ دیں گے۔ یہ صورت بہت اچھی ہے جس پر رؤساء بلاواسطہ کسی انجمن وغیرہ کے خود بھی عمل کرسکتے ہیں۔ پھر کسی انجمن یا کسی مولوی لیڈر کو گالیاں بھی نہ دے سکیں گے مگر سب سے زیادہ اہم یہ ہے کہ جن سے یہ کام لیا جاوے وہ اس کے اہل ہوں' ایسوں کو خدمت دین کی سپرد نہ کرو۔ جن سے اصلاح کی توقع نہیں۔ دوسرے کو جو ہدایت کرے گا پہلے وہ خود بھی تو متبع شریعت ہونا چاہیے۔

الٰہی توبہ الٰہی توبہ کل ہی دہلی میں مغرب کے وقت کسی انجمن کی طرف سے ایک صاحب فخر المساجد میں آئے۔ انہوں نے کچھ کہنا چاہا۔ صاحبو! ذرا ٹھہر جانا مجھے دو ایک بات سنانی ہے۔ لوگ کچھ جانے لگے' بعض نماز پڑھ رہے تھے آپ تقریر کے لئے آگے بڑھے بھلے مانس نے یہ بھی خیال نہ کیا کہ اس سے نمازیوں کا دل بٹے گا۔ بعض آدمیوں نے روک دیا کہ یہاں سب مسافر ہیں کچھ ملنے ملانے کا نہیں' نماز پڑھنے دو۔ خیر وہ ذرا رک کے پھر جوش اٹھا اور مصلے کے پاس کھڑے ہوگئے پھر روکا گیا۔ غرض دو تین دفعہ ایسے ہی کیا۔ آخر میں ناخوش ہوکر طعن سے کہتے ہیں۔ افسوس میں تو اب تک سمجھتا تھا کہ مغرب کی نماز کی تین رکعتیں ہیں۔ اب معلوم ہوا کہ بارہ رکعت ہیں۔ مطلب یہ کہ اتنی لانبی پڑھی جارہی ہے کہ مجھ کو تقریر کا وقت ہی نہیں ملتا۔ غرض اس نے بہت ہی چاہا۔ تقریر کرنے کو مگر ایک نہ چلی اور خیر سے آپ کا لباس بھی شریعت کے موافق نہیں تھا۔ کوٹ پتلون پہنے ہوئے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اس کی تحریک کیلئے آئے تھے کہ ہندوؤں سے کوئی چیز نہ خریدی جائے اور علماء کا حکم تھا کہ اس کی تبلیغ کریں۔ سبحان اللہ آپ علماء کے سردار ہیں۔ آپ ہی علماء کو

رائے دینے کیلئے رہ گئے ہیں۔ گویا آپ اعلم العلماء ہیں۔ افسوس آج کل زعماء اسلام ایسے لوگ رہ گئے جن کو نہ شریعت کی خبر' نہ حلال وحرام کی پرواہ' نہ لباس شرع کے موافق' نہ وضع مسلمانوں کی سی ایسی حالت میں کیا کامیابی ہو۔ بس وہی حالت ہے۔

گربہ میر وسگ وزیر وموش را دیوان کنند — ایں چنیں ارکان دولت ملک را ویران کنند

بلی امیر، کتا وزیر اور چوہا دیوان مقرر ہو، جب ایسے ارکان سلطنت ہوں تو ملک کو کیوں نہ ویران کریں گے۔

نماز تک نہیں پڑھتے اور عمائد اسلام بنے ہوئے ہیں۔ صاحبو! اسلام کی خدمت کے قاعدہ سے کرو اور اس وقت تبلیغ اسلام کی سخت حاجت ہے اس کے لئے اٹھ کھڑے ہو۔ اس کے آداب میں نے بتلا دیئے ہیں۔ اب پھر مکرر عرض کرتا ہوں کہ مبلغین کی خرچ میں مدد کرو مگر اپنے انتخاب سے کسی کو مبلغ مت بناؤ۔ نہ اپنی رائے سے کام تجویز کرو۔ علماء سے پوچھو کہ ہمیں کیا کام کرنا چاہیے اور اس کا کیا طریق ہے تو علماء سے یہ کام لو۔ باقی روپیہ جمع کرنے کی مولویوں سے درخواست کرو کہ وہ بھیک مانگ کر تمہیں لا کر دیں۔

اب تو میں علماء کو رائے دیتا ہوں کہ ترغیب چندہ بھی نہ کریں۔ چندہ ہی کی بدولت علماء عوام کی نظروں میں ذلیل وخوار ہوتے جاتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ چونکہ اس وقت ترغیب اسلام کی سخت ضرورت ہے۔ اس لئے لازم ہے کہ اس میں سب حصہ لیں اور اسلام کی خوبیاں بیان کر کر کے لوگوں کو اسلام سے مانوس کریں۔ باقی لڑائی جھگڑے سے اکثر وحشت بڑھتی ہے۔ اس کو ترک کریں۔

ترجمہ وتفسیر آیت:

اب میں ترجمہ پر بیان کو ختم کرتا ہوں۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں: **الیوم یئس الذین کفروا من دینکم فلا تخشوھم واخشون** کہ آج کے دن کفار تمہارے دین سے مایوس ہوگئے یعنی اس بات سے کہ اس کو مٹائیں یا اس پر غالب آ جائیں۔ یہاں بدل اشتمال محذوف ہے ای **الیوم یئس الذین کفروا من دینکم ان یغلبوہ یا ان یمحقوہ** کے' اور وہ کیوں مایوس ہوئے؟ **لکثرۃ شیوعہ ولنصرتہ تعالیٰ** یعنی **بحمداللہ** اس وقت اسلام اس قدر پھیل بھی گیا ہے کہ ملت اسلامیہ میں اب مٹ نہیں سکتا اور نیز اللہ تعالیٰ نے وعدہ بھی فرمالیا ہے کہ یہ قیامت تک قائم رہے گا۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ آپ نے چند دعائیں کی تھیں کہ میری امت ہلاک نہ ہو یہ دعا قبول ہوگئی۔ دوسری یہ دعاء کی تھی کہ اس پر قحط مہلک نہ ہو یہ بھی دعاء قبول ہوئی۔ تو اس میں وعدہ ہوگیا

قیامت تک بقاءِ دین کا۔ تیسرے یہ کہ میری امت میں نااتفاقی نہ ہو یہ قبول نہ ہوئی تو فرماتے ہیں کہ آج کے دن کفار مایوس ہو گئے تمہارے دین سے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حدیث میں ہے کہ وہ دن حجۃ الوداع کا تھا یعنی نویں تاریخ ذی الحجہ کو عرفہ کے میدان میں جمعہ کے روز نازل ہوئی وقت بھی عصر کا تھا۔ تو گویا جب یہ آیت نازل ہوئی وہ وقت تقریباً سال کا بھی آخر تھا' ہفتہ کا بھی آخر تھا' دن کا بھی آخر تھا' حضورؐ کی عمر شریف کا بھی آخر تھا' کیونکہ حجۃ الوداع کے بعد محرم' صفر اور ربیع الاول کی چند تاریخوں تک آپ زندہ رہے۔

کسی یہودی نے حضرت عمرؓ سے کہا تھا کہ اگر یہ آیت ہم پر نازل ہوتی تو ہم اس دن کو عید مناتے۔ پہلے یہ مرض یہودیوں میں تھا۔ اب مسلمان میں بھی یہ مرض ہو گیا ہے کہ ہر بات کی یادگار میں عید کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے معلوم ہے کہ یہ آیت کہاں نازل ہوئی اور کس جگہ نازل ہوئی یعنی عرفات میں حجۃ الوداع میں جمعہ کے روز نازل ہوئی ہے۔ مطلب یہ تھا کہ جہاں یہ آیت نازل ہوئی ہے وہ مقام ہمیشہ سے من جانب اللہ جائے عید ہے' اور جس وقت نازل ہوئی ہے وہ زمانہ بھی من جانب اللہ عید کا ہے۔ ہمیں اور عید کی ضرورت نہیں۔ بس یہی عید کافی ہے یہ تو حقیقت تھی جو حضرت عمرؓ نے ظاہر فرما دی۔ مگر اب مسلمانوں میں ایک یہ رسم پیدا ہو گئی ہے کہ وہ یہود کی طرح ہر بات کی عید اور ہر چیز کی ایک یادگار بنانا چاہتے ہیں۔ یاد رکھو یہ ابتداع فی الدین ہے۔ جن ایام کو شریعت نے عید بنا دیا ہے ان کے علاوہ کسی دن کو عید بنانا حرام و بدعت ہے۔ اور پہلے تو صرف یادگار کا یہی طریقہ تھا کہ اس دن کو عید بناتے تھے حتیٰ کہ کسی کے مرنے کے دن کو بھی عرس کا دن بناتے تھے۔ اور اب اس کے علاوہ ایک اور نئی ایجاد ہوئی ہے کہ یادگار کے لئے ہڑتال کر دیتے ہیں۔ نہ معلوم یہ ہڑتال کیسا نام ہے' ہڑتال سے تو بال صاف کئے جاتے ہیں ہڑتال تو ان کی' اور سر مُنڈتا ہے غریبوں اور مزدوروں کا کہ وہ بیچارے اس دن کھائیں کہاں سے کمائیں کیسے۔ کیونکہ اس دن بازار اور تمام کاروبار بند ہو جاتا ہے۔ جس سے غریبوں اور مزدوروں کو بیحد تکلیف ہوتی ہے مگر ان کو اس کی ذرا پرواہ نہیں۔

یہ رسم بھی بعض کفار ہی سے لی ہے۔ نہ معلوم مسلمانوں میں اتباع طریقہ کفار کا اتنا شوق کیوں پیدا ہو گیا۔ اپنے بزرگوں کی حالت نہیں دیکھتے کہ وہ کیا کر گئے ہیں' اور یہ جو میں نے کہا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی اس وقت سال کا آخر تھا' ہفتہ کا آخر تھا' دن کا بھی آخر تھا' حضورؐ کی عمر کا بھی آخر تھا۔ ان سب چیزوں کا آخر تھا۔ اس کے متعلق یک بات طالب علموں کے کام کی ہے وہ بھی عرض کرتا ہوں کہ اس آخر سے آخر حقیقی مراد نہیں بلکہ قریب آخر کے مراد ہے۔ چنانچہ سال بھی

قریب آخر کے تھا۔ حضورؐ کی عمر بھی قریب آخر کے تھی، دن بھی قریب آخر کے تھا اور جیسے یہ چیزیں قریب آخر کے تھیں۔ اسی طرح اس آیت کو بھی جو آخر آیات کہا جاتا ہے وہ بھی قریب آخر کے ہے آخر حقیقی نہیں۔ چنانچہ اس کے بعد **فمن اضطر فی مخمصة غیر متجانف لاثم فان اللہ غفور رحیم** نازل ہوئی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ پس جو شخص شدت کی بھوک میں بے تاب ہو جائے۔ بشرطیکہ کسی گناہ کی طرف اس کا میلان نہ ہو تو یقیناً اللہ تعالیٰ معاف کرنے والے رحم کرنے والے ہیں۔ تو ان سب میں آخر حقیقی مراد نہیں ہے بلکہ قریب آخر مراد ہے۔ اور مجھے اس سے ایک فائدہ نکالنا مقصود ہے وہ یہ کہ یہاں پر ایک اشکال ہے وہ یہ کہ جب دین کامل اور تام ہو چکا تو پھر یہ حکم اضطرار اور مخمصہ کا، اس کے بعد کیسا اور اس کا یہ جواب نہیں دیا جا سکتا ہے کہ احکام کے بارے میں جو آیتیں نازل ہوئی ہیں ان میں یہ آخر ہے اس کے بعد کوئی اور حکم نازل نہیں ہوا۔ کیونکہ **فمن اضطر فی مخمصة** (جو شخص شدت بھوک سے بے تاب ہو جائے) الآیہ تو احکام ہی میں سے ہے اور یہ **الیوم اکملت لکم دینکم** (آج کے دن میں نے تم پر اپنا دین مکمل کر دیا) الآیہ کے بعد میں نازل ہوا ہے۔ تو پھر آخر کہاں ہوا پس جواب صحیح وہی ہے جو میں نے کہا ہے کہ آخر سے مراد قریب آخر ہے اس پر کوئی خدشہ نہیں وارد ہوتا۔ مشکل یہ ہے کہ لوگ قرآن کو اصطلاحات منطقیہ پر اتارتے ہیں، محاورہ کو نہیں دیکھتے۔ محاورہ میں قریب آخر کو بھی آخر کہا جاتا ہے۔ مثلاً کوئی کسی دوست سے ملنے جاتا ہے تو کہتا ہے اب تمہارے ساتھ میری یہ آخری ملاقات ہے اور اس کے بعد دو گھنٹہ تک بیٹھا رہتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ الیوم سے مراد خاص آج ہی کا دن نہیں جس پر یہ شبہ ہو کہ جب آج اکمال دین ہو گیا تو اس کے بعد کوئی حکم نازل نہ ہونا چاہیے اور آیات احکام میں یہ آخری آیت اور آخر احکام ہونا چاہیے۔ سو یہ شبہ اس لئے وارد نہیں ہوتا کہ الیوم سے مراد خاص آج ہی کا دن نہیں بلکہ الیوم سے مراد زمانہ حاضرہ مع متصل ماقبل و بعد کے ہے اور محاورہ میں اس مجموعہ کو زمانہ حاضرہ ہی کہا جاتا ہے بس کسی حکم کا اس کے بعد نازل ہونا مگر نزول متصلاً باتصال حقیقی جیسا **فمن اضطر** (پس جو شخص بے قرار ہو جائے) متصل ہے یا باتصال عرفی جیسا اگر کسی دوسرے حکم کا نزول اس کے بعد ہو جاوے یہ اکمال بزمانہ حاضرہ کے منافی نہیں۔ الغرض حق تعالیٰ فرماتے ہیں **الیوم یئس الذین کفروا** کہ آج سے کافر مایوس ہو گئے تمہارے دین سے کہ اس کو مٹا دیں یا اس پر غالب آویں جب یہ بات ہے **فلا تخشوھم واخشون** (ان سے مت ڈرو صرف مجھ سے ڈرو) تو تم ان سے ڈرو مت تمہارا کچھ کر نہیں سکتے۔

اگر اسلام سے تم کو محبت ہے تو اس میں پختہ رہو کسی سے مت ڈرو۔

افسوس اب بہت لوگوں کو دعویٰ ہے محبت اسلام کا اور کفار سے ڈر کر ان سے دوستی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر یہ ساتھ نہ ہوں تو ہمارا دین قائم نہیں رہ سکتا اس لئے ان سے مدد لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کا رد فرماتا ہے کہ اب وہ تمہارے دین سے مایوس ہو گئے۔ پھر تم کیوں ڈرتے ہو۔ افسوس کفار تو سمجھ گئے کہ ہم اس دین کو دنیا سے نہیں مٹا سکتے۔ چنانچہ ان کا یاس اس سمجھنے کی دلیل ہے اور مسلمان نہیں سمجھتے۔ پس ارشاد ہے **فلاتخشوھم واخشون** تو تم ان سے مت ڈرو۔ مجھ سے ڈرو یعنی ان کی خوشامد میں شریعت کے خلاف نہ کرو دین کو تباہ مت کرو کوئی اس دین کو مٹا ہی نہیں سکتا۔ اسلام تو وہ چیز ہے کہ۔

چراغے را کہ ایزد بر فروزد
ہر آنکس تف زند ریشش بسوزد

جس چراغ کو اللہ تعالیٰ روشن کریں جو شخص اس میں پھونک مارے گا اسکی ڈاڑھی جل جائے گی۔

کیا یہ اسلام کا معجزہ نہیں کہ فتنہ تاتار میں چنگیز خان نے اپنے نزدیک اسلام کو فنا کر دیا تھا کیونکہ خلافت کی جڑ اکھاڑ دی تھی۔ مگر یہ اس کی حماقت تھی کہ خلافت کے مٹانے کو اسلام کا مٹانا سمجھا۔ آخر خلافت کیا ہے وہ تو اسلام کی ایک شاخ ہے۔ خدانخواستہ خلافت کے مٹ جانے سے اسلام نہیں مٹ سکتا۔ بلکہ کبھی پیڑ کی ایک شاخ کٹنے سے ایک اور شاخ نکل آتی ہے جو پہلی شاخ سے اچھی ہوتی ہے۔ خلافت تو فرع ہے اسلام کی۔ اس کے جانے سے کہیں اسلام مٹ سکتا ہے؟ غرض چنگیز خان نے خلافت کی جڑ کاٹ ڈالی تھی مگر خدا نے یہ کیا کہ جنہوں نے اسلام کو مٹانا چاہا تھا' انہیں سے اسلام کی خدمت کرائی۔ چنانچہ وہی اب اسلام کو مخالفین کے حملوں سے بچا رہے ہیں۔ یعنی ترک جو چنگیز خان کی اولاد اور خاندان اور قوم سے ہیں۔ میں نے بعض مورخین سے سنا ہے کہ اس وقت روئے زمین پر کوئی ترک نہیں جو مسلمان نہ ہو۔ اور انہوں نے اتنی بڑی خدمت اسلام کی ہے جس سے لوگوں کو ان کے متعلق گمان ہو گیا خلافت کا کہ وہ خلیفہ ہیں اسی لئے کہتے ہیں۔

چراغے را کہ ایزد بر فروزد
ہر آنکس تف زند ریشش بسوزد

جس چراغ کو خدا روشن کرے وہ گل نہ ہوگا۔ اس کی بیخ کنی کوئی کر ہی نہیں سکتا۔ اور یاد رکھو جس دن یہ ڈوبے گا اس دن سب ڈوب جائیں گے۔ اسلام وہ مذہب نہیں جو دنیا سے تنہا رخصت ہو بلکہ اس کا مٹنا تمام مذاہب اور تمام عالم کا مٹنا ہے اس کی تو وہ شان ہے کہ۔

؎ ہم تو ڈوبیں گے مگر تم کو بھی لے ڈوبیں گے

صاحبو! جس روز اسلام نہ رہے گا اس دن عالم فنا ہو جائے گا' اور راز اس کا یہ ہے کہ اگر کسی شہر میں سب باغی نہ ہوں بلکہ مطیع بھی ہوں تو بادشاہ ایک طرف سے اس شہر کو نہیں اڑایا کرتا بلکہ پہلے مطیعین کو وہاں سے الگ کرتا ہے پھر شہر کو اڑاتا ہے تو جب تک شہر میں مطیعین موجود ہیں اس وقت تک اطمینان رہتا ہے کہ یہ شہر ابھی نہیں اڑایا جائے گا اور جس دن مطیعین کو وہاں سے الگ کر لیا جائے پھر بستی کی خیر نہیں کیونکہ اب اس میں سارے باغی ہی باغی ہیں۔ کوئی ایسا نہیں جس کی رعایت سے شہر کو باقی رکھا جائے۔ چنانچہ قرآن میں لوط علیہ السلام کے قصہ میں بھی اسی اصل کا ذکر ہے **لما جاءت رسلنا ابراهيم بالبشرى قالوا انا مهلكوا اهل هذه القرية ان اهلها كانوا ظلمين۔** ابراہیم علیہ السلام سے فرشتوں نے کہا کہ ہم اس بستی کے باشندوں کو ہلاک کرنے والے ہیں۔ کیونکہ وہاں کے باشندے بڑے ظالم و شریر ہیں **قال ان فيها لوطا** ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ ان میں لوط علیہ السلام بھی تو موجود ہیں' اس حالت میں بستی کو کیسے ہلاک کرو گے **قالوا نحن اعلم بمن فيها** فرشتوں نے کہا کہ جو وہاں رہتے ہیں ہم کو سب معلوم ہیں **لننجينه واهله الا امرأته كانت من الغابرين** ہم ان کو اور ان کے خاص متعلقین تبعین کو بچا لیں گے۔ مگر ان کی عورت کو کیونکہ وہ بھی نافرمانوں میں تھی۔ دوسری جگہ اس تجیہ کی صورت فرماتے ہیں **فاخرجنا من كان فيها من المومنين فما وجدنا فيها غير بيت من المسلمين** کہ ہم نے جتنے ایماندار تھے سب کو وہاں سے نکال دیا علیحدہ کر دیا اور مسلمانوں کا بجز ایک گھر کے اور کوئی گھر نہ پایا جب ان کو الگ کر دیا اب قہر خدا نازل ہوا۔ غرض یہ خدا کی رحمت ہے کہ اگر کسی بستی میں ایک مطیع بھی موجود ہو تو وہاں قہر عام نازل نہیں فرماتے یہ ان کی عنایت ہے رحمت ہے۔ جب یہ سمجھ گئے تو اگر دنیا میں ایک اللہ اللہ کہنے والا بھی موجود ہو گا تو حق تعالیٰ عالم کو فنا نہ کریں گے عالم باقی رہے گا۔ اور اگر ایک بھی مسلمان نہ رہے تو پھر اسی دم عالم کو فنا کر دیں گے جب بقائے عالم اور بقائے اہل عالم اسلام پر موقوف ہے تو تمام دنیا کو اس کی خوشامد کرنا چاہیے نہ کہ مسلمان کسی کی خوشامد کریں' اس لئے فرماتے ہیں **فلا تخشوهم واخشون** یعنی کفار کی خوشامد کر کے اور ان سے دوستی بڑھا کر اسلام کو مت کھو بیٹھو۔ ہماری خوشامد کرو ہم سے ڈرو وہ ہیں کیا چیز۔ آگے اس کے بعد فرماتے ہیں **اليوم اكملت لكم دينكم واتممت عليكم نعمتى** الآیۃ اب ہم نے دین کو کامل کر دیا' دین ایسا کامل ہو گیا کہ اس کو دیکھ کر کسی کی ہمت نہ ہو گی اس کے مٹانے کی **واتممت عليكم نعمتى** یعنی تم پر اپنی نعمت پوری کر دی۔ دو اعتبار سے ایک

قوت سے دوسرے قواعد واحکام سے۔ قوت کے اعتبار سے تو اتنا مضبوط کر دیا کہ **الیوم یئس الذین کفروا** اب کفار مایوس ہو گئے ان کے اندر اتنی قوت نہیں جو اس کا مقابلہ کر سکیں۔ سو اب اس کو مٹانے کی ان کو ہمت نہ ہو گی اور قواعد کے اعتبار سے **الیوم اکملت لکم دینکم الآیۃ** یعنی قواعد واحکام کے اعتبار سے اتنا کامل کر دیا کہ قیامت تک کے جتنے احکام ہیں سب اس سے نکل سکتے ہیں کوئی حادثہ ایسا پیش نہ آوے گا جس کا حکم اس میں نہ ملے اگر کوئی کہے پھر اور دلائل کی کیا ضرورت ہے حدیث واجماع امت وقیاس تو یہ بات نہیں۔ حدیث تو خود دین کا جزو ہے اور دینکم میں داخل ہے دینکم کا مقابل نہیں باقی قیاس مظہر ہے مثبت نہیں' وہ احکام قیاسیہ بھی قرآن وحدیث ہی سے ثابت ہیں۔ رہا اجماع امت سو وہ اجماع کسی آیت یا حدیث ہی کے مضمون پر ہوتا ہے تو یہ سب حقیقت میں ایک ہی چیز ہوئے یعنی دین۔ صرف نام الگ الگ ہیں ایک لحاظ سے اسکا نام قرآن ہے اور ایک اعتبار سے حدیث' ایک اعتبار سے اجماع امت' ایک اعتبار سے قیاس۔

عباراتنا شتی وحسنک واحد **وکل الی ذاک الجمال یشیر**
بہر رنگے کہ خواہی جامہ میپوش من از رفتار پایت می شناسم

ہماری عبارتیں مختلف ہیں اور تیرا حسن ایک ہے اور وہ سب تیرے حسن وجمال کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ جس رنگ کا چاہو لباس پہن لو، میں تمہاری رفتار کو پہچانتا ہوں۔

یہ سب ایک ہی چیز ہے کسی وقت کسی رنگ میں ہے کسی وقت کسی لباس میں اسی کی نسبت فرماتے ہیں **الیوم اکملت لکم دینکم** الآیۃ یعنی تمہارے دین کو میں نے کامل کر دیا اور اپنی نعمت پوری کر دی ظاہراً بھی اور باطناً بھی کسی قسم کا نقص کوئی کمی اس میں نہیں رہی **ورضیت لکم الاسلام دیناً** اور پسند کیا میں نے تمہارے لئے دین اسلام کو یہی دین خدا کے نزدیک مرضی اور پسندیدہ ہے یہاں پر ایک شبہ ہوتا ہے وہ یہ کہ رضیت کا عطف ظاہر ہے کہ **اکملت واتممت** پر ہے اور معطوف علیہ مقید ہے الیوم کے ساتھ یعنی اکمال اور اتمام دین اب ہوا۔ تو رضیت معطوف میں بھی وہ قید ہوگی۔ سو معطوف علیہ میں تو کچھ اشکال نہیں کیونکہ وہ واقعی ابھی متحقق ہوا لیکن رضیت میں کیا کہا جاوے گا۔ کیا یہ رضا بالاسلام بھی آج ہی ہوئی کیونکہ عطف کا مطلب تو یہی نکلتا ہے کہ جیسے اکمال واتمام اب ہوا ایسے ہی یہ رضا بالاسلام بھی ابھی ہوئی' حالانکہ اسلام کو ان کیلئے پسند کرنا پہلے سے ہے یہ اشکال ہے اسکا جواب بعض نے تو یہ دیا ہے کہ اکملت پر عطف نہیں بلکہ الیوم پر ہے اب کوئی اشکال نہیں مگر یہ ضعیف توجیہ ہے کیونکہ اس میں متبادر کا ترک لازم آتا ہے۔ محققین کہتے

ہیں کہ اس تکلیف کی ضرورت نہیں کہ الیوم پر عطف ہے۔ بلکہ سہل تفسیر یہ ہے کہ یہاں ایک قید ہے یعنی **رضیت لکم الاسلام دیناً تابیداً** مطلب یہ کہ ہمیشہ کیلئے ہم نے اسی کو پسند کیا ہے یہ دنیا سے کبھی زائل نہ ہوگا کوئی اس کا مٹانے والا نہیں، کوئی اس کا ناسخ نہیں جیسے اور ادیان یکے بعد دیگرے منسوخ ہوتے گئے یہ ایسا نہ ہوگا ہمیشہ رہے گا۔ سو یہ خبر بقاء الی الیوم القیامہ کی تصریحاً آج ہی ارشاد فرمائی گئی اگرچہ ختم نبوت کی خبر سے لزوماً یہ بھی معلوم ہوگیا تھا۔ یہاں شاید کسی کو وہم ہو کہ عیسیٰ علیہ السلام تو آخر زمانہ میں آویں گے اور وہ اپنے خاص احکام جاری کریں گے۔ مثلاً جزیہ کا قانون اٹھا دیں گے جو کہ حکم اسلامی ہے یا خنزیر کی نسل کو مٹا دینے کا حکم فرمادیں گے اور یہ سب ظاہراً نسخ ہے۔ جواب یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اس حیثیت سے نہ آویں گے کہ ان کو اس وقت نئی نبوت یا شریعۃ اسلامیہ کے خلاف کوئی شریعت عطا ہوگی۔ **لا نبی بعدی** (الصحیح لمسلم، الامارۃ: ۴۴) کے یہی معنی ہیں کہ حضورؐ کے بعد کوئی جدید نبوت نہیں۔ یعنی بعد حضور کی وفات کے کسی کو جدید نبوت یا شریعۃ اسلامیہ کے خلاف کوئی شریعت عطا نہ ہوگی۔ یہ مطلب نہیں کہ کوئی پہلے کی نبوت عطا کیا ہوا نبی بھی شریعۃ اسلامیہ کا متبع ہو کر بھی دنیا میں نہ آوے گا۔ عیسیٰ علیہ السلام تو پہلے سے نبی تھے اور شریعۃ اسلامیہ ہی کے تابع ہو کر تشریف لائیں گے ان کا حضورؐ کے بعد آنا اور متبع ہو کر آنا **لا نبی بعدی** کے خلاف نہیں۔ سو وہ آ کر حضورؐ ہی کی شریعت کے موافق عمل کریں گے تو لا نبی کے یہ معنی نہیں کہ کوئی پرانا نبی بھی حضورؐ کے دین کی خدمت کیلئے نہ آوے گا۔

غرض عیسیٰ علیہ السلام نازل بھی ہوں گے اور اس وقت نبی بھی ہوں گے، مگر اعطائے نبوت ان کیلئے پہلے ہو چکی ہے اور آپ نیابت کے طور پر آویں گے نہ کہ مستقل بن کر اور حاکم ہو کر بلکہ حضورؐ کے محکوم ہو کر آویں گے۔

اس میں تو حضورؐ کی اور فضیلت بڑھ گئی کہ نبی بھی حضورؐ کے خادم ہوں گے۔ حدیث میں ہے **لو کان موسیٰ حیا لما وسعہ الا اتباعی** (الأسرار المرفوعۃ: ۸۳، ۲۹۴) کہ اگر موسیٰ علیہ السلام بھی زندہ ہوتے تو وہ سوائے میرے اتباع کے اور کچھ نہ کرتے۔ آپؐ نے یہ نہیں فرمایا لسلبت نبوتہ کہ ان کی نبوت چھن جاتی بلکہ یہ فرماتے ہیں کہ متبع ہو کر رہتے۔ غرض رضیت کے یہ معنی ہوئے کہ ہم نے ہمیشہ کیلئے اسی دین کو پسند کیا ہے پس حدیث میں جو ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نازل ہو کر جزیہ کو موقوف کر دیں گے اور اس وقت دو ہی باتیں رہ جاویں گی یا اسلام لاؤ یا قتال کرو تو وہ نسخ نہیں ہے بلکہ اس وقت کیلئے شریعت محمدیہ کا یہی قانون ہوگا جس کو عیسیٰ علیہ السلام جاری فرمادیں

گے۔ اور بڑے مزہ کا لطیفہ ہے کہ عیسائی لوگ مسئلہ جہاد کے اوپر اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام نے اس مد کو کیوں رکھا۔ میں کہتا ہوں کہ اپنے پیغمبر سے ہی پوچھو وہ عنقریب آنے والے ہیں **فانتظروا انا منتظرون**۔ حضورؐ نے تو پھر بھی تمہاری رعایت کی ہے کہ جزیہ دے کر بچا سکتے ہو۔ عیسیٰ علیہ السلام نے تو اس کی بھی پرواہ نہ کی۔ ان کے عہد میں دو ہی باتیں ہوں گی یا اسلام یا سیفؒ غرض عیسیٰ علیہ السلام حکم اسلامی قدیم کو منسوخ نہ فرماویں گے کہ پہلے جزیہ کا حکم تھا اور آپ اس کو اٹھا دیں گے تا کہ ان کو ناسخ کہا جاوے۔

پھر **رضیت لکم الاسلام دینا** (اور میں نے تمہارے لئے دین اسلام پسند کیا) **تابیدا** پر شبہ کیا جاوے کہ تابید تو جب ہوتی کہ اسلام کا ہر حکم قیامت تک رہتا۔ سو جواب ظاہر ہے کہ اس حکم کو عیسیٰ علیہ السلام نے منسوخ نہیں کیا بلکہ حضورؐ ہی نے منسوخ کیا ہے۔ پس اس حدیث میں کہ **یضع الجزیۃ خبر** بمعنی انشاء ہے۔ یعنی حضورؐ ہی خود یہ حد مقرر کر گئے ہیں کہ اے عیسیٰ جب تم آؤ اس وقت کفار کے ساتھ یہ معاملہ برتنا۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ طبیب نے کسی مریض کو مسہل دیا اور اس سے کہہ دیا کہ مسہل لینے کے بعد یہ ٹھنڈائی پئے گا تو اب مریض جو ٹھنڈائی پیتا ہے یہ اس کی ایجاد نہیں بلکہ طبیب ہی کا کہنا پورا کرتا ہے طبیب ہی نے بتلا دیا تھا کہ تین روز کے بعد تبرید تجویز ہوگی۔ اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام کو حکم ہے کہ اس وقت آپ جزیہ کو موقوف کر دیں۔ عیسیٰ علیہ السلام اپنی طرف سے ایجاد نہیں کریں گے۔ بلکہ آپؐ ہی کے فرمان کو بجا لاویں گے غرض **ان الدین عنداللہ الاسلام** (خدا کے نزدیک دین پسندیدہ اسلام ہی ہے) اور **رضیت لکم الاسلام دیناً** کے معنی یہ ہیں کہ ہمیشہ یہی دین رہے گا۔ آگے ایک نکتہ ہے اہل علم کیلئے وہ یہ کہ **فمن اضطر فی مخمصۃ** (جو شخص بھوک سے بے قرار ہو جائے) **الآیۃ** یہ حکم یہاں بظاہر بے جوڑ معلوم ہوتا ہے۔ ماقبل کے ساتھ اس آیت کا ربط نہیں معلوم ہوتا کہ یا تو اوپر تکمیل اسلام کی بشارت دی جا رہی ہے یا اب **فمن اضطر فی مخمصۃ** کا حکم نازل فرما دیا اور پھر اس مضمون کو فاء کے ساتھ لائے جو ترتیب کیلئے آتا ہے تو بعض نے تو اس اشکال سے گھبرا کر یہ کہہ دیا کہ فاء ترتیب ذکری کیلئے ہے۔ ترتیب حکمی کیلئے نہیں۔ لہٰذا حکم کا مرتب ہونا اور مسلسل ہونا ضروری نہیں۔ مگر **الحمدللہ** میری سمجھ میں آ گیا ہے کہ یہاں پر فاء ترتیب حکمی ہی کیلئے ہے اور پھر بھی اشکال نہیں چنانچہ عنقریب مذکور ہوگا۔ باقی جن لوگوں نے فا کو ترتیب ذکری کیلئے قرار دیا ہے ان پر ایک اشکال پھر بھی باقی رہتا ہے وہ یہ کہ اس مضمون کو ماقبل سے کیا جوڑ ہوا اس بے ربطی کا کیا جواب ہے۔ انہوں نے اس کا بھی ایک جواب دیا ہے وہ یہ

کہ **الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا** (آج کے دن تمہارے لئے تمہارے دین کو میں نے کامل کر دیا اور تم پر میں نے اپنا انعام تمام کر دیا اور میں نے اسلام کو تمہارا دین بننے کیلئے پسند کیا) یہ بیچ میں آ گیا ہے **فمن اضطر فی مخمصة** (پس جو شخص شدت بھوک میں بے تاب ہو جائے) کا ربط اس کے ماقبل سے ہے کہ اول میں حلال وحرام چیزوں کا ذکر تھا **حرمت علیکم المیتة والدم ولحم الخنزیر وما اھل لغیر اللہ بہ والمنخنقة والموقوذة والمتردیة والنطیحة وما اکل السبع الا ما ذکیتم وما ذبح علی النصب وان تستقسموا بالازلام ذلکم فسق** (تم پر حرام کئے گئے ہیں مردار اور خون اور خنزیر کا گوشت اور جو جانور غیر اللہ کے نام نامزد کر دیا گیا ہو اور جو گلا گھٹنے سے مر جائے اور جو اونچے سے گر کر مر جائے اور جو کسی ٹکر سے مر جائے اور جس کو کوئی درندہ کھانے لگے لیکن جس کو ذبح کر ڈالو اور جو جانور پرستش گاہوں پر ذبح کیا جائے اور یہ کہ تقسیم کرو بذریعہ قرعہ کے تیروں کو۔ یہ سب گناہ ہیں۔) یہ احکام حق تعالیٰ نے پہلے ذکر فرمائے ہیں۔ ان احکام کے ساتھ **فمن اضطر فی مخمصة** (جو شخص بھوک سے بے قرار ہو جائے) الخ مرتبط ہے کہ یہ چیزیں جو ہم نے بیان کی ہیں یہ ہیں تو حرام مگر مضطر کیلئے جائز ہیں اور **الیوم اکملت لکم** بیچ میں جملہ معترضہ ہے اور جملہ معترضہ کو بھی اول سے کچھ مناسبت ہوتی ہے وہ مناسبت یہ ہے کہ دیکھو اسلام میں کیسے کیسے قواعد ہیں اور چونکہ خداتعالیٰ کو اسلام کا اکمال مقصود ہے۔ اس لیے دیکھو اللہ میاں نے سارے ضروری احکام بتلا دیئے تاکہ کسی طرح کمی نہ رہ جاوے۔ یہ تو مشہور جواب ہے۔ اور میں کہتا ہوں کہ اگر فاؤ ترتیب حکمی ہی کیلئے ہو پھر بھی کچھ اشکال نہیں اور جو اشکال کیا گیا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ **فمن اضطر فی مخمصة غیر متجانف لاثم** (پس جو شخص بھوک سے بے قرار ہو جائے بشرطیکہ کسی گناہ کی طرف اس کا میلان نہ ہو) کا ترتب **الیوم اکملت لکم دینکم** الخ (آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو کامل کر دیا) پر ہو سکتا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ حق تعالے فرماتے ہیں ہم نے تمہارے دین کو مکمل کیا اور تم پر اپنی نعمت کو پورا کیا اور تمہارے لیے اس دین کو ہمیشہ کیلئے پسند کیا۔ آگے ارشاد ہے **فمن اضطر فی مخمصة** (جو شخص بھوک سے بے قرار ہو جائے) الخ یعنی ہم اتنے کامل النعمة ہیں اور تم سے اتنے خوش ہیں اور ہماری اس قدر تم پر رحمت ہے بعض حالات میں تمہاری راحت وسہولت ومصلحت کیلئے حرام کو بھی حلال کر دیتے ہیں۔ اس پر فاء کا ترتب نہایت لطیف اور چسپاں ہو گیا۔ اور اس میں ایک اور لطیفہ بھی ہو گیا وہ یہ کہ اس میں اشارہ

ہے۔ **سبقت رحمتی علی غضبی** (مسند الحمیدی۔ ۱۱۲۶) (میری رحمت میرے غضب پر غالب آ گئی) کی طرف۔ چنانچہ آیت کو ختم بھی رحمت پر کیا ہے یعنی غفور رحیم پر، گویا اشارہ ہے اس طرف کہ اے بندو ہمارے احکام کو تنگ مت سمجھو، احکام میں کوئی تنگی نہیں ہے جہاں تنگی کا وہم ہے جیسے تحریم محرمات وہاں بھی رحم کی رعایت ہوتی ہے۔ بخدا میں دعوٰی سے کہتا ہوں کہ دین میں ونی تنگی اور حرج نہیں ہے۔ میرا ایک وعظ ہے نفی الحرج وہ چھپ گیا ہے اس میں ثابت کر دیا گیا ہے کہ دین میں تنگی بالکل نہیں ہے۔ کسی قسم کی رکاوٹ اس میں نہیں ہے۔ اُس کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ واقعی دین میں کوئی تنگی نہیں ہے۔ اب ایک اشکال وارد ہوتا ہے اس کا جواب دے کر بیان کو ختم کرتا ہوں وہ یہ کہ میں نے تو کہا تھا کہ اللہ تعالے نے رحمت پر اپنے کلام کو ختم فرمایا ہے۔ چنانچہ تکمیل دین کے مضمون کو اس پر ختم کیا ہے کہ ہماری اتنی رحمت ہے کہ کبھی حرام کو بھی حلال کر دیتے ہیں اور غفور رحیم میں رحمت کی تصریح فرمادی مگر یہ ثابت ہے کہ سب سے آخر آیت قرآن کی یہ ہے **واتقوا یوما ترجعون فیه الی الله ثم توفی کل نفس ما کسبت وھم لایظلمون** یعنی ڈرو تم اس دن سے جس روز تم اللہ تعالیٰ کے پیشی میں لائے جاؤ گے، پھر ہر شخص کو اپنے کئے ہوئے کا پورا پورا بدلہ ملے گا اور اُن پر کسی قسم کا ظلم نہ ہوگا اور اس میں ظاہر ہے کہ وعید کا مضمون ہے سو اس سے تو ثابت ہوا کہ اللہ تعالے نے اپنے کلام کو وعید پر ختم کیا ہے۔

اور یہاں کلام کو وعید پر ختم کرنے کی ایک وجہ بھی علماء نے لکھی ہے کہ جو کلام آخر میں ہوتا ہے وہی نقش دل رہتا ہے اور اس کا اثر قلوب پر زیادہ رہتا ہے تو اس نقل میں اور میرے قول میں تعارض ہوگیا کیونکہ میں نے تو لکھا تھا کہ مضمون رحمت پر کلام ختم ہوا ہے اور اس نقل سے معلوم ہوا وعید پر ختم ہوا ہے۔ سو رفع اس تعارض کا یہ ہے کہ کلام تو رحمت ہی پر ختم ہوا ہے مگر اس مصلحت سے کہ کہیں رحمت پر نظر کر کے کوئی بالکل بے پروائی نہ کرنے لگے ذرا سی دھمکی بھی دے دی مطلب یہ ہے کہ ہمارے احکام میں تو بالکل تنگی نہیں، بہت آسان احکام ہیں لیکن اگر سہل سہل احکام پر بھی عمل نہ کرو گے تو تمہاری کم بختی آوے گی یہ تھی تو تم پر رحمت کی کہ بالکل ہلکے ہلکے احکام نازل کئے پھر اگر اس میں بھی کاہلی برتو گے تو بس جان تباہی میں آجائے گی تو یہ آیت ہماری تقریر کے مخالف نہ ہوئی بلکہ اس سے رحمت کی اور تائید ہوگئی اس کی ایسی مثال ہے کہ بچہ کو سبق آسان بتلا دیا اور اس کی یاد کی بھی آسان صورت بتلا دی پھر اگر اس میں بھی وہ شوخی اور سستی کرے تو اس کے کان کھینچ لے، تاکہ اس ڈر کے مارے سبق جلدی یاد کر لے اور پھر دس روپیہ انعام کے دے دے۔ اس صورت میں سبق

تو اسکا بالکل آسان تھا مگر وہ لاپروائی سے یاد نہیں کرتا اس لئے تنبیہاً اس کے کان کھینچ لئے تا کہ اس کو یاد کرے تو یہ گوشمالی بھی رحمت ہی کا اثر ہے۔ بہرحال تعارض نہ رہا۔ اب میں ختم کرتا ہوں۔

حاصل آیت

خلاصہ اس آیت کا یہ ہوا کہ اللہ تعالٰے نے اس آیت میں نعمت اسلام کا کامل اور تام ہونا ذکر فرمایا ہے تا کہ اس نعمت پر متنبہ ہو کر اُس کا شکر بجالاویں اور شکر یہ ہے کہ اُس کے فضائل و برکات خود بھی حاصل کریں اور دوسروں کو بھی اس سے بہرہ ور کریں۔ دوسروں کے سامنے بھی اس کے فضائل و برکات بیان کریں، تبلیغ کریں اور دوسروں کی بھی اصلاح کریں، اُن کو ترغیب دیں ادھر متوجہ کریں'' قرآن میں جہاں نماز، روزہ، زکوٰۃ کا حکم ہے وہاں امر بالمعروف کا بھی حکم ہے اس لیے امر بالمعروف بھی کریں مگر خوبصورتی کے ساتھ، کسی سے لڑے بھڑے نہیں اور جیسے نماز باوجود فرض ہونے کے کبھی کبھی کسی عذر کے ساقط ہو جاتی ہے جیسے حائض سے نماز ساقط ہو جاتی ہے اسی طرح یہاں بھی اعذار و قیود ہیں۔ اسی لئے میں نے کہا ہے کہ جو کچھ کرو علماء سے پوچھ کر کرو۔ وہ ہر ایک کے مناسب کام بتاویں گے، کسی کے تصنیف کا کام سپرد کر دیں گے۔ کسی کو زبانی تبلیغ و اشاعت کیلئے تجویز کریں گے۔ کسی کو مالی امداد کا مشورہ دیں گے۔ کسی کو دعا کا حکم کریں گے کہ تم دعاء ہی کرتے رہو، اور دعا کا کام تو سب ہی کر سکتے ہیں اور کام کرنے والے بھی اس میں شریک رہیں، اب دُعا کیجئے کہ خداوند کریم فہم سلیم عطا فرما دیں اور ہم کو ظاہری و باطنی اصلاح کی توفیق بخشیں۔ آمین

الاتمام لنعمۃ الاسلام

(۲)

یہ وعظ حاجی کرم الٰہی صاحب کے مکان پر نظامت نارنول ریاست پٹیالہ میں ۲۲ رشوال ۱۳۴۱ھ بروز جمعہ صبح کے وقت ساڑھے تین گھنٹے تک بیٹھ کر ارشاد فرمایا۔

مرد سامعین کی تعداد ڈیڑھ ہزار تھی، مستورات اس کے علاوہ تھیں۔

مولوی اطہر علی صاحب سلہٹیؒ نے اسے قلمبند فرمایا۔

> جو شخص اپنے سر پر ایسے مالک کو مانے گا جو ہر طرح سے کامل ہے۔ اس کا ثمرہ خاص یہ ہوگا کہ اس کے دل میں خدا تعالیٰ کی ہیبت وعظمت ہوگی۔ کیونکہ بادشاہ جتنا کامل ہوگا اتنی ہی محبت وہیبت زیادہ ہوگئی ہے۔ پھر حق تعالیٰ ایسے جمیل ہیں کہ کوئی ان کے جمال کے قریب بھی نہیں
>
> (از حضرت حکیم الامت)

خطبہ

اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطن الرجیم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی

و رضیت لکم الاسلام دینا۔

ترجمہ۔ آج کے دن تمہارے لئے تمہارے دین کو میں نے کامل کر دیا اور میں نے تم پر اپنا انعام تام کر دیا اور میں نے اسلام کو تمہارا دین بننے کیلئے پسند کر لیا۔

تمہید۔ یہ ایک لمبی آیت کا ٹکڑا ہے، اس کے متعلق ریواڑی میں کچھ بیان ہو گیا تھا، آج پھر اسی کا اعادہ اس وجہ سے کیا گیا کہ اس کے متعلق کچھ تفصیل کی حاجت تھی، وہاں اس کے بیان کی نوبت نہیں آئی تھی۔ اس لیے اب اس کی کچھ تفصیل کی جائے گی۔ ہر چند کے وہ تفصیل بھی پوری مفصل نہیں مگر اس اجمال کے مقابلہ میں ضرور تفصیل ہے۔

پسندیدہ نعمت:

اس اجمال کا حاصل یہ تھا کہ حق تعالیٰ نے اس آیت میں ایک بڑی نعمت کا ذکر فرمایا ہے۔ اور وہ نعمت اسلام ہے۔ حق تعالیٰ نے ہم کو اس کے کامل ہونے کی بشارت دے دی ہے، اور اس کو پسند کرنے کی خبر دی ہے۔ تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ بہت ہی بڑی نعمت ہے اس سے خدا تعالیٰ کی رضا حاصل ہوتی ہے اور بڑی نعمت مسلمانوں کے لیے حق تعالیٰ کی رضا ہی ہے تو حق تعالیٰ نے اسلام کو ہمارے لیے پسند بھی کیا اور اس کو کامل بھی کر دیا۔ یعنی وہ نعمت اپنی ذات میں بھی کامل ہے اور صفت میں بھی۔ جب اس کو پسند بھی فرمایا ہے تو اس سے بڑھ کر اور کیا نعمت ہوگی؟ دیکھیے اگر کوئی چیز فی نفسہ مکمل ہو اور بادشاہ کو پسند نہ ہو تو وہ کچھ بھی کمال نہیں سمجھا جاتا۔ کیوں کہ جب بادشاہ ہی اس سے راضی نہیں ہے تو پھر اس کمال سے کیا فائدہ؟ اور اگر وہ فی نفسہ کامل بھی نہ ہو مگر بادشاہ کو پسند ہے تو کافی ہے اور اگر وہ چیز فی نفسہ بھی کامل ہو اور بادشاہ کو بھی پسند ہو، تو پھر کیا کہنا؟ یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے' نور علی نور ہے۔ تو اسلام ایسی نعمت ہے کہ حق تعالیٰ نے اس کو پسند کیا ہے اور کامل بھی کیا ہے تو اس کا اثر یہ ہوگا کہ جس شخص کے پاس یہ دولت ہوگی اس سے وہ راضی بھی ہوگا تو یہ بہت بڑی نعمت ہوئی کہ اپنی

ذات میں بھی کامل ہے اس کے ساتھ اس سے خوشنودی حق بھی حاصل ہے۔ خوب سمجھ لو۔

اقسام نعمت:

اب ایک دوسری طرح سمجھو کہ نعمت دو قسم کی ہوتی ہے اور اس کو میں اس لئے بیان کرتا ہوں تاکہ معلوم ہو جائے کہ وہ کتنی بڑی نعمت ہے اور یہ اندازہ ہو جائے کہ اسلام کتنی عظیم الشان نعمت ہے اور ہم اس کا کیا حق ادا کرتے ہیں اور ہم کو کیا کرنا چاہئے تھا' غرض نعمتیں دو قسم کی ہوتی ہیں، ایک دنیا کی نعمتیں جیسے کھانا، پینا، مال وجاہ و اولاد، مکان، زمین جائیداد وغیرہ۔ یعنی وہ نعمتیں کہ دنیا میں ان کا نفع حاصل ہوتا ہے اور ان کی راحت محدود ہے اور ایک آخرت کی نعمتیں یعنی وہ نعمتیں کہ ان کے منافع آخرت میں حاصل ہوتے ہیں اور ان کا نفع کبھی زائل نہیں ہوگا۔ کیونکہ وہ نعمتیں باقی اور دائمی ہیں' جیسے جنت کا ملنا، حور وغلمان کا ملنا، جنت میں باغ کا ملنا اور طرح طرح کی راحت اور لذت ملنا، کسی قسم کا غم نہ ہونا، دنیا میں خواہ کتنی ہی بڑی خوشی ہو اس کے ساتھ کچھ نہ کچھ رنج ضرور ہوتا ہے۔ راحت کے ساتھ کلفت ملی ہوتی ہے' مگر آخرت میں کوئی غم کسی قسم کا رنج پاس نہ پھٹکے گا اور دنیا کی نعمتیں تو دو چار روز کے بعد زائل ہو ہی جاتی ہیں کوئی نہ کوئی نقصان اس میں ضرور آ ہی جاتا ہے مگر نعمائے اخروی ابد الآباد کیلئے ہیں یعنی ختم نہ ہوں گی، غرض نعمت کی دو قسمیں ہیں ایک دینوی ایک اخروی دنیا کی نعمت تو کبھی ختم ہو جائے گی اور کوئی نعمت کلفت سے خالی بھی نہیں ہے' کچھ نہ کچھ کلفت سب کے اندر ہے۔ دیکھئے کھانا ایک نعمت ہے' اسمیں کتنی محنت ہے پھر یہ محنتیں بھی دو قسم کی ہیں ایک وہ جو قبل کھانیکے ہیں جیسے اول زمین کھودی جائے پھر اس کو ہموار کیا جائے دھوپ کے محتاج ہیں، بارش کی ضرورت ہے اگر بارش نہ ہو تو کنویں سے سینچائی کیجائے' پھر ہل چلانا' اس کے واسطے بیل کی ضرورت ہے پھر بیلوں کے رہنے کو ایک مکان چاہئے، اس مکان کی درستی کا بھی خیال رکھنا۔ پھر ان کے چرانے کیلئے ایک آدمی ساتھ رہے، خواہ دھوپ ہو یا بارش ہو، سب چرانے والے کے سر پر کبھی بیل نہیں ہوتا تو خریدنا پڑتا ہے اسمیں کبھی روپیہ پاس نہیں ہوتا قرض لینا پڑتا ہے پھر کبھی بیل مر بھی جاتا ہے تو صدمہ اور زیادہ ہوتا ہے، ایک تو بیل کا صدمہ پھر قرض کا بار زمین درست کرکے تخم ڈالا کبھی دانہ نہیں اگتا۔ پھر دوبارہ ڈالنا پڑتا ہے۔ اور اگر دانہ جم گیا تو اس کی حفاظت کیواسطے ایک آدمی چاہئے، اور جو آدمی نہوا تو خود زمیندار کو اپنا مکان چھوڑ کر جنگل میں رہنا پڑتا ہے۔ پھر اس مصیبت سے جب کبھی کھیت قابل کٹنے کے ہوئے تو دفعۃً اولا گر کر ساری کھیتی خراب ہوگئی تو بے حد صدمہ ہوتا ہے۔ یہ کلفتیں تو کھیتی سے پہلے کی ہیں پھر کھانیکے ساتھ کلفتیں یہ ہیں

کہ کبھی مرچ زیادہ ہوگئی تو تکلیف ہو رہی ہے کبھی نمک زیادہ ہوگیا تو کھایا نہ گیا۔ کبھی کچا رہ گیا تو لطف نہیں آتا۔ کبھی جل گیا تو بے لطفی رہی کبھی گرم گرم لقمہ منہ میں ڈالا تو منہ جل گیا، کبھی گلے میں اٹک گیا پھر تو جان پر نوبت آجاتی ہے اور پھر کھانے کے بعد یہ کلفتیں ہیں کبھی ایک دو لقمہ زیادہ کھالیا تو گرانی ہوگئی کبھی قبض ہوجاتا ہے، کبھی دست آنے لگتے ہیں، ہیضہ ہوجاتا ہے کبھی قے ہوجاتی ہے کبھی اور کوئی مرض ہوتا ہے اب حکیم کو بلاؤ ڈاکٹر کو بلاؤ اب کہیں نسخہ پیا جارہا ہے کہیں چورن کھایا جارہا ہے، دیکھئے اتنی کلفتیں بھگتنے کے بعد تب کہیں دو لقمے ملتے ہیں اسی طرح ہر نعمت کے ساتھ کچھ نہ کچھ کلفتیں ضرور ہیں بخلاف نعمت اخروی کے کہ جب وہ ملیگی پھر کبھی ختم نہ ہوگی۔ بلکہ ہمیشہ رہیگی، پھر اسمیں کوئی رنج نہیں، کوئی کلفت ومشقت نہیں ابتداء سے انتہا تک خوشی ہی خوشی ہے، ابتداء دخول جنت سے تو یہ برتاؤ ہوگا۔ **وسیق الذین اتقوا ربھم الی الجنۃ زمراً حتیٰ اذا جاؤھا وفتحت ابوابھا** جب جنت کے پاس پہونچیں گے، اور دروازہ کھولدیا جاویگا۔ یہ گویا ابتداء ہوگی اس نعمت کے عطا ہونے کی۔ گویا ابتداء عطائے نعمت کی یہ ہوئی کہ فرشتہ کے ذریعے سے حکم ہوگا کہ داخل ہوجائے جنت کے اندر اور داخلہ اس طرح ہوگا کہ ان کے جاتے ہی دروازہ کھول دیا جائے گا۔ اس وقت ایک خاص فرحت ہوگی۔ پھر دوسری فرحت یہ ہوگی۔ **وقال لھم خزنتھا سلام علیکم طبتم فادخلوھا خالدین** ۔ فرشتے دعا دیں گے سلامتی کی، کہ سلامتی ہو تم پر، خوشحال ہو جنت میں داخل ہوجاؤ **فادخلوھا خالدین** پھر ساتھ ہی خلود کی بشارت بھی دیں گے۔ یہ سامان تو ابتداء کا ہے پھر بہشت کے اندر جائیں گے۔ تو اس وقت خوش ہوکر کہیں گے **وقالوا الحمد للہ الذی صدقنا وعدہ واورثنا الارض نتبوأ من الجنۃ حیث نشاء فنعم اجر العاملین** یعنی وہاں کے حالات دیکھ کر خوش ہوکر کہیں گے کہ سب تعریف اس ذات کو ہے جس نے وعدہ کو سچا کیا اور ہم کو ارض جنت کا مالک بنادیا کہ جہاں چاہیں اس میں چل پھر سکتے ہیں۔ پوری آزادی ہے کسی طرح کی رکاوٹ نہیں ہے ہر طرح سے آرام ہے، جو چاہو گے وہی ہوگا۔ مثلاً کسی کو مکان بیٹھے بیٹھے یہ خیال ہوا کہ اسپر چھت نہ ہو خیال کرتے ہی معاً ایسا ہی ہوجاوے گا۔ نگاہ اٹھ کر دیکھا، تو چھت ندارد کھلا ہوا مکان ہے۔ یا کوئی پرندہ کہیں بیٹھا ہوا ہے کسی کا خیال ہوا کہ اس کے کباب کھاؤ، بس فوراً کباب بن کر رقب کے اندر حاضر۔ ایک منٹ کی بھی دیر نہیں اور پھر دیکھا تو وہی جانور وہاں بیٹھا ہوا ہے یا کسی نے کوئی پھل بہت خوشنما کھانے کیلئے توڑا اس کے اندر سے ایک حور عجیب غریب حسین وخوبصورت نکل آئی کہ السلام علیکم پھل رہا نگ اور مفت میں

ایک حور ہاتھ آ گئی غرض وہاں کی عجیب وغریب حالت ہے اور دنیا کی نعمتیں دو چار دن کے بعد نہ رہیں گی۔ کبھی نہ کبھی ختم ہو ہی جائیں گی اور وہاں کی نعمت ہمیشہ باقی ہے کبھی اس کو زوال اور فنا نہیں۔

دینی نعمت میں کمال:

پھر یہ کہ یہاں کی نعمت کی یہ حالت ہے کہ اگر اسے ہمیشہ کھایا جائے تو اخیر میں طبیعت اکتا جاتی ہے یا کبھی کوئی مرض پیدا ہو جاتا ہے دست آنے لگتے ہیں قبض ہو جاتا ہے۔ وغیر **ذالک** اور اگر یہ بھی نہ ہو تو انقطاع تو ضرور ہو جاتا ہے ہمیشہ میسر نہیں آتی اور وہاں اگر کوئی میوہ پسند ہو اور کھانے کو جی چاہے اور ہمیشہ کھائیں تو کھاتے رہو کچھ ڈر نہیں نہ پیشاب ہے نہ پاخانہ ہے نہ مرض کا خوف ہے صرف پسینہ آیا اور ڈکار لی اور سب کھانا ہضم ہو گیا اور کوئی بکھیڑا ہی نہیں اور پسینہ بھی مشک کی طرح خوشبودار اور ڈکار بھی اس قدر خوشبودار کہ کبھی سونگھی بھی نہ ہو گی عفونت اور بدبو کا وہاں بالکل نام نہیں۔ بہر حال وہاں ایسی ایسی نعمتیں ہیں کہ نعمائے دنیوی کو ان سے کچھ نسبت ہی نہیں تو اس سے معلوم ہوا کہ دینی نعمت بہت زیادہ کامل ہے دنیوی نعمت سے۔۔

نعمت اسلام:

جب یہ سمجھ گئے تو اب سمجھ لو کہ آخرت کی نعمت بغیر اسلام کے کبھی نصیب نہ ہو گی۔ تو اب بتلاؤ جب ان کی جڑ اسلام ہے اور وہ نعمتیں ایسی ہیں کہ دنیا کی نعمتیں ان کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں اور اسلام سے وہ نعمتیں ملتی ہیں تو اسلام کتنی بڑی دولت ہوئی۔ پھر کیا یہ زیرکی اور عقلمندی ہے کہ ایک چیز کو چھوڑ کر نعمت فانی کے طالب بنیں اور ہم تمہاری خاطر سے کچھ عذر بھی مان لیتے اگر اسلام سے دنیا کی نعمتیں نہ ملتیں۔ مگر اس میں تو دنیوی نعمتیں بھی ملتی ہیں یعنی اگر کوئی اسلام قبول کرے تو دنیا میں بھی کوئی نعمت اس کی برابر کسی کو نہیں مل سکتی اس کو میں عنقریب ثابت کرونگا بہر حال اسلام کے اندر جب دنیوی نعمتیں بھی موجود اور اخروی کی تو وہ جڑ ہی ہے تو اس کی برابر کونسی نعمت کامل ہو گی؟ تو حق تعالٰی نے اسلام کا نعمت ہونا اس آیت میں بیان فرمایا ہے۔ **الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی** (آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو کامل کر دیا اور میں نے تم پر اپنا انعام تام کر دیا) اور یہ بھی بتلایا ہے کہ وہ نعمت کاملہ ہے اور نعمت تامہ ہے پھر اس کا دین ہونا بھی ظاہر فرمایا ہے ان چند اوصاف میں کوئی تو اس کا علم ہے اور کوئی لقب ہے غرض یہ ایسا مضمون ہے کہ اس میں کوئی خفا نہیں پس فرماتے ہیں کہ اسلام دین کامل ہے نعمت کاملہ ہے اسلام دین پسندیدہ ہے جب ایسی نعمت ہے تو اس کا حق بھی ایسا ہی ہو گا یعنی ہر نعمت کا ایک حق ہوتا ہے تو

نعمت اسلام کا بھی ایک حق ضرور ہوگا اور ہر نعمت کا حق یہ ہوتا ہے کہ اس سے نفع حاصل کرو تو اس کا بھی یہی حق ہوگا کہ اس سے نفع حاصل کرو یعنی اس کو کامل کرو اس سے اپنی حالت کو درست کرو تو اس کے آثار و برکات تمکو حاصل ہوں گے اس کے فیوض سے آپ بہرہ یاب ہوں گے یہ تو ایک موٹی بات تھی۔ دوسری ایک باریک بات اس میں ہے۔

امر بالمعروف:

جس کا بیان اس وقت مقصود ہے وہ یہ کہ ابھی معلوم ہوا کہ نعمت کا حق یہ ہے کہ اس کو کامل طور پر حاصل کیا جائے تو اسلام کا بھی ہم پر یہ حق ہوا کہ ہم اسے کامل طور پر حاصل کریں اب سمجھئے کہ اسلام کیوں کر کامل ہوتا ہے تو شریعت نے بتلا دیا ہے کہ جیسے اسلام بغیر صوم و صلوۃ کے کامل نہیں ہوتا ایسے ہی اور ایک چیز ہے کہ اس کے بدون بھی اسلام کامل نہیں ہوتا اس کا بیان یہ ہے کہ ہم نے جو احکام کو دیکھا تو جہاں **اقیموا الصلوۃ واتوا الزکوۃ** کا حکم ہے یعنی نماز ادا کرو۔ زکوۃ دو۔ اور **کتب علیکم الصیام** یعنی تم پر روزہ فرض ہے اور **اتموا الحج والعمرۃ للہ** (اور حج وعمرہ کو اللہ کے واسطے پورا پورا کرو) یعنی حج کا بھی حکم ہے۔ یہ سارے احکام تو ہم پر فرض ہیں ہی نماز روزہ حج زکوۃ سب ہی کے ادا کرنے کا حکم ہے اور **اتل ما اوحی الیک من الکتاب** (جو کتاب آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کی گئی ہے اس کو پڑھا کیجئے) میں تلاوت قرآن کا بھی حکم پایا۔ ان احکام کے ساتھ ہی ایک حکم یہ بھی فرمایا ہے **وامر بالمعروف وانہ عن المنکر** یعنی دوسروں کو بھی بھلائی کا حکم کرو اور برائی سے روکو اور یہ حکم احکام مذکورہ کے مقابل نہیں بلکہ جہاں نماز کا حکم ہے وہاں ہی امر بالمعروف کا بھی حکم ہے چنانچہ ارشاد ہے۔ **یبنی اقم الصلوۃ وامر بالمعروف وانہ عن المنکر** (اے میرے بیٹے نماز کو قائم کرنا اور نیک کاموں کا حکم دینا اور برے کاموں سے منع کرنا) اور ارشاد ہے **والمومنون والمومنات بعضهم اولیاء بعض یامرون بالمعروف وینهون عن المنکر ویقیمون الصلوۃ ویوتون الزکوۃ ویطیعون اللہ ورسوله اولئک سیرحمهم اللہ ان اللہ عزیز حکیم** (اور مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں آپس میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں نیک باتوں کی تعلیم دیتے ہیں اور برے کاموں سے منع کرتے ہیں اور نماز کی پابندی رکھتے ہیں اور زکوۃ ادا کرتے ہیں اور اللہ اور اسکے رسول کا کہنا مانتے ہیں) اور جہاں جنت کا وعدہ ہے وہاں نماز کے ساتھ امر بالمعروف کا وصف بھی مذکور ہے۔ چنانچہ آیت بالا میں ان اوصاف کے بعد ہی ارشاد ہے۔ **وعد اللہ المؤمنین والمومنات جنات** (اللہ تعالی نے مؤمنین اور

مؤمنات سے بہشتوں کا وعدہ فرمایا ہے) جہاں ان کے اور فضائل بیان کئے گئے ہیں اس کے ساتھ یہ بھی مذکور ہے کہ وہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرتے ہیں سو حکم تو یہ ہے کہ جیسے اور احکام فرض ہیں ایسے ہی امر بالمعروف بھی فرض ہے مگر حالت ہماری یہ ہے کہ اس کا بالکل خیال ہی نہیں اول تو ہم لوگوں کو خود دین ہی کی طرف توجہ نہیں اور جو دیندار ہیں بھی ان کی حالت یہ ہے کہ صرف اپنی کملی کی تو خیر مناتے ہیں مگر دوسروں کی خبر نہیں کسی کو نہ نیک کام کی ترغیب دیتے ہیں اور نہ برائی سے روکتے ہیں۔ گویا یہ حکم قرآن میں ہے ہی نہیں اور غیروں کو تو کیا کرتے خود اپنے گھر والوں سے بھی پوچھ گچھ نہیں کرتے؟ حالانکہ جیسے اپنے اوپر عمل کرنا فرض ہے ایسے ہی اپنے اہل وعیال کو عمل کیلئے کہنا بھی فرض ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں **قوا انفسکم واھلیکم نارا** (اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ) اور خاص حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے **وامر اھلک بالصلوۃ** یعنی خود بھی نماز ادا کیجئے اور اپنے گھر والوں کو بھی حکم کیجئے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر والے کیا نماز نہیں پڑھتے تھے؟ ان جیسا تو نمازی بننا مشکل ہے لیکن اس کے ساتھ ہی جو آپ کا حکم ہوا ہے کہ اہل بیت کو نماز کا حکم کیجئے تو اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص کرتا بھی رہے اسے بھی کہتے رہو۔ دیکھو جب بچہ قرآن ختم کرتا ہے تو جو شفیق استاد ہوتا ہے وہ اس سے کہتا رہتا ہے کہ بھائی اس کو بھول مت جانا بلکہ دو ایک منزل ہمیشہ پڑھتے رہنا۔ شفیق استاد یہ نہیں کرتا کہ میں نے تو اب ختم کرا دیا آگے وہ جانے اس کا کام جانے یا تم نے اپنے کسی عزیز کو حساب سکھلایا ہو تو اسے کہتے رہتے ہو کہ دیکھو روزانہ ایک دو سوال نکال لیا کرو۔ نہیں تو بھول جاؤ گے اور پھر اس پر بس نہیں کرتے بلکہ روز یا دوسرے تیسرے دن اس سے پوچھتے رہتے ہو کہ سوال نکالا تھا یا نہیں اگر کسی دن اس نے سستی کی تو ڈانٹتے ہو اسی طرح اپنی اولاد اور اپنے بچے کو بیماری میں آپ نے سکھلا دیا کہ تم کو فلاں چیز مضر ہے۔ دماغ خراب کرتی ہے اس سے پٹھے خراب ہو جاتے ہیں رطوبت پیدا کرتی ہے کھٹائی مت کھانا وہ یہ یہ نقصانات کریگی اور وہ سمجھ بھی گیا کہ یہ شے مضر ہے مگر پھر بھی تم دوسرے تیسرے دن کہتے رہتے ہو دیکھو کبھی کھٹائی نہ کھانا اب وہ کہتا ہے کہ میں نے تو سمجھ لیا ہے سن لیا ہے پھر روزانہ کہنے کی ضرورت کیا؟ تو اس سے کہتے ہو کہ بھائی محبت کا تقاضہ ہوتا ہے اس لئے کہتا ہوں یہ نہ ہو کہ کبھی غلطی سے کھا جاؤ۔ اور نقصان کرے تو۔ اسی طرح حق سبحانہ وتعالیٰ نے حضور کو فرمایا کہ اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم کیجئے باوجودیکہ حضرات ازواج مطہرات اس کی نہایت پابند تھیں اور ایسی کامل ولیات تھیں کہ ان کے فضائل قرآن میں جا بجا موجود ہیں ایک مقام پر تو یہ تصریح ہے کہ۔

یا نساء النبی لستن کاحد من النساء کہ تم اور عورتوں جیسی نہیں ہو۔ کیا اسی طرح بے نمازیوں کے فضائل میں ایسا خطاب ہو سکتا ہے ہرگز نہیں مگر پھر بھی حکم ہوتا ہے۔ **وامر اھلک بالصلوۃ** اپنے گھر والوں سے نماز کیلئے کہتے رہو کہنا مت چھوڑو واقعی کہنے کی بڑی برکت ہے دیکھا جاتا ہے کہ بڑے بڑے متقی نیک لوگ بھی چندروز کے بعد عمل میں کچیا جاتے ہیں کہنے سننے سے پھر تنبیہ ہو جاتا ہے اور اسی لئے تو صحبت نیک کی تاکید آئی ہے وجہ یہ ہے کہ اس سے عمل میں پختگی ہوتی ہے صحبت کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ چنانچہ بے نمازی آدمی چندروز نمازیوں میں رہنے سے نمازی ہو جاتا ہے۔ اور نمازی بے نمازیوں کی صحبت سے چند دنوں میں بے نمازی ہو جاتا ہے، پس کوئی اپنے کمال پر ناز نہ کرے میں بڑا نمازی ہوں یہ سب نمازیوں کے پاس رہنے کی برکت ہے پس یا تو اپنے سے بڑوں میں رہو اور اگر بڑے میسر نہ ہوں تو چھوٹوں میں ہی رہو بشرطیکہ وہ نیک اور صالح ہوں۔ بڑے کے پاس رہنے سے تو اس کی صحبت کا اثر اپنے اندر ہوگا۔ اس کے حالات کو دیکھ کر ذوق شوق پیدا ہوگا اور کوئی لغزش ہو جائے تو وہ روک ٹوک کریگا اور چھوٹوں کی صحبت سے ان کے اعمال صالحہ کو دیکھ کر شرم آئے گی کہ ہائے اتنے چھوٹے چھوٹے بچے تو کیا کچھ کرتے ہیں کسقدر خوف خدا ان میں ہے کس پابندی سے احکام کو ادا کرتے ہیں اور ہم نہیں کرتے بڑی شرم کی بات ہے غرض جس طرح بڑے سے نفع ہوتا ہے ایسے ہی کبھی چھوٹے سے بھی نفع ہوتا ہے۔ یہی راز ہے صحبت کا کہ اس سے عمل میں پختگی ہوتی ہے غرض حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہے **وامر اھلک بالصلوۃ** کہ اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم کیجئے۔ جب حضور کو یہ حکم ہے تو اوروں کے گھر والوں کا کیا حال ہوگا؟ انہیں تو تاکید کرنا بہت ہی ضروری ہوگا مگر ہمارا یہ حال ہے کہ جب کوئی گھر میں جاتا ہے تو اول سوال یہ ہوتا ہے کہ روٹی پکی یا نہیں؟ کرتہ سل گیا یا باقی ہے؟ ہانڈی پک گئی یا نہیں؟ یہ ساری باتیں تو پوچھی جاتی ہیں مگر نماز کا کہیں ذکر ہی نہیں کہ تم نے نماز بھی پڑھی یا نہیں؟ جب گھر والوں کے ساتھ ہمارا یہ حال ہے تو غیروں کیساتھ کیسا ہوگا؟ خیال فرمایئے کہ اگر تمہارے کسی دوست کا روپیہ راستہ میں گر پڑے تو تم پر حق یہ ہے کہ اسے اٹھا کر دے دو اور اس سے کہو کہ اچھی طرح باندھ کر رکھو اور ایسا ہی کرتے بھی ہیں یہ نہیں کرتے کہ روپیہ کو راستہ ہی میں پڑا رہنے دیں کہ ہمیں کہنے کی کیا ضرورت ہے یہ کوئی بچہ ہے خود خیال کیوں نہیں کرتا ہے نہیں نہیں بلکہ روپیہ کو ضرور اٹھا کر دیتے ہیں یوں کہ سمجھتے ہیں کہ یہ دوست ہے اس سے بیچارے کو نفع ہوگا لاؤ اٹھا کر دیدو اور سمجھا دو یہ اس سے کام آوے گا اسی طرح مسلمان کو چاہیے کہ جب اپنے بھائی مسلمان کو

دیکھے کہ نماز نہیں پڑھتا ہے۔ اور اس کی نماز چھوٹ گئی ہے۔ تو یہ سمجھے کہ گویا اس کا روپیہ کھویا گیا بلکہ روپیہ اور اشرفی کی بھی اس کے سامنے کیا حقیقت؟ تو اسکو بھی ضرور سمجھا دو مگر یہاں یہ کہتے ہو کہ ہمیں کیا غرض پڑی؟ کیوں صاحبو کیا نماز روپیہ سے بھی کم ہے؟

طرز نصیحت:

ہاں تم ایک عذر کرو گے کہ وہاں تو بتلانے سے دوسرا احسان مانے گا اور یہاں برا مانتا ہے۔ حضرت یہ کوئی عذر نہیں تم کہنے کے طریقہ سے کہو ہرگز کوئی برا نہ مانے گا اس طرح کیوں کہتے ہو جس سے دوسرا بھڑک اٹھے تم تو کہتے ہو طعن وتشنیع سے۔ اس سے بے نمازی تو کیا جو نمازی ہے وہ بھی برا مانے گا مگر یہ مرض ایسا عام ہو گیا ہے کہ جو بے نمازی کبھی نماز کیواسطے آتا ہے اُس پر ضرور طعن کرتے ہیں۔ قصبہ چرتھاول میں ایک مسجد میں ایک مولوی صاحب مہمان تھے نماز کیوقت ایک بے نمازی بھی مسجد میں آ گیا تو اس بیچارے کو لوگ شرمندہ کرنے لگے اوہو آج کیسے آ گئے کیا راستہ بھول گئے۔ مولوی صاحب بڑے دانشمند تھے انہوں نے فرمایا تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ یہ نماز نہیں پڑھتے ممکن ہے گھر میں پڑھ لیتے ہوں لوگ کہنے لگے اجی یہ تو ہٹا کٹا ہے پھر مسجد میں کیوں نہیں آتا کوئی لنجا لنگڑا تو نہیں اندھا تو نہیں کوئی عذر نہیں فرمایا کہ بھائی کوئی عذر ہوگا جو تمہیں معلوم نہیں انکی صورت سے تو نور معلوم ہوتا ہے۔ یہ بے نمازی تو نہیں ہے وہ شخص کہتا تھا کہ میں دنیا بھر کے وعظ سے بھی نماز نہ پڑھتا مگر ان کی تھوڑی سی طرفداری سے پکا نمازی بن گیا تو صاحبو! کہنے کا اثر کیوں نہ ہوا اور دوسرا برا کیوں مانے تم اس طریقہ سے کہہ کر تو دیکھو اب تو طعن سے کہتے ہیں۔ یوں تو اگر اٹھا کر روپیہ بھی طعن سے دو تو دوسرا ضرور برا مانے گا۔ مثلاً اتنے زور سے اس کے ابرو پر مارو کہ آنکھ ہی پھوڑ دو تو ضرور برا مانے گا غرض برے طریقہ سے کہہ دے گا تو دوسرا ضرور برا مانے گا خواہ روپیہ کا معاملہ ہو یا نماز کا معاملہ اور اچھے طریقہ سے ممنون ہوگا۔ ایک دفعہ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب نے مجلس وعظ میں ایک شخص کو دیکھا کہ اس کا پاجامہ ٹخنوں سے نیچا ہے اپنے وعظ میں تو کچھ نہ فرمایا جب وعظ ختم ہوا۔ اور وہ مصافحہ کیلئے آیا فرمایا کہ آپ ذرا ٹھہر جائیں مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے وہ ڈرا کہ اب مجھے لتاڑیں گے جب سب لوگ چلے گئے تو آپ نے اس کو بلایا۔ اب ظاہر میں تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اس سے یوں فرماتے کہ پاجامہ ٹخنوں سے لٹکانا حرام ہے مگر وہ تو حکیم تھے دیکھا یہاں یہ طرز نافع نہ ہوگا۔ فرمایا کہ بھائی میرے اندر ایک عیب ہے چونکہ اپنے عیوب خود کو معلوم نہیں ہوا کرتے لہذا تم کو دکھلاتا ہوں ذرا دیکھنا وہ عیب میرے اندر ہے یا نہیں وہ

یہ کہ میرا پاجامہ ٹخنوں سے نیچا ہو جاتا ہے میں تمہارے سامنے کھڑا ہوتا ہوں دیکھنا ٹخنوں سے نیچے تو نہیں ہوتا کیونکہ اکثر میرا پاجامہ نیچے لٹک جاتا ہے اور حدیث میں ہے جو شخص مسبل ازار ہے یعنی پاجامہ ٹخنوں سے نیچے پہنتا ہے وہ دوزخ میں جاوے گا اور جتنی بھی وعیدیں اس بارہ میں آئیں تھیں سب اس بہانہ سے اس کے کان میں ڈالدیں اور کہا میں کھڑا ہوتا ہوں ذرا دیکھنا وہ پیروں میں گر پڑا اور کہا حضرت آپ میں یہ عیب کیوں ہوتا یہ عیب تو مجھ میں ہے۔ میں توبہ کرتا ہوں آئندہ نہیں کرونگا۔ تو کہنے کا ایک یہ بھی طریقہ ہوتا ہے۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک بار میرٹھ تشریف لائے ان کے پاس ایک خان صاحب آیا کرتے تھے وہ داڑھی چڑھاتے تھے اور ٹخنوں سے نیچے پاجامہ پہنتے تھے لوگوں نے عرض کیا کہ حضرت یہ شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے اور اس کا یہ حال ہے اس کو نصیحت کر دیجئے اب مولانا کا طرز نصیحت دیکھئے۔ میں کہتا ہوں جس کو نصیحت کرنا ہو اس کا طریقہ بزرگوں سے سیکھ لے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ نصیحت نہ کرے بلکہ طریقہ سیکھے نصیحت سب کرو مگر بزرگوں سے سیکھ کر۔ صاحبو! ہر چیز حاصل کرنے سے حاصل ہوتی ہے کوئی چیز یوں ہی نہیں آیا کرتی اور حاصل کرنے کی صورت یہ ہے کہ ان کے پاس رہو ان سے پوچھتے رہو وہ بتلا دیں گے۔ یاد رکھو نصیحت میں سختی نہ کرو لطافت اور نرمی سے کہو اور اگر ممکن ہو دوسروں پر رکھ کر سنا دو۔ مولانا رومیؒ کا شعر ہے۔

خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں　　گفتہ اند در حدیث دیگراں

محبوبوں کے ایسے اسراروں کا دوسروں کی حکایات و تمثیلات میں بیان ہونا مناسب ہے۔ دوسروں پر رکھ کر سب کچھ کہہ بھی لو اور کسی کا دل بھی نہ دکھے۔ اب مولانا کی نصیحت دیکھئے فرماتے ہیں کہ بھائی میں تو کہہ دیتا مگر خان صاحب بڑے پکے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ یہ اپنی وضع کے بہت پابند ہیں۔ جب تک اس فعل کی برائی سمجھ میں نہ آوے گی اس وقت تک چھوڑیں گے نہیں اور جب سمجھ لیں گے تو آپ ہی چھوڑ دیں گے۔ کسی کے کہنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ ان سے جو یہ واقعہ کہا گیا تو وہ پگھل ہی تو گئے اسی وقت توبہ کی اور کہا کہاں میں اور کہاں مولانا مگر پھر بھی۔ مولانا نے میری کتنی بڑی رعایت کی۔ اسی طرح کانپور میں ایک شخص داڑھی منڈاتے تھے اور مجھ سے ملنا چاہتے تھے۔ ایک بار ایک شخص نے کہا کہ مجھ کو حاضری کا بہت شوق ہے مگر میں داڑھی منڈا ہوں۔ اس لئے سامنے آتے ہوئے شرم آتی ہے۔ میں نے جواب دیا شرم کی کوئی بات نہیں تمہارے اندر ظاہری عیب ہے میرے اندر باطنی عیوب ہیں اس کے بعد وہ مجھ سے ملنے آئے۔ تو پہلی دفعہ تو منڈی ہوئی داڑھی نظر آتی تھی مگر جب دوسری دفعہ آئے تو داڑھی پر ہاتھ رکھے ہوئے تھے اور جب تیسری یا چوتھی دفعہ آئے تو داڑھی تمام تھی

اقسامِ نصیحت:

بعض اوقات کچھ نہ کہنے کا بھی اثر ہوتا ہے چنانچہ میں ایک دفعہ ریل میں سفر کر رہا تھا اس میں ایک ڈپٹی کلکٹر بھی سوار تھے جب نماز کا وقت آیا ہم نے ریل میں نماز پڑھی اور وہ ویسے ہی بیٹھے رہے۔ میرے ایک دوست کہ وہ بھی ڈپٹی کلکٹر تھے اس سفر میں رفیق تھے انہوں نے مجھ سے کہا کہ ان کو تم سے محبت معلوم ہوتی ہے تم ان سے کہو تو نماز پڑھ لیں گے میں نے کہا کہ مجھے کہنے کی کیا ضرورت ہے، یہ کوئی بچے ہیں کہ میں کہوں گا تو سمجھیں گے ورنہ نہیں سمجھیں گے۔ بالآخر ہم نے ان سے کچھ نہیں کہا اور نماز پڑھ لی اور حقیقت میں سب کچھ کہا مگر اس طریقہ سے کہا کہ دوسروں کو علم بھی نہ ہوا اور اثر ہو گیا۔ اب ان کا یہ گمان تھا کہ جب یہ نماز پڑھ کر بیٹھیں گے تو بولیں گے بھی نہیں۔ مگر میں پھر ویسے ہی بشاشت سے باتیں کرنے لگا اس سے ان پر یہ اثر ہوا کہ وہ پکے نمازی ہو گئے پھر وہ ہمارے ضلع میں پولیس کے سپرنٹنڈنٹ ہو گئے تھے اور وطن میں مجھ سے ملے تھے مجھ سے یہ بھی کہا میرا جی چاہتا ہے کہ تمہارے پیچھے نماز پڑھوں اس وقت نماز ایک دوسرے امام پڑھاتے تھے میں نے ان سے اجازت لے لی کیونکہ وہ تو دراصل میرے ہی نائب تھے تو کہنے کا بھی طریقہ ہوتا ہے کہنا کبھی صریح ہوتا ہے کبھی تدبیر سے موقع محل کا خیال کرنا چاہیے مگر فکر کہنے کی ہو۔ اگر اسی دھن میں لگے رہو تو یہ طریقے بھی معلوم کرنے کا شوق ہوگا مگر یہاں تو یہ فکر ہی نہیں بلکہ اپنی خیر منائی جاتی ہے اور نصیحت کریں گے بھی تو برے طریقہ سے جیسے دوسرے کے سر پر کلہاڑی مار دی جاوے اس کی بھی پرواہ نہیں کہ کس طرح کہنے سے فائدہ ہوگا؟ کیوں کہ نصیحت کے بھی اقسام ہیں کبھی نصیحت قالی ہوتی ہے کبھی حالی مولانا فرماتے ہیں۔

گرچہ تفسیر زباں روشن گرست
لیک عشق بے زباں روشن ترست

اگرچہ زبان کا بیان روشن گر ہے لیکن عشق بے زبان زیادہ روشن ہے۔

جہاں جو طریقہ مناسب ہو اسی کو اختیار کرنا چاہیے اور ہر موقع پر مختلف طریقوں سے نصیحت کرنا چاہیے اگر ایک طریقہ مفید ثابت نہ ہو تو دوسرے طور سے کرے پیچھا نہ چھوڑے دیکھو جب اپنے لڑکے کو نصیحت کرتے ہیں تو کبھی مارتے ہیں کبھی پیار کرتے ہیں کبھی پیسے دیتے ہیں مٹھائی کھلاتے ہیں کبھی لڑکے کے سامنے اگر دوسرا برا کہتا ہے کہ یہ لڑکا خراب ہے یا بد شوق ہے تو تم کہتے ہو کہ نہیں ایسا نہیں وہ تو مدرسہ میں جاتا ہے اگر شوقین نہ ہوتا تو مدرسہ میں کیوں جاتا فضول تم اس کے سر ہوتے ہو اس سے تعریف مقصود نہیں ہوتی بلکہ ترغیب مقصود ہوتی ہے کبھی کہہ دیتے ہو کہ بھائی

تمہاری چھٹی ہے اور اس سے مقصود تعطیل نہیں ہوتی بلکہ مقصود پڑھوانا ہے کہ آج تمہاری چھٹی ہے جلدی سے چار دفعہ سبق اور کہہ لو وہ چھٹی کا نام سن کر خوشی خوشی کہہ لیتا ہے غرض سب کو ایک لکڑی سے مت ہانکو مواقع اور مراتب کا لحاظ رکھو۔ ایسا نہ کرو جیسے ہمارے یہاں عقلمندوں کا ایک قصبہ ہے ضلع سہانپور میں وہاں ایک شخص اپنے باپ سے کہا کرتا تھا کہ میں تو آپ کو بجائے باپ ہی کے سمجھتا ہوں خواہ آپ مجھے کچھ ہی سمجھیں۔ دیکھئے نامعقول باپ سے کہتا ہے کہ میں آپکو بجائے باپ کے سمجھتا ہوں۔ اسی طرح ضلع مظفر نگر میں ایک قصبہ ہے وہاں کا ایک قصہ ہے کہ ایک شخص ایک معاملہ میں اپنے باپ سے کہتا ہے کہ آپ اپنے اخلاق درست کیجئے ذرا اس نامعقول کا کلام تو دیکھئے قرآن میں تو حکم ہے کہ والدین کا ادب کرو ان کی تعظیم کرو حتیٰ کہ اگر وہ کافر بھی ہوں تب بھی ان کے ساتھ شائستگی برتو دیکھئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کو نصیحت کی کیوں کہ وہ کافر تھے مگر کس خوبی سے فرماتے ہیں۔ **یا ابت لم تعبد مالا یسمع ولا یبصرو لا یغنی عنک شیئا.** اے میرے اباجان'' اولاً یا ابت فرمایا یہ لفظ ہی ایسا ہے کہ جس سے باپ پگھل جاتا ہے۔ کیوں کہ باپ کو اپنی طرف نسبت کرنے سے اس پر خاص اثر ہوتا ہے جیسے بیٹے کو کہو اے میرے بیٹے تو اس کا خاص اثر ہوتا ہے اسی طرح یہ کہنا کہ اے میرے ابا اس کا بہت زیادہ اثر ہوتا ہے اس کا وہ اثر ہے جو تلوار کا بھی نہیں تو اولاً تو یہ لفظ ہی غضب کا موثر ہے پھر فرماتے ہیں کہ آپ ایسی چیز کی عبادت کیوں کرتے ہیں جو نہ دیکھے نہ سنے نہ کچھ فائدہ ہی پہنچا سکے اس کی عبادت کیوں کرتے ہیں دیکھئے کس خوبی سے تبلیغ کی یہ نہیں کہ لٹھ سا ماردیں بلکہ اول تو اس میں ان کے طریقہ کی مذمت بیان کی پھر فرماتے ہیں۔ **یا ابت انی قد جاءنی من العلم مالم یاتک فاتبعنی اھدک صراطاً سویا.** (اے ابا جان اللہ نے مجھے ایسا علم دیا ہے جو آپ کو نہیں دیا آپ میرا اتباع کیجئے میں آپ کو سیدھا راستہ دکھاؤں گا) یہاں بھی مکرر وہی لفظ ہے یا ابت۔ شاید کسی کو وہم ہو کہ ایک دفعہ یا ابت کہہ چکے ہیں پھر بار بار یا ابت یا ابت دہرانے کی کیا ضرورت؟ جواب یہ ہے کہ وہاں کوئی لیکچر تو دینا تھا نہیں وہاں تو دل سوزی کی ضرورت تھی اس لئے بار بار وہی لفظ استعمال کرنا چاہیے جس سے دل پگھل جائے تو فرماتے ہیں یا ابت **انی قد جاء نی من العلم مالم یاتک فاتبعنی.** اے میرے باپ اب مجھے خدا نے ایسا علم دیا ہے جو آپ کو نہیں دیا آپ میرا اتباع کیا کیجئے **اھدک صراطا سویا** میں آپ کو سیدھا رستہ بتلاؤنگا جس میں کوئی کجی اور زیغ نہیں ہے جب سارے دلائل بطلان کے بیان کر چکے تو اب بطور تفریع کے فرماتے ہیں۔ **یا ابت**

لا تعبد الشیطان ان الشیطان کان للرحمن عصیا۔ پیارے ابا۔ شیطان کی پرستش نہ کیجئے بظاہر تو وہ بت کو پوجتے تھے شیطان کی عبادت نہیں کرتے تھے مگر واقع میں وہ شیطان ہی تھا کیوں کہ عبادت اصنام کا امر وہی کرتا ہے اس لئے بجائے صنم کے شیطان فرمایا جس میں اس پر تنبیہ تھی کہ عبادت اصنام درحقیقت عبادت شیطان ہے اور شیطان کو آپ بھی برا جانتے ہیں پھر جس کو آپ خود بھی برا جانتے ہیں ایسے کی عبادت کیوں کرتے ہیں؟ اس کو چھوڑ دیجئے **یا ابت انی اخاف ان یمسک عذاب من الرحمن فتکون للشیطان ولیا۔** (اے ابا جان میں اس سے ڈرتا ہوں کہ اللہ کی طرف پر کوئی عذاب آ جائے اور آپ شیطان کے دوست بن جائیں) غرض یہاں انہوں نے چار دفعہ یا ابت یا ابت کہا۔ اور یہ بھی جب ہے کہ آذر باپ ہو کیونکہ اس میں دو قول ہیں بعض نے کہا کہ آذر باپ تھا اور بعض نے کہا چچا تھا باقی راجح قول یہی ہے کہ باپ تھا اور یہ قول مرجوح ہے کہ چچا تھا اور باپ مجازاً کہہ دیا اگر باپ ہو تو دیکھئے کس قدر ادب سے پیش آئے اور اگر چچا ہو تب تو اور زیادہ ادب ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے چچا کے ساتھ وہ برتاؤ کیا جو اب کوئی اپنے باپ کے ساتھ بھی نہیں کرتا بلکہ بجائے ادب کے اب تو یہ ہے کہ اگر باپ سے کوئی بات خلاف مرضی کے ہو جائے تو اس کو بھی حقیر اور ذلیل کرتے ہیں۔ بہر حال نصیحت اگر ادب و شفقت کے ساتھ ہو تو اس کا خاص اثر ہوتا ہے۔ کانپور کا ذکر ہے کہ جامع مسجد میں ایک مسافر عطر فروش جمعہ کی نماز پڑھنے گیا اتفاق سے ایک داروغہ صاحب بھی جماعت میں شریک تھے جماعت کے بعد لوگ حسب معمول سنتیں پڑھنے لگے داروغہ صاحب بھی ولائتی طریقہ سے سنتیں پڑھنے لگے جس میں ارکان کی تعدیل نہ تھی جب انہوں نے سلام پھیرا اس گندھی نے سامنے آ کر سلام کیا اور کہا داروغہ جی کچھ عرض کرتا ہے حضور آپ کی نماز ٹھیک نہیں ہوئی اسے پھر پڑھ لیجئے وہ بڑے خفا ہوئے کیوں کہ وہ تو دروغ بات کو پسند کرتے ہیں داروغہ ہی جو ٹھہرے وہ سچی بات کیوں سنتے مارے غصہ کے آگ بن گئے کہ نالائق بیہودہ تیری یہ جرأت کہ مجھے نصیحت کرتا ہے اس نے کہا نہیں میں نصیحت نہیں کرتا میں اس قابل کہاں مگر میرا دل دکھتا ہے مجھے آپ کے وقت کا بڑا قلق ہے کہ آپ نے اتنی محنت کی اور یوں ہی رائیگاں جا رہی ہے اس سے اور خفا ہوئے کہ خبردار چپ رہ مگر اس نے پیچھا نہ چھوڑا حتی کہ داروغہ نے اس کو مارا بھی مگر اس نے کہا اور مار لیجئے جی بھر کر پیٹ لیجئے مگر جب تک نماز اچھی طرح نہ پڑھو گے مسجد سے نکلنے نہ دوں گا میں نے تمہاری مار پٹائی سب معاف کی کیوں کہ تم حقیقت سمجھتے نہیں اس لئے معذور ہو اب داروغہ عاجز آ گیا اس نے ہر چند ڈانٹا دھمکایا مارا پیٹا مگر کسی طرح چھٹکارا نہیں

ملتا اس شور وغل میں چاروں طرف سے لوگ جمع ہوگئے لوگوں نے داروغہ ہی کو ملامت کی کہ اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے؟ ایک مسلمان خیر خواہی کرتا ہے اور تم سختی کرتے ہو نماز دہرانے میں تو تمہارا ہی نفع ہے اب وہ نماز پڑھنے کو کھڑے ہوئے سوچا اگر ویسی ہی پڑھوں گا تو پھر پکڑا جاؤنگا لہذا تعدیل کے ساتھ پڑھنی چاہیے اب تو ایسی نماز پڑھی کہ شاید ان کی سات پشت تک بھی کسی نے ایسی نماز نہ پڑھی ہوگی گویا جنید بغدادیؒ نماز پڑھ رہے ہیں پھر اس گندھی نے معافی چاہی کہ میں نے آپکو تکلیف دی داروغہ نے کہا کہ آپ مجھے معاف کردیجئے اور بزبان حال کہا۔

جزاک اللہ کہ چشمم باز کردی
مرا با جان جاں ہمراز کردی

اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے کہ آپ نے میری آنکھیں کھول دیں اور مجھے محبوب حقیقی سے ہمراز کردیا۔

اب تو داروغہ راست جی ہوگئے تو دیکھئے یہ بھی طریقہ ہے نصیحت کا اس میں ثواب تو انشاءاللہ ملا ہی اس کے ساتھ دنیوی نفع یہ ہوا کہ لوگ اس گندھی کے معتقد ہوگئے اسے بزرگ سمجھنے لگے پہلے تو وہ گند تھا اب طیب ہوگیا ساری بستی میں اس قصہ کی شہرت ہوگئی اب یہ جدھر جاتا ہے لوگ کہتے ہیں حضرت ذرا یہاں بیٹھ جایئے کوئی دکان پر بٹھاتا ہے۔ کوئی گھر لے جاتا ہے کہ برکت ہوگی کوئی پان کھلاتا ہے کوئی شربت پلاتا ہے کوئی جیبی پیش کرتا ہے اس نے کہا بھائی میں کوئی بزرگ نہیں ہوں میں تو معمولی عطر فروش آدمی ہوں اس سے لوگ اور معتقد ہوگئے کہا اچھا اور کچھ نہیں تو عطر مول دے دیجئے اب لوگ ضرورت سے نہیں بلکہ تبرکاً عطر خریدتے ہیں داموں میں بھی کچھ تکرار نہیں کرتے اگر زیادہ بھی چلے جائیں گے تو برکت ہوگی غرض اس کا عطر خوب بکا اور دین کی ایک بات سے دنیا کا بھی فائدہ ہوگیا میں نے جو کہا تھا کہ دین کی دوستی سے دنیا کا بھی نفع ہوتا ہے اس میں کا ایک شعبہ یہ بھی ہے مگر اس میں دنیا کی نیت نہ کرنا چاہیے بلکہ خلوص ہونا چاہیے برکت خلوص ہی سے ہوتی ہے۔

خلوصِ نیت:

مگر آج کل خلوص نیت ہی نہیں رہا بلکہ جو کام بھی دین کا کرتے ہیں۔ اس میں دنیا کی بیخ لگی ہوتی ہے اپنے گھر میں وعظ کہلواتے ہیں شہرت کیلئے تاکہ لوگ کہیں کہ فلاں کے یہاں وعظ ہوا تھا۔ اور کسی نیک کام میں چندہ دیا تاکہ شہرت ہو کہ فلاں نے پچاس روپے دیئے ہیں کوئی سیکرٹری بننا چاہتا ہے کوئی صدر ہونا چاہتا ہے پھر اس کیلئے کسی کو ساتھ بھی لیجاویں گے کہ تم میری صدارت کی تحریک کرنا اور فلانے تم تائید کرنا اور تائید کرنے والے بکثرت ایسے جاہل کودن ہوتے ہیں کہ ان کو

وہاں سبق پڑھایا جاتا ہے کہ میں یوں کہوں گا تم یہ کہنا خانہ سازشیں ہوتی ہیں کہ میں یہ تقریر کروں گا تم اس طرح تائید کرنا اور وہ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ حقیقت کو سمجھتے بھی نہیں غلط سلط جو زبان پر آتا ہے کہہ جاتے ہیں۔ غلط پر ایک قصہ یاد آیا۔ کانپور میں ایک جلسہ میں کوئی صاحب ایک مہاجن کو اپنی تائید کیلئے لے گئے اول تو اسے گھر پڑھا کر لے گئے تھے کہ میں تقریر کروں گا تو تم یہ کہنا کہ میں بھی تائید کرتا ہوں وہ بیچارہ محض ہندی پڑھا ہوا تھا اس نے عمر بھر کبھی تائید کا لفظ سنا نہ تھا کیوں کہ عربی کا لفظ ہے اس کے منہ سے نکلتا نہ تھا ٹاؤن ہال میں جلسہ تھا سب تو تقریریں سن رہے تھے ادھر ادھ دیکھ رہے تھے۔ مگر یہ بیچارا اس لفظ کو یاد کر رہا تھا پریشان تھا کہ کب وہ شخص تقریر کرے تا کہ جلدی سے میں یہ لفظ کہہ کر اس مصیبت سے رہائی پاؤں دل سے بوجھ اترے۔ جب انہوں نے تقریر کی تو اس نے کھڑے ہو کر کہا صاحبو میں بھی اس کی تردید کرتا ہوں اب وہ پڑھانے والے آنکھیں دکھلاتے ہیں گھورتے ہیں اس نے تو سارا کیا کرایا ناس کر دیا اگر وہ نہ بولتا تو اچھا تھا کیونکہ یہ تو بجائے تائید کے تردید کرنے لگا آنکھوں کے گھورنے سے وہ کچھ سمجھا کہ میں نے شاید غلطی کی تو جلدی سے اس نے کہا نہیں صاحبو ہم تارید کرتے ہیں یہ کوئی لفظ ہی نہیں مہمل بے معنی ہے انہوں نے پھر اشارہ سے دھمکایا تو وہ کہتا ہے کہ میں تاکید کرتا ہوں غرض اس نے بہت کوشش کی مگر وہ لفظ منہ سے نہ نکا پھر ایسے شخص سے تائید کرانا محض لاحاصل نہیں تو کیا ہے مگر بات کیا ہے وہی شہرت اور نمود اس لئے اس کے آثار بھی ایسے ہی ہوتے ہیں کہ ثمرہ کچھ نہیں محض کاغذ پری۔ میں ایک دفعہ ڈیگ علاقہ بھرت پور میں گیا تھا وہاں ایک شخص مجھ سے ملے وہ کسی انجمن کے سیکرٹری تھے مجھ سے کہنے لگے کہ یہاں کے مسلمان انجمن کی تائید نہیں کرتے ہیں میں نے کہا اس انجمن کے مقاصد کیا ہیں؟ کہا۔ تعلیم علم دین۔ اعانت تکفین وتجہیز موتی۔ تیامیٰ کی امداد۔ مساجد کی مرمت۔ میں نے کہا بعضے کام تو کسی قدر آپ تنہا بھی کر سکتے ہیں مثلاً علم دین سکھلانا ہے تو علم دین کے دو درجے ہیں ایک اعلیٰ ایک ادنیٰ اگر آپ اعلیٰ درجہ کا نہیں کر سکتے ادنیٰ درجہ کا تو کر سکتے ہیں مثلاً سیپارہ اور مال بد کا ترجمہ اور راہ نجات یہ تو آپ پڑھا سکتے ہیں کہا ہاں۔ پھر میں نے پوچھا کہ تم بھی اتنا کرتے ہو یا نہیں جواب دیا نہیں میں نے کہا پھر فضول مسلمانوں کی شکایت کرتے ہو تم سے تو خود انجمن کی خدمت ہوتی نہیں دوسروں کو بدنام کرتے ہو خدا کی قسم تم کام کرنے لگو تو لوگ خود ہی کھنچے آئیں گے آج کل یہ بھی ایک مصیبت ہے کہ غیر کا عیب تو نظر آتا ہے اور اپنی بغل میں گند در گند ذخیرہ بھرا ہو مگر کچھ خبر نہیں۔

ہر یکے ناصح برائے دیگراں ناصح خود یافتم کم در جہاں

ہر شخص دوسروں کو نصیحت کرنے والا ہے خود اپنے آپ کو نصیحت کرنے والے دنیا میں کم ہیں۔

ہر شخص غیر کا شاکی ہے پھر میں نے کہا اگر مردہ مر جائے اور تم کفن میں مدد نہ کر سکو قبر تک تو جا سکتے ہو معلوم ہوا کہ سیکرٹری صاحب دفن کرنے بھی کبھی نہیں گئے اور سچ کہتا ہوں کہ اگر وہ ایسے کام کرتے تو جو لوگ ان کاموں میں اعانت نہیں کرتے سب کرنے لگتے۔ مسجد کی مرمت نہ ہو سکے تو ٹوٹا چٹائی ہی دے دو۔ باقی یہ خوب رہی کہ تم حکومت کرو اور سب تمہارے غلام بنے رہیں حالانکہ **سید القوم خادمھم** (قوم کا سردار لوگوں کا ہوتا ہے) (مشکوٰۃ المصابیح: ۳۹۲۵) یہ بزرگوں کا قول ہے اس پر میں دو بزرگوں کا واقعہ بیان کرتا ہوں کہ ایک دو بزرگوں کو سفر درپیش ہوا تو آپس میں کہنے لگے کہ شریعت کا حکم ہے سفر میں ایک سردار ہونا چاہیے تاکہ انتظامات درست ہوں اس کے موافق ایک حاکم بنے ایک محکوم جو سردار تھے انہوں نے منزل پر پہنچتے ہی خود خیمہ گاڑا پانی لائے روٹی پکائی محکوم نے کہا اجی پھر میں کاہے کے واسطے ساتھ ہوا تھا کہنے لگے کہ دیکھو تم نے مجھے سردار بنایا ہے تو میرا کہنا مانو لہٰذا ساکت بیٹھے رہو وہ کہنے لگے کہ اس سے تو میں ہی سردار ہو جاتا تو اچھا تھا کہنے لگے آئندہ کو تم ہو جانا۔ صاحبو! ہمارے بزرگوں کی تو یہ عادت تھی کہ بڑے بن کر سب کے خادم ہو جاتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب بیت المقدس عیسائیوں کے بلائے ہوئے تشریف لے گئے ہیں تو آپ کا اور خادم کا ایک ہی اونٹ تھا باری باری دونوں اسی پر سوار ہوتے تھے سارا راستہ یونہی طے کیا اور جب بیت المقدس پاس آ گیا تو آخری باری خادم کی تھی آپ نے اس کو سوار ہونے کا حکم دیا اور خود نکیل کھینچنی شروع کی اس نے عرض کیا کہ آپ امیر المومنین ہیں اب سوار ہو جائیے اب آپ عیسائیوں کے سامنے جا رہے ہیں مگر نہ مانا اور اسی حالت میں عیسائیوں کے پاس جانے پر آمادہ ہو گئے۔ دیکھئے یہ حالت تھی ہمارے سلف کی کہ امیر المومنین نکیل پکڑے ہوئے ہیں اور خادم سوار حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک سفر میں تھے اونٹ تھے کم اور سوار زیادہ۔ تو دو دو تین آدمی کو ایک ایک اونٹ ملا اسی طرح حضورؐ کے ساتھ بھی دو شخص شریک ہوئے جب آپ کی چلنے کی باری آئی تو آپ اتر پڑے ساتھیوں نے عرض کیا حضور ہم اپنا حصہ سواری کا آپ کو دیتے ہیں آپ نے فرمایا تم مجھ سے قوی نہیں اور میں تم سے زیادہ ثواب سے مستغنی نہیں میں بھی ثواب کا محتاج ہوں سبحان اللہ یہ برتاؤ تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے خدام کے ساتھ کسی بات میں ترفع نہ تھا نہ نشست و برخاست میں کسی قسم کا امتیاز تھا۔ جب حضورؐ کے دربار میں کوئی آتا تو ہر شخص تمیز نہیں کر سکتا تھا کہ ان میں آقا کون ہیں اور خدام کون۔ ایک دفعہ آپ صحابہؓ کے مجمع میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک شخص آیا اور کہا من **محمد فیکم** کہ تم میں محمد کون ہے؟ یہاں یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ آپ

کو اس نے کیوں نہ پہچانا آپ کے چہرہ مبارک پر تو انوار و برکات خداوندی نمایاں تھے۔ جواب یہ ہے کہ اول تو انوار دیکھنے کیلئے نظر چاہیے انوار کو ہر شخص نہیں پہچان سکتا ہر مومن بھی تمیز نہیں کرسکتا پھر غیر مومن کیا پہچانے؟ دوسرے انوار سے اتنا ہی تو معلوم ہوسکتا ہے کہ یہ صاحب انوار مقدس ہیں باقی آقا اور سلطان ہونا کیونکر معلوم ہوسکتا ہے کیونکہ صاحب انوار کیلئے سلطان ہونا ضرور نہیں اور یہ شخص حضور کو سلطان ہی سمجھ کر آیا تھا ہنوز اس کو کمال نبوت کی خبر نہ تھی اسی طرح ظاہری حسن اور آب وتاب بھی آپ میں اس قدر تھی کہ کسی بڑے حسین وجمیل میں نہ تھی مگر اس سے بھی سلطان ہونا کیسے معلوم ہو لوازم سلطنت تو تاج وتخت وغیرہ ہیں جس سے آپ منزہ ہیں اس لئے ہر کس وناکس آپ کو نہیں پہچان سکتا تھا غرض آپ کی عادت شریف یہ تھی کہ سب سے ملے جلے رہتے تھے کوئی امتیاز کوئی شان نہیں تھی اگر تم یہ کہو کہ حضور کی کیا بات وہ تو نبی تھے ہم ویسے کیوں کر ہوجائیں۔ میں کہتا ہوں کہ ارے جب باوجود اس عظمت کے نبی کی یہ عادت تھی تو ہم کو تو بہت زیادہ تواضع اختیار کرنا چاہیے اور اگر یہ سمجھ میں نہیں آتا تو میں ابھی ایک غیر نبی مگر عظیم الشان کا واقعہ سناتا ہوں۔ خوجہ کے ایک آدمی مجھ سے نقل کرتے تھے اب ان کا انتقال ہوگیا۔ وہ کابل گئے تھے مجھ سے بیان کرتے تھے کہ عبدالرحمٰن خاں امیر کابل کا یہ حکم تھا کہ جب وہ دربار سے اٹھ جائیں تو پھر مجلس میں کوئی انکی تعظیم نہ کرے دربار کے بعد مصاحبین کے ساتھ ہنستے بولتے تھے اور مصاحبین میں سے کوئی انکی طرف پشت کئے ہوئے ہے کوئی پاؤں پھیلائے ہوئے ہے کچھ برا نہیں مانتے تھے تو واقعی مسلمان کی حالت ایسی ہی ہونی چاہیے یہ کیا کہ دیکھو فلاں داروغہ ہیں فلاں جج ہیں دیکھو کوئی گستاخی نہ ہوجائے ورنہ سزا ہوجائے گی کچھ نہیں واللہ ہم کو نام ونمود نے خراب کر رکھا ہے اسی لئے ہمارے اندر خلوص نہیں ہے ہمارے ہر کام میں اغراض فاسدہ بھری ہوئی ہیں ہمارے پہلے بزرگ تو دنیا کے کام بھی دین کی وجہ سے کرتے تھے اور اب دین کے کام بھی دنیا سے خالی نہیں ہر کام میں شہرت ونمود وجاہ کا خیال ہے جب ہم میں خلوص نہیں تو برکت بھی نہ ہوگی البتہ اول اول ایک دفعہ خوب آب وتاب اور عزت وشہرت ہوجاتی ہے پھر یہ حالت ہوتی ہے کہ یا تو کوئی اس کا نام ہی نہیں لیتا یا لیتا ہے تو دو گالی اول میں دیتا ہے اور دو آخر میں اور۔ درمیان میں نام۔

اخلاص اور شہرت:

صاحبو! اخلاص حاصل کرو اس سے بلاقصد شہرت بھی ہوگی اور عزت بھی مولانا فرماتے ہیں۔

کعبہ را ہردم تجلی مے فزود　　　ایں زا خلاصات ابراہیم بود

کعبہ کیلئے ہر وقت تجلیات کی زیادتی ہے صرف اس لئے کہ اسکی بنیاد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خلوص نیت سے رکھی تھی۔

ورنہ نام کا کعبہ تو اور لوگوں نے بھی بنایا تھا جو ظاہری زیب وزینت میں اس سے کہیں زیادہ تھا مگر کہیں اُن کا نام ونشان بھی نہیں رہا چنانچہ ایک کعبہ تو حضور سے پہلے یمن میں بنا تھا جس کے بانیوں نے اس سچے کعبہ کو اس جھوٹے کعبہ کی بے رونقی کا سبب دیکھ کر ہدم بیت اللہ کا ارادہ کیا تھا جس پر عذاب غیبی سے سب تباہ ہوئے اور ایک اور کعبہ حضور کے زمانہ میں بنا تھا۔ حضور نے اس کو منہدم کرادیا اگر کہو کہ منہدم نہ ہوتا تو شاید شہرت ہوتی اب شہرت ہو کیسے جب منہدم کرادیا تو میاں اس کعبہ پر بھی بہت سی آفتیں نازل ہوئی ہیں مگر وہی آب و تاب ہے اور اس مصنوعی کو کوئی جانتا بھی نہیں اور مثال لو ایک تو حضور نے دعویٰ کیا نبوت کا اور ایک سلیمہ کذاب نے بھی نبوت کا دعویٰ کیا تھا مگر دونوں کا فرق دیکھ لیجئے مولانا فرماتے ہیں۔

بو مسیلم رالقب کذاب ماند ، مر محمد را او الالباب ماند

بو مسیلم کا لقب کذاب ہوا، اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا خطاب اولوالباب ہے۔

اس کا کذاب لقب ہوا اور حضور کو اولوالاباب کا خطاب ملا اور مولانا فرماتے ہیں

احمدؐ اور بوجہل دربت خانہ رفت زیں شدن تا آں شدن فرقت زفت

بتخانہ میں تو دونوں گئے تھے مگر فرق کیا ہوا ابوجہل نے تو بتوں کو سجدہ کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جانے سے آپ کے پیروں میں بت گر پڑے اور فرماتے ہیں۔

گر بصورت آدمی انسان بدے احمد و بوجہل ہم یکساں بدے
اینکہ ے بینی خلاف آدم اند نیستند آدم غلاف آدم اند

اگر آدمی کو انسان کی شکل میں دیکھے تو احمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوجہل یکساں معلوم ہوں یہ کہ جو تم آدم میں خلاف پاتے ہو یہ تو آدم نہیں، آدم کے غلاف میں ہے۔

اور ایک جگہ فرماتے ہیں

کار پاکاں راقیاس از خود مگیر گرچہ باشد در نوشتن شیر و شیر

نیک لوگوں کے کام کو اپنی طرح نہ سمجھو اگرچہ شیر اور شیر ایک طرح لکھے جاتے ہیں مگر مفہوم میں بہت فرق ہے۔

اس شعر سے پہلے مثنوی دفتر اوں میں مولانا نے ایک حکایت لکھی ہے کہ کسی عطار کے یہاں

ایک طوطی تھی خوش آواز خوش رنگ وہ دکان پر نگہبانی کیلئے رہا کرتی تھی اور سوداگروں سے باتیں کیا کرتی آدمیوں کی بولی بولتی وہ بقال مالک طوطی ایک روز گھر گیا ہوا تھا اور طوطی دکان کی نگہبانی کر رہی تھی دفعۃً کوئی بلی چوہا پکڑنے دوڑی طوطی اپنی جگہ سے جان کے خوف سے جست کر کے ایک طرف چلی وہاں روغن گل کی بوتل رکھی تھی اس کے بازو یا پاؤں لگنے سے گر گئی۔ مالک جب گھر سے آیا دیکھا کہ تمام دکان اور فرش چکنا ہو رہا ہے معلوم ہوا کہ یہ اسی کی حرکت ہے اس کو مارنا شروع کیا اتنا مارا کہ اس کے سر کے بال اڑ گئے گنجی کر دی۔ اب وہ خفا ہو گئی ہر چند یہ اس سے باتیں کرتا ہے بولتی ہی نہیں میوہ اور پھل دیتا ہے دعا تعویذ کراتا ہے فقراء کو خیر خیرات کرتا ہے مگر وہ بولتی ہی نہیں یہ بڑا پریشان ہوا اور اس پر بڑی حسرت سوار ہوئی۔ اپنی داڑھی کے بال نوچتا تھا کہ ہائے دکان کی رونق جاتی رہی اسوقت میرا ہاتھ کیوں نہ ٹوٹ گیا جب میں نے اس کو مارا تھا غرض حسرت واویلا کر کے مایوس ہو کر بیٹھ گیا۔ ہر قسم کی تدبیریں کیں طرح طرح پھل پھول نقش ونگار اس کے سامنے پیش کرتا تھا کہ کسی طرح بول اٹھے مگر سب بیکار۔ اس مایوسی میں تین روز کے بعد ایک گنجا اس کے سامنے سے گذرا جس کے سر پر مطلق بال نہ تھے جیسے تانبے کا طشت ہو اس کو دیکھتے ہی طوطی بول پڑی اور کہا

از چہ اے کل با کلاں آمیختی　　تو مگر از شیشہ روغن ریختی

کہ او گنجے تو کس وجہ سے گنجوں میں شامل ہوا معلوم ہوتا ہے شاید تو نے بھی کسی کا روغن گرایا ہوگا۔

از قیاسش خندہ آمد خلق را　　کہ چو خود پنداشت صاحب دلق را

اس سے لوگ بہت ہنسے کہ اس نے گنجے کو بھی اپنا جیسا خیال کیا تو وہاں مولانا فرماتے ہیں۔

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر　　گرچہ باشد در نوشتن شیر و شیر

نیک لوگوں کے کام کو اپنے اوپر گمان مت کرو۔ اگرچہ شیر (درندہ) اور شیر (دودھ) ایک طرح لکھے جاتے ہیں۔

اس طرح کہاں مخلص کا عمل؟ کہاں غیر مخلص کا؟ لوگ بزرگوں کی ریس کرتے ہیں کہ ان کی تو شہرت و عزت ہوتی ہے اور ہماری نہ شہرت ہے نہ کسی کے دل میں وقعت ہے نہ عزت ہے ارے ہو کیسے ان میں خلوص ہے اور یہ تم سے بمراحل دور ہے خدا کی قسم اگر خلوص سے کام ہو تو شہرت خود بخود ہو جائے صاحب کہتا ہے۔

اگر شہرت ہوس داری اسیر دام عزلت شو　　کہ در پرواز دارد گوشہ گیری نام عنقا را

اگر تمہیں شہرت کی تمنا ہے تو گوشہ تنہائی کے دام میں اسیر ہو جاؤ کیونکہ گوشہ گیری کی وجہ سے

حتی تمام دنیا میں مشہور ہو گیا۔

غرض جو مٹنا چاہتا ہے وہ روشن ہو جاتا ہے اور جو شہرت چاہتا ہے اسے ذلت گھیر لیتی ہے اور بزرگوں نے جو کام بھی کیا خلوص سے کیا اس لئے ان کے ہاتھوں کام بھی پورا ہوا اور شہرت اور نیکنامی بھی ہوئی مگر ان کو کبھی شہرت کا قصد تو کیا وسوسہ بھی نہیں ہوتا تھا اور ہم تو ابتداء سے شہرت ہی چاہتے ہیں اس لئے وہ بھی نصیب نہیں ہوتی۔ ارے کیا شہرت کا طالب بنے ہو ایسی تیسی میں جائے شہرت۔ مقصود اصلی تو خدا کو راضی کرنا ہے بس جو کام کرو رضائے حق کو پیش نظر رکھو۔

کارِ پاکاں:

غرض ہم میں بڑی کوتاہی یہ ہے کہ ہمارے اندر خلوص نہیں ہے حالانکہ ہمارے بزرگوں نے جو کچھ کامیابی حاصل کی خلوص ہی کے بدولت حاصل کی۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اس خلوص ہی کی برکت سے کتنی بڑی بڑی فتوحات حاصل کی ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب خلیفہ ہوئے اس وقت حضرت خالد بن ولیدؓ دمشق کا محاصرہ کئے ہوئے تھے حالانکہ یہ بڑے قوی اور شجاع تھے اور حضرت ابو عبیدہؓ ضعیف و نحیف تھے گو تھے بڑی شجاعت اور مردانگی والے مگر اس وقت تک جرنیل نہیں تھے بلکہ حضرت خالدؓ کے ماتحت تھے۔ حضرت عمرؓ کی نظر دیکھئے کہ تخت امارت پر بیٹھتے ہی حضرت ابو عبیدہؓ کو جرنیل بنایا اور حضرت خالدؓ کو معزول فرما دیا لوگوں نے کہا کہ حضرت یہ کیا کیا؟ وہ تو بڑے دلیر اور بہادر تھے اور یہ کمزور دبلے پتلے ہیں فرمایا اسی وجہ سے معزول کرتا ہوں کہ خالدؓ پر سب کی نظر ہو گئی ہے اور ابو عبیدہؓ کی امارت میں سب کی زبان پر یہی ہوگا کہ خدا ہی خیر کرے خدا ہی مدد فرمادیں اور جو فتح حاصل ہوگی وہ خدا ہی کی طرف سے بے ساختہ سمجھی جائیگی حضرت یہ تھے سمجھنے والے دین کے چنانچہ آپ نے فرمان لکھا حضرت ابو عبیدہؓ کے پاس کہ میں آج سے آپ کو عسکر اسلام کا جرنیل بناتا ہوں اور خالدؓ کو اطلاع کردو یعنی خود ان کو خط لکھا بھی نہیں کہ تمہارے بجائے ابو عبیدہؓ کو جرنیل مقرر کردیا گیا ہے۔ اب حضرت ابو عبیدہؓ شرمائے کہ میں کیسے ان کو کہوں اب تک تو ان کی ماتحتی میں کام کر رہا تھا اور اب ان کو معزول کروں مگر امیر المومنین کا حکم تھا ماننا ضروری تھا اس لئے وہ خط ایک آدمی کے حوالہ کیا کہ اس کو حضرت خالد بن ولیدؓ کے پاس لے جاؤ اور یہ کہلا بھیجا کہ خدا کی قسم کہ اسمیں میرا کوئی دخل یا خواہش نہیں ہے آپ مجھ سے کبیدہ خاطر نہ ہوں وہ خط پڑھ کر خوشی خوشی حاضر خدمت ہوئے اور کہا کہ میں اپنے کو معزول کرتا ہوں اور امیر المومنین کا فرمان سر آنکھوں پر ہے۔ واللہ میں آپ کی اطاعت کرونگا اور کام پہلے سے زیادہ کرونگا پھر اس کی حقیقت بتلائی ورنہ

شاید کوئی اس قول کو شاعری پر محمول کرتا وہ یہ کہ آپ نے فرمایا کہ اب تک کبھی کبھی مجھے یہ خیال ہوتا تھا کہ اگر میں مارا گیا تو لشکر بددل ہو کر پسپا ہو جائے گا کیونکہ عادۃ اللہ یہی جاری ہے کہ افسر کے مارے جانے سے لشکر بیکار ہو جاتا ہے اس لئے بہت دفعہ میں اپنی حفاظت کرتا تھا اور اب آزاد ہوں مجھ کو اندیشہ نہیں رہا اب انشاءاللہ تعالیٰ میری خدمت دیکھئے گا۔ حضرت یہ لوگ تھے خادمان دین اور یہ وہ تھے کہ حضرت عمرؓ نے ایک بار اُنکو جاہ طلب بھی فرمایا تھا اور وہ واقعہ اسی طرح ہوا تھا کہ ایک بار حضرت خالدؓ نے ایک شاعر کو کچھ روپیہ دیدیا تھا۔ اس سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ خیال ہوا کہ ان میں حب جاہ ہو گیا ہے حالانکہ ممکن ہے حضرت خالدؓ نے شاعر کو بیت المال کا مصرف سمجھ کر دیا ہو اور یہ سمجھے ہوں کہ یہ شخص محتاج ہے یا یہ خیال ہوا ہو کہ اگر نہ دیں گے تو شاید ہجو کرے کیونکہ شعراء کی حالت یہی ہے کہ اگر ان کو کچھ ملتا ہے تعریف کرتے ہیں نہیں ملتا تو ہجو کرنے لگتے ہیں چنانچہ ایک شاعر نے ایک شخص کی ہجو کی تھی اس نے کچھ انعام اکرام دیدیا تو پھر تعریف بھی کر دی کسی نے کہا میاں ہجو بھی کرتے ہو اور تعریف بھی یہ تو اجتماع ضدین ہے کہا میاں دونوں حال میں سچا ہوں کیونکہ آدمی میں بھلائی برائی دونوں ہوتی ہیں ہم خوش ہوتے ہیں بھلائیاں بیان کر دیتے ہیں ناخوش ہوتے ہیں برائیاں بیان کر دیتے ہیں تو ممکن ہے کہ حضرات خالدؓ نے اس نیت سے دیا ہو کہ اس سے دفع شر ہوگا اور دفع شر کیلئے دینا جائز ہے لہذا ہم جیسوں کو تو ان پر اعتراض کا حق نہیں لیکن امیر المومنین کو حق ہے وہ ان کو جائز سے گذر کر اولیٰ اور احوط کے درجہ پر دیکھنا چاہتے تھے جیسے اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی شان میں فرمایا ہے **وعصی ادم ربہ فغوی** اور ہم لوگوں کو زبان کھولنے کی مجال نہیں غرض حضرت عمرؓ نے ان کو معزول کر دیا۔ جس میں اس واقعہ کو بھی دخل تھا سو اس حالت میں اگر یہ خلوص سے کام نہ کرتے ہوتے تو اس وقت ضرور کام چھوڑ دیتے مگر وہ تو خالق عمرؓ کیلئے کام کر رہے تھے خواہ عمرؓ راضی ہوں یا ناراض اس کی ان کو پرواہ نہیں تھی یہ رنگ تھا ہمارے بزرگوں کا اور ہماری یہ حالت ہے کہ اول ہی دن سے بڑا ہونیکا خیال ہو جاتا ہے اور یہ بڑا ہونا ایسی بری بلا ہے کہ اگر کوئی بد طلب و خواہش بھی بڑا ہو جائے تب بھی آفت ہے مولانا فرماتے ہیں۔

تن قفس شکلست اما خار جاں ٭ ازفریب داخلاں و خارجاں
اینش گوید نے منم انباز تو ٭ آنش گوید نے منم ہمراز تو
او چو بیند خلق را سرمست خویش ٭ از تکبر میرود از دست ویش ، الخ

یہ مصائب ہیں شہرت اور بڑا ہونے کے اس لئے تفریعاً وصیت فرماتے ہیں۔

خویش را رنجور ساز و زار زار   تا ترا بیروں کنند از اشتہار
اشتہار خلق بند محکم ست   بند ایں از بند آہن کے کم ست

اپنے آپ کو افسردہ اور گمنام رکھو تا کہ لوگ تم کو شہرت سے باز رکھیں۔ مخلوق میں شہرت کا ہونا ایک مضبوط بند ہے۔ یہ بند لوہے کے بند سے کم نہیں ہے۔

یہ تو دین کی خرابی ہے اور دنیا میں یہ حالت ہوتی ہے۔

چشمہا و خشمہا و رشکہا   بر سرت ریزد چو آب از مشکہا

حسد، غصہ اور رشک میں ایسے برستے ہیں جیسے مشک سے پانی باہر نکلتا ہے۔

سب کا حسد اور احکام کی دار و گیر اور جمور کے مطالبات ساری دنیا کے اعتراضات اس پر پڑتے ہیں اور اگر شہرت نہ ہو تو کسی کو بھی اس کا خیال نہیں ہوتا اور نہ اس کو کسی کی پرواہ ہوتی ہے، یہ حال ہوتا ہے۔

لنگکے زیرو لنگکے بالا   نے غم دزد نے غم کالا

ایک چادر نیچے ایک چادر اوپر، نہ ڈاکو کا ڈر، نہ چور کا خوف۔

ایک دوست مجھ سے کہنے لگے اگر تین باتیں حاصل ہوں ایک تو کھانا دوسرے کپڑا اور تیسرے کوئی مارے پیٹے نہیں۔ تو اس کے بعد چاہے کوئی ہمیں بھنگی ہی سمجھے تو ہمارا حرج کیا ہے حقیقت میں جن لوگوں نے جاہ کو مطلوب بالذات بنایا ہے بڑی غلطی میں ہیں اس سے دنیا کے مقصد بھی حاصل نہیں ہوتے اور دین تو گیا ہی ہے اور اگر نیت صادق ہو خلوص ہو دنیا کی کوئی غرض نہ ہو تو دین بھی رہے گا اور دنیا کا بھی نفع ہوگا۔ دیکھو اس عطر فروش کی نیت اپنے عطر چلانے کی نہ تھی بلکہ وہ تو اس پر آمادہ تھا کہ عطر اور تیل بنا کیا معنی۔ اگر میرا بھی عطر اور تیل نکل جائے تب بھی نصیحت نہ چھوڑوں گا پھر نتیجہ کیا ہوا کہ دین دنیا دونوں کا بھلا ہوا تو حضرت نصیحت کا یہ طریقہ ہوتا ہے اب تو یہ آفت ہے کہ پہلے ہی سے یوں کہنے لگتے ہیں کہ تجھ کو شرم نہیں آتی بے ایمان بدمعاش کیا یہ طریقہ ہے نصیحت کرنے کا آخر وہ بھی تو آدمی ہے اس کو بھی اشتعال و غضب ہوتا ہے وہ برا مان کر کلمات کفر بکنے لگتا ہے میرے ایک دوست بیان کرتے تھے کہ کسی موقع پر ایک محصل چندہ نے ایک شخص سے چندہ مانگا اس نے عذر کر دیا اب وہ فرماتے ہیں کہ اسلامی کاموں میں مسلمانوں کی مدد کرنا مسمان کا کام ہے کیا تم مسلمان نہیں ہو اس نے کہا ہاں میں مسلمان نہیں۔ محصل نے کہا کہ لکھ دو کہ تم مسلمان نہیں کہا لاؤ کاغذ اس نے لکھ بھی دیا اب کرے کوئی اس کا کیا کرے اس کے بعد ایک شخص نے کہا میاں تم نے کیا بکا اور کیا لکھدیا کیا تم اسلام سے خارج ہو گئے۔ کہنے لگا نعوذ باللہ میں کیوں اسلام

سے خارج ہوتا میں تو پکا مسلمان ہوں کہا پھر تم نے یہ فعل کیوں کیا کہنے لگا ان سسروں نے تنگی کی مجھ پر جبر کیا میں نے انکار کیا پھر انہوں نے میرے انکار کو اسلام کے خلاف سمجھا اور مجھ سے لکھوانا چاہا کہ لکھ میں مسلمان نہیں میں نے لکھ دیا اور مطلب یہ تھا کہ جیسا تم جسکو اسلام کہہ رہے ہو جو چندہ نہ دینے سے جاتا رہا میں ویسا مسلمان نہیں اور سسروں کے لکھوانے اور کہلوانے سے کیا ہوتا ہے حق تعالیٰ تو یرید اللہ بکم الیسر (اللہ تعالیٰ تم سے آسانی کرنا چاہتے ہیں) فرمائیں اور یہ کرتے ہیں تنگی۔ تو صاحبو! یہ طریقہ نہیں نصیحت کا دیکھئے نبی کریمؐ کی خدمت میں قبیلہ بنی ثقیف کا ایک وفد آیا تھا اور کہا کہ ہم دو شرطوں سے اسلام لاتے ہیں ایک تو یہ کہ زکوٰۃ نہیں دیں گے دوسرے یہ کہ جہاد نہیں کریں گے یعنی نہ مال خرچ کریں گے نہ جان حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں شرطوں کو منظور فرمایا۔ عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ یہ شرطیں کیسے تسلیم کر لیں باوجودیکہ زکوٰۃ و جہاد دونوں فرض ہیں۔ فرمایا کہ تم ان کو مسلمان تو ہونے دو جب اسلام ان کے دل میں گھر کر لیگا اس وقت سب کچھ خود ہی کریں گے کہنے کی بھی ضرورت نہ ہوگی۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ تم کسی کو شراب پلاؤ اور وہ کہے اس شرط سے پیتا ہوں کہ شراب پی کر جھولوں گا نہیں تو آپ کو اس شرط کے ماننے سے انکار کی کیا ضرورت ہے وہ تو خود ہی شراب ہی جھولا دیگی۔ تمہارے جھلانے کی ضرورت نہیں اسی طرح اسلام خود ہی زکوٰۃ بھی دلوا دے گا اور جہاد بھی کرا دے گا۔ بغیر اس کے چین نہیں ہوگا اور ایک روایت میں ہے کہ کوئی شخص حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں بشرطیکہ نماز سے چھٹی مل جاوے آپ نے انکار فرمایا کیونکہ اسمیں کوئی خرچ نہیں جس سے تنگی ہو اور اس وقت ایسے کم ہمت نہ تھے کہ ہاتھ پاؤں نہ چلائیں۔ لیکن اب ایسے بھی کم ہمت ہیں اس لیے اب اگر کوئی یہ شرط لگا دے کہ ہم مسلمان اس شرط پر ہو سکتے ہیں کہ ہم کو نماز سے معافی دی جاوے تو ہم اس کی بھی اجازت دیں گے۔ چنانچہ مولانا مظفر حسین صاحب ایک بار گڑھی جو ایک مقام ہے تشریف لے گئے تھے وہاں ایک بڑا رئیس فیل نشین تھا جو نماز نہیں پڑھتا تھا۔ مولانا نے اس سے دریافت فرمایا کہ خانصاحب نماز کیوں نہیں پڑھتے کہا مولانا مجھ کو داڑھی چڑھانے کا شوق ہے اور وضو کرنے سے وہ بار بار خراب ہو جاتی ہے پھر ان میں پانچ دفعہ اتارنا چڑھانا مصیبت ہے مولانا نے فرمایا کہ تم بے وضو پڑھ لیا کرو۔ انہوں نے کہا کہ اس طرح تو ضرور پڑھ لوں گا فرمایا مگر ایک شرط ہے وہ یہ کہ جماعت سے پڑھنا اور مسجد میں پڑھنا کہا بہت اچھا شاید دو ایک وقت خانصاحب نے بے وضو ہی پڑھائی پھر خیال ہوا کہ میاں خواہ مخواہ اتنی محنت بھی کی اور پھر نماز بے وضو پڑھی۔ غرض تیسرے

ہی وقت سے وضو کرنے لگے اور وضو کر کے پھر داڑھی چڑھاتے مگر دو ایک روز کے بعد کہا کہ میاں میں یہ اتار چڑھاؤ اور ادھیڑ بن کب تک کرونگا اب داڑھی چڑھانا بھی چھوڑ دیا تو مولانا نے جو بے وضو کی اجازت دی تھی تو مولانا نے یہ سمجھا تھا کہ جب جماعت سے نماز پڑھے گا تو ان میں کوئی اللہ والا بھی ہوگا اس کے قلب کا نور اس پر پڑے گا اور یہ صحیح طور سے نمازی ہو جائیگا دوسرے خانصاحب کو بھی عبرت ہوگی مولانا نے یہ راز سمجھ کر اجازت دی تھی۔ یہ نہ سمجھنا کہ بے وضو تو نماز ہوتی ہی نہیں پھر مولانا نے کیسے اجازت دی بات یہ ہے کہ مولانا نے جواز کا فتویٰ نہیں دیا تا کہ ان پر اعتراض ہو بلکہ اس کے نمازی بنانے کا طریقہ یہی سمجھا اور یوں خیال فرمایا ہوگا کہ جہاں اس نے اور نمازیں ترک کی ہیں چار وقت اور بے نمازی رہ لے گا مگر طریقہ یہی ہے اس کو راہ پر لگانیکا کیوں کہ مولانا نے دیکھا کہ یہ عہد و پیمان کا بڑا پکا ہے غیرت مند ہے جب کام شروع کرے گا چھوڑے گا نہیں اس وقت کے دنیادار تو اتنے پکے ہوتے تھے کہ اب دینداروں میں بھی وہ پکا پن نہیں ہے اس کو عراقی کہتے ہیں۔

بہ قمار خانہ رفتم ہمہ پاک باز بینم
چو بصومعہ رسیدم ہمہ یافتم ریائی

جب میں قمار خانہ پہنچا وہاں کے لوگوں کو نظم وضبط کا پابند پایا۔ جب گرجا پہنچا وہاں لوگوں کو نظم وضبط سے آزاد پایا۔

یہ قمار خانہ میں پاک باز کیسے مطلب یہ ہے کہ بعض صفات میں وہ پاک باز تھے یعنی عہد و پیمان کے پکے تھے۔ گو دین کے پکے نہ تھے کیوں کہ اگر سب چوری بدعہدی کریں تو بازی کسی کو بھی نہ ہو تو نری لڑائی ہی لڑائی ہوا کرے تو پہلے لوگ قول کے پکے تھے اگر کبھی نمازی ہو جاتے تو اس میں بھی پکے ہو جاتے تھے۔ اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی سید الطائفہ حضرت جنیدؒ ایک جگہ تشریف لے گئے تو راستہ میں دیکھا کہ سولی پر ایک چور لٹک رہا ہے جس کا ہاتھ بھی کٹا ہوا پاؤں بھی کٹا ہوا اور عبرت کیلئے سولی پر ، ٹک رکھا ہے حضرت جنید نے جا کر اس کے پاؤں چوم لیے خدام سب حیران کہ شیخ کیا کرتے ہیں۔ چور کی قدم بوسی کرتے ہیں۔ عرض کیا۔ حضرت یہ کیا کرتے ہیں یہ تو بڑا چور تھا ایک دفعہ اس کا ہاتھ کٹا پھر پاؤں بالآخر سولی پر چڑھایا گیا فرمایا میں نے اس کی دیانتداری پر قدم بوسی نہیں کی بلکہ اس کی پختگی پر قدم بوسی کرتا ہوں کہ اس نے کتنی سزائیں پائیں مگر اپنے کام میں پکا رہا اخیر تک وہی حالت رہی۔

دست از طلب ندارم تا کام من بر آید
یا تن رسد بجاناں یا جان زتن بر آید

میں طلب سے اس وقت تک باز نہ آؤں گا یا تو بدن محبوب حقیقی تک پہنچ جائے یا جان جسم سے نکل جائے۔

اس سے لوگوں پر ایک حالت طاری ہوگئی اور سب اپنے اپنے کام میں پکے ہوگئے۔ اسی بناء پر حاجی صاحب فرماتے ہیں کہ اخلاق اپنی اپنی جگہ میں سب اچھے ہیں صرف مصرف کے اعتبار سے ان میں بھلائی برائی آجاتی ہے۔ اسی طرح خان صاحب کی پختگی کا وصف دیکھ کر ان کو اس ترکیب سے مولانا راہ پر لگا گئے تھے یہ سب کچھ نرمی کی بدولت ہوا اگر سختی کرتے تو ہرگز یہ اثر نہ ہوتا اسی لئے حق تعالیٰ فرماتے ہیں **ادع الیٰ سبیل ربک بالحکمة والموعظة الحسنة** (اپنے رب کے راستہ کی طرف بلایئے حکمت اور مواعظ حسنہ سے) اگر نصیحت موعظت حسنہ سے ہوگی اس سے کسی کو ناگواری نہ ہوگی اور فرضاً اگر نصیحت سے دوسرا غصہ بھی ہوگیا تب بھی لزومت اس وقت چپ رہو دوسرے وقت سمجھاؤ کہ بھائی تم تو برا مان گئے غور تو کرو یہ کیسی اچھی بات ہے اس کو قبول کرلو۔ اگر ایک دفعہ سے کام نہیں چلتا تو مکرر سے مکرر سمجھاؤ غرض سر ہوجاؤ اور صرف اسی پر اکتفا نہ کرو بلکہ خلوت میں ذات باری سے دعا بھی کرو کہ خطاب کا اثر اس کے قلب میں پیدا کرے یا اللہ! ہم نے کام شروع کیا ہے تو اس کو پورا فرما اگر پکے رہو اور ان کے سر ہوجاؤ انشاء اللہ کام ضرور بن جاوے گا۔

مبالغہ فی النصیحت:

انبیاء علیہ السلام کے حالات دیکھئے وہ کیا کرتے تھے فرماتے ہیں **افانت تکرہ الناس حتی یکونوا مومنین** (پس کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں پر زبردستی کرسکتے ہیں جس میں وہ ایمان ہی لے آئیں) ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اکراہ تلوار سے نہیں کیا تھا بلکہ نصیحت سے اکراہ فرماتے تھے یعنی ان کا پیچھا نہیں چھوڑتے تھے اس میں مبالغہ فرماتے تھے اس مبالغہ فی النصیحت کو حق تعالیٰ نے برا نہیں بتایا بلکہ مبالغہ کے بعد جو ناصح کی طبیعت پر رنج کا اثر ہوتا ہے اس سے آپ کو بچانا مقصود ہے کیوں کہ فطری بات ہے کہ نصیحت کی ناکامی بلکہ ہر چیز کی ناکامی کا قلب پر ایک اثر ضرور ہوتا ہے اور جب رنج ہوتا ہے تو بعض اوقات اس کام ہی سے رہ جاتا ہے چنانچہ اسی لئے **لا تحزن علیھم ولا تک فی ضیق مما یمکرون** (اور ان پر غم نہ کیجئے اور یہ تدبیریں کیا کرتے ہیں اس سے تنگ دل نہ ہوجایئے) فرمایا اتنی مشقت نہ کرو جس کے عدم ترتب ثمرہ پر رنج ہوجائے مقصود کو دیکھنا چاہیے سو یہ مقصود اصلی نہیں کہ بس مخاطب ہمارے کہنے سے مسلمان ہی ہوجائے گو ایک درجہ میں یہ بھی مقصود ہے مگر خود اس کی بھی حقیقی غایت پر خیال کرنا چا۔ یے وہ کیا ہے وہ رضائے حق ہے اور وہ ناکامی میں بھی حاصل ہے اس لئے ایسی ناکامی پر بھی راضی رہے اس کو بھی کامیابی ہی سمجھے۔ مولانا اسی کو فرماتے ہیں۔

گر مرادت را مذاق شکر ست   بے مرادی نے مراد دلبرست

اگرچہ تمہاری مراد شکر کی طرح پسندیدہ ہے کیا بے مرادی محبوب کی مراد نہیں ہے۔

اور فرماتے ہیں۔

بس زبوں وسوسہ باشی دلا   گر طرب را باز دانی از بلا

تم بالکل مغلوب وساوس سمجھے جاؤ گے اگر محبوب کے کرب و بلا میں فرق سمجھو گے۔

ثمرہ پر عدم نظر:

ایک بزرگ نے ایک دینی مقصود میں کوشش کی تھی مگر اس میں کامیاب نہ ہوئے اس پر کسی نے طعن کیا کہ میاں اس کوشش سے کیا ملا انہوں نے خوب جواب دیا سودا کے شعر سے۔

سودا قمار عشق میں شیریں سے کوہ کن   بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا
کس منہ سے اپنے آپکو کہتا ہے عشق باز   اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

مگر یہ جب ہے کہ مقصود اور عمل شریعت کے خلاف نہ ہو ورنہ **خسر الدنیا والآخرہ** (دنیا و آخرت کا نقصان) ہو جاویگا غرض عاشق کو ثمرہ پر نظر نہیں ہوتی عاشق کی تو یہ حالت ہوتی ہے کہ۔

ناخوش تو خوش بود بر جان من   دل فدائے یار دل رنجان من

محبوب کی جانب سے جو امر پیش آئے گا گو وہ طبیعت کو ناخوش ہی کیوں نہ ہو مگر وہ میری جان پر خوش اور پسندیدہ ہے جو میری جان کو رنج دینے والا ہے میں اپنے دل کو اس پر قربان کرتا ہوں۔

اور یہ مذہب ہوتا ہے۔

زندہ کنی عطائے تو   ور بکشی فدائے تو
جان شد مبتلائے تو   ہرچہ کنی رضائے تو

زندہ کریں آپ کی عطا ہے اور اگر قتل کریں آپ پر قربان ہوں جان آپ پر مبتلا ہے آپ جو بھی کریں میں اس سے راضی ہوں۔

عاشق کو اس سے کیا بحث کہ کام ہوا یا نہیں اس کی نظر تو یہاں تک بلند ہوتی ہے کہ اگر محبوب کو صرف خبر ہی ہو جائے کہ فلاں اس کا چاہنے والا ہے وہ اس پر بھی اکتفا کرتا ہے یعنی اس کو رضا کا بھی خیال نہیں ہوتا اسی کو کہتے ہیں۔

ہمینم بس کہ داند ماہرویم   کہ من نیز از خریداران اویم

یہی کافی ہے کہ میرا محبوب جان لے کہ میں بھی اس کے خریداروں میں سے ہوں۔

واند کہتے ہیں اور جو مغلوب الحال ہوتے ہیں وہ اس سے بھی آگے کہتے ہیں۔

ہمینم بس اگر کاسد قماشم　　　　کہ من نیز از خریدارانش باشم

یہی بہت ہے کہ اگر میں کھوٹی پونجی یعنی غریب ہوں لیکن اسکے خریداروں کی لڑی میں آجاؤں۔
غرض نتیجہ پر نظر مت کرو جو کرنے کا کام ہے وہ کرو۔

عملی نمونہ:

ان ہی کرنے کے کاموں میں سے ایک تبلیغ اور ترغیب بھی ہے مگر اس سے پہلے اپنی اصلاح کرو تا کہ تم کو دیکھ دیکھ کر لوگ مسلمان ہونے لگیں پہلے مسلمان عملی نمونہ ہوتے تھے۔ تاریخ سے بکثرت پتہ چلتا ہے کہ ہمارے اسلاف کے زمانہ میں کفار جاسوس کے طور پر لشکر اسلام میں آئے اور مسلمان ہو گئے، پھر کفار کے لشکر میں جا کر اسلام پھیلایا۔ ایک واقعہ ایسے ہی اثر کا ذکر کرتا ہوں۔ ایک دفعہ حضرت علیؓ کی زرہ چوری ہو گئی تھی آپ نے اس کو ایک یہودی کے پاس دیکھا اس وقت آپ خلیفہ تھے کہا یہ زرہ میری ہے۔ یہودی نے کہا میری ہے دیکھئے خلیفہ کے مقابلہ میں ایک رعیت کا آدمی کس بیباکی سے کہتا ہے کہ یہ چیز میری ہے۔ یہ اسلام ہی کے قوانین سے تو اس کی جرات تھی کیونکہ جانتا تھا کہ بادشاہ کے صرف کہنے سے یہ زرہ ان کی نہ ہو جائے گی دیکھئے اسلام کی کتنی خوبی ہے کہ غیر قوموں کو بھی اس سے نفع ہوتا تھا اب تو یہ حال ہے کہ خود مسلمان بھی اس سے نفع نہیں لیتے ہیں۔ غرض آپ نے قاضی کے پاس جا کر دعویٰ کیا اس وقت قاضی تھے شریح تابعی وہ آپ کے ماتحت تھے اب دیکھئے ادھر آپ بادشاہ اور شیخ کامل صاحب فضائل اور حضرت علیؓ کے خصائص وفضائل دیکھ کر کہیں یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ آپ جھوٹ بول سکتے ہیں ہرگز نہیں مگر باایں ہمہ حضرت شریح یہودی کے مقابلہ میں حضرت علیؓ سے پوچھتے ہیں کہ آپ کے پاس کوئی گواہ ہے صاحبو! اب تو حضرت علیؓ کیا اگر ہم بھی ہوتے اور ہمارا کوئی شاگرد یا مرید قاضی ہو اور وہ ہم سے گواہ طلب کرے تو کہتے کیوں جی کیا ہم جھوٹ بولتے ہیں مگر وہاں تو یہ بات نہ تھی وہ تو قوانین اسلام کے پابند تھے چنانچہ حضرت علیؓ نے گواہ پیش کئے ایک قنبر آزاد شدہ آپ کے غلام تھے اور ایک آپ کے بیٹے امام حسنؓ شریح نے کہا غلام آزاد شدہ کی تو شہادت معتبر اور لڑکے کی شہادت باپ کے حق میں قبول نہیں کیجاتی۔ حضرت شریح کا مذہب یہی تھا کہ اولاد کی شہادت باپ کے حق میں مقبول نہیں اس میں اختلاف ہے کہ اولاد کی شہادت معتبر ہے یا نہیں۔ حضرت علیؓ کا مذہب یہ تھا کہ معتبر ہے اسی لئے ان کو پیش کیا اور شریح کے نزدیک معتبر نہیں اور قاضی فیصلہ کے وقت اپنے مذہب پر عمل کرے

گانہ کہ بادشاہ کے مذہب پر اس لئے شریح نے حکم دیا کہ زرہ یہودی کی ہے۔

حضرت علیؓ مقدمہ ہار کر عدالت سے ہنسی خوشی نکل آئے کوئی تکدر اور رنج نہ ہوا۔ یہودی نے دیکھا کہ باوجودیکہ یہ بادشاہ ہیں مگر میرے مقابلہ میں ان کا لحاظ نہیں کیا گیا۔ کہا اگر یہ مذہب سچ نہ ہوتا تو اس میں اتنی حقانیت و برکت نورانیت نہ ہوتی۔ بس کلمہ شہادت پڑھ کر کہا کہ حضور آپ ہی کی زرہ ہے میں مسلمان ہوتا ہوں آپ نے کہا اب میں نے تم کو ہبہ کردی وہ حضرت علیؓ سے بیعت ہوگیا اور جنگ صفین میں شہید ہوا۔ دیکھا آپ نے کہ ایک زرہ کے ادنیٰ معاملہ نے کیا کیا۔ دیکھئے ہمارے بزرگ کیسے تھے کہ ان کی حالت کو دیکھ دیکھ کر لوگ مسلمان ہوئے تھے اور اب ہم کو دیکھ کر کوئی کافر ہوجائے تو تعجب نہیں اس کے مناسب مولانا نے ایک حکایت لکھی ہے کہ کسی مقام پر کافروں کے محلہ میں ایک موذن جا کر اذان کہا کرتا تھا جو بڑا ہی بدآواز تھا مگر اس کے دماغ میں یہ خبط سمایا ہوا تھا کہ میں خوش آواز ہوں۔ یہ بھی ایک مرض ہے۔ چنانچہ میں نے بھی مکہ میں دیکھا کہ ہر جمعہ کو نماز جمعہ کے بعد ایک ہندی حاجی سورہ الرحمٰن بہت چلا چلا کر پڑھا کرتا تھا پھر غلط میں نے دل میں کہا ارے ظالم کیوں ہندوستان کو بدنام کرتا ہے مگر وہ سمجھتا ہی نہ تھا اسی طرح وہ موذن تھا اسی اثناء میں ایک کافر رئیس نے ایک دن اس بدآواز کے سامنے مٹھائی وغیرہ پیش کی اس کی برادری نے اس پر ملامت کی کہ ایک مسلمان کا اتنا اکرام اس نے کہا میری ایک لڑکی کو اسلام کی طرف میلان ہوگیا تھا۔ میں بڑا پریشان تھا ہر وقت خائف رہتا تھا کہ کہیں یہ نکل جائے جب یہ موذن بدآواز آیا تو لڑکی نے پوچھا کہ ابا جان یہ کیا ہے میں نے کہا کہ یہ اسلام کی اذان ہے بس یہ سن کر اسے اسلام سے نفرت ہوگئی تو اس نے اس شکریہ میں اس بدآواز کو مٹھائی دی تھی کہ یہ تو میرا بڑا محسن ہے کہ اس کے آنے سے میری لڑکی کو اسلام سے نفرت ہوگئی یہ تو حکایت ہے مگر ہماری حالت ایسی ہے کیوں کہ آج کل معاملات میں بعض اعتبار سے ہم کافروں سے بھی گرے ہوئے ہیں۔ ہزاروں کافر ایسے نکلیں گے جو وعدہ کے پکے عہد کے پورا کرنے والے ہیں۔ کسی پرانے انگریز یا ہندو کے پاس امانت رکھو تو دل میں کھٹک نہ ہوگی اور مسلمان کے پاس رکھنے سے کھٹک ہوتی ہے صاحبو! اب تو لوگوں کو کافر پر زیادہ اعتماد ہے خواہ کھا ہی جاوے اور مسلمان پر اعتماد نہیں یہ کیسی ڈوب مرنے کی بات ہے۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ سب سے پہلے اپنی اصلاح کرو مگر یہ نہیں کہ اپنی اصلاح کے انتظار میں دوسرے کو نصیحت نہ کرو بلکہ دوش بدوش دونوں کام کرو اگر ایک ہی طرف لگ جاؤ گے تو ممکن ہے کہ دوسرے مرض کو قوت ہوجاوے اس کو ایک نظیر سے سمجھو مثلاً تعلیم کا بعض جگہ قاعدہ یہ ہے کہ معقولات کے

ساتھ منقولات بھی پڑھتے ہیں یہ ٹھیک قاعدہ ہے اور بعض جگہ پہلے کل معقولات پڑھتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پھر منقولات کی نوبت ہی نہیں آتی یا یہ شخص بددماغ ہو جاتا ہے اور جو مقصود تھا اس سے رہ جاتا ہے مقصود تو ہے منقولات اور معقولات محض اس کا آلہ ہیں کہ اس سے منقولات کے سمجھنے میں ایک گونہ مدد ملتی ہے تو یہ کتنی حماقت ہے کہ معقولات میں ایسے پھنسے کہ۔ منقولات کے سمجھنے کی نوبت ہی نہ آئی اور بعض جگہ پہلے منقولات اور پھر معقولات پڑھتے ہیں اس کی مضرت آج کل یہ ہے کہ فہم کی کمی سے بعض بعض مشکل جگہ ان کی سمجھ ہی میں نہیں آتی۔ لہٰذا تجربہ کار بزرگوں نے یہ ترتیب رکھی ہے کہ دونوں کو دوش بدوش رکھتے ہیں۔

طریق باطن میں ترتیب:

اسی طرح طریق باطن میں بھی یہی تفصیل ہے۔ پہلے بزرگوں میں اختلاف تھا کہ تحلیہ مقدم ہونا چاہیے یا تجلیہ۔ دونوں کے پاس دلائل موجود ہیں مگر آج کل محققین نے اس طرز کو بدل دیا ہے کسی کو مقدم یا موخر نہیں کیا بلکہ ساتھ ساتھ دونوں کو رکھا ہے اب اتنی قوت کہاں؟ اتنا زمانہ کہاں ملتا ہے کہ ایک کو الگ دوسرے کو الگ حاصل کیا جائے بس تا تو بمن می رسی من بخدا میرسم کا قصہ ہو جاتا ہے غرض اصلاح نفس و اصلاح غیر دونوں کو ساتھ ساتھ کرتے رہو۔ بعض تو غیر ہی کی اصلاح میں ایسے کھپ جاتے ہیں کہ اپنی مطلق خبر نہیں رہتی۔

مقتدایان اسلام:

اس وقت کثرت سے ایسے ہی لوگ موجود ہیں اور وجہ اس کی صرف نام و نمود ہے آج کل وہ لوگ جن کا نماز روزہ تک ٹھیک نہیں عقائد خراب ہیں حلال و حرام کی تمیز نہیں مصلح قوم بنے بیٹھے ہیں چنانچہ ایک بہت بڑے لیڈر کا واقعہ ہے کہ وہ کہیں جا پھنسے نمازیوں میں وہاں پانی وضوء کا نہیں ملا تو سب سے سبقت کر کے آپ نے تیمم کیا مٹی لے کر کلائی تک ملی حالانکہ تیمم میں اول منہ پر ہاتھ ملا جاتا ہے مگر ایجاد بندہ آپ نے سمجھا کہ جب یہ وضو کا خلیفہ ہے تو اس جیسا ہونا چاہیے اول کلائی پر مٹی ملی پھر منہ میں مٹی لے کر کلی کرنا چاہا اس پر سب لوگ ہنسے تب میاں شرمندہ ہوئے جب جانتے نہیں تھے تو شوق ہی کیوں ہوا سبقت کا انہیں لیڈر کا اور قصہ ہے کہ ایک بار موٹر پر سوار تھے کہ نماز کا وقت آ گیا آپ نے وہیں موٹر میں بیٹھ کر نماز پڑھی کیونکہ موٹر سے اترنا خلاف شان تھا کیونکر اتریں بہت لوگوں کو خبط ہے کہ وہ ریل میں بیٹھ کر نماز پڑھتے ہیں یاد رکھو استطاعت قیام کی حالت

میں بیٹھ کر نماز نہیں ہوتی خیر ریل میں ایک بات یہ بھی ہے کہ وہ چلتی ہے اور چلنے کے بعد ہمارے اختیار سے نہیں ٹھہرتی اور بعض دفعہ حرکت بہت ہوتی ہے اس میں معذور آدمی بیٹھ سکتا ہے۔ موٹر تو کھڑا تھا اور چلتا ہوا بھی کھینے سے فوراً ٹھہر سکتا ہے یہاں قیام سے کون سی چیز مانع تھی مگر وہ تو لیڈر تھے پھر لیڈر کے پاؤں زمین پر کیسے رکھے جا سکتے ہیں وہ تو پرندے تھے جیسے ایک پرندہ ہے کہ وہ زمین پر بیٹھتا ہی نہیں اگر کبھی بیٹھتا بھی ہے تو درخت پر پرندہ پر ایک بات فیشن کی اور یاد آ گئی کہ آجکل ایک خبط یہ بھی ہو گیا ہے کہ آدمی کے لقب بھی پرندوں کے نام پر رکھے جاتے ہیں۔ طوطی ہند۔ بلبل ہند اور اس کو فخر سمجھتے ہیں بھلا آدمی کا نام اگر جانور پر رکھ دیا گیا تو اس میں فخر کی کیا بات ہے غرض اتنی تو ناواقفی احکام ہے کہ تیمم تک کی بھی خبر نہیں اور پھر رہبر قوم کہلاتے ہیں افسوس ایسے لوگ مقتدا اور ہادی بنتے ہیں ان کی حالت کو دیکھ کر وہی شعر یاد آتا ہے کہ۔

گربہ میر و سگ وزیر و موش را دیواں کنند
ایں چنیں ارکان دولت ملک را ویراں کنند

بلی امیر، کتا وزیر اور چوہے کو دیوان مقرر کریں جب ایسے ارکان سلطنت ہوں تو ملک کو ویران کریں گے۔

واقعی یہی حالت ہے جب یہ مصلحان قوم ہیں اور یہ رہنمائے اسلام ہیں تو بس کچھ نہ پوچھو کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔

اذا كان الغراب دليل قوم
سيهديهم طريق الهالكينا

جب کوا کسی قوم کا لیڈر ہو تو وہ انہیں ہلاکت کے راستہ پر لے جائے گا۔

اپنی اصلاح کی فکر:

غرض آج کل ایسے ایسے لوگ تبلیغ اور اصلاح کو کھڑے ہوئے ہیں جن کی یہ حالت ہے تو بات کیا ہے کہ اس سے شہرت اور نمود ہوتی ہے کہ فلاں صاحب رات دن تبلیغ میں رہتے ہیں ور اپنی اصلاح کی اس لئے فکر نہیں کہ اس میں تکالیف بہت ہیں اس میں زبان پر بھی بار پڑتا ہے کیوں کہ جی چاہتا ہے کسی کی غیبت کریں پھر وعید آئی ہے تو چھوڑنا پڑتا ہے کسی حسین عورت کو دیکھ لیا یا کسی امرد حسین پر نظر پڑ گئی جی چاہتا ہے اس سے نظر نہ پھیریں بار بار تقاضا ہوتا ہے کہ اسے دیکھتے ہی رہیں ادھر یہ آیت یاد آتی ہے **قل للمومنين يغضوا من ابصارهم ويحفظوا فروجهم الآية** ادھر نفس کا تقاضا ہے کہ دیکھتا رہے ادھر یہ وعید یاد آتی ہے تو قلب پر آرہ چلتا ہے ہر لحظہ نئی موت آتی ہے۔ وہ حالت ہوتی ہے۔

کشتگان خنجر تسلیم را
ہر زماں از غیب جانے دیگر است

تسلیم و رضا کے خنجر لگے ہوؤں کو ہر آن غیب سے نئی زندگی ملتی ہے۔

میں نے یہ جھکما پڑھا ہے ورنہ یہ حالت تو سچے عشاق کی ہے جن کی شان ان شہداء کی سی ہے جن کی نسبت حدیث میں آیا ہے کہ شہداء جنت میں اپنے اجر کو دیکھ کر تمنا کریں گے کہ پھر زندہ کئے جائیں پھر مارے جائیں پھر زندہ کئے جائیں۔ یہی حال عشاق و عارفین کا دنیا میں عمر بھر رہتا ہے کہ مرتے ہیں پھر جیتے ہیں پھر مرتے ہیں مگر وہ موت و حیات کونسی ہیں وہ موت موت نفس ہے۔ اور وہ حیات حیات روح ہے ایک بار نفس کو مارا روح کو حیات ہوئی پھر کچھ دنوں میں نفس زندہ ہوا تو پھر مجاہدات سے اس کو مارا ساری عمر اسی طرح گزرتی ہے جس میں پہلے پہلے البتہ چند روز زیادہ مجاہدہ ہوتا ہے پھر تو مشاہدہ کی دولت نصیب ہو جاتی ہے شیخ فرید فرماتے ہیں۔

جائے گریہ ست ایں جہاں دروے مخند   چند روزے جہد کن باقی بخند

یہ دنیا رونے کا مقام ہے یہاں نہ ہنس چند روز محنت (مجاہدہ) کر اور باقی ہنس کر (مشاہدہ میں) اور مولانا فرماتے ہیں۔

ندریں راہ می تراش و می خراش   تادم آخر دمے فارغ مباش

اس راہ سلوک میں ادھیڑ بن میں لگے رہو یعنی خوب کوشش کرو۔ آخر وقت تک لگے رہو۔

مولانا اور شیخ فرید کے کلام میں تعارض کا شبہ نہ کرنا تیاری تو مجاہدہ کیجئے ساری عمر رکھو لیکن وہ ہوتا ہے چند ہی روز ذرا اول اول کچھ زیادہ ہوتا ہے پھر کم ہوتے ہوتے لطف ہی رہ جاتا ہے۔ حافظ محمد ضامن صاحب شہید رحمہ اللہ نے ایک سالک کو فرمایا تھا کہ میاں کیوں اپنے پیچھے جنم روگ لگایا ظرافت سے فرمایا تھا کہ یہ مجاہدات ساری عمر کرنا پڑتے ہیں ہاں اول اول قلب پر بہت بار ہوتا ہے پھر اتنی مشقت نہیں رہتی۔ مگر بالکل فارغ بھی نہیں ہو سکتے جیسے شائستہ گھوڑا بھی کبھی شوخی کرتا ہے مگر ایڑ کے اشارہ سے ٹھیک ہو جاتا ہے شائستہ تو ہے لیکن کبھی کبھی شرارت بھی کرتا ہے مگر تھوڑی سی حرکت سے ٹھیک ہو جاتا ہے اسی طرح نفس ساری عمر شرارت کرتا ہے مگر اصلاح ہونے کے بعد تھوڑی سے توجہ سے درست ہو جاتا ہے صاحبو! نفس سے کبھی بے فکر نہ ہونا چاہیے مولانا فرماتے ہیں۔

نفس اژدہاست او کے مردہ است   از غم بے آلتی افسردہ است

نفس اژدہا ہے وہ کب مرا ہے یعنی ابھی نہیں مرا غم بے آلتی سے افسردہ ہو رہا ہے۔

یعنی نفس اژدہا کے مثل ہے جو سردی میں ٹھٹھر گیا ہے سامان حرارت نہیں اس لئے مردہ کی مانند ہو گیا ہے سامان ہو تو پھر دیکھو پس ہر چند کہ فرق ضرور ہے ابتداء اور انتہا میں لیکن بالکل مطمئن

کسی وقت نہیں ہو سکتے سو یہ مصیبتیں ہیں اپنی اصلاح میں اور دوسرے کی اصلاح کیا مشکل ہے صرف زبان چلانا پڑتی ہے جو بالکل ہی آسان ہے اس لئے لوگوں کو اپنی اصلاح کی فکر نہیں ایسے ہی لوگوں کے بارہ میں عارف شیرازی فرماتے ہیں۔

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر میکنند   چوں بخلوت میر سند ایں کار دیگر میکنند
مشکلے دارم ز دانشمند مجلس باز پرس   توبہ فرمایان چرا خود توبہ کمتر میکنند

واعظین جب محراب و منبر پر جلوہ افروز ہو کر جو نیک باتیں کرتے ہیں جب خلوت میں پہنچتے ہیں تو دوسرے کام کرتے ہیں مجھے یہ مشکل درپیش ہے کہ کوئی مجلس کے عقلمندوں سے دریافت کرے کہ دوسروں کو توبہ کی تلقین خود کیوں توبہ کم کرتے ہیں۔

صاحبو! پہلے اپنی اصلاح کرو گو وہ بڑی کٹھن ہے مگر میں اس کو آسان کئے دیتا ہوں۔ دیکھئے اگر کوئی اندھا دہلی جانا چاہے تو اس کی دو صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ وہ لوگوں سے راستہ پوچھتا پھرے اور کوئی اس کو دہلی کا راستہ بتادے کہ فلاں راستہ پر جانا پھر فلاں مقام آوے گا اس سے داہنی طرف کو جانا مگر کوئی سوانکھا اس کے ساتھ نہیں ہے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ کہیں گڑھے میں گر کر مر جائے گا اور اگر جس سے راستہ پوچھا ہے وہ شفیق ہے تو وہ یہ کرے گا کہ کوئی سوانکھا جا رہا ہے اس کے ساتھ اندھے کو کردے گا اب وہ بے کھٹکے پہنچ جائے گا تو دیکھئے اندھے کو خود تو پہنچنا بہت مشکل تھا مگر چونکہ سوانکھا ساتھ ہے اس لئے اب وصول آسان ہو گیا اسی طرح اصلاح باطنی کی حالت ہے بطور خود اصداح بہت مشکل ہے مگر کسی واصل کا ہاتھ پکڑ لیا جاوے تو اب آسان ہے اسی کو مولانا فرماتے ہیں۔

قال را بگذار مرد حال شو   پیش مرد کاملے پامال شو

قال کو چھوڑو حال پیدا کرو اس کے لئے کسی شیخ کامل کے سامنے پامال ہو جاؤ۔ اور فرماتے ہیں

یار باید راہ را تنہا مرو   بے قلاوز اندریں صحرا مرو
ہر کہ تنہا نادر ایں راہ را برید   ہم بعون ہمت مردان رسید

راہ سلوک میں مددگار ہونا چاہیے اس میں تنہا قدم مت رکھو بلا (مرشد) کے اس عشق کی وادی میں مت چلو۔ اتفاقاً اس سلوک کو جس شخص نے اکیلے خود طے کیا ہے وہ مردان خدا (اللہ والوں) کی توجہ سے طے کیا ہے۔

اور شیخ فرید فرماتے ہیں۔

بے رفیقے ہر کہ شد در راہ عشق   گر ہوائے ایں سفر داری ولا

درارادت باش صادق اے فرید　　عمر بگذشت ونشد آگاه عشق
دامن رہبر بگیرد پس در آ　　تا بیابی گنج عرفاں را کلید

بلا عمر کے جس نے طریق عشق میں قدم رکھا اس نے عمر ضائع کی اور عشق سے آگاہ نہ ہوا۔ اے دل اگر محبت کے سفر کو طے کرنے کی خواہش رکھتا ہے تو کسی رہبر کامل کا دامن مضبوط پکڑے چلا آ۔ اے فرید حسن عقیدت اور ارادت کا دامن کبھی نہ چھوڑنا تا کہ تجھ کو گنج معرفت کی کنجی حاصل ہو جائے۔

گو فی نفسہ یہ طریق آسان ہے کچھ اس پر موقوف نہیں کہ کسی کا ہاتھ پکڑو اگر اپنے پاس عقل سلیم ہو تو خود ہی طے کر سکتے ہو مگر چونکہ ایسی عقل سلیم قریب قریب مفقود ہے اس لئے اگر تنہا بھی ہمت کرو گے تب بھی چار منزل چل کر کہو گے۔ یا رجلاً خذ بیدی اس وقت یہ شخص بالکل اندھا معلوم ہوگا بعض لوگوں نے گوشہ عزلت اختیار کر لیا ہے میں ان پر کوئی طعن نہیں کرتا کیوں کہ وہ تارک الدنیا ہیں مگر میں یہ ضرور کہتا ہوں کہ ساتھ میں تارک الدین بھی ہیں' کیونکہ امر بالمعروف بھی تو دین ہی ہے البتہ اگر شیخ کسی مصلحت سے اس سے چند روز کیلئے منع کر دے تو پھر نہ کرنا چاہیے مگر وہ ترک نہیں کراتا بلکہ ملتوی کراتا ہے جیسے طبیب کسی کو مسہل دیتا ہے تو بھنی ہوئی بوٹیاں کھانے سے منع کرتا ہے تو یہ نہیں کہ ساری عمر کیلئے چھڑا دیتا ہے بلکہ غذا تو یہی ہے مگر اس وقت اس کا معدہ اس قابل نہیں کہ اس کو ہضم کر سکے اسی طرح شیخ دیکھتا ہے کہ اگر یہ اب ہی سے امر بالمعروف کرنے لگا تو اس کے اندر عجب پیدا ہو جائے گا اس لئے روکتا ہے مولانا فرماتے ہیں۔

منصب تعلیم نوعے شہوتیست　　ہر خیال شہوتی در رہ بتے ست

منصب تعلیم ایک قسم کی شہوت ہے اس راہ میں شہوت کا ہر خیال بت ہے۔

چنانچہ خود میں نے ایک شخص کو جس نے اپنی تقدیس اور دوسرے کی تحقیر کے طور پر ڈانٹا تھا اور یہ سزا مقرر کی تھی کہ نمازیوں کی جوتیاں سیدھی کیا کرو ان کو لوٹے بھر کر وضو کیلئے دیا کرو کیونکہ جب اس نے نصیحت کی تھی اپنے کو اس شخص سے اچھا سمجھا تھا اور یہ کبر ہے اور اس کا علاج بھی ذلت ہے بس امر بالمعروف کیلئے ایک شرط یہ بھی ہے کہ عین نصیحت کے وقت بھی یہ نہ سمجھے کہ میں اس شخص سے اچھا ہوں شاید اس پر کوئی کہے کہ صاحب ہم تو نماز پڑھتے ہیں اور دوسرا بے نمازی ہے اس سے تو اپنے کو اچھا ہی سمجھیں گے مسلمان اپنے کو کافر سے تو اچھا ہی جانتا ہے اس کے جواب کے دو درجے ہیں ایک ذوقی دوسرا عقلی۔ ذوقی کو تم کیا سمجھو گے۔ جواب عقلی بتلاتا ہوں وہ یہ کہ الصبرة للخواتيم تو افضل وہ ہے جس کا خاتمہ اچھا ہو۔ اب کس کو پتہ ہے کہ بے نمازی کا

خاتمہ اچھا ہوگا یا ہمارا۔ اس وقت تو ہماری یہ حالت ہے۔

گہ رشک برد فرشتہ بر پاکی ما   گہ خندہ زند دیو ز ناپاکی ما
ایمان چو سلامت بلب گور بریم   احسنت بریں چستی و چالاکی ما

کبھی فرشتہ ہماری پاکدامنی پر رشک کرتا ہے کبھی شیطان ہماری پلیدی و ناپاکی پر ہنستا ہے اگر ہم اپنا ایمان قبر تک صحیح سلامت لے جائیں اس وقت ہماری چستی و چالاکی پر آفرین سمجھنا۔

بس بڑی فضیلت تو یہ ہے کہ آدمی ایمان کے ساتھ مر جاوے جو معلوم نہیں۔ اسی طرح کافر کی حالت معلوم نہیں کہ اس کا خاتمہ اچھا نہ ہوگا ممکن ہے کہ مرتے دم وہ مسلمان ہو جاوے اور اس کا خاتمہ اچھا ہو جاوے۔ پھر یہ دعوی کیسے کر سکتے ہو کہ تم اس سے اچھے ہو۔ مولانا فرماتے ہیں۔

ہیچ کافر را بخواری منگرید   کہ مسلمان بودنش باشد امید

کسی کافر کو حقیر مت جانو جبکہ اسکے مسلمان ہونے کی امید ہے۔

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے قصہ نقل کیا تھا کہ مولانا محمد قاسم صاحب نے ایک بنیے کو خواب میں دیکھا جو ان کے پڑوس میں رہتا تھا اس کے مرنے کے بعد دیکھا کہ وہ جنت کے باغ میں سیر کر رہا ہے پوچھا لالہ جی تم یہاں کیسے ہو کہا مرتے وقت کلمہ پڑھ لیا تھا اللہ تعالی نے مغفرت فرما دی۔ یہاں لالہ جی تھے وہاں گل لالہ ہو گئے کیا معلوم کس کا خاتمہ کیسا ہو۔ ایک عابد نے عیسی علیہ السلام کو دیکھا اور ان کے ساتھ ہو لیا اور ایک بدکار فاجر فاسق اپنے دروازہ پر کھڑا رہا۔ عیسی علیہ السلام کو دیکھ کر بہت جی چاہتا تھا کہ ان سے ملے مگر اپنی بدکاری پر نظر کرتے ہوئے ہمت نہ ہوتی تھی کہ آپ کے پاس آوے اپنے کو بہت ہی روکا آخر رہ نہ گیا اور ساتھ ہو لیا۔ حضرت عیسی علیہ السلام تو اخلاق سے پیش آئے اور اس جاہل عابد کمبخت متکبر نے اس کو بہت لتاڑا کہ تو ہمارے ساتھ کیسے ہو گیا اور دعا کی کہ اے اللہ مجھ کو آخرت میں بھی اس کو ساتھ جمع نہ کیجو اور اس گنہگار نے اپنی مغفرت کی دعا کی فوراً وحی آئی کہ دونوں کی دعا مقبول ہوئی اس نے تو **اللهم اغفرلی** (اے اللہ مجھے بخش دے) کہا تھا اس کو ہم نے جنتی بنا دیا اور اس نے یہ دعا کی تھی کہ میرا اس کا آخرت میں ساتھ نہ ہو ہم نے اس کی بھی دعا قبول کی کہ دوزخ میں جائے گا تا کہ اس کا ساتھ نہ ہو اسی لئے ایک عارف فرماتے ہیں۔

غافل مرو کہ مرکب میدان مرد را   در سنگلاخ بادیہ پیہا بریدہ اند
نومید ہم مباش کہ رندان بادہ نوش   ناگہ بیک خروش بمنزل رسیدہ اند

غافل ہو کر نہ چل اس سے مردان راہ کے گھوڑے سخت جنگل میں چلنے سے عاجز رہے ہیں

ناامید بھی مت ہو اس لئے کہ رند شرابی اچانک ایک نالہ سے منزل پر پہنچ گئے۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں کہ مومن مومن نہیں ہو سکتا جب تک اپنے کو کافر فرنگ سے بھی بدتر نہ سمجھے۔

غرض اس کا عقلی جواب یہی ہے کہ **الصبرة للخواتیم** اور خاتمہ کا حال معلوم نہیں کیا ہوگا۔

ایک شخص نے مجھ سے پوچھا کہ یزید پر لعنت کرنا کیسا ہے میں نے کہا لعنت کی ایسے شخص کو اجازت ہے جس کو یہ یقین ہو کہ میں اس سے اچھا ہو کر مروں گا ورنہ وہ چڑاویگا کہ کہیے یہی منہ تھا لعنت کرنے کا۔ خدا قہر سے بچاوے کیا خبر اب تو اپنے کو بایزید سمجھتے ہو اور وہاں کہیں یا حذف ہو کر یزید ہی نہ رہ جاؤ۔ اس لئے شیوخ جب تک کسی کے اندر عجب و پندار دیکھتے ہیں اس تک امر بالمعروف ونہی عن المنکر سے منع کر دیتے ہیں پھر جب اہل ہو جاتا ہے اجازت دیتے ہیں سو اصل فرض تو امر بالمعروف ونہی عن المنکر ہی ہے مگر عوارض کیوجہ سے روک دیتے ہیں جیسے مریض کو گوشت بوٹی سے روکا جاتا ہے ایک اور مثال دیتا ہوں اس سے وہ ذوقی جواب سمجھنے کی کسی قدر قابلیت ہو جائے گی گو تفصیل سے نہ سمجھ سکو۔ مثلاً کسی شہزادہ نے کوئی جرم کیا ہو اور بادشاہ کی طرف سے کسی بھنگی کو حکم ہوا ہو کہ شہزادہ کے ایک درجن بید لگاؤ اور بادشاہ بھی عادل ہے ظالم نہیں اور یہ بے چارہ بھنگی ہے اور وہ شہزادہ ہے اب وہ لنگی باندھ کر بید لگاتا ہے کیا کرے شاہی حکم ہے گو بید مارتے ہوئے اس کی روح نکلتی ہو۔ اب دیکھنا چاہیے کہ ضارب تو بھنگی ہے اور مضروب شہزادہ ہے مگر باوجود اس کے کیا یہ بھنگی بید لگانے کے وقت یہ سمجھے گا کہ میں اس سے افضل ہوں نہیں ہرگز نہیں اس کا تصور بھی اس کے ذہن میں نہ آوے گا مگر مجبوراً مارنا پڑتا ہے اگر نہ مارے تو مجرم بنے کیا کرے ہاتھ اٹھتا نہیں روح فنا ہوتی ہے حالت یہ ہے کہ بید تو مارتا ہے اس کی کمر پر مگر اپنے قلب پر بھی آرہ چل رہا ہے ذرا ہاتھ ڈھیلا ہوا اور بادشاہ نے کہا زور سے مار اب بیچارہ شرم کے مارے مرا جا رہا ہے مگر کرے کیا۔

چوں طمع خواہد زمن سلطان دیں　　خاک برفرق قناعت بعد ازیں

جب دین کا بادشاہ مجھ سے طمع کا اظہار کرے تو پھر ایسی قناعت پر خاک

جب یہ مثال سمجھ میں آ گئی تو اب سمجھو اگر کسی وقت مصلح کو حکم شرعی یہ ہو کہ بے نمازی کو دھمکاوے اور مارے تو جیسے بھنگی عین ضرب کے وقت اپنی حقیقت کو دیکھ رہا ہے اسی طرح جو عارف ہوگا وہ عین عتاب کے وقت یہ سمجھے گا کہ ممکن ہے اس کا درجہ مجھ سے بڑھا ہوا ہو اور میں اس سے کم درجہ ہوں مگر حکم سے مجبور ہوں جب آپ کو یہ درجہ حاصل ہو جائے اس وقت قابلیت ہوگی امر بالمعروف کی

اس سے ثابت ہوا کہ شیوخ کا امر بالمعروف سے کسی مرید کو منع کرنا برا نہیں ہے میں یہ کہہ رہا تھا کہ جیسے دوسرے کی اصلاح کے درپے ہوتے ہو اول اپنی اصلاح کی فکر کرنی چاہیے اور تربیت کی فرصت نہ ہو تو یہ دونوں کام دوش بدوش ہوں مگر اس جمع کا طریقہ کسی بزرگ سے پوچھ لو چاہے اس کے مرید مت ہو میں مرید ہونے کو نہیں کہتا بلکہ ان سے مشورہ لینے کو کہتا ہوں کیونکہ اس کی اونچ نیچ نشیب وفراز کو وہ خوب سمجھ سکتے ہیں جہاں ان کا ذہن پہنچتا ہے وہاں تک تمہاری عقل کی رسائی نہیں ہوگی پس جیسے کسی طبیب سے نسخہ لکھوا لیتے ہو اسی طرح کسی شیخ سے پوچھ کر کام کرو۔ مرید تو نہ ہو مگر اس کے اتباع کو ویسا ہی لازم سمجھو جیسے پیر کے حکم کو لازم سمجھتے ہو۔ غرض اصل ترتیب یہی ہے کہ پہلے اپنی اصلاح کرو پھر دوسرے کی پھر دوسروں کی اصلاح میں بھی پہلے اپنے گھر کی اصلاح کرو پھر نوکر چاکر کی پھر اپنے ہم وطنوں کی پھر ان میں جو کافر ہوں ان کو اسلام کی ترغیب دو ان کو اسلام کے محاسن سے مطلع کرو مگر طعن وتشنیع مت کرو دیکھو اگر تمہیں کسی کو حسین معشوق پر عاشق بنانا ہے اور دوسرے بدشکل آدمی سے اس کو پھرانا ہے جو اس کے دل میں رچا ہوا ہے اور اس کی محبت اس کے دل میں جاں گزیں ہے تو اول تو وہ تم سے جھگڑے گا اور اپنے معشوق کو اچھا کہے گا اس سے رنجیدہ نہ ہو اور کچھ معارضہ نہ کرو بلکہ اس کو اپنے معشوق کی ادائیں دکھلاؤ جب وہ اس کی ادائیں دیکھ لے گا تو فوراً کہے گا۔

زفرق تابقدم ہر کجا کہ مینگرم　　　کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجاست

سر سے قدم تک جس جگہ دیکھتا ہوں کرشمہ دامن دل کو کھینچتا ہے کہ یہی جگہ محبوب کی ہے۔

وہ خود ہی کہے گا کہ ارے میں نے کہاں اپنی عمر برباد کی۔ ایسے دلکش دلربا معشوق کو چھوڑ کر کس چڑیل کے پیچھے میں نے اپنی جان کھپائی۔ صاحبو! اسلام کی خوبیاں صاف صاف ہیں پھر باوجود سادگی کے دلکش ہیں متنبی شاعر کہتا ہے۔

حسن الحضارة محبوب بتطرية　　　وفي البداوة حسن غير مجلوب

یعنی شہری معشوق کا حسن بناوٹی ہوتا ہے اور دیہاتی میں اصلی حسن ہوتا ہے اسی کے متعلق عارف شیرازی فرماتے ہیں۔

دل فریبان نباتی ہمہ زیور بستند　　　دلبر ماست کہ با حسن خداداد آمد

خودرو پودے زیور سے آراستہ ہیں ہمارے محبوب میں خداداد حسن ہے۔

تبلیغ میں بے فکری:

اور اسلام کا حسن خداداد اور دلکشی بھی ایک بناء ہے تبلیغ سے اہل حق کی ایک درجہ میں بے فکری

کی اور یہ ایک راز ہے جی تو چاہتا نہیں کہ اس کو بیان کروں کہیں لوگ اس سے مر بالمعروف میں زیادہ سستی نہ کرنے لگیں مگر جب میں نے سستی کی مذمت بیان کر دی پھر اس راز کو کیوں چھپاؤں جب کہ اس سے اسلام کی خوبی نکلتی ہے وہ راز یہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ اہل باطل اپنے مذہب کے پھیلانے میں بڑی بڑی تدبیر کرتے ہیں مال سے۔ جان سے۔ جاہ سے ہر طرح اس میں کھپے رہتے ہیں اور اہل حق اکثر ایسے بے فکر ہیں کہ اشاعت اسلام کو اپنا کام بھی نہیں سمجھتے بلکہ اللہ میاں کا کام سمجھتے ہیں کہ حضور آپ کی جائیداد ہے ہمیں تو نفع سے مطلب ہے کہ ہم کو کھانے کو مل جائے تو بس کافی ہے باقی جائیداد کا انتظام خود آپ کر لیں چنانچہ آپ نے انا لہٗ لحافظون فرمایا بھی ہے۔

سو اصل تو اس کی یہ ہے کہ اہل باطل اپنے بطلان کو جانتے ہیں اور اس لئے سمجھتے ہیں کہ امداد غیبی تو ہوگی نہیں ہم بھی اگر کوشش نہ کریں گے تو مذہب ہی مٹ جاوے گا اور اہل حق اسلام کو حق سمجھ کر تائید حق کا یقین رکھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ بدون ہماری کوشش کے بھی اس کی ترقی ہوگی سو اس اصل کے اعتقاد میں تو کوئی ملامت نہیں مگر اس میں غلو کر لیا کہ جتنی کوشش کا حکم ہے اس میں بھی کوتاہی کرتے ہیں اور حیرت کی بات ہے کہ قرآن مجید کے حفظ کرنے کو تو جو کہ ایک فرد ہے حفاظت قرآن کی اس طرح خدا کے حوالے نہ کیا بلکہ تین تین چار برس سر مار کے یاد کرتے ہیں۔ پھر ہمیشہ دور کرتے رہتے ہیں اور اسلام کی حفاظت کو اس طرح خدا کے حوالے کیا کہ ذرا سعی نہیں کرتے۔ اگر قرآن مجید کے متعلق کوئی ان سے سوال کرے کہ میاں قرآن کا بھی تو خدا حافظ ہے پھر تم یاد کیوں کرتے ہو؟ تو وہاں جواب دیتے ہیں کہ یہ بھی تو خدائی محافظت ہے کہ ہم کو حکم دیا ہے کہ ہم یاد کریں اور اس ذریعہ سے اس کو قائم رکھیں۔ سو ایسا ہی اسلام کے متعلق معاملہ ہونا چاہیے کہ یہ بھی خدائی حفاظت ہے کہ ہم کو حکم دے دیا کہ اسلام کی خدمت کریں اور اسلام کو قائم رکھیں غرض یہاں ایسی بھاری غلطی کی کہ حفاظت و اشاعت اسلام سے بالکل بے فکر ہو گئے۔ اور قریب قریب جتنے اہل حق ہیں سب ہی بے فکر ہیں اور گو اس بے فکری کا راز اصل میں یہی ہے کہ اسلام کا حسن ہی ایسا ہے کہ جو کوئی اس کو نظر انصاف سے دیکھے گا وہ اس کی طرف خود ہی مائل ہو جاوے گا کسی کے بلانے کی ضرورت نہیں بقول حافظ شیرازیؒ کے۔

ز عشق ناتمام ما جمال یار مستغنی ست
باب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را

جمال محبوب ہمارے عشق ناتمام سے مستغنی ہے جس طرح زیبا صورت کو رنگ و روپ، خط و خال کی حاجت نہیں۔

سو اس کو تو میں تسلیم کرتا ہوں کہ آب و رنگ خال و خط اسلام میں خود ہی بہت کچھ ہے اور ضرور ہے۔ مگر اتنا تو کرنا تمہارا کام ہے کہ کسی آنکھ بند کرنے والے کی آنکھ کھول دو۔ اسے ایک دفعہ اس کا چہرہ دکھا دو پھر یہ اپنا کام خود ہی کر لے گا گو جن لوگوں نے اس کا چہرہ نہیں دیکھا ان پر بھی اس کا قبول کرنا اس لئے فرض ہو گیا ہے کہ وہ دیکھ سکتے ہیں اور یہ نہ دیکھیں تو ایسوں نے دیکھ لیا ہے جن کا دیکھنا ان پر حجت ہے لیکن اگر ان کو بھی دکھلا دو تو ان کا یہ جہل رفع ہو جاوے گا کہ ہم نے تو دیکھا ہی نہیں اس لئے ہم مکلف نہیں۔

جیسے کوئی ڈوم تھا اس نے سنا تھا کہ چاند دیکھنے سے روزہ فرض ہو جاتا ہے اس نے رمضان کا مہینہ آتے ہی گھر میں ایک پاخانہ کا برتن رکھ لیا وہاں ہی ہگتا موتتا تھا کہ مبادا گھر سے نکلے تو کہیں چاند نظر نہ آ جاوے پھر روزہ فرض ہو جاوے گا دو چار دن تو عورت نے خدمت کی پھر ہاتھ پکڑ کر کہا نکل یہ کہاں کی پخ لگائی اچھا خاصا تندرست آدمی اور میں اس کا گوہ موت صاف کروں جا نکل اب جنگل جانا تجویز کیا کہ کبھی شہر میں کوئی دل لگی میں منہ اوپر کو اٹھا دے اور چاند نظر پڑ جائے اب جو وہ جنگل میں پاخانہ کر کے تالاب پر آبدست کرنے گیا تو پانی میں چاند نظر آ گیا اب چاند سے کہتا ہے گھس جا آنکھوں میں کر دے روجا فرج ہم تو دیکھتے نہیں تو آنکھوں میں گھسا آتا ہے۔ سنگ آمد سخت آمد کا مضمون ہے غرض چاند کو تو اس کی ضرورت نہیں کہ اس کے نور کو کوئی دکھلا دے مگر جو شخص جہل سے آنکھ نیچے کئے ہوئے ہے جہل رفع کرنے کیلئے ذرا اس کی آنکھ تو اوپر کو کرو۔ بس یہ حاصل ہے امر بالمعروف کی حقیقت کا۔ کہ جو کوئی اسلام کا حسن دیکھنا چاہے یا آنکھیں نیچی ہونیکی وجہ سے نہ دیکھے اس کو دکھا دینا چاہیے اب میں اسلام کی کچھ خوبیاں بطور نمونہ کے بیان کرتا ہوں لوگوں نے آج کل ایک بڑی غلطی کی ہے اسی غلطی پر تنبیہ کرنے سے اسلام کا حسن نمایاں ہو جاوے گا وہ غلطی یہ کی ہے کہ جیسے آج کل سب چیزوں کا ست نکالا جاتا ہے اسی طرح لوگوں نے اسلام کا بھی ست نکالا ہے حکم تو یہ ہے **ادخلوا فی السلم کافة** کہ اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ اور لوگوں نے اس کا خلاصہ نکالا تو اب اسلام صرف نماز روزہ حج زکوۃ کا نام رہ گیا اور باقی احکام معاملات و عقائد و معاشرت و اخلاق کو کالخارج کر دیا گویا وہ اسلام میں داخل ہی نہیں چنانچہ دیکھا جاتا ہے کہ لوگ نماز تو پڑھ لیتے ہیں مگر عقائد کی فکر نہیں کہ یہ موافق شرع کے ہیں یا نہیں۔ بعضوں کے ایسے عقائد ہیں کہ کفر تک نوبت پہنچتی ہے اس کی کسی کو فکر نہیں اسی طرح معاملات کا حال ہے بلکہ اس کو تو عقائد سے بھی زیادہ دین سے بے تعلق سمجھتے ہیں دلیل اس کی یہ ہے کہ جب کسی رہن بیع وغیرہ کا مسودہ لکھواتے ہیں تو وکیل کو تو دکھلاتے ہیں کہ یہ

قانون کے موافق ہے یا مخالف مگر کبھی کسی کو یہ بھی کرتے دیکھا ہے کہ اس نے کسی عالم سے پوچھا ہو کہ یہ مسودہ شرع کے موافق ہے یا نہیں اگر یہ کہو کہ صاحب اگر کسی عالم کو دکھلائیں تو جیسے وہ بتلادیں گے وہ یقیناً قانون کے موافق نہ ہوگا پھر یہ مسودہ کس کام کا رہے گا تو یہ عذر محض غلط ہے جب تم نے تو کسی عالم کو دکھلایا ہی نہیں تمہیں کیا خبر کہ وہ شریعت اور قانون کو جمع کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اگر کبھی ایسی مشکل پڑے تو کسی محقق عالم سے پوچھو جب شریعت اور قانون میں مخالفت ہوگی، وہ تفصیل وار حکم بتلادے گا جو اکثر صورتوں میں قانون کے بھی موافق ہوگا بشرطیکہ وہ فعل کھلم کھلا خلاف شریعت نہ ہو۔ یہ نہیں کہ زنا چوری کو بھی شریعت جائز کردے گی بلکہ مطلب یہ ہے کہ جائز معاملات کی صورت علماء اکثر ایسی بتلادیں گے کہ قانون کے بھی خلاف نہ ہوگی بہرحال پوچھنے ہی سے تو اس کا پتہ لگے گا لیکن معاملات کو تو دین میں داخل سمجھتے ہی نہیں آج کل لوگوں کے زعم میں بیع باطل یا فاسد کرنے سے تو دین نہیں جاتا البتہ نماز روزہ نہ کرنے سے جاتا رہتا ہے۔

اسی طرح یہ سمجھ لیا ہے کہ معاملات و معاشرت کا دین سے کچھ علاقہ ہی نہیں کوئی یہ نہیں سمجھتا کہ بلا ٹکٹ کے ریل کا سفر کرنا گناہ ہے خیر ایسے لوگ تو کچھ کم بھی ہیں مگر پندرہ سیر کے بجائے بیس سیر لیجانے والے تو بہت ہی کثرت سے ہیں۔ اس کی پرواہ ہی نہیں۔

اجزائے اسلام:

غرض لوگوں نے شریعت کا خلاصہ نکالا حالانکہ وہ اور سخت حماقت ہے اسلام کامل مکمل اور بہت مفصل مکمل قانون ہے جس کا خلاصہ ہو ہی نہیں سکتا اب اس کے مفصل مکمل ہونے کو ثابت کرنے کیلئے بتلاتا ہوں کہ اس کے کتنے اجزاء ہیں سو سمجھ لو کہ اس کے یہ اجزاء ہیں ایک عقائد دوسرے دیانات جیسے نماز، روزہ حج زکوٰۃ تیسرے معاملات جیسے ہبہ بیع وغیرہ چوتھے معاشرت یعنی آپس میں ایک دوسرے سے کس طرح ملنا جلنا چاہیے کیا برتاؤ رکھنا چاہیے۔ سب کے حقوق ادا کرنا۔ بیٹے کے خاص حقوق ہیں رعیت کے خاص حقوق ہیں حاکم کے خاص حقوق ہیں پڑوس کے خاص حقوق ہیں۔ پانچویں اخلاق باطنی جیسے صبر۔ شکر۔ زہد، توکل، محبت حق، تفویض۔ تسلیم، رضا۔ مراقبہ موت۔ مراقبہ حساب۔ یہ اعمال باطنی ہیں جن کو خلق کہتے ہیں تو شریعت کے پانچ اجزاء ہوئے اب ان پانچ چیزوں میں سے ایک ایک کو دیکھ لو ان کے اندر کیسی کیسی خوبیاں ہیں ایک مشترک خوبی تو یہی ہے کہ اس سے نجات آخرت حاصل ہوتی ہے مگر اس کے علاوہ ہر ایک میں

خاص خاص خوبیاں بھی ہیں جن کا دنیوی مصالح پر بھی اثر پڑتا ہے اب ان خوبیوں کو سمجھو۔

فوائد توحید:

چنانچہ پہلا جزو اسلام کا عقائد ہے اس کی خوبی کو دیکھو کہ اسلام کا بہت بڑا عقیدہ یہ ہے کہ خدا کو واحد مانو موجود مانو۔ یعنی تمام کمالات علم وقدرت وغیرہ میں وہ یکتا ہے اس کا علم ایسا ہے کہ اس سے کوئی چیز خارج نہیں۔ قدرت ایسی ہے کہ کوئی ممکن چیز اس کی قدرت سے خارج نہیں۔ یہ عقیدہ قطع نظر اس سے کہ دلائل سے اس کا ہونا ثابت ہے، اس کے ثمرات دنیوی کو دیکھئے جو شخص اپنے سر پر ایسے مالک کو مانے گا جو ہر طرح سے کامل ہے اس کا اثر خاص یہ ہوگا کہ اس کے دل میں خدا تعالیٰ کی ہیبت وعظمت ہوگی اور ان سے محبت ہوگی کیوں کہ بادشاہ جتنا کامل ہوگا اتنی ہی محبت وہیبت زیادہ ہوتی ہے پھر حق تعالیٰ ایسے جمیل ہیں کہ کوئی ان کے جمال کے قریب قریب بھی نہیں۔ جب کسی کے قلب میں خدا تعالیٰ کی ہیبت ومحبت ہوگی تو کسی شخص کو اس سے ایذا نہ پہنچے گی وہ کسی کا حق تلف نہ کرے گا کیوں کہ ڈرے گا کہ خدا ناراض ہوگا۔ ادھر تو محبت کا تقاضا محبوب کو راضی رکھنا ہے پھر ہیبت کے سبب اس کی مخالفت کرتے ہوئے جان نکلے گی۔ قطع نظر دوزخ جنت کے خوف وطمع کے اگر حق تعالیٰ کی یہ محبت وہیبت پیدا ہو جائے تو ایسا شخص ہرگز مخالفت نہیں کرسکتا چنانچہ حدیث میں ایک صحابی کی بابت آپ فرماتے ہیں کہ اگر ان کو خدا کا خوف بھی نہ ہو تو بھی نافرمانی نہ کرے گا وہ کیا چیز ہے جو نافرمانی نہ کرنے دے گی؟ وہ محبت ہی تو ہے۔ دیکھئے فوائد اس عقیدے کے بھلا جو شخص خدا کے ساتھ یہ عقیدہ رکھے گا کیا وہ کبھی اس کی نافرمانی کرے گا ہرگز نہیں برخلاف اس کے جو کوئی حاکم دنیا ہی سے خائف ہو وہ جرائم سے اتنا پرہیز نہ کرے گا۔ کیوں کہ دنیا کا حاکم ہر وقت سامنے نہیں اگر پیٹھ پیچھے کچھ کرلیا تو اس کو خبر بھی نہ ہوگی مثلاً کسی کے پاس کوئی خط آیا اس وقت اس کے سامنے کوئی پولیس کا آدمی بھی نہیں ہے اور لفافہ کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ ٹکٹ پر مہر نہیں پڑی بالکل سادہ صاف ہے تو اب دو قسم کے لوگ ہیں ایک تو وہ جن کو خدا کا خوف یا اس سے محبت ہے اور ایک وہ جس کو خوف خدا نہیں ایسے شخص کو اس وقت کوئی قوت روکنے والی نہیں ہے کہ وہ کچھ اس سے کام نہ لے اور یہ جرم ہے جس میں ڈاکخانہ کا نقصان ہے گو کم ہی ہو مگر خبر یہی ہے کہ ایک پائی کی خیانت بھی خیانت ہی ہے بخلاف اس شخص کے جس کو خوف خدا ہے وہ اس پر ہرگز جرات نہیں کرسکتا کہ اس ٹکٹ سے کچھ کام لے گو کسی کو اس کی خبر نہ ہو کوئی اس کو دیکھ نہ رہا ہو مگر مالک حقیقی کو تو خبر ہے اس لئے وہ خط پڑھنے سے پہلے اس

ٹکٹ کو چاک کر دیگا۔ دیکھئے یہ دنیا کا نفع پہنچا حکومت کو یا نہیں؟ اور یہ محض اس لئے کہ اس شخص کا عقیدہ یہ ہے کہ جیسے اللہ تعالیٰ رحم میں کامل ہیں انتقام میں بھی کامل ہیں۔

اور دیکھو فرض کرو کہ تم ریل میں جا رہے ہو ایک بچہ ملا۔ یتیم جس کے ساتھ کوئی نہیں اور ایک ہزار کا نوٹ اس کے پاس ہے اس نے کہا ہم کو فلاں جگہ پہنچا دو۔ راستہ میں اتفاق سے وہ مر گیا اور کوئی نہیں جانتا کہ اس کے پاس اتنے روپے ہیں نہ ریل والے جانتے ہیں اور نہ کسی مسافر کو خبر ہے اور نہ ہم کو اس کی جان پہچان ہے صرف اتنا جانتے ہیں کہ فلاں جگہ جانے والا ہے غسل دینے کے وقت جو پہلا کپڑا اس کے بدن سے نکالا تو جیب سے ہزار کا نوٹ نکلا اب کسی کو خبر بھی نہیں اور تم حاجت مند بھی ہو کہ دس ہزار کے قرض دار بھی ہو جس میں جائیداد نیلام ہونے والی ہے آبرو پر بن رہی ہے۔ فرمایئے کوئی قوت ہے اس وقت اس نوٹ کے لینے سے روکنے والی۔ اب خیال کیجئے کہ ایک تو دہری ہے جو خدا کا قائل نہیں اور اس کو ایسا موقع پیش آوے وہ تو یقیناً سب روپیہ دبا لے گا اور ایک وہ ہے جس کے دل میں خدا کا خوف ہے وہ اس یتیم بچہ کے بتلائے ہوئے موقع پر جاوے گا اور اس کے ورثہ کو تلاش کر کے یہ روپیہ سب کو حصہ رسد بانٹ دے گا اگر وہاں کوئی نہ ملے تو اس میں لقطہ کے احکام جاری کرے گا۔ دیکھئے یہ کیسا پاکیزہ عقیدہ ہے جس نے ایک عالم کو خطرہ سے بچا لیا یہ اسی عقیدہ کی بدولت ہوا کہ خداوند کریم کامل ہے علم و قدرت میں۔

برکات تقدیر:

اور اسلام کا ایک عقیدہ اور ہے کہ خداوند کریم نے جس چیز کو جس طرح مقدر کیا اسی طرح ہوگا اس کی برکت اور نافع ہونے کو خیال فرمایئے اس کا بیان یہ ہے کہ بڑا دنیوی نفع انسان کا جو اصلی مقصود ہے راحت ہے کماتا ہے اسی لئے کہ راحت ہو اولاد کی تمنا کرتا ہے اسی لئے تاکہ راحت ہو دوست جائیداد سے بھی مطلوب راحت ہی ہے۔ مکان بناتا ہے راحت ہی کیلئے غرض مطلوب ہر چیز میں راحت ہی ہے اب اس تمہید کے بعد میں کہتا ہوں کہ اگر دنیا میں کوئی ناقابل تدارک مصیبت میں مبتلا ہو جائے تو اب دیکھنا چاہیے کہ اس کی راحت کا کوئی سامان کسی کے پاس ہے نہیں ہرگز نہیں مگر میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ اسلام کے پاس اس کی بھی راحت کا سامان موجود ہے اور وہی عقیدہ تقدیر ہے بخدا اس عقیدہ کے بدون اس کو راحت ہرگز میسر نہیں ہو سکتی اور یہ عقیدہ اسلام کے سوا کسی کے پاس نہیں کہ ہر چیز مقدر کے موافق ہوتی ہے کسی کا جوان لائق بیٹا مر جاوے اور اس کا یہ اعتقاد نہ ہو تو عمر بھر مصیبت میں مبتلا رہے گا کہ ہائے اس کا علاج اچھی طرح کرتا تو نہ مرتا ہائے

اس کا پرہیز اچھی طرح نہ ہوا اگر فلاں ڈاکٹر کے پاس لے جاتا تو اچھا ہو جاتا یہ تو منکر عقیدہ تقدیر کی حالت ہوگی اور ایک وہ ہے جس کا یہ عقیدہ ہے کہ ہر چیز تقدیر کے موافق ہوتی اور اس میں حکمت ہوتی ہے اگر اس کا کوئی ایسا ہی عزیز مر جاوے تو گو اس کو رنج طبعی تو ہوگا اور وسوسہ کے طور پر اگر اس کو یہ خیال بھی ہو کہ دوا میں غلطی ہوگئی تو تھوڑی ہی دیر کے بعد معاً پھر وہ اسی سے تسلی حاصل کریگا کہ یہ بات بھی تقدیر ہی میں تھی کہ دوا میں غلطی ہو جائے اول اول تو اسے ضرور حزن تھا۔ مگر تفویض کے ساتھ تھا پھر بعد چندے وہ بھی زائل ہو گیا بخلاف دہری شخص کے وہ تو تمام عمر ہی غم والم میں گھٹتا رہے گا تو دیکھئے مسئلہ تقدیر کا دنیوی بھی کتنا بڑا نفع عظیم ہے اور حق تعالیٰ نے بھی اس حکمت کو بیان فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں۔ **ما اصاب من مصيبة في الارض ولا في انفسكم الا في كتاب من قبل ان نبرأها ان ذالک على الله يسير لكيلا تاسوا على مافاتكم ولا تفرحوا بما اتكم والله لا يحب كل مختال فخور** (کوئی مصیبت نہ دنیا میں آتی ہے اور نہ خاص تمہاری جانوں میں مگر وہ ایک بار کتاب میں لکھی ہے قبل اسکے کہ ہم ان جانوں کو پیدا کریں۔ بیشک یہ اللہ کے نزدیک آسان کام ہے۔ تاکہ جو چیز تم سے جاتی رہے تم اس پر رنج نہ کرو اور تاکہ جو چیز تم کو عطا فرمائی ہے اس پر اتراؤ نہیں اور اللہ تعالیٰ کسی اترانے والے شیخی باز کو پسند نہیں کرتا) یہ لام کی ایک مقدر کے متعلق ہے جس پر پہلا جملہ دال ہے یعنی **اخبركم بهذا لكيلا تاسوا** یعنی ہم نے مسئلہ تقدیر کو اس لئے بیان کیا تاکہ تم کو رنج نہ ہو مافات پر اور نہ اتراؤ ما آتی پر۔ یہ تو مصیبت کا ذکر تھا۔ میں اور ترقی کر کے کہتا ہوں کہ جو مسئلہ تقدیر کے معتقد نہیں ان کو نعمت میں بھی راحت نہیں ہے کیونکہ انسان کے اندر اکثر طبعاً حرص بہت ہوتی ہے اس کو جتنا بھی ملے اسی قدر اس کی حرص بڑھتی ہے کہ اور ترقی ہو۔ ایک گاؤں کا مالک ہو تو ذہن میں حرکت ہوئی کہ ایک گاؤں اور مل جاوے اسی طرح اس کی کوئی انتہا ہی نہیں ہے عمر بھر چین نہیں ہے چاہے کتنا ہی صاحب جائیداد ہو جاوے مگر حرص کا مادہ اور بڑھتا ہے اور جو تقدیر کا قائل ہے وہ ہر درجہ میں قانع ہو جاتا ہے اسے جتنا بھی ملے کہے گا کہ اتنا ہی میری تقدیر میں تھا اور بھی کچھ اگر تقدیر میں ہوگا وہ بھی ضرور ملے گا وہ ہر وقت بادشاہ ہے گو ظاہر میں مفلس ہو۔ چین سے بیٹھا ہے اسے کوئی فکر و رنج پریشانی نہیں ہے۔

ان کے چین کا حال کیا بیان کروں۔ حضرت شیخ عبدالقادرؒ کو ملک نیمروز کے بادشاہ سنجر نے لکھا تھا کہ آپ کی خانقاہ کیلئے میں ملک نیمروز کا ایک معتدبہ بڑا حصہ دینا چاہتا ہوں آپ نے جواب میں یہ تحریر فرمایا۔

چوں چتر سنجری رخ بختم سیاہ باد　　در دل بوداگر ہوس ملک سنجرم
زانگہ کہ یافتم خبراز ملک نیمشب　　من ملک نیمروز بیک جو نمخرم

یعنی میرے دل میں اگر ملک نیمروز کی ہوس ہو تو میرا چہرہ سنجری چتر کی طرح سیاہ ہو جائے اس وقت اس سلاطین کا چتر سیاہ ہوتا تھا اور فرمایا۔

زانگہ کہ یافتم خبراز ملک نیمشب　　من ملک نیمروز بیک جو نمخرم

جب سے مجھے نیم شب کی سلطنت ملی ہے میں اس نیمروز کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتا یعنی آدھی رات کو اٹھ کر اللہ اللہ کہنا یہی ہے بڑی سلطنت۔ نیمروز کی سلطنت سے کیا ہوگا صاحبو! آخر یہ کاہے کی برکت ہے۔ مسئلہ تقدیر ہی کی برکت ہے وہ جانتے تھے کہ جو ملنے والا ہے ضرور ملے گا ہم کو اس میں سرگردانی اور پریشانی اٹھانے کی کیا ضرورت پڑی ہے اور واقعی ایسا ہی ہوتا ہے کہ جو ملنے کی چیز ہے وہ ضرور ملتی ہے اور جو تقدیر میں نہیں وہ ہزار تدبیر سے بھی حاصل نہیں ہوتی یہ ہے عیش اور راحت جو بادشاہوں کو بھی میسر نہیں اور جس طرح اس عقیدہ والے کو کسی سے طمع نہیں ہوتی جیسا کہ بیان ہوا اس طرح اس کو کسی سے خوف بھی نہیں ہوتا وہ بڑے سے بڑے بادشاہوں کو بھی منہ نہیں لگاتے کیوں کہ ان کا عقیدہ یہ ہے **ماھم بضارین به من احد الا باذن اللہ** کہ بلا حکم پروردگار کوئی تکلیف نہیں پہنچا سکتا اور اگر ادھر ہی سے حکم ہے تو بہ دل وجان راضی ہیں۔ حضرت علیؓ صفین کی لڑائی کے میدان میں گھوڑے پر اونگھ رہے تھے کسی نے عرض کیا حضرت یہ میدان حرب وضرب ہے گردنیں گیند کی طرح اڑ رہی ہیں آپ کو نیند آ رہی ہے جواب دیا۔

ای یومین من الموت افر　　یوم لا یقدرا ویوم قدر

فرمایا کونسی تاریخ میں موت سے بھاگوں یا تو مقدر دن میں یا غیر مقدر دن میں۔

یوم لا یقدرلا یاتی القضا　　یوم قد قدر لایغنے الحدر

ہے کوئی ایسا شخص جو میدان جنگ میں اپنے کو ایسی شان سے دکھلا سکے؟ یہ حضرت علیؓ ہی کی ہمت ہے یا انکے غلاموں کی۔ فرمائیے یہ ہمت وجرات کاہے سے ہے؟ اسی عقیدہ کی بدولت اسی کو فرماتے ہیں۔

موحد چہ برپائے ریزی زرش　　چہ فولاد ہندی نہی برسرش
امید وہراسش نباشد زکس　　ہمیں ست بنیاد توحید وبس

مؤحد کے قدموں میں خواہ سونا بکھیر دیں یا اسکے سر پر ہندی تلوار رکھ دیں اسے امید وخوف (سوائے خدا کے) اور کسی سے نہیں۔ توحید کی بنیاد بس یہی ہے۔

اور اگر کسی معتقد تقدیر میں اتنی قوت نہ پائی جاوے تو اس کی وجہ یہ ہوگی کہ خود اس اعتقاد میں اتنی ہی کمی ہوگی خواہ جزم کی کمی ہو خواہ غلبہ حال کی کمی ہو یہ تو بڑے درجہ والوں کی باتیں ہیں۔

اب میں ادنیٰ سا ایک نمونہ دکھلاتا ہوں اصلی کے تو ہم اہل ہی کہاں ہیں گو اس نمونہ کو بیان کرتے ہوئے شرم بھی آتی ہے کیوں کہ صورت دعویٰ کی سی ہے۔ مگر حاشا وکلا میرا مقصود دعویٰ نہیں ہے صرف ایک نمونہ دکھلانا ہے۔ میرے پاس ایک رئیس کا خط آیا تھا کہ میں تمہارے مدرسہ کیلئے دو سو روپیہ بھیجتا ہوں اور میں تم کو بلاؤں گا بھی میں نے منی آرڈر واپس کر دیا اور یہ لکھا کہ آپ روپے بھیج کر مجھ کو متاثر بنانا چاہتے ہیں، روپیہ اپنے پاس رکھئے اور اب بلانے کی تحریک کیجئے لوگوں کو خیال بھی ہوا کہ اتنی بڑی رقم کو کیوں واپس کر دی۔ مدرسہ کا کوئی کام نکل جاتا میں نے کہا اگر یہ مدرسہ کی تقدیر کا ہے تو پھر آوے گا چنانچہ پھر منی آرڈر آیا اور معذرت کی کہ میری غلطی ہوئی یہ رقم حسبۃً للہ مدرسہ کو دیتا ہوں اور بلانے کی درخواست کو واپس لیتا ہوں اب میں نے لے لیا اور لکھ دیا کہ آپ کی تہذیب سے اب مجھ کو آپ کے ملنے کا اشتیاق ہو گیا پھر مدت کے بعد انہوں نے بلایا تو چلا گیا اب بتلائیے روپے آنے والے تھے۔ ٹالنے سے بھی نہ ٹلے۔ کیا کوئی منکر تقدیر ایسا کر سکتا ہے؟ اور ایک جگہ سے پانچ روپے آئے اور لکھا کہ طلبہ سے میرے واسطے دعا کراؤ۔ میں نے واپس کر دیا اور لکھا کہ یہاں دعا کی کوئی دکان نہیں ہے پھر اس نے لکھا میں دعا نہیں چاہتا اور معذرت کے ساتھ روپیہ پھر بھیجا ہم نے لے لیا اور لکھ دیا کہ آپ کے واسطے خاص طور پر دعا بھی کی گئی مگر تمہیں یہ حق نہیں ہے کہ روپیہ دیکر دعا کی درخواست کرو تم کو تو برعکس ہمارے لئے دعا کرنا چاہیے کہ تمہاری رقم ہم نے لے لی اور تمہاری طرف سے کار خیر میں لگا دی۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

ویطعمون الطعام علیٰ حبه مسکینا ویتیما واسیرا انما نطعمکم لوجه اللہ لا نرید منکم جزاء ولا شکورا (اور وہ لوگ خدا کی محبت سے غریب اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں ہم تم کو خدا کی رضا مندی سے کھانا کھلاتے ہیں نہ ہم تم سے بدلہ چاہتے ہیں نہ شکر)

اس میں مخلصین کی حالت بیان فرما کر یہ تعلیم دی گئی ہے کہ کھانا کھلا کر یہ کہو کہ نہ ہم اس کا بدلہ چاہتے ہیں نہ شکریہ جس میں دعا بھی داخل ہے بلکہ اللہ واسطے خدا ہی کی محبت سے کھلاتے ہیں رقم دے کر دعا کی درخواست کرنا ایک قسم کا بدلہ لینا ہے پس ادب یہ ہے کہ دینے والا لینے والے سے دعا بھی نہ طلب کرے آگے اس کا فعل ہے خواہ دعا کرے یا بددعا بلکہ خود ہدیہ دینے کا ادب یہ ہے کہ دے اور پھر اس کیلئے دعا کرے کہ انہوں نے لے لیا میرے مال کو ٹھکانے پر لگا دیا۔ دیکھو مجذوب

گالیاں دیتے ہیں اور پھر لوگ انکے پیچھے پیچھے پھرتے ہیں مولویوں نے کیا جرم کیا کہ وہ بارے گالی بھی نہیں دیتے بلکہ رقم لے لیتے ہیں اور پھر ان سے دعا کی بھی درخواست ہے کو مدرسہ ہی کیلئے دی ہو اصل میں بعضے مولویوں نے ہی عوام کو خراب کیا ہے اگر انکے مدرسہ کیلئے کہیں سے روپیہ آتا ہے تو یہ اس کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ ارے یہ شکریہ کیسا ایک تو تم نے اس کا کام کیا کہ اس کی رقم کو ٹھکانے لگا دیا پھر شکریہ بھی تم ہی ادا کرو۔ ہاں پچاس روپے خود تم نے رکھ لئے ہیں اور پچاس مدرسہ میں لگا دیئے تو بے شک نصف شکریہ ادا کرنا چاہیے۔

وہ بھی اگر لگانا حقیقی لگانا ہو نہ ایسا لگانا جیسے ایک شخص کی حکایت ہے کہ باہر جا کر روپیہ مسجد کے نام سے چندہ کر کے لاتا اور خود کھا جاتا پھر جا کر چندہ کرتا اور کہتا کہ وہ تو مسجد میں لگا دیئے اور دو ایک واقف راز شخص نے کہا ارے ظالم کچھ خدا سے بھی ڈر کہ مسجد کے نام سے مانگ کر لاتا ہے اور خود ہی ہضم کر لیتا ہے اور جھوٹ بولتا ہے کہ میں نے مسجد میں لگا دیئے۔ کہا خدا کی قسم میں مسجد میں لگاتا ہوں تو آ میرے ساتھ دیکھ لگاتا ہوں یا نہیں بس آ کر کیا کیا کہ سب روپے کو مسجد کے فرش سے رگڑ کر پھر گھر لے گیا تو یہ بھی ایک قسم کا لگانا ہے اگر پچاس روپیہ مدرسہ کو اس طرح لگایا ہے تو البتہ پورا شکریہ ادا کرنا آپ کے ذمہ ہے۔

اور اس لگانے کی تاویل پر ایک اور حکایت یاد آ گئی ایک قصبہ میں ایک شخص تھا نیک تہجد گزار وہ دودھ میں پانی ملا کر بیچتا تھا اور قسمیں کھا جاتا تھا کہ میں دودھ میں پانی نہیں ملاتا ایک شخص نے کہا ارے جھوٹی قسم کیسے کھاتا ہے؟ کہا جھوٹ کہاں میں تو پانی میں دودھ ملاتا ہوں دودھ میں پانی نہیں ملاتا یعنی وہ یہ کرتا تھا کہ پہلے سے برتن میں پانی رکھ کر الگ کر کے اوپر سے دودھ چھوڑ دیتا تھا تاکہ قسم کھا سکے تو بعض ایسے بھی متقی ہیں خدا غارت کرے ایسے متقیوں کو یا اصلاح کر دے اگر قابل اصلاح ہوں غرض اگر ایسے چندہ لینے والے ہوں وہ ضرور شکریہ ادا کریں ہمیں تو اس کی ضرورت نہیں جو لوگ چندہ لے کر شکریہ ادا کرتے ہیں مجھے تو ان پر شبہ ہوتا ہے کہ کہیں انہوں نے غبن تو نہیں کیا؟ کھایا تو نہیں؟ ورنہ شکریہ کیوں کرتے ہو۔ بلکہ اس سے شکریہ لینا چاہیے (یہ مزاحاً فرمایا ١٢ جامع)

اصل بات یہ ہے کہ بعض مدعیان علم کو غیرت نہیں رہی جاہلوں کی' عوام کی خوشامدیں کرتے ہیں کوئی رئیس بیمار ہو تو اس کی عیادت کو تو دس دفعہ جائیں گے اور غریب کو پوچھتے بھی نہیں۔

ایک مرتبہ ایک شخص نے ہمارے مدرسہ میں چار ہزار روپیہ بھیجنا چاہا مگر اس شرط کے ساتھ کہ ایک سب رجسٹرار کے سامنے اقرار کر لو کہ ہم نے پایا اور دستاویز پر سب رجسٹرار کے دستخط کرا دو وجہ

اس شرط کی یہ تھی کہ اس رقم کی کسی نے وصیت کی تھی اور گورنمنٹ کو اس کا نگراں بنایا تھا تو وصی کو باقاعدہ حساب داخل کرنا ضروری تھا ہم نے کہا ہم ایسی مشروط رقم نہیں لیتے پھر انہوں نے لکھا ہم مجبور ہیں اور وہی وجہ مجبوری کی لکھی میں نے جواب دیا کہ ہم تو مجبور نہیں اگر آپ مجبور ہیں وہ رقم نہ بھیجئے انہوں نے پھر لکھا اچھا قصبہ کے کسی مجسٹریٹ ہی کے دستخط کرادو میں نے جواب دیا کہ مجسٹریٹ تو خود ہمارے دروازہ پر آسکتے ہیں مگر مجھے غیرت آتی ہے کہ روپے کیلئے مجسٹریٹ سے التجا کروں۔ پھر خط آیا کہ اچھا اپنے مدرسہ کے دو آدمیوں کے بھی دستخط کرادو گے ہم نے کہا ہاں دو لنگوٹ بندوں کے دستخط کرادیں گے بالآخر وہ اس شرط سے دست بردار ہوئے اور بدوں کسی شرط کے انہوں نے روپیہ بھیج دیا جس روز یہ روپیہ آیا اتفاق سے ایک ڈپٹی کلکٹر اور ایک جج میرے مہمان تھے میں نے ان کے دستخط کرادیئے تو دونوں کی شرطیں پوری ہوگئیں ہماری بھی اور ان کی بھی۔

صاحبو! خدا سے تعلق پیدا کرو خدا کی قسم اگر خدا سے تعلق ہوگیا تو دنیا کی یہ حالت ہوگی اتتہ الدنیا وھی راغمة کہ دنیا ناک رگڑتی ہوئی آوے گی ہم لوگوں نے شرح عقائد تو پڑھی ہے اس میں سب سچے عقائد ہیں اور دلائل سے ہم لوگ ان کو ثابت بھی کرتے ہیں، مگر عمل کے وقت سب ذہن سے رخصت ہوجاتے ہیں بس وہی حالت ہوتی ہے جیسے ایک طوطا ہر وقت کہتا ہے نبی جی بھیجو۔ مگر جب بلی آئی تو بس ٹاں ٹاں رہ گیا وہی حالت ہے جب تک سایہ میں ہیں عیش وعشرت سے ہیں تو اللہ اللہ کرتے ہیں اور جب کوئی مصیبت آئی سب حذف تو یہ ہماری خامی ہے باقی عقیدہ تقدیر کا نور اور برکت اور حکمت تو اوپر دکھلا چکا ہوں کہ اس سے دل کتنا قوی ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عقیدہ جس کے دل میں جما ہوا ہو وہ بادشاہ ہے کیونکہ سلطنت سے اصل غرض تو راحت ہی ہے اور اس شخص کو وہ راحت حاصل ہے کہ بڑے بڑے بادشاہوں کو بھی حاصل نہیں اس کی وہ حالت ہے۔

خوشا وقتے وخرم روزگارے　　کہ یارے برخورد از وصل یارے

اسکے غم میں پریشان لوگوں کا کیا اچھا وقت ہے خواہ اپنے زخموں پر نظر پڑے یا اسکے زخموں پر مرہم۔ اور یہ حالت ہے کہ

بفراغ دل زمانے نظرے بماہرے　　بہ ازانکہ چتر شاہی ہمہ روز ہاو ہوئے

ایک ساعت ایک لحہ محبوب کو اطمینان سے دیکھ دن بھر کی دار وگیر شاہی سے بہتر ہے۔

حضرت سلیم چشتی کا قصہ ہے کہ ایک روز اپنے ایک خادم کو کرتہ دیا جوئیں مارنے کیلئے اتفاق سے بادشاہ بڑے حشم وخدم سے ملاقات کیلئے آیا اس کو دیکھ کر خادم گھبرایا اور دوڑ کر حجرہ پر آواز دی

حضرت نے پوچھا کیا ہے؟ کہا بادشاہ مع حشم و خدم کے بڑے کروفر کے ساتھ آ رہا ہے کہا جا بھلے مانس میں تو یوں سمجھا کہ کوئی بڑی سی جوں ہاتھ آئی ہے اس کو دکھلانے کیلئے پکار رہا ہے یہ کہہ کر پھر اپنے کام میں لگ گئے ان کی طرف التفات بھی نہ کیا۔ یہ کیا ہے اسی عقیدہ کی جھلک ہے اور خبر بھی ہے کہ یہ کون چیز ہے۔ **کم من فئة قليلة غلبت فئة كثيرة** (بعض اوقات ایک چھوٹی جماعت پر غالب آجاتی ہے) وہی مسئلہ تقدیر ہے۔ غرض یہ کہ دریا ہو یا پہاڑ ندی ہو یا نالہ مومن کا سب جگہ وہی عقیدہ مشعل راہ ہے وہ حالت ہے کہ **كان ميتاً فاحييناه وجعلنا له نوراً يمشى به فى الناس** (ایسا کوئی شخص جو کہ پہلے مردہ تھا ہم نے اس کو زندہ کر دیا اور ہم نے اس کو ایسا نور دیا کہ وہ اس کو لئے ہوئے آدمیوں میں چلتا پھرتا ہے) الآیۃ کہ پہلے تو ایک مردہ تھا اب اس کو ایک نور عطا ہو گیا جہاں جاتا ہے وہی نور رہبری کرتا ہے یہ نور کیا ہے وہی عقیدہ توحید و تقدیر ہے۔ حضرت شیرازیؒ فرماتے ہیں۔

گر گزندت رسد ز خلق مرنج — کہ نہ راحت رسد ز خلق نہ رنج
از خدا داں خلاف دشمن و دوست — کہ دل ہر دو در تصرف اوست

اگر تجھے مخلوق سے نقصان پہنچے تو مغموم نہ ہو کہ مخلوق سے نہ آرام پہنچ سکتا ہے نہ رنج، مخالف دشمن اور دوست کو اللہ کی طرف سے سمجھ۔ کہ دونوں کا دل اسکے قبضہ میں ہے۔

اور تصرف اس طرح ہوتا ہے کہ

رشتہ در گردنم افگندہ دوست — میبرد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

انہوں نے یہ حرکات پیدا کر رکھی ہیں جس طرف چاہتے ہیں متحرک کر دیتے ہیں۔

بزرگوں کی شانیں:

ایک مرید نے اپنے پیر سے کہا کہ میں مختلف بزرگوں کی شانیں دیکھنا چاہتا ہوں فرمایا فلاں مسجد میں جاؤ تین آدمی مراقب بیٹھے ہیں ہر ایک کو ایک۔ ایک دھپ مار دینا اس سے ان کے الوان کا اندازہ ہوگا یہ ان کے پاس گیا تو دیکھا نورانی شکل متقی پارسا **لا حول ولا قوة** ان کو کیسے ماروں مگر اس کو آزمانا تھا اپنی طبیعت پر بار ڈال کر اول ایک کو دھپ مارا وہ اٹھے یہ سمجھے کہ بس اب کم بختی آئی یہ تو کھڑے ہی ہو گئے اب وہ دونوں بھی ان کا ساتھ دینے کو اٹھیں گے اور مار کوٹ کر مجھے پیس لیں گے اچھا امتحان کرنے آیا کہ جان بچانا مشکل ہو گئی مگر وہ بزرگ اٹھ کر اس کے ویسی ہی ایک دھپ مار کر پھر اپنے کام میں مشغول ہو گئے پھر دوسرے کے پاس گئے ان کو بھی ایک دھپ لگایا وہ کچھ نہ بولے اپنی نشست بھی نہیں بدلی پھر تیسری جگہ گئے وہاں بھی یہی حرکت کی وہ اٹھے اور اس کے ہاتھ پکڑ کر سہلانا

شروع کیا کہ بھائی تمہارے بہت چوٹ لگی ہوگی کس قدر تکلیف ہوئی ہوگی۔ یہ پیر کے پاس آئے کہا سمجھے بھی کیا دیکھا؟ کہا آپ سمجھائیے۔ فرمایا کہ پہلا شخص تو شریعت کے ضروری درجہ پر ہے اس نے جزاء سیئة سیئة مثلها (برائی کا بدلہ اس برائی کے مطابق بدلہ لینا ہے) پر عمل کیا اس لئے اس نے صرف ایک دھپ پر اکتفا کیا اس سے معلوم ہوا کہ ہم لوگ اس پر بھی عمل نہیں کرتے انہوں نے اس قدر مساوات برتی کہ اس سے یہ پوچھنا بھی گوارا نہیں کیا کہ تو کون ہے کیوں مارتا ہے کیوں کہ ادھر سے بھی اس نے تو صرف مارا ہی تھا کچھ بولا نہیں تھا آپ نے بھی صرف مارنے پر اکتفا کیا اور دوسرا صاحب طریقت ہے یعنی شریعت کے کامل درجہ پر اس کو یہ مراقبہ پیش نظر ہو گیا کہ۔

از خداداں خلاف دشمن و دوست
که دل ہر دو در تصرف اوست

مخالف دشمن اور دوست کو اللہ کی طرف سے سمجھ، کہ دونوں کا دل اسکے قبضہ میں ہیں۔

اس کا یہ مراقبہ راسخ ہو چکا تھا سمجھا کہ اس نے نہیں مارا یہ کون ہوتا ہے مارنے والا جو کچھ ہے ادھر سے ہی ہے یہ تو ایک پرزہ ہے اس کی کیا مجال ہے کہ اپنی طرف سے کچھ کر سکے۔

قال الجداد للوتد لم تشقنی
قال الوتد انظرالی من یدقنی

دیوار نے میخ سے کہا کہ تو مجھے شق نہ کر، میخ نے کہا اسکی طرف دیکھ جو مجھے ٹھونک رہا ہے۔

اور تیسرا شخص شریعت کے اکمل درجہ پر تھا یعنی فنافی اللہ سے بڑھ کر بقاء باللہ میں پہنچ گیا فنا تک تو غیبت و اضمحلال کا غلبہ رہتا ہے۔ جب اس سے ترقی کر کے بقاء باللہ کو پہنچ جاتا ہے تو وجود کے آثار نمایاں ہوتے ہیں مگر تخلق باخلاق الہیہ کے رنگ پر اور خداتعالیٰ کی شان ہے شفقت اس لئے اس کو غلبہ شفقت سے رحم آیا کہ اس کو تکلیف ہوئی ہوگی اس لئے اس نے شفقت کا برتاؤ کیا۔ شیخ شیرازی نے ایسا ہی قصہ لکھا ہے کہ کسی شرابی کے ہاتھ میں بربط تھا اس نے ایک درویش کے سر میں ایسی زور سے مارا کہ وہ ٹوٹ گیا ظاہر ہے سر کا کیا حال ہوا ہوگا درویش نے ایک دینار پیش کیا کہ میرا سر تو ویسے ہی جڑ جائیگا مگر تمہارا بربط بدون داموں کے درست نہ ہوگا ان داموں سے اس کو درست کرا لینا ان واقعات والوں پر اس عقیدہ ہی کا تو غلبہ تھا جس کے یہ آثار تھے خدا کی قسم ان عقیدوں نے سارے عالم سے بے فکر کر دیا ہے ان کی بدولت جہاں کو کتنی راحت پہنچتی ہے۔ سبحان اللہ۔

اپنا ہی غم:

اور جیسے اسلام کا عقیدہ ہے جزا و سزا کا کہ نیکی پر جزا ملے گی اور بدی کرنے سے سزا ہوگی اس عقیدہ میں بھی بڑے بڑے منافع ہیں اگر کسی کو محبت نہ ہو ہیبت و عظمت کا بھی خوف نہ ہو تب بھی وہ

بہت جرائم سے محض سزا ہی کے خوف سے بچے گا اور سنئے ایک اسلامی عقیدہ ہے **الصبرة للخواتیم** اس نے عجب وپندار کی جڑ کاٹ دی کسی بات پر ناز ہی نہیں کر سکتے۔ اس سے تواضع پیدا ہوگی تکبر زائل ہوگا اور کسی کو اس شخص سے ایذاء نہ پہنچے گی کیوں کہ کینہ بغض حسد عداوت غیبت ظلم سب تکبر ہی سے ہوتا ہے بلکہ جتنے اخلاق ذمیمہ ہیں بعد تامل سب کی جڑ تکبر ہی معلوم ہوتی ہے اسلام نے اس تواضع کو بتلا کر مخلوق کو ساری آفات سے بچادیا اس کو اپنے غم میں لگا دیا کہ نہ معلوم خدا جانے عاقبت کیا ہوتی ہے ایسا شخص نہ کسی پر ظلم کرے گا نہ کسی کی غیبت میں مبتلا ہوگا۔ رات دن اپنے ہی غم میں گرفتار رہے گا ایسے ہی شخص کے باب میں مولانا فرماتے ہیں۔

خود چہ جائے جنگ وجدل نیک وبد
کیں الم از صلح باہم می رسد

اچھی اور بری لڑائی کی کوئی گنجائش نہیں کیونکہ میرا دل صلح وآشتی سے جیتا جا سکتا ہے۔

یہ چند عقائد ہیں اسلام کے جو مختصر عنوان سے میں نے بیان کردیئے ہیں آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ ان سے دین کا نفع تو ہوتا ہی ہے دنیا کے بھی کتنے منافع ومصالح ان کے ساتھ وابستہ ہیں اب وقت میں گنجائش نہیں رہی جمعہ کی نماز کا وقت آ گیا ہے اگر وقت ہوتا تو اور بیان کرتا۔

غرض یہ ہیں خوبیاں اسلام کی ان کو دوسروں کے سامنے بھی پیش کرو مگر لڑو مت اس وقت دوسری قومیں بھی اپنے اپنے مذہب کی اشاعت میں بہت کوشش کر رہی ہیں اور فساد کرنے پر بھی آمادہ ہیں مگر تم صرف اپنا کام کرو فساد کی تدبیر مت کرو البتہ فساد کی مدافعت مناسب طریقہ سے مضائقہ نہیں بس یہی کافی ہے اب وقت کم ہے اور سچی بات تو یہ ہے کہ یہ ایک ظاہری بہانہ ہے ورنہ دراصل میں خود بھی تھک گیا ہوں اب دعا کرو خدا فہم سلیم عطا فرماویں اور عمل کی توفیق دیں۔ آمین۔

اشرف علی

۶؍صفر المظفر ۱۳۵۴ھ

الاتمام لنعمة الاسلام

(۳)

یہ وعظ لوگوں کی درخواست پر پانی پت درگاہ حضرت شاہ جلال الدین کبیر الاولیا مخدوم صاحبؒ میں ۲۸ رشوال ۱۳۴۱ھ بروز جمعرات پونے چار گھنٹے بیٹھ کر ارشاد فرمایا۔ سامعین کی تعداد ۵۰۰ تھی۔ مولوی اطہر علیؒ نے ضبط اور ان کے مبیضہ سے مولانا ظفر احمد صاحب تھانویؒ نے صاف کیا۔

مسمانوں کی یہ حالت ہونی چاہیے

ترکت اللات والعزی حمیعا　　　کذلک یفعل الرجل البصیر

خدا تعالیٰ کے احکام مضبوط پکڑو۔ اس میں دین کا بھی بھلا ہے۔ اور دنیا کا بھی نفع ہے۔

(از حضرت حکیم الامت صاحب تھانویؒ)

بعد از خطبہ ماثورہ

اما بعد: فاعوذ باللہ من الشیطن الرجیم. بسم اللہ الرحمن الرحیم. الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا. (المائدہ:۳)

ترجمہ: آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو کامل کر دیا اور میں نے تم پر اپنا انعام تام کر دیا اور میں نے اسلام کو تمہارا دین بننے کیلئے پسند کر لیا۔

تمہید: یہ ایک آیت کا حصہ ہے اس کی تلاوت کل بھی کی گئی تھی اور یہ بھی ظاہر کیا گیا تھا کہ اس کے قبل اور بھی چند موقعوں پر اس آیت کی تلاوت کی گئی ہے اور تکرار تلاوت کی وجہ بھی بیان کر دی گئی تھی کہ بیان کرنے سے جو مقصود اس کے متعلق تھا وہ اتنی جگہ بیان کرنے سے بھی مکمل نہیں ہوا اور مقصود بھی کل بیان کر دیا تھا یعنی اسلام کی خوبی ایسی ہے کہ دنیا کے لئے بھی نافع ہوتا ہے اور آخرت کیلئے بھی یعنی اس کے قواعد و ضوابط تمام عالم کیلئے دونوں جہاں میں راحت رساں ہیں بشرطیکہ ان پر عمل کیا جائے۔

عمومی غلطی:

اور یہاں سے ایک مسئلہ طے ہو جاتا ہے، جس کا سمجھنا ضروری ہے اور اس کے نہ سمجھنے سے لوگ بہت بڑی غلطی میں پڑے ہوئے ہیں۔ وہ غلطی یہ ہے کہ بہت لوگوں کا یہ خیال ہو گیا ہے یعنی ان کے معاملہ اور طرز سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ان کا عقیدہ یہی ہے کہ اصل مقصود شریعت اور احکام سے اغراض دنیاویہ ہیں اور شریعت کے احکام کو ان اغراض کا آلہ بنا رکھا ہے۔ چنانچہ مشاہدہ ہے کہ یہ لوگ جب احکام کو بیان کرتے ہیں ان کی حکمت کو بھی ساتھ ساتھ بیان کرتے ہیں اور وہ حکمتیں سب کی سب دنیوی ہوتی ہیں اور اس حکمت کا نام فلاسفی رکھا ہے یہ لفظ موقع بے موقع ہمیشہ مقررین کی زبان پر آتا ہے۔ کہتے ہیں روزہ کی فلاسفی یہ ہے، حج کی فلاسفی یہ ہے، زکوۃ کی یہ ہے علی ہذا اور احکام کی بھی فلاسفی بتلاتے ہیں اور بزعم خود اپنے کو احکام جاننے والا اور اسرار و حکم کا واقف سمجھتے ہیں بلکہ اسی کو علوم مقصودہ سمجھتے ہیں اور ایسی تقریریں کر کے اپنے کو دین کا بڑا خدمت گذار بلکہ علماء راسخین کے درجہ میں سمجھتے ہیں اور علماء محققین کو اپنے سامنے صورت پرست خیال

کرتے ہیں بلکہ ان کو پست خیال اور خود کو روشن خیال جانتے ہیں۔ گو ایک صیغہ کی تحقیق یا تعلیل بھی نہ جانتے ہوں۔ ایک چھوٹے یا بڑے جملہ کی ترکیب بھی نہ کر سکتے ہوں۔ لیکن ان کو اس کی ضرورت ہی کیا ان کے نزدیک تو یہ سب فضول ہیں۔ بس وہی علوم و اسرار ان کے نزدیک مطلوب ہیں اور اسرار بھی وہ جو ان کے ذہن میں آ گئے۔ گو فی الواقع باطل محض ہی ہوں۔

مقصود احکام شریعت:

حقیقت یہ ہے کہ حکمت اور اسرار کے درپے ہونا یہ خود مضر ہے کیونکہ مقصود شریعت کے احکام جاننے سے کیا ہے اس کو خیال کرنا چاہیے۔ سو حق تعالٰی فرماتے ہیں **ماخلقت الجن والانس الا لیعبدون** (اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لئے پیدا کیا کہ وہ صرف میری عبادت کریں) یعنی مقصود عبدیت ہے اور عبدیت یہ ہے کہ جہاں حکم ہوا وہیں گردن جھکا دی۔ کاہے کی حکمت اور مصلحت؟ یہ اور بات ہے کہ اللہ تعالٰی کا فعل یا حکم حکمت سے خالی نہیں ہو سکتا مگر ہم کو حکمت کے درپے تو نہیں ہونا چاہیے۔

اور تجربہ سے معلوم ہوا کہ جس حکم کی علت بلکہ یوں کہیے کہ مصلحت و حکمت نہ معلوم ہو اس میں عبدیت زیادہ ظاہر ہوتی ہے اور میں نے لفظ علت کو بدل کر اس کی جگہ لفظ حکمت و مصلحت کو اس لئے اختیار کیا کہ علت کا اتباع اور تتبع ممنوع نہیں مگر تتبع علل مجتہد کا منصب ہے کہ جو حکم منصوص ہو اور اس کے اندر کوئی علت ہو اور وہ علت غیر منصوص میں بھی موجود ہو تو منصوص کا حکم غیر منصوص میں بھی ثابت کر دیا جاتا ہے یعنی بعض احکام قیاسی ہیں جو قیاس سے ثابت ہیں اور بعض منصوص غیر قیاسی ہیں جو صراحۃً ثابت ہیں سو قیاس مجتہد کا حاصل غیر منصوص کو منصوص پر قیاس کرنا ہے یعنی جس کے ساتھ یہ غیر منصوص مشابہ ہو، اس مشبہ بہ کا حکم اس مشابہ پر کر دیتے ہیں جس سے ظن غالب یہ ہو جاتا ہے کہ اس کا بھی حکم وہی ہے جو منصوص کا اور اصل کا ہے تو جہاں فرع کو اصل پر کسی علت جامعہ کیوجہ سے قیاس کرتے ہیں۔ وہاں کہتے ہیں کہ اس حکم کی یہ علت ہے تو علت قیاس میں ہوتی ہے جو مجتہد کا منصب ہے حکمت کو علت کہنا صحیح نہیں۔ اس لئے میں نے لفظ علت کو لفظ حکمت سے بدل دیا۔ گو اس کو بھی محاورہ میں بعضے علت کہتے ہیں لیکن اصل میں یہ علت نہیں ہے تو خلاصہ یہ ہے کہ احکام کی حکمت اور مصلحت تلاش کرنے میں بڑی خرابی یہ ہے کہ مثلاً ایک مصلحت پر ہماری نظر ہے، دوسری پر نہیں، تو احتمال ہے کہ جب یک مصلحت اٹھ جاوے، گو دوسری باقی رہے تو یہ شخص جو حکمت کی وجہ سے احکام کا متبع تھا اس حکم کی تعمیل ہی چھوڑ دیگا۔

صاحبو! ہمیں تو حکم ہوا ہے کام کرنے کا تو بلا مطالبہ حکمت و مصلحت اس کو کرنا چاہیے۔ غرض

تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عبدیت اس میں زیادہ ظاہر ہوتی ہے کہ احکام کی حکمت معلوم نہ ہو اور پھر بھی اس کا امتثال کرے۔ محض حاکم کا حکم سمجھ کر اس کی پابندی کرے اس میں عبدیت زیادہ ظاہر ہوتی ہے مثلاً حاکم نے کہا دوڑ، وہ دوڑنے لگا۔ بلاوجہ پوچھے ایسے احکام کو تعبدی کہتے ہیں اس میں قیاس کی بھی گنجائش نہیں ہوتی اس نام ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں عبدیت زیادہ ہے بخلاف ان احکام کے جن کی حکمت معلوم ہو گو ان کا بجالانا بھی موجب اجر ہے بلکہ ایک معنی کر کے زیادہ قابل اہتمام ہے کیونکہ بعض طبائع کو اس سے زیادہ شگفتگی وطمانیت ہوتی ہے مگر بعض موقع پر حکمت کا جاننا مضر بھی ہوتا ہے میں اس کو آگے بیان کروں گا (جس جگہ یہ شعر مذکور ہے دوستی بے خرد چوں دشمنی ست) بہرحال ان احکام کے امتثال میں بھی اجر ہوتے ہیں شبہ نہیں مگر ان میں ظہور عبدیت زیادہ نہیں۔

اس میں یہ وہم ہوتا ہے کہ شاید مصلحت کی وجہ سے امتثال کیا ہو اگر مصلحت سمجھ میں نہ آتی۔ شاید امتثال نہ کرتا اور یہ عبدیت کے خلاف ہے کہ جو سمجھ میں آوے کرے اور جو نہ آوے نہ کرے۔ چنانچہ بہت لوگوں کو اس میں کلام ہے کہ حج کیوں مقرر ہوا۔ اس کی حکمت سمجھ میں نہیں آئی۔ روزہ نماز کی حکمت تو سمجھ میں آ گئی مگر حج کے بارہ میں حکمت سمجھ میں نہ آنے سے بعض لوگوں کا یہ حال ہو گیا کہ فرضیت حج ہی سے انکار کے قریب ہو گئے۔ نماز میں تو یہ سمجھے کہ اس میں عبدیت کی صورت ہے۔ تسبیح وتقدیس رکوع وسجود میں اپنی شکستگی نمایاں ہے بہت خشوع خضوع ہے اور روزہ واقعی قوت بہیمیہ کو توڑ دیتا ہے اس کا نکتہ بھی سمجھ میں آ گیا۔ اسی طرح زکوۃ کی حکمت تو کھلی ہوئی ہے۔ اس میں مساکین کا اغناء ہے مادہ بخل کو توڑتا ہے یہ سب کچھ سمجھ میں آ گیا مگر حج کا فلسفہ سمجھ میں نہیں آیا کہ باولوں کی طرح رہو سلا ہوا کپڑا نہ پہنو سر کھلا ہوا ہو ٹوپی نہ ہو اس میں کیا فائدہ؟ اور لیجئے بیت اللہ کے طواف میں دیوانوں کی طرح دوڑتے ہیں صفا ومروہ میں دوڑتے ہیں اور کنکریاں مارتے ہیں یہ کیا ہے؟ یہ حرکات عاقلانہ تو ہیں نہیں۔ بے شک عقل پرستوں کی سمجھ میں یہ باتیں نہیں آ سکتیں مگر باوجود اس کے یہ لوگ فرضیت کا انکار اس لئے نہ کر سکے کہ قرآن میں اس کی تصریح ہے اس پر ایمان ہے کہ قرآن حق ہے اور حکمت کی ضرورت تھی لہذا حکمت اور مصلحت ڈھونڈی۔ چنانچہ ایک بات نکالی کہ گو افعال حج تو غیر معقول ہیں۔ مگر پھر بھی اس کو شریعت میں جو رکھا گیا ہے اس لئے کہ اہل عرب پہلے سے کرتے ہوئے آ رہے تھے اس لئے اگر اب روکتے تو روکنے سے ان کو وحشت ہوتی لہذا ان کو اپنی پہلی حالت پر برقرار رکھا گیا تو اس حکمت کی رعایت کی گئی۔ زوائد کا لحاظ نہیں کیا گیا۔ طواف سعی وغیرہ زوائد ہیں۔ اگر روکتے تو یہ حکمت مختل ہو جاتی۔

بعض نے ایک اور حکمت نکالی کہ سارے مسلمان اگر جمع ہوں گے تو باہم تبادلہ خیالات کر سکیں گے۔ نہ معلوم یہ تبادلہ کیسا لفظ ہے اگر تفاعل کا مصدر ہے تو دال کا ضمہ کہاں گیا پھر آخر میں یہ کیسی یہ لغت بھی نیا نکالا ہے اتنی بڑی تو غلطی اور اس پر غضب ہے کہ کہتے ہیں فصیح ہو گیا غلط العام فصیح۔ اسی طرح آج کل کی اردو میں اور بھی بعض الفاظ ہیں چنانچہ ایک لفظ شکریہ مستعمل ہے یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ یا اور ہا کیسی اور ایک لفظ صداقت ہے اس کو صدق کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ صداقت کے معنی صدق کبھی نہیں سنے۔ دوستی کے معنی میں تو البتہ آتا ہے باقی صدق کے معنی میں میری نظر سے نہیں گذرا مگر عام لوگوں میں رائج ہے۔ عداوت کے مقابلہ میں صداقت آتا ہے نہ کہ کذب کے مقابلہ میں۔ بس اسی طرح یہ لفظ تبادلہ ہے (البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر زبان کو دوسرے زبان کے الفاظ میں تصرف کا حق ہے جیسے عربی میں فارسی الفاظ کے اندر تصرف کیا جاتا ہے۔ اسی طرح اردو زبان بھی عربی اور فارسی لغت میں تصرف کرتی ہے اگر وہ تصرف عام طور سے مستعمل ہو جائے تو محل اعتراض نہ رہے گا ۱۲ ظ) غرض یہ لوگ کہتے ہیں کہ حج اس لئے مقرر ہوا تاکہ تبادلہ خیالات اور سوال ہو سکے۔ اصل مقصود یہ ہے کہ ایک دوسرے سے بیع فروخت کریں ایک دوسرے کو اپنے خیالات پر مطلع کر سکیں یہ اتفاق کی جڑ ہے یہ حاصل ہے اس فلسفہ مخترعہ کا مگر ہم نے تو حاجیوں کو اکثر لڑتے دیکھا ہے اسی لئے ارشاد ہے **ولا جدال فی الحج** (حج میں لڑائی جھگڑا نہیں) غرض یہ سب بے سروپا مجذوب کی سی بڑ ہے نہ اس کی کوئی دلیل ہے نہ ثبوت ہے۔ جو جی میں آیا ہانک دیا۔ ان کو تو ہر جگہ فکر دنیا کی ہے۔ اور اسی کی مصلحت کی تلاش ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان افعال کو جو فی الواقع زوائد تھے اصل سمجھ لیا یعنی تجارت اموال و تبادلہ خیالات۔ حج میں تجارت کی اجازت تو ہے مگر یہ مقصود تو نہیں ہے۔

رہا تبادلہ خیالات تو اس کا موقع ہی کہاں ملتا ہے اور اگر موقع بھی ہوتا تو ایک بات اس سے مانع تھی۔ وہ یہ کہ ایک دوسرے کی زبان نہیں سمجھتے دوسرے اگر سمجھے بھی تو اس وقت پریشانی اتنی ہوتی ہے کہ اس کے انسداد کیلئے حق تعالیٰ نے فرمایا۔ **فلا رفث ولا فسوق ولا جدال فی الحج** یعنی دیکھو حج میں بیہودہ باتیں اور لڑائی جھگڑا نہ کرنا اب فرمائیے یہ فلسفیاں کیسی مہمل باتیں ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے لکھنے والے نے کبھی حج ہی نہیں کیا اگر حج کرتا تو معلوم ہوتا کہ وہاں اس کی فرصت ہے یا نہیں؟ مگر یوں ہی ہندوستان میں بیٹھے بیٹھے جو جی میں آیا ہانک دیا۔ غرض تبادلہ خیالات کی مصلحت تو مہمل ٹھہری وہ تو باطل ہو گئی ہاں تبادلہ اموال کی حکمت کچھ کچھ صحیح نظر آتی

ہے مگر حقیقت اس کی صرف اتنی ہے کہ جائز ہے واجب اور مقصود نہیں۔ **کما قال تعالیٰ لیس علیکم جناح ان تبتغوا فضلا من ربکم** (تم کو اس میں ذرا بھی گناہ نہیں کہ معاش کی تلاش کرو جو تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے) صحابہ کو یہ شبہ تھا کہ ایام حج میں تجارت کرنا کہیں گناہ نہ ہو تو اللہ تعالیٰ نے اس شبہ کو دور فرمادیا کہ اگر کوئی کرنا چاہے تو اس کو گناہ نہ ہوگا اگر حج سے مقصود ہی تجارت ہوتی تو صحابہ کو گناہ کا خیال ہی نہ ہوتا اور ہوتا بھی تو اللہ تعالیٰ اس خیال کو رد فرماتے اور رد بھی اس عنوان سے نہ فرماتے بلکہ بلیغ عنوان سے زور سے رد کرتے یہاں رد کہاں بلکہ **لیس علیکم جناح ان تبتغوا فضلا من ربکم** (تم کو اس میں ذرا بھی گناہ نہیں کہ معاش کی تلاش کرو جو تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے) سے ہر شخص یہی سمجھتا ہے کہ گناہ کے نہ ہونے کو بیان فرمایا ہے کہ تھا تو حج کی وضع کے خلاف کام' مگر بندوں کی مصلحت سے اجازت دے دی ہے تو یہ صرف اجازت ہے تجارت کی نہ کہ مقصودیت تجارت کی۔ کیونکہ مقصود کو ایسے عنوان سے بیان نہیں کیا جاتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ یہ مقصود نہیں۔ اور جن کو یہ لوگ زوائد سمجھتے ہیں ان کے متعلق حکم ہے **ولیطوفوا بالبیت العتیق** (اور اس مامون گھر کا طواف کریں) یعنی امر کے صیغہ سے اس کو بیان فرمایا جو وجوب کیلئے ہے اور حدیث میں ہے **الحج عرفۃ** رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں حج عرفات میں جانے کا نام ہے۔ استغفر اللہ استغفر اللہ ان لوگوں کو قرآن حدیث کی پرواہ نہیں۔ بس اپنے ہوائے نفسانی کو رہبر بنالیا ہے اور قرآن وحدیث کو چھوڑ دیا۔ جس کو قرآن وحدیث نے فرض اور مقصود بتلایا تھا' یہ اس کو زوائد کہتے ہیں اور جس کو زوائد بتلایا تھا یہ اس کو اصل مقصود قرار دیتے ہیں اور ان میں بعضے وہ لوگ بھی ہیں جو منشی فاضل مولوی فاضل وغیرہ بڑے بڑے پاس حاصل کئے ہوئے ہیں۔ میں نے تو ایک موقع پر ایسے لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ یہ زبان دانی تو ابوجہل کا علم ہے۔ جرمن۔ بیروت میں بھی بہت سے عیسائی بڑے بڑے عربی داں اور ادیب ہیں مگر کیا وہ مقتدائے دین ہیں۔ ہرگز نہیں۔ بس یہ لوگ دو چار عربی کے دیوان سمجھ کر دیوانے ہوگئے اور اپنے نزدیک بڑے عالم اور کامل ہوگئے مگر محض دعوی سے آدمی کامل نہیں ہوسکتا کامل تو وہ ہے جس کو کوئی کامل کہہ دے۔

بنمائے بصاحب نظرے گوہر خود را
عیسی نتواں گشت بتصدیق خرے چند

اپنا گوہر کسی صاحب نظر کو دکھلاؤ کیونکہ چند گدھوں کی تصدیق سے تم عیسیٰ نہیں ہو سکتے۔

جب تک کہ اہل فن کسی کی نسبت نہ کہے کہ یہ کامل ہے اس وقت تک کسی کو حق نہیں کہ اپنے کو

کامل سمجھے تو کیا یہ غضب ہی نہیں کہ عربی کی دو چار کتابیں پڑھ کر لوگ یوں سمجھ لیں کہ ہم عالم تبحر ہو گئے ہیں اور قرآن وحدیث کی تاویل کرنے بیٹھ جاویں۔ اس طرح تو جس کا دل چاہے تاویل کرلے۔ چنانچہ قرآن کی تاویل کر کے ہی بہتر (۷۲) فرقے ہوئے ان کا یہ مقصود ہی نہ تھا کہ حق کو معلوم کریں اگر یہ قصد ہوتا تو غلط تاویل کی جرات ہی نہ ہوتی۔ باقی اہل حق میں جو اختلاف ہے تو اس کا منشاء یہ ہے کہ انہوں نے قصد تو کیا اتباع قرآن وحدیث کا اس قصد کے ساتھ مختلف محمل سامنے آگئے تو اہل حق کا تو قصد اتباع کا ہوتا ہے مگر اہل ہوا کا یہ خیال نہیں ہوتا۔ میں بقسم کہتا ہوں ان کا حال یہ ہے کہ پہلے ایک رائے آزادی سے قائم کرلی۔ اس کے بعد قرآن وحدیث کو دیکھتے ہیں کہ اپنی خواہش کے موافق کوئی آیت حدیث مل جاوے۔ اور ملنے کی بھی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ جس طرح شیعوں کو قرآن میں جہاں کہیں میم تے عین کا مادہ ہو۔ متعہ ہی نظر آتا ہے۔ اسی طرح اہل ہوا کو بھی کسی ایک جگہ اپنی خواہش کے موافق کوئی لفظ مل گیا تو قرآن میں ہر جگہ اپنی خواہش کو ٹھونسنے لگتے ہیں اور معانی میں تحریف کرنے لگتے ہیں۔ سو اس کا نام اتباع حق نہیں یہ تو دلیل اصیبت کیسی ہے اور اس دلیل پر دعوی مبنی نہیں کیا گیا بلکہ دعویٰ پر دلیل کو مبنی کیا گیا ہے کیونکہ انہوں نے تو دلیل کو اس نظر سے دیکھا ہے کہ ہمارے دعویٰ کے مخالف ہے یا موافق اگر مخالف ہوئی تو اس کو معنی میں تاویل اور ہیر پھیر کر لیتے ہیں مولانا فرماتے ہیں۔

بر ہوا تاویل قرآں میکنی　　پست وکژ شد از تو معنی سنی
کردہ تاویل لفظ بکر را　　خویش را تاویل کن نے ذکر را
چوں ندارد جان تو قندیلہا　　بہر بینش میکنی تاویلہا

ہوا پر قرآن کی تاویل کرتے ہیں جس سے اس کے روشن معنی پست ہو جاتے ہیں۔ تم تاویل لفظ بکر سے کرتے ہو اپنی تاویل کرو کسی کا ذکر نہ کرو۔ تمہارے اندر قرآن سمجھنے کا فہم ہی نہیں اس نے تاویلات کرتے ہو قرآن سمجھنے کا فہم پیدا کرو اور تاویلات چھوڑ دو۔

سو اس طرح سے فرق باطلہ پیدا ہو گئے کہ انہوں نے قرآن کو اپنی ہوا کے تابع بنایا یعنی تابع بنانا چاہا گو ہوا نہیں کیونکہ

کلامیکہ محتاج یعنی باشد لایعنی ست

جو کلام یعنی کا محتاج ہو وہ باطل ہے۔

سو قرآن ایسا کلام کیوں ہونے لگا اس لئے قرآن میں ایسی تاویلیں نہیں چلتیں۔ اس کو اہل

حق سمجھتے ہیں اور اگر ذوق صحیح ہو اور آدمی منصف ہو تو ہر شخص معلوم کرے گا کہ کس جگہ کیسی دلیل ہے یعنی کسی جگہ تو دلیل کی بناء ہے دعویٰ پر اور کہاں دعویٰ کی بناء ہے دلیل پر۔

حقیقت علم:

اس کے سمجھنے کیلئے قلب میں نور ہونا شرط ہے اور وہی نور علم ہے حقیقت میں۔ امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

شکوت الی وکیع سوء حفظی   فاوصانی الی ترک المعاصی
فان العلم فضل من الہ   وفضل اللہ لا یعطیٰ العاصی

میں نے حضرت وکیعؒ سے سوء حافظہ کی شکایت کی۔ انہوں نے مجھے گناہوں کے چھوڑنے کی نصیحت کی پس علم اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے ہے جو گناہگار کو عطا نہیں ہوتا۔

پس علم وہ ہے جو گناہ کرنے سے زائل ہو جاتا ہے اور گنہگار کو حاصل نہیں ہوتا۔ اگر محض الفاظ دانی کا نام علم ہوتا تو وہ معاصی کے ساتھ بھی جمع ہو جاتا ہے بلکہ کفر کے ساتھ بھی ورنہ بیروت اور جرمن میں عیسائی عربی کے ادیب کیسے ہوتے۔ ان کا حافظہ بھی قوی ہے ذہن بھی تیز ہے۔

پس معلوم ہوا کہ علم اس کا نام نہیں ہے' حقیقت میں علم کی حقیقت نور ہے جس کی نسبت قرآن میں ہے قد جاء کم من اللہ نور و کتاب مبین (تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشن چیز آئی ہے اور ایک کتاب واضح) اسی کو روح بھی فرمایا ہے وایدھم بروح منه (اور ان کو اپنے فیض سے قوت دی ہے) بس حقیقت میں یہی چیز علم ہے۔ امام ابو حنیفہؒ نے کتابیں زیادہ نہیں پڑھی تھیں مگر اللہ تعالیٰ نے قلب میں ایک نور بخشا تھا کہ جس چیز کو بیان فرماتے تھے۔ بالکل صحیح فرماتے تھے اور اب کسی کو کتنا ہی تبحر ہو جاوے مگر وہ علم نصیب نہیں جو امام صاحب کو حاصل تھا۔ اس حالت میں اگر کوئی کہنے لگے کہ میں ابو حنیفہؒ سے علم میں زیادہ ہوں تو وہ جاہل ہے۔ اس کو حقیقت معلوم نہیں کہ علم کہتے ہیں کس کو۔ عارف شیرازی فرماتے ہیں۔

نہ ہر کہ چہرہ برا فروخت دلبری داند   نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند
ہزار نکتہ باریک ترز مو اینجاست   نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

ہر وہ شخص جو اپنے چہرہ کو روشن کرے ضروری نہیں کہ وہ دلبری بھی جانتا ہو ہر وہ شخص جو آئینہ رکھتا ہو ضروری نہیں۔ اس میں بال سے زیدہ باریک نکات ہیں ہر وہ شخص جو سر منڈاتا ہو ضروری نہیں کہ وہ دلبری بھی جانتا ہو۔

حقیقت میں فن دانی اور چیز ہے۔ تحریر اور روایات کا معلوم ہونا اور بات ہے۔ خوب کہا ہے عارف شیرازیؒ نے۔

شاہد آں نیست کہ موئے ومیانے دارد   بندہ طلعت آن باش کہ آنے دارد

معشوق وہ نہیں جو خوبصورت بال اور پتلی کمر رکھتا ہو بلکہ حسین وہ ہے کہ اس میں کچھ آن ہو۔

اس آن کا نام شان اجتہادی ہے جواب مقصود ہے جس کا امتحان بہت آسانی سے اہل علم کر سکتے ہیں یعنی اپنی اور سلف کی علمی شان کا وہ یہ کہ چند سوال ایسے تجویز کیے جائیں کہ واقعات اور حوادث پیش آتے رہتے ہیں وہ سوالات ان کے متعلق ہوں مگر ان کے جواب سلف کے کلام میں نہ دیکھے ہوں پس ایسے سوالات قائم کر کے بدون فقہ کی کتاب دیکھے محض قرآن وحدیث سے ان کا جواب نکالا جائے۔ پھر سلف کے کلام میں ان سوالات کے جواب دیکھے جائیں۔ اس کے بعد انصاف کی نظر سے موازنہ کر کے دیکھا جائے کہ دونوں کے جواب میں کس قدر فرق ہے۔ قرآن وحدیث پر ان کے جوابات زیادہ چسپاں ہیں یا تمہارے؟ میں بقسم کہتا ہوں کہ ہمارا جواب تو اوپر اوپر ہوگا اور وہ تہہ سے ہوگا۔ نکال کر لائیے اور موازنہ کر لیجئے مگر شرط یہ ہے کہ مخاطب اہل فہم ہو تو معاند نہ ہو تو اس کو صاف معلوم ہو جائے گا کہ دونوں کے علوم میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس وقت خود فیصلہ ہو جائے گا کہ کون اجتہاد کی صلاحیت رکھتا ہے کون نہیں؟ یقیناً اقرار کرنا ہوگا کہ تم کو اجتہاد کا حق نہیں ہے۔ وہی اس کیلئے مخصوص تھے۔ علوم حقیقی انہیں کے پاس تھے انہوں نے ہی دین کو مکمل کیا۔ یہ نہیں کہ اپنی طرف سے کچھ بڑھا دیا بلکہ قرآن اور حدیث سے نکال کر سب کچھ بیان کیا۔ ہمارا علم انکے علم کے سامنے حقیقت میں علم ہی نہیں۔

بہر حال علم خاص نور سے نصیب ہوتا ہے گو اجتہاد کے درجہ کا نہ ہو مگر اس کے تابع تو ہو اور اس وقت اس نور میں کمی ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ یہ نور عمل سے بڑھتا ہے اگر عمل ہے تو علم صحیح بھی نصیب ہے اگر عمل نہیں تو وہ علم بھی میسر نہیں۔ سلف کو دیکھ لیجئے کہ وہ کیسے عمل کرنے والے تھے۔ اس لئے ان کو وہ نور حاصل تھا وہ کہیں جائیں نور ان کے ساتھ ساتھ تھا۔ ادھر ہمارے اعمال دیکھ لیجئے کیسے گندے ہیں اس لئے وہ نور بھی نصیب نہیں۔ پس ہمارے نہ سمجھنے کی زیادہ وجہ یہ ہے کہ ہم میں وہ نور نہیں ہے اور اب بھی جن کو وہ نور حاصل ہے وہ جیسا سمجھتے ہیں دوسرا نہیں سمجھ سکتا حتی کہ ان کے یہاں جو چیزیں بدیہیات بلکہ حسیات ہیں دوسروں کے یہاں عقلیات اور حسیات سے بھی زیادہ خفی ہیں۔ پھر ان میں اور سلف میں وہی نسبت ہے جو اس زمانہ کے صاحب نور اور غیر صاحب

نور میں فرق ہے کہ سلف کے یہاں جو چیز بدیہی بلکہ بدیہی سے بھی زیادہ جلی ہے ان کے یہاں نظری ہے اور اس فرق کے امتحان کی وہی صورت ہے جو میں نے اوپر بتلا دی ہے۔ جب چاہو امتحان کر کے دیکھ لو اور حقیقی فرق تو مدت کے بعد معلوم ہوتا ہے مگر کوشش کرو بقدر ضرورت ضرور ہدایت ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے **والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا وان اللہ لمع المحسنین** (اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں ہم انکو رستے ضرور دکھائیں گے اور اللہ تعالیٰ ایسے خلوص والوں کے ساتھ ہے) غرض حقیقت میں علم وہ ہے جس میں نور ہے مگر اب تو یہ حال ہے کہ چار حرف پڑھ لئے بس اپنے کو فاضل کامل سمجھنے لگے اور علماء کو ناواقف کم فہم اور اپنے کو عاقل ہوشیار کہنے لگے اور پھر اس پر رائے دیتے ہیں علماء کو کہ یوں کرو یوں نہ کرو۔ میں نے ایک موقع پر کہہ دیا کہ ان علماء سے تو یہ توقع رکھومت کہ وہ تمہارا اتباع کریں گے کیونکہ وہ تو پرانے دقیانوسی ہیں تمہارے کہنے میں نہیں آویں گے ہاں تم خود مولوی بن جاؤ پھر مولوی بن کر جو چاہو کرو مگر ان کو رائے مت دو۔ ایک شخص صدقہ فطر دے رہا تھا ان کے ایک رشتہ دار صاحبزادے کہنے لگے یہ حکم فطرہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہر زمانہ میں نصف صاع گیہوں دیا جائے اس زمانہ میں اناج سستا تھا نصف صاع کا حکم مناسب تھا۔ اب اناج کی قیمت زیادہ ہے نصف صاع کے دام بہت ہوتے ہیں اب کم دینا چاہیے اس شخص کا بیان ہے کہ میں نے کہا ہاں آپ اس کا علاج کردیجئے مگر مولویوں سے ایسے فتویٰ کی توقع نہ رکھئے۔ کہا سبحان اللہ میں گالیاں کھاؤں میں نے کہا سبحان اللہ اور وہ گالیاں کھا دیں تم کو تو کم گالیاں پڑیں گی کیونکہ تم جاہل ہو اور ان کو زیدہ گالیاں دیں گے کیونکہ وہ عالم ہیں جب میں نے یہ کہا تو آپ چپ ہوئے۔

غرض یہ حالت ہے کہ ہر شخص رائے دیتا ہے علماء کو میں تو ایسے رائے دہندوں کے بارہ میں یوں کہتا ہوں۔

مگر افسوس اب تو اکثر علماء جاہلوں کے تابع ہوگئے اب تم دیکھو گے کہ وہ الیکشن میں بھی مارے مارے پھرتے ہیں اور ووٹروں کی زیارت بھی کرتے ہیں۔ خان بہادروں کی خوشامد بھی کرتے ہیں اور ہندو لیڈروں کا استقبال بھی کرتے ہیں۔ **قد کان ماخفت ان یکونا انا الی اللہ راجعون** ۱۲ ط

گربہ میر وسگ وزیر وموش را دیوان کنند ایں چنیں ارکان دولت ملک را ویران کنند

بلی کو امیر کتے کو وزیر اور چوہے کو اگر دیوان مقرر کریں تو ایسے ارکان سلطنت ملک کو ویران کردیں گے۔

آثارِ منصوریت:

اگر دین ان کے ہاتھ ہوتا تو خدا جانے یہ کیا کرتے وہ تو خدا گنجے کو ناخن ہی نہیں دیتے خدا نے اپنے دین کی حفاظت خود کی ہے حدیث میں ہے **لایزال طائفة من امتی ظاھرین علی الحق منصورین لا یضرھم من خذلھم** (سنن ابن ماجۃ: ۱۰) کہ اس امت میں ہمیشہ ایک گروہ حق پر قائم رہ کر اہل باطل پر غالب رہے گا ان کا مقابلہ کوئی نہ کر سکے گا اس لئے تحریف محرفین سے کچھ ضرر دین کو نہیں پہنچتا حدیث میں طائفہ کا جو لفظ آیا ہے غالباً اشارہ اس طرف ہے کہ وہ جماعت قلیل ہوگی مگر موید من اللہ ہوگی خدا کی طرف سے اس کی تائید ہوگی اگر کوئی ان کا ساتھ نہ دے تو ان کو کچھ ضرر نہ ہوگا بلکہ ان کی منصوریت کی شان یہ ہوگی کہ اگر کوئی ان کی مخالفت کرے وہ خود مخذول ہوگا خاذل تو کیا ہوتا عارف شیرازیؒ فرماتے ہیں۔

بس تجربہ کردیم دریں دیر مکافات
با دردکشاں ہرکہ درافتاد برافتاد

اس دیر مکافات میں بہت تجربہ ہم نے کیا ہے کہ جو شخص اہل اللہ سے الجھا ہلاک ہوگیا۔

اور مولانا فرماتے ہیں۔

ہیچ قومے را خدا رسوا نہ کرد
تا دل صاحب دلے نامد بدرد

کسی قوم نے اس وقت تک اللہ تعالیٰ کو ناراض نہیں کیا جب تک انہوں نے کسی ولی اللہ کو اذیت نہ پہنچائی۔

ان کی یہ شان ہے ان کی منصوریت کا یہ اثر ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے **من عادی لی ولیاً فقد اذنته بالحرب** (اسنن الکبری للبیہقی ۳۴۶:۳) کہ جو ہمارے کسی ولی سے عداوت کرے ہم اس کو اعلان جنگ سناتے ہیں۔ لڑائی کا الٹی میٹم دیتے ہیں۔ پھر کیا خدا کا کوئی مقابلہ کرسکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ غرض وہ اتنے قوی ہوتے ہیں۔ ظاہر میں تو بہت پست اور ضعیف مگر باطن میں بڑے رفیع اور قوی۔ مولنا اسی اثر کو فرماتے ہیں۔

ہر کہ ترسید از حق و تقوی گزید
ترسد ازوے جن و انس و ہر کہ دید

جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اور تقویٰ اختیار کرتا ہے جنات اور انسان اور جو بھی اسے دیکھتے ہیں اس سے ڈرتے ہیں۔

اور وہ کیا چیز ہے جو بزرگوں کو عطا ہوتی ہے جس سے سب پر ان کی ہیبت ہو جاتی ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں جب ان کو حکم ہوا کہ جاؤ فرعون کے پاس اس کو

توحید کی دعوت کرو۔ اس وقت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔ **رب انی قتلت منھم نفساً فاخاف ان یقتلون واخی ھارون ھوافصح منی لسانا فارسلہ معی ردءً یصدقنی انی اخاف ان یکذبون** کہ میں نے قبطیوں میں سے ایک کو قتل کردیا تھا مجھے خوف ہے کہیں مجھے قتل نہ کریں اور میرے بھائی ہارون کی زبان صاف ہے ان کو بھی رسول بنا کر میرے ساتھ کردیجئے مجھے ڈر ہے کہیں وہ لوگ میری تکذیب نہ کریں تو اللہ تعالیٰ جواب میں فرماتے ہیں۔ **سنشد عضدک باخیک ونجعل لکما سلطانا فلایصلون الیکما بآیاتنا انتما ومن اتبعکما الغالبون** یعنی وعدہ فرمایا کہ تمہارے بھائی کو تمہارا قوت بازو بنادیں گے یہ اجابت ہے انکی درخواست کی مگر حقیقت میں اس کے علاوہ ایک اور قوت کی ضرورت تھی وہ موسیٰ علیہ السلام کے ذہن میں ظاہرا نہ آئی تھی۔ نہیں نہیں ذہن میں تو کیوں نہ ہوتی۔ انبیاء کے قلوب میں تو یہ بات راسخ ہے کہ بغیر تائیدایزدی کے کچھ ہو نہیں سکتا بلکہ زبان پر نہ آئی تھی اس کو فرمایا نجعل لکما سلطانا کہ ہم تم کو ایک قوت دیں گے اس سے وہ قوت مراد نہیں جوان کے جسم میں تھی بلکہ سلطان غلبہ کو کہتے ہیں۔ یہ وہی ہے جس کو ہیبت اور رعب کہا جاتا ہے حالانکہ یہاں کوئی سامان نہ تھا بیک بینی و دوگوش سیدھے سادھے طریق سے دونوں حضرات تشریف لے گئے تھے نہ کوئی بندوق تھی نہ تلوار تھی مگر فرعون کی حالت یہ ہے کہ دیکھ کر تھرا گیا زبان نہیں کھلتی تھی بات نہ کرسکتا تھا مولٰنا فرماتے ہیں۔

ہیبت حق است ایں از خلق نیست　　ہیبت ایں مرد صاحب دلق نیست

یہ ہیبت حق کی ہے خلق کی نہیں ہے کچھ ہیبت صاحب دلق کی نہیں ہے۔

یہ رعب اس گذری پوش کا نہیں یہ خدا کا رعب ہے۔ اب بھی اکثر اہل باطل کو دیکھا ہے کہ اہل حق کے سامنے دب جاتے ہیں تو یہ آثار ہیں منصوریت کے کہ جوان کے آزار کے درپے ہو وہ ان کا ضرر تو کیا کرے گا خود کو ذلیل کردیگا تو اس طائفہ کا کام شریعت کو تحریف سے بچانا ہے اگر ساری دنیا باطل پر جمع ہوجاوے تب بھی دین اسلام میں تحریف نہیں کرسکتی کیونکہ یہ طائفہ دین کو محفوظ رکھے گا ورنہ ان مخالفین دین نے تو جن میں بعضے مدعیان دین بھی ہیں دین کے مٹانے میں کچھ تقصیر نہیں کی بقول شیرازیؒ۔

قتل ایں خستہ بشمشیر تو تقدیر نبود　　ورنہ ہیچ از دل بے رحم تو تقصیر نبود

اس ناتواں کا قتل تیری تلوار سے مقدر نہ تھا ورنہ بے رحم دل سے ذرا برابر بھی کسر باقی نہیں تھی۔

شریعت زبان حال سے گویا کہتی ہے کہ تم نے تو میرے بگاڑنے میں کسر نہ کی تھی مگر میری

تقدیر ہی میں تمہارے ہاتھوں مٹانا تھا اور یہ اہل حق عدد میں قلیل ہوتے ہیں مگر قوت میں بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ دیکھئے فرق باطلہ کثیر اور اہل حق قلیل اور پھر ان اہل حق میں بھی محقق بہت کم گو محق کثرت سے ہوں مگر بایں ہمہ دین کی وہی حالت ہے کہ۔

هنوز آں ابر رحمت درفشاں ست ‏ ‏ ‏ ‏ خم و خمخانہ با مہر و نشان ست

اب بھی ابر رحمت درفشان اے خم وخمخانہ مہرو نشان کے ساتھ ہے۔

وہی مہر وہی علامت وہی مار کہ باقی ہے یعنی ایسا محفوظ ہے کہ یہی سمجھ میں نہیں آسکتا کہ اس میں سے کیا چیز خراب ہوئی باقی جس دن خدانخواستہ خراب ہوجائیگا بس سمجھ لو قیامت قریب ہے اس کی نسبت فرماتے ہیں۔ **لا یزال طائفة من امتی ظاهرین علی الحق** (سنن ابن ماجۃ: ۱۰) یعنی وہ غالب رہیں گے اور جن مخالفین کا اوپر ذکر ہے ان لوگوں کی یہ حالت ہے کہ انہوں نے دین کے مٹانے میں کوئی کسر نہیں رکھی حتی کہ علماء حق کو لکیر کا فقیر سمجھتے ہیں اور ان کو رائے دیتے ہیں کہ یوں ہونا چاہیے یوں کرنا چاہیے۔

بددین عقلاء:

اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اسرار واحکام شریعت کے سمجھنے کیلئے اپنی عقل کو کافی سمجھتے ہیں۔ بس جہاں جو کچھ سمجھ میں آ گیا اس کو تسلیم کر لیا۔ اور بعض جگہ جو سمجھ میں نہیں آیا تو اس کی نسبت کہہ دیتے ہیں کہ اس کو علماء نے بنالیا ہے۔

چنانچہ ایک بیرسٹر تھے الہ آباد میں انہوں نے ایک مولوی صاحب سے کہا کہ سود کو حلال کر دو وہ غریب یہی سمجھتا تھا کہ مولوی صاحب کی قدرت میں ہے حلال کرنا۔ مولوی صاحب نے کہا بھلا یہ کس کو قدرت ہے کہ سود کو حلال کرے یہ کیونکر ممکن ہے کہ صریح نص قرآن کے خلاف جرات کرے تو آپ حیرت سے پوچھتے ہیں کیا قرآن میں سود کا حرام ہونا مذکور ہے۔ مولوی صاحب نے قرآن کی آیت سنائی تو اس خیال سے توبہ کی اور کہا واللہ میں تو اب تک یہی سمجھے ہوئے تھا کہ یہ مولویوں نے بنا رکھا ہے خیر یہ ندامت بھی ایمان کی بدولت ہوگئی۔ وہ بیرسٹر صاحب مشہور تھے مولوی کر کے مگر قرآن کی خبر نہیں تھی ان کو یہ خیال تھا کہ سود کو مولویوں نے حرام کیا ہے اب سب مولوی جمع ہوکر دوسرا حکم کردیں گے۔ بیچارے کو علم نہ تھا۔ علم کے بعد توبہ کر لی۔ پھر بھی غنیمت ہے کیونکہ وہ ممالک متحدہ کے نہ تھے بمبئی کے تھے۔ جہل بسیط میں مبتلا تھے جہل مرکب میں نہ تھے کیونکہ جو جہل مرکب میں مبتلا ہے اس کی اصلاح نہیں ہوتی۔ اب تو یہ حالت ہے کہ اس کو قرآن کا

حکم تسلیم کر کے جان بوجھ کر بدلتے ہیں چنانچہ ایک رسالہ میں یہ لکھا تھا کہ احل اللہ البیع وحرم الربوا (اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال کیا اور سود کو حرام قرار دیا) میں یہ لفظ ربوا نہیں ہے بلکہ ربابضم الراء ہے جیسے ہوش ربا و دلربا ربودن سے جس کے معنی چھیننے غصب کرنے کے ہیں۔ مولویوں نے زیر لگا دیا نہ معلوم قرآن میں فارسی کہاں سے آ گئی؟ وہ تو لغت عرب پر نازل ہوا ہے اور یہ ان کے نزدیک بالکل ٹھیک تھا۔ چودہ قرات میں تو کہیں یہ ہے نہیں یہ پندرہویں قرات ہوگی تو لکھا ہے کہ مطلب قرآن کا یہ ہے کہ چھین جھپٹ کر کے مال نہ کھاؤ باقی سود تو رضامندی سے ہوتا ہے مولویوں نے زیر لگا کر ربا بنا دیا۔ حضرت کے زمانہ میں زیر نہ تھا۔ کوئی پوچھے اس احمق سے کہ اس وقت کیا تھا تیرے پاس اس کی کوئی دلیل ہے اگر دلیل ہو تو لا۔

پھر یہ کہ قرآن میں فارسی اور اگر فارسی بھی ہے تو مصدر بھی نہیں بلکہ اسم فاعل ہوگی تو معنی یہ ہوئے کہ ربائندہ کو نہ کھاؤ یہ تو لغۃً حماقت ہے اور عقل کی رو سے یہ جہالت ہے کہ اگر ربوا حلال ہو تو کافروں سے لیں یا مسلمانوں سے کافروں کو تو ضرورت نہیں کیونکہ کافروں کے پاس بہت مال ہے تو کافروں سے تو سود لینے کی نوبت نہ آوے گی وہ خود ہی مالدار ہیں وہ تو مہاجن ہیں۔ مہاجن تمہارے در پر کیوں آویگا۔ کافر سے تو لے نہ سکے اب مسلمان سے لوگے۔ تو ایک تو مسلمان ہندوؤں ہی کے ہاتھ تباہ حال ہیں اب دو طرف سے ذبح ہوں گے کہ کافر ان سے الگ سود لیں مسلمان الگ لیں پھر مسلمان کو فائدہ کیا ہوا سود کے حلال ہونے سے افسوس اتنی عقل بھی جس کو نہ ہو وہ قرآن میں دخل دے پھر لوگ اس کو زمانہ شناس بھی کہتے ہیں۔ زمانہ شناس تو ہے نہیں ہاں زنانہ شناس اگر کہتے تو اچھا تھا کہ گھر کے اندر بی بی بچہ ہی کو جانتے ہیں اور کسی بات کی خبر نہیں۔

غرض یہ حالت ہے ہم لوگوں کی کہ دین کی خدمت کرنا تو الگ رہی الٹے دین کے دشمن بنے ہوئے ہیں اور لیجئے ایسے ہی ایک اور شخص کا واقعہ ہے وہ کہتے تھے کہ نماز کیلئے وضو کی ضرورت نہیں وضو مقصود فی نفسہ نہیں ہے۔ پہلے وضو کا حکم اسلئے تھا کہ وہ لوگ بکریاں چراتے تھے اونٹ پالتے تھے وہ موت دیتے تھے چھینٹیں پڑتی تھیں اونچی لنگی ہوتی تھی ہاتھ پیر پر موت کے چھینٹے لگ جاتے تھے اس لئے حکم ہوا کہ ہاتھ پاؤں دھولو اور ہمیں کیا ضرورت ہے؟ ہم تو سر سے پیر تک بوٹ سوٹ دستانوں جرابوں میں جکڑے رہتے ہیں۔ بند کمروں میں بیٹھے رہتے ہیں۔ میں کہتا ہوں اچھا منہ اور سر پر تو موت نہیں پہنچ سکتا تھا پھر اس کے دھونے کا حکم کیوں ہے؟ اس پر شاید یہ کہا جائے گا کہ وہ ریگستانی ملک ہے وہاں غبار بہت اڑتا تھا منہ [illegible] پر غبار رنگ جاتا تھا اس لئے اس کے دھونے کا حکم ہوا اس لغو

تاویل کی بزعم ان کے اس بات سے اور تائید ہوگئی کہ وضو میں اعضائے مکشوفہ ہی کے دھونے کا حکم ہے اعضائے مستورہ کا نہیں۔ ایک تو یہ دعویٰ ہی بددینی تھا پھر شیطان نے یہ تائید بھی بتلادی اس پر اس مقدمہ کا اضافہ ہوگیا کہ ہم تو ہمیشہ غسل کرتے ہیں آئینہ دار مکان میں رہتے ہیں عالی شان کمروں میں رہتے ہیں جس میں ہر میل کچیل سے مامون رہتے ہیں پھر ہمیں کیا ضرورت ہے وضو کرنے کی؟ بس یہ مقدمات گھڑ کے ان کو باہم ترتیب دے کر یہ نتیجہ نکال لیا کہ بدون وضو کے نماز جائز ہے۔

کوئی اس جاہل سے یہ پوچھے کہ حضرات صحابہ ہی کے ہاتھوں اللہ تعالیٰ نے قیصر و کسریٰ کے خزائن اور محلات و قصور فتح کرادیئے تھے اور یہ بکری چرانے والے ایسی عالی شان بادشاہت کے مالک بنے تھے جس کا تم کو خواب بھی نہیں آسکتا تو کیا اس درجہ پر پہنچ کر انہوں نے وضو کو ترک کر کے بے وضو نماز شروع کردی تھی۔ اگر نہیں تو کیا تم ان سے زیادہ قرآن کو سمجھتے ہو؟

اور لیجئے ایک بہت بڑے بیرسٹر فخریہ کہتے تھے کہ ہم نے جس روز امتحان کا پرچہ لکھا ہے نماز قصر پڑھی تھی کسی نے پوچھا کیوں کہا قرآن میں آیا ہے **لیس علیکم جناح ان تقصروا من الصلوٰة ان خفتم** (تم کو اس میں کوئی گناہ نہ ہوگا کہ تم نماز کو کم کردو اگر تم کو اندیشہ ہو) اور ہمیں امتحان کی وجہ سے خوف تھا کہ پرچہ اچھا لکھا گیا یا نہیں ان سے کوئی پوچھے کہ **ان خفتم** کا معقول کیا ہے مگر یہ لوگ کہہ دیں گے **ان یفتنکم** جو امتحان کے معنی میں بھی آتا ہے اور ممتحن کفار تھے اس لئے **ان یفتنکم الذین کفروا** (کہ تم کو کافر لوگ پریشان کریں گے) صادق تھا۔ مگر ایک شخص نے بہت اچھا جواب دیا کہ اگر تم نماز نہ پڑھتے تو اچھا تھا کہ اپنے کو گنہگار تو سمجھتے اور نماز کی قضا تو کرتے اب تو اس اجتہاد کی گھمنڈ میں تم نے اپنے کو گنہگار بھی نہ سمجھا اور نہ نماز کی قضا کی حالانکہ یہ اجتہاد محض غلط ہے کیونکہ یہ حکم ایک۔ اور شرط سے بھی مشروط تھا جس کو تم نے حذف کردیا کیونکہ آیت کی ابتدا اس طرح ہے **واذا ضربتم. فی الارض فلیس علیکم جناح** (اور جب تم زمین پر سفر کرو تو تم پر کوئی گناہ نہیں) اور تم نے امتحان کے دن کونسی منزل یا مسافت طے کی تھی۔ اب بیرسٹر صاحب کی آنکھیں کھلیں کہنے لگے واقعی ہم نے اس شروط پر غور نہیں کیا پھر نماز قضا کی۔ کیونکہ اتنا وہ بھی جانتے تھے کہ کوئی قانون معاہدہ اگر مشروط ہو دو شرطوں کے ساتھ وہ ایک شرط کے پائے جانے سے متحقق نہیں ہوتا ہے اور یہاں قصر مشروط ہے دو شرطوں کے ساتھ ایک تو خوف کفار دوسرا سفر۔ گو اس شخص نے کسی درجہ میں تاویل کر کے ایک شرط پیدا کرلی تھی یعنی خوف فار مگر دوسری شرط تو موجود نہیں تھی یعنی **اذا ضربتم فی الارض** یعنی جب سفر کرو زمین میں۔ مگر سمجھانے سے وہ مان گئے کہ واقعی مجھ

سے غلطی ہوئی۔ خیر صاحب پھر بھی وہ اوروں سے غنیمت تھے غلطی کا اقرار تو کر لیا۔ مگر ممکن ہے کہ کوئی صاحب امتحان کے دن اس شرط کو بھی پورا کر لیں اور کہنے لگیں ضرب کے معنی چلنے کے ہیں اللہ میاں فرماتے ہیں جب چلو زمین میں اور ہم بھی تو زمین میں چلے ہیں۔ کہ گھر سے دارالامتحان تک چل کر آئے گھر میں۔ کہتا ہوں پھر اس طرح تو امتحان کی بھی تخصیص نہ رہے گی تم کو ہمیشہ قصر ہی پڑھنا چاہیے کیونکہ دو چار قدم تو گھر میں بھی چلنے کی نوبت آتی ہے۔

اب ان سب سے بڑھ کر اور لیجیے ایک شخص ہمیشہ گھر میں بھی قصر پڑھا کرتے تھے آپ کا استدلال بھی سنئے کہتے تھے کہ حدیث میں آیا ہے **کن فی الدنیا کانک غریب او عابر سبیل** (الصحیح للبخاری ۸: ۱۱۰ - المصابیح ۳: ۵۲۷) کہ دنیا میں اپنے کو مسافر سمجھ کر رہو پس ہم تو دنیا میں مسافر ہیں اور مسافر کو قصر پڑھنا چاہیے۔ ایک اور صاحب تھے معقولی انہوں نے ترمذی شریف کی حدیث میں ایک باطل تاویل کی تھی حدیث میں ہے **لایقبل اللہ صلوۃ بغیر طہور**. (سنن النسائی ۱: ۸۷) فرماتے تھے اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بغیر وضو کے نماز کو قبول نہیں کرتے ہیں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ بدون وضو کے نماز صحیح بھی نہیں ہوتی اور عدم قبول کو عدم صحت لازم نہیں۔ ممکن ہے بلا وضو صحیح تو ہو جاوے مگر مقبول نہ ہو۔ پھر بعد میں وضو کر لے تو قبول بھی ہو جائیگی تو وضو شرط قبول ہے نہ کہ شرط صحت۔

کانپور میں ایک شخص نے بیان کیا کہ ایک مدعی حدیث دانی سڑک پر جا رہا تھا سڑک کے ایک جانب مسجد تھی جس میں پانی تھا مگر باوجود اس کے اس مدعی نے تیمم کر کے نماز پڑھی۔ راوی نے کہا بھائی پانی تو قریب ہے تم نے تیمم کیسے کیا کہا وہ مسجد میں تھا ہم نے جہاں نماز پڑھی وہاں تو نہ تھا۔ انہوں نے کہا فقہاء نے تو دوری کی حد بتلا دی ہے کہ کتنے دور ہونے سے تیمم کر سکتا ہے کہا وہ دوری ابو حنیفہؒ کی شرط ہے قرآن میں اس کا ذکر کہاں ہے قرآن میں تو مطلق آیا ہے کہ جب پانی نہ ملے تیمم کر لو۔ یہ آپ کے اجتہاد اور فتویٰ کا حال دیکھئے۔ آپ کیا پوچھتے ہیں اگر دین ان لوگوں کے ہاتھ میں ہوتا تو نہ معلوم اس کی کیسی بری گت بنتی۔

مطلوب اہل باطل:

اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اہل باطل نے اپنا اصل مطلوب تو ہوائے نفسانی کو بنایا اور قرآن وحدیث میں تاویلیں کر کے ان کو اپنی اغراض کی آڑ بنایا جہاں سہارا مل گیا وہ تو ان کی دلیل ہو ہی گئی مگر جہاں خلاف بھی ہو گیا اس کو ہیر پھیر کر اپنے موافق کر لیا۔ اس قسم کی جماعتیں پہلے بھی رہی ہیں مگر ان کے یہاں کچھ تدین تھا قرآن وحدیث سے کچھ نہ کچھ سہارا حاصل کر لیتے تھے اور اب تو یہ کہتے

ہیں کہ ہماری رائے یہ ہے یوں ہونا چاہیے۔ چنانچہ احکام میں اس قسم کی فلاسفی اور اسرار بیان کرتے ہیں جوان کی ہوا کے موافق ہو سو خوب سمجھ لو اس میں دین کا بہت ہی بڑا ضرر ہے اولاً تو یہ دیکھنا چاہیے کہ آپ نے جن کو حکم اور مصالح خیال کیا آیا واقع میں بھی وہ مصالح ہیں یا نہیں اور اگر فرضاً وہ مصالح بھی ہوں تو ان کو حکم کا مبنیٰ قرار دینا بڑی خرابی کا سبب ہے کیونکہ وہ احکام کی علت اور لم تو نہیں ہیں مصالح ہی تو ہیں اور جب مصالح کو مبنیٰ قرار دیا تو اگر کسی وقت یہ مصالح زائل ہو جائیں تو حکم ہی کو منعدم سمجھے گا یا اگر کسی دوسرے فعل سے وہ مصلحت حاصل ہو جائے تو یہ شخص اس دوسرے فعل کو کافی سمجھے گا اور پہلے کو چھوڑ دیگا اور ظاہر ہے کہ یہ صریح تغیر ہے دین میں اور تبدل ہے شرع کی۔ مسلمان کو ایسا کرنا کیسے جائز ہو سکتا ہے۔ یہ دین کے خیر خواہ بنتے ہیں مگر ان کی خیر خواہی کی حقیقت وہ ہے جس کو مولنا فرماتے ہیں۔

دوستی بے خرد چوں دشمنی ست　　　حق تعالیٰ زین چنیں خدمت غنی ست

بے عقل کی دوستی دشمنی ہے حق تعالیٰ شانہ کو ایسی خدمت کی ضرورت نہیں۔

جیسے کسی نے ایک ریچھ کو تعلیم دی تھی کہ جب وہ سوجاتا تھا تو یہ بیٹھ کے مکھی اڑاتا تھا۔ ان جانوروں کی تعلیم تو ہو جاتی ہے مگر ایسی تعلیم کہ **حفظت شیئاً وغابت عنک اشیاء** ایک خیر خواہ نے کہا کہ آپ نے کس کو مقرب بنایا ہے یہ تو انسان کا دشمن ہے تم نے یہ کام کیسے سپرد کیا تو آپ فرماتے ہیں ہمارا ریچھ تعلیم یافتہ ہے وہ ہمارا خیر خواہ ہے اس سے نقصان نہیں ہوگا واہ رے تعلیم یافتہ اس پر رڑکی کا ایک واقعہ یاد آ گیا جنٹلمین کیچڑ میں جلدی جلدی قدم بڑھائے جا رہے تھے ہمارے ماموں صاحب بھی وہاں تھے انہوں نے فرمایا کہ بھائی پاؤں جما کے رکھو آہستہ آہستہ چلو کبھی گر نہ جاؤ آپ نے کہا میں گر نہیں سکتا میں اقلیدس کے قاعدہ پر چل رہا ہوں ماموں صاحب خاموش ہو گئے وہ تھوڑے ہی دور چل کر گر پڑے تو ماموں صاحب نے پوچھا ہاں بھائی یہ کونسی شکل تھی تو جیسے یہ تعلیم یافتہ تھے اور ان کو اقلیدس کے اوپر ناز تھا تو وہ ان کا ریچھ بھی ایسا ہی تعلیم یافتہ تھا ایک روز آپ سو رہے تھے اور ریچھ صاحب بیٹھے ہوئے مکھی اڑاتے تھے ایک مکھی اس کے ناک پر آ بیٹھی ریچھ نے اس کو اڑا دیا تو وہ پھر آ گئی پھر اڑایا پھر آ گئی۔ بعض مکھی بڑی ضدی ہوتی ہے۔ غرض اس کو اڑاتا رہا اور بار بار وہ آ کے بیٹھتی رہی۔ ایک بادشاہ کا قصہ ہے کہ اس نے ایک دفعہ مکھیوں سے تنگ آ کر اپنے وزیر سے کہا کہ خدا نے جو مکھی پیدا کی ہے اس کے پیدا کرنے سے معلوم نہیں کیا فائدہ وزیر نے کیا خوب جواب دیا وہ یہ کہ متکبروں کا غرور ٹوٹ جاوے یعنی خدا نے

اس کو اس لئے پیدا کیا تا کہ فرعونیت دور ہو کہ تم ایک مکھی کے اڑانے پر بھی قادر نہیں ہو اگر وہ ضد پر آ جائے تو تمہارا ناک میں دم کر دے اس جواب سے بادشاہ کا دماغ سیدھا ہو گیا۔ غرض ریچھ بار بار مکھی کو اڑاتا وہ پھر آ جاتی وہ کسی طرح جاتی نہ تھی ریچھ کو غصہ آ گیا کہا اب تجھے ٹھیک کروں گا۔ چنانچہ ایک بڑا پتھر اٹھا لایا جب وہ پھر آ کر بیٹھی آپ نے زور سے پتھر مارا جس سے مکھی تو کیا مرتی مگر مالک کے دماغ کا کچلہ بن گیا۔ اور ریچھ خوش تھا کہ لے اب بیٹھ کہاں بیٹھے گی اب میں نے اڑا ہی اڑا دیا۔ مکھی تو خدا جانے اڑی یا مری مگر اس کے سر کا تو قیمہ ہو گیا اس کا تو چکنا چور کر دیا تو جس طرح یہ ریچھ خادم تھا ایسے ہی یہ لوگ خادم دین ہیں۔

دوستی بے خرد چوں دشمنی ست   حق تعالیٰ زیں چنیں خدمت غنی ست

بے عقل کی دوستی دشمنی ہے حق تعالیٰ شانہ کو ایسی خدمت کی ضرورت نہیں۔

دین اور مصالح عقلیہ:

چنانچہ اس خادم نے بزعم خود یہ خدمت کی کہ نماز روزہ کی حکمت بیان کرنا شروع کی کہ نماز جماعت کے ساتھ ادا کرنے کا جو حکم ہے اس میں یہ حکمت ہے کہ اس سے اتفاق پیدا ہوتا ہے اور اتفاق مطلوب ہے اور یہ ایک عام مرض ہو گیا ہے۔ سب کی زبان پر آتا ہے کہ جماعت سے یہ مطلوب ہے کہ اتفاق ہو اور اس کو عجیب ترتیب سے بیان کرتے ہیں کہ اتفاق کی رعایت شارع نے کیسی عجیب کی ہے کہ اول تو اہل محلہ کے اتفاق کی ضرورت ہے تو اس کیلئے یہ تجویز کیا کہ پانچ وقت مسجد میں جا کر جماعت سے نماز پڑھو جس میں ہر شخص کو آنا ضروری ہے جب دن میں پانچ دفعہ ملیں گے اور آپس میں سلام کلام ہو گا تو ایک دوسرے سے محبت ہو جائے گی ایک دوسرے کا ہمدرد ہو جائے گا۔ آپس میں جنگ وجدال باقی نہیں رہے گا تبادلہ خیالات ہو گا وہی تبادلہ تبادلہ ہر جگہ ہے وہ ٹیپ کا بند ہے۔ غرض پنج وقتی نمازوں میں تو اہل محلہ کا اتفاق اور تبادلہ خیالات ہو گیا مگر شہر کے سب لوگ پانچ وقت جمع نہیں ہو سکے لہذا اس کیلئے جمعہ رکھا اس لئے کہ شہر کے سارے لوگوں کا ہر وقت جمع ہونا مشکل تھا کسی کا مکان قریب ہے کسی کا دور۔ لہذا ان کیلئے ہفتہ میں ایک دن مقرر کیا کہ جامع مسجد میں آؤ اور یہاں سب مل کر تبادلہ خیالات کرو۔ پھر اطراف ونواح کے لوگ شریک ہونے سے رہ گئے تھے تو ان کی رعایت سے عیدین کی نماز رکھی گئی کہ وہ اس میں شرکت کر کے تبادلہ خیالات کر سکتے ہیں۔ پھر ضرورت ہوئی تمام عالم کے جمع ہونے کی تا کہ سارے عالم میں اتفاق ہو ہر ایک جگہ سے بطور نمائندہ کچھ آدمی آویں اور تبادلہ خیالات کر کے جاویں اور اپنے اپنے شہروں کو

جا کر خبر کریں اس لئے جج مقرر کیا گیا کیا واہیات خرافات ہے۔

فلاسفہ کی بدفہمی:

اپنے نزدیک تو یہ لوگ بڑے خوش ہوئے ہوں گے کہ ہم نے بڑے حکم اور مصالح بیان کئے مگر یہ ساری تک بندی ایسے ہے جیسے یونانی حکماء نے نظام عالم کیلئے عقول عشرہ کو گھڑ لیا ہے اور اپنی گھڑت کے ایسے معتقد ہیں گویا ان کے گھڑنے سے ہی نظام عالم ٹھیک ہو گیا۔ حیرت کی بات ہے کسی ایسی ہی فلسفی سے سوال کیا گیا تھا کہ چیتے کا رنگ مختلف کیوں ہے کہیں سفید کہیں سیاہ جب تمہارے نزدیک طبیعت فاعل ہے اور وہ واحد ہے تو اس کا فعل ایک ہی نہج پر ہونا چاہیے مختلف نہ ہونا چاہیں فلسفی صاحب نے جواب دیا کہ اس کا کوئی جد امجد ایک درخت کے سایہ میں بیٹھ کرتا تھا جس سے کچھ حصہ تو اس کا دھوپ میں رہتا اور کچھ سایہ میں جتنا سایہ میں تھا وہ تو سیاہ ہو گیا اور جو دھوپ میں آ گیا وہ سفید ہو گیا واہ کیا خوب اپنے نزدیک تو فلسفہ ختم کر دیا مگر اس احمق کو خبر نہیں کہ اگر دھوپ سے سفید ہوا ہے تو کیا ہمیشہ ایک ہی جگہ دھوپ پڑتی ہے وہ تو بدلتی رہتی ہے اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ چیتا بڑا مہندس اور اعلیٰ درجہ کا انجینئر تھا کہ ہمیشہ پرکار لگا کر بیٹھا کرتا تھا اور انجینئر ہونے کے ساتھ اتنا بڑا صاحب کرامت بھی تھا کہ آفتاب کو مقید کر دیا تھا کہ اپنی جگہ سے بالکل ٹل نہ سکے ورنہ سایہ کی جگہ دھوپ اور دھوپ کی جگہ سایہ آفتاب کی حرکت سے ہوتا رہتا ہے تو پھر یہ صحت تسخ ہوئی۔ دیکھئے کیسا حساب بنا دیا؟ ایسے ہی احمقوں نے انسان کے جد اعلیٰ کو بندر بنا دیا کہ انسان پہلے بندر تھا پھر آدمی ہوا میں کہا کرتا ہوں کہ تمہارے باپ دادا بندر ہوں گے۔ ہمارے آباؤ اجداد تو ہمیشہ سے آدمی ہی تھے اور غضب ہے مولوی عالم فاضل کی زبان سے ایسی باتیں صادر ہوں۔ چنانچہ ایک صاحب علامہ کے لقب سے مشہور ہیں ان سے کسی نے سوال کیا وہ سائل بھی بڑے آدمی تھے سوال یہ کیا کہ اگر انسان بندر سے آدمی بنا ہے جیسا آپ کا عقیدہ ہے کہ طبیعت حیوانیہ ترقی کرتے کرتے بندر بنی پھر جو بندر نے ترقی کی تو انسان ہو گیا یہ قرآن کے خلاف ہے قرآن سے تو معلوم ہوتا ہے کہ تمام انسان آدم علیہ السلام سے پیدا ہوئے تو علامہ نے کہا ممکن ہے کہ پہلا بندر جو انسان بنا تھا وہ آدم ہی ہوں نعوذ باللہ توبہ توبہ یہ مسلمان ہیں علامہ ہیں صاحب تصانیف کثیرہ ہیں۔ ان کا یہ جواب اور یہ عقیدہ۔ ڈارون کو تو اس عقیدہ کی اس لئے ضرورت تھی کہ وہ کافر تھا مگر وہ پھر عاقل تھا ان علامہ کی طرح بیوقوف نہ تھا کیونکہ ان علامہ کے قول پر تو یہ اشکال لازم آتا ہے کہ پہلا بندر جو انسان بنا۔ وہ ایک ہی ہو اور یہ خود قانون ارتقاء کے خلاف ہے اور

ڈارون پر یہ اعتراض نہیں پڑتا کیونکہ وہ ایک بندر کو اصل انسان نہیں سمجھتا وہ تو یہ کہتا ہے کہ جس وقت بندر نے ترقی کی ہے تو ایک دم بہت سے بندر انسان ہو گئے تو یہ ان مسلمانوں پر کیا غضب ہے کہ ان میں نہ عقل ہے جیسا ابھی بیان ہوا نہ دین ہے کہ قرآن میں تحریف کی نہ تہذیب ہے کہ آدم علیہ السلام کے نہ باپ ہونے کا لحاظ ہے نہ نبی ہونے کا۔

اس سے بڑھ کر ان کے ایک شاگرد نے یہ کہہ دیا کہ آدم علیہ السلام نبی ہی نہ تھے ایک مثل ہے کہ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا ان کو اسی مثل کے موافق اس کی تائید میں بزعم ان کے ایک جملہ حدیث کا مل گیا۔

ایک حدیث ہے میں اس کو بیان تو نہ کرتا مگر اب کروں کیا قرآن حدیث سب کا ترجمہ اردو میں ہے اور ان بددینوں کی کتابیں بھی اردو میں ہیں نہ معلوم اس سے کون کس غلطی میں پڑ جائے اس لئے بیان کرنا پڑتا ہے۔ اگر ہم قادر ہوتے تو بدفہم لوگوں کو ان کتابوں کے مطالعہ سے روک دیتے۔ غرض ان کو ایک حدیث ملی اس سے دھوکہ ہو گیا کہ آدم علیہ السلام نبی نہ تھے وہ حدیث شفاعت کی ہے۔ اس میں یہ آیا ہے کہ لوگ قیامت کے روز پریشان ہو کر شفاعت کیلئے مختلف پیغمبروں کے پاس جاویں گے پہلے آدم علیہ السلام کے پاس جاویں گے پھر نوح علیہ السلام کے پاس آویں گے اور نوح عیہ السلام سے کہیں گے کہ آپ اول رسول ہیں آپ ہمارے واسطے سفارش کیجئے یہ حدیث ان کو مل گئی استدلال کا حاصل ہے یہ کہ دیکھو اس میں آیا ہے نوح علیہ السلام اول رسول ہیں تو سب سے پہلے نبی نوح علیہ السلام ہوئے ان سے پہلے کوئی نبی نہیں ہوا اور آدم علیہ السلام نوح علیہ السلام سے پہلے ہیں ہذا وہ نبی نہیں یہ دلیل تو پیش کی مگر **حفظت شیئاً وغابت عنک اشیاء** (ایک چیز یاد رکھی اور دوسری چیز اس سے غائب کر دی) یہ خبر نہیں کہ یہی حدیث بتلا رہی کہ آدم علیہ السلام نبی تھے۔

اور یہ موٹی بات ہے کیونکہ اس حدیث میں غیر پیغمبروں سے طلب استعانت کا کہیں ذکر نہیں صرف انبیاء علیہم السلام سے مدد طلب کرنا مذکور ہے اور سب سے اول آدم علیہ السلام سے شفاعت کے خواہاں ہوں گے اگر غیر انبیاء سے بھی شفاعت میں استعانت کرتے تو غیر انبیاء بہت تھے اولیاء اقطاب لقمان علیہ السلام خضر عیہ السلام جن کی نبوت مختلف فیہ ہے ان کا بھی ذکر نہیں وغیرہم مگر ان سے استعانت نہیں کرینگے تو آدم علیہ السلام کے پاس شفاعت کیلئے جانا اگر وہ نبی نہ ہوتے تو ان کو انبیاء علیہم السلام کے ساتھ کیوں ذکر فرماتے یہ خود دلیل ہے اس کی کہ وہ نبی تھے لیجئے ورنہ سب سے اول نوح علیہ السلام کے پاس جاتے خود اسی حدیث سے ثابت ہو گیا کہ وہ نبی تھے۔ باقی

نوح علیہ السلام سے جو کہا گیا کہ آپ اول رسول ہیں اس کے یہ معنی نہیں کہ نوح علیہ السلام سے پہلے کوئی نبی نہیں ہوئے بلکہ اور بھی نبی ہوئے۔ تاریخ سے متعدد نبیوں کا نوح علیہ السلام سے پہلے ہونا ثابت ہے قرآن سے بھی ادریس علیہ السلام کی نبوت ورسالت ثابت ہے **کما قال تعالیٰ فی سورۃ مریم علیہ السلام واذکر فی الکتاب ادریس انہ کان صدیقا نبیا** (اور اپنی اس کتاب میں حضرت ادریس علیہ السلام کا بھی ذکر کیجئے بیشک وہ راستی والے نبی تھے) **الآیۃ** اور وہ بہ اتفاق مورخین نوح علیہ السلام سے پہلے تھے تو نوح علیہ السلام کو اول رسول کہنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان سے پہلے اور نبی نہیں ہوئے بلکہ اس کا مطلب دوسرا ہے جس کو وہ مستدل سمجھا نہیں۔

اس لئے میں کہا کرتا ہوں کہ ضرورت ہے بزرگوں کی جوتیاں سیدھی کرنے کی اس مطلب کی تقریر میں نے کسی کتاب میں نہیں دیکھی مجھے تو اپنے ایک بزرگ کی تقریر سے قناعت ہوگئی۔ شاید کسی کتاب میں بھی موجود ہو اور ممکن ہے کتابوں میں اس سے بھی اچھا جواب ہو میری نظر زیادہ وسیع نہیں مگر ہمیں تو ایسے بزرگ مل گئے تھے کہ باوجود اپنی عدم وسعت نظر کے ہم کو ان کی شرح کفایت ہوگئی۔ وہ تقریر میں نے استاد علیہ الرحمۃ سے سنی ہے انہوں نے فرمایا کہ نوح علیہ السلام کو جو اول رسول فرمایا گیا تو وجہ اس کی یہ ہے کہ پیغمبر دو قسم کے ہوئے ایک تو وہ جو کہ تعلیم معاد کے ساتھ تعلیم معاش بھی کرتے تھے کیونکہ ابتدائے عالم میں تعلیم معاش کی بھی ضرورت تھی انسان کی عقل اتنی کامل نہ تھی کہ بغیر کسی کے بتلائے تمام ضروریات معاش کو خود سمجھ لیتے اس لئے معاش کی بھی تعلیم ہوتی تھی انسان کی تو بس اتنی عقل ہے کہ جب ہابیل کو قابیل نے قتل کر دیا تو اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس کو چھپائے کیسے آدمی اس وقت تک دفن کرنا نہیں جانتے تھے کیونکہ کسی کو موت تو آئی نہ تھی تو جو بات اب ایک چھوٹا بچہ بھی جانتا ہے وہ اس کی سمجھ میں نہ آئی۔ غرض لاش کو لئے لئے مارا مارا پھرتا تھا مورخین نے لکھا ہے کہ ایک سال کامل لاش کندھے پر لادے پھرا اس حالت پر خدا کو رحم آیا وہ ایسے رحیم ہیں کہ گنہگار پر بھی ان کو رحم آتا ہے **فبعث اللہ غرابا یبحث فی الارض لیریہ کیف یواری سواۃ اخیہ** خدا نے دو کوؤں کو بھیجا کہ آپس میں لڑیں اور ایک دوسرے کو مار کر زمین میں دفن کر دے تاکہ اس کو دفن کرنا سکھلا دے **قال یویلتی اعجزت ان اکون مثل ھذا الغراب فاواری سواۃ اخی** یہ کیفیت دیکھ کر قابیل بے ساختہ بول پڑا کہ افسوس میں اس کوے کے برابر بھی نہ ہو سکا کہ اپنے بھائی کی لاش کو دفن کر دیتا غرض اس کو اپنی بے عقلی پر بڑی ندامت ہوئی تو انسان کی عقل تو یہ ہے اگر معاش کو انسان کی رائے پر چھوڑا جاتا تو اس سے

کوئی کام بھی نہ ہوتا نظام عالم بگڑ جاتا خدا نے اپنی عنایت وشفقت سے انبیاء کے ذریعہ سے ضروری معاش کی بھی تعلیم دی۔ آدم علیہ السلام نے کپڑا بننا سکھلایا۔ کھیتی سکھلائی ادریس علیہ السلام نے سینا سکھلایا۔ اسی طرح دوسرے انبیاء کے ذریعہ سے تدابیر معاش سکھلائی گئیں تو جب تک اصول معاش مکمل نہ ہوئے تھے انبیاء علیہم السلام دونوں کام کرتے تھے معاش کی بھی تعلیم دیتے تھے اور معاد کی بھی اور جب یہ ضرورت رفع ہوگئی تو معاش کی تعلیم بند کردی گئی کیونکہ دنیا مقصود تو تھی نہیں بلکہ ضرورت کی وجہ سے اس کی تعلیم دی گئی تھی اور بقدر ضرورت تعلیم ہوگئی **والضروری یتقدر بقدر الضرورة** اس کے بعد سے صرف معاد کی تعلیم کرتے تھے تو ایسے انبیاء جو فقط معاد ہی کی تعلیم دیتے تھے ان کا سلسلہ نوح علیہ السلام سے شروع ہوا تو ارسل پر جو الف لام ہے وہ عہدی ہے یعنی جو رسول فقط معاد ہی کیلئے مبعوث ہوئے تھے ان میں اول نوح علیہ السلام ہیں یہ ہے حقیقت اس جملہ کی مگر ان لوگوں کو حدیث سمجھنے کی فرصت کہاں؟ ان کو تو اس کی پرواہ ہی نہیں کہ بات صحیح ہو بس جو زبان پر آ گیا کہہ دیا کچھ خیال نہیں کرتے کہ اس کا وبال کیا ہوگا؟ دین پر ان لوگوں کی زیادتی حد سے بڑھ گئی چنانچہ نماز کے متعلق ایک ترتیب گھڑی کہ اصل مقصود اتفاق ہے جس کی تقریر عنقریب گذری جس جگہ شعر دوستی بے خرد چوں دشمنی ست الخ دوسرے مقام پر مذکور ہے اور ظاہر میں اس کو بڑا اچھا نکتہ سمجھا جاتا ہے مگر واقع میں یہ دین کو سخت مضر ہے اس میں دین کی بڑی خرابی ہے کیونکہ ممکن ہے کہ ایک وقت ایسا آ جاوے کہ نماز سے اتحاد نہ ہو یعنی لوگ نماز تو پڑھیں مگر آپس میں اتحاد کی جگہ تبدد وتشتت ہی بڑھے جیسا اب ہے کہ نماز پڑھتے ہیں لیکن قلوب میں اتفاق نہیں بلکہ بجائے اس کی جنگ وجدل ہے موذن کو امام سے لڑائی ہے دوش بدوش صف میں کھڑے ہیں مگر دلوں میں کینہ وفساد ہے یہ تو نمازیوں کا حال ہوا اور جو لوگ کلب گھر میں گیند بلا یا شطرنج کھیلتے ہیں ان کے آپس میں اتحاد واتفاق ہے پس اگر ایسا زمانہ آ گیا تو جس کے ذہن میں یہ ہے کہ مقصود نماز اور جماعت سے صرف اتفاق ہے اور وہ یہ بھی دیکھے کہ اب نماز سے یہ مقصود حاصل نہیں ہوتا اور کلب گھر میں اتحاد واتفاق حاصل ہوتا ہے تو لامحالہ وہ یہ کہے گا کہ نماز کو چھوڑ کر کلب گھر کی خدمت اختیار کرنی چاہیے اب بتلائیے یہ بددینی ہے یا نہیں یہ گناہ عظیم بلکہ کفر میں ابتلا ہوا یا نہیں؟ حضرت یہ مضرت ہے احکام کے حکم اور مصالح تلاش کرنے میں اگر یہ مرض نہ ہوتا تو لوگ خدا کا حکم سمجھ کر دیوانوں کی طرح ہر حکم کو بجا لاتے اب وہ بات نہ ہوگی بلکہ اب تو سنت کی وجہ سے نماز پڑھی۔ نماز خاص خدا کے حکم کی وجہ سے نہ ہوئی اور اس کے مقابلہ

میں ایک وہ شخص ہے جس کا مذہب یہ ہے۔

زبان تازہ کردن بہ اقرار تو نینگیختن علت از کار تو

تیرے اقرار سے زبان کو تر و تازہ کرنا ہے نہ کہ تیرے کاموں میں علتیں ڈھونڈنا

اور جس کا مشرب یہ ہے۔

زندہ کنی عطائے تو در بکشی فدائے تو
دل شدہ مبتلائے تو ہرچہ کنی رضائے تو

زندہ کریں آپ کی عطا ہے اور اگر قتل کریں تو آپ پر قربان ہوں دل آپ پر فریفتہ ہے جو کچھ کریں میں آپ پر راضی ہوں۔

یہ ایسا مشرب ہے کہ اسکے ہوتے ہوئے شیطان کبھی وسوسہ دل میں ڈال ہی نہیں سکتا۔ بخلاف مشرب مصلحت واتباع حکمت کے کہ اکثر طبائع ایسے مصالح کے بتلانے سے بگڑ جاتی ہیں عقائد تباہ ہو جاتے ہیں۔

علاج فلاسفہ:

خدا کی توحید کے بارہ میں کسی فلسفی نے سو دلیلیں جمع کیں اور یہ طریقہ اختیار کیا کہ ہر شخص سے پوچھتے پھرتے کہ خدا واحد ہے اس کی کیا دلیل؟ جو نہ بتلا سکتا اس کو جاہل اور حقیر سمجھتے غرض لوگوں کو پریشان کر دیا۔ ایک گاؤں والے کے پاس جا کر کہا اس کی کیا دلیل ہے کہ اللہ واحد ہے۔ دیہاتی نے کہا ذرا ٹھہرو گھر میں سے لٹھ لایا اور اس کے پیچھے لٹھ لیکر دوڑا کہا ٹھہر تجھے دلیل بتاتا ہوں یہ لٹھ دلیل ہے وہ بھاگا۔

تو صاحبو یہ ایسی دلیل ہے کہ ٹوٹتی ہی نہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ بلا دلیل اللہ واحد ہے۔ سنار کی کھٹ کھٹ لوہار کی ایک یہ سو کی ایک دلیل ہے مولٰنا یعقوب صاحب اسی باب میں فرماتے ہیں۔

الوعظ ینفع لو بالعلم والحکم والسیف ابلغ وعاظ علی القمم

وعظ نفع دیتا ہے اگر علم وحکمت سے معمور ہو اور تلوار سروں پر تمام واعظین سے بلیغ وعظ ہے۔

اور یہ بھی فرماتے تھے دیکھو لوگ تو کہتے ہیں چار کتابیں نازل ہوئی ہیں مگر میں کہتا ہوں کہ ایک پانچویں کتاب بھی اللہ کی طرف سے نازل ہوئی ہے وہ یہ ہے **لقد ارسلنا رسلنا بالبینات وانزلنا معھم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط وانزلنا الحدید فیه باس شدید ومنافع للناس** کتب اربعہ کے بارے میں بھی انزلنا آیا ہے کہ سب کتابیں آسمان سے نازل ہوئی ہیں اور حدید کے واسطے بھی انزلنا آیا ہے یہ پانچویں کتاب ہے اور بعض وقت ظرافة

فرماتے تھے کہ حدید سے مراد ہے نعلدار جوتا اور مولنا نے اس کا نام رکھا تھا روشن دماغ کے سر پر دو چار لگا دینے سے دماغ درست ہو جاتا ہے۔ اس سے بھی ایک نور پیدا ہوتا ہے۔

تو حضرت دلائل علمیہ اور مصالح عقلیہ بعض کیلئے مضر ہوتی ہیں ہر جگہ ہر کس و ناکس سے ان کو بیان کرنا برا ہے کہیں لٹھ ہی کام دیتا ہے چنانچہ لٹھ سے اس فلسفی کا دماغ ٹھیک ہو گیا۔

دلائل عقلیہ کی بے بسی:

ایک اور فلسفی کی حکایت ہے وہ بڑے عالم تھے جب مرنے لگے تو مرتے وقت شیطان ان سے مناظرہ کو کھڑا ہو گیا۔ مناظرہ توحید ہی میں تھا جس کے سو دلائل ان کے پاس تھے شیطان توحید کے دلائل پر نقوض وارد کرنے لگا یہ جو دلیل قائم کرتے وہ اس کو رد کر دیتا جتنے دلائل ان کے پاس تھے سب ہی پیش کئے اس نے سب کو توڑ دیا اس کے بعد اس نے شبہ ڈالدیا کہ توحید جو اصل الاصول ہے جب اس کی یہ حالت ہے تو اور اصول کی کیا اصل ہے خود ہی سمجھ و قریب تھا کہ ان کو اصول اسلام کی حقانیت میں شبہ یا تذبذب ہو جاتا کہ ایک بزرگ نے ان کی دستگیری فرمائی وہ بزرگ شیخ نجم الدین کبریٰؒ تھے جو اس وقت صدہا میل کے فاصلہ پر اپنے گھر میں وضو کر رہے تھے ان کو مکشوف ہوا کہ اس عالم فلسفی کے اوپر یہ مصیبت نازل ہے آپ نے اپنے خدام سے فرمایا کہ اس وقت ایک بڑے عالم کا ایمان خراب ہوا جاتا ہے کسی نے عرض کیا کہ حضرت بچا لیجئے آپ نے وضو کا پانی زور سے اس طرف پھینکا اور فرمایا کہدو بلا دلیل خدا واحد ہے اللہ تعالیٰ نے یہ پانی اور آواز ان کے کان میں پہنچا دی اور انہوں نے شیطان سے یہی کہا کہ میں بلا دلیل خدا کو واحد مانتا ہوں۔ شیطان یہ سن کر بھاگا اور اس کے دام تزویر سے رہائی ہوئی اسی کو مولنا فرماتے ہیں۔

دست پیر از غائباں کوتاہ نیست   دست او جز قبضہ اللہ نیست

پیر کی توجہ غائبوں سے کوتاہ نہیں ہے اس کا قبضہ بجز اللہ کے قبضہ کے نہیں ہے۔

وہ فلسفی عالم ان بزرگ کی خدمت میں آئے تھے۔ آپ نے ذکر کی تلقین فرمائی اور خلوت کا حکم دیا ذکر شغل شروع کیا تو ان کو معلوم ہوا کہ کوئی چیز اندر سے نکل رہی ہے۔

شیخ سے اس حال کو عرض کیا تو فرمایا کہ تمہارا فلسفہ دل سے نکل رہا ہے یہ ان کو گوارا نہ ہوا شیخ نے فرمایا کہ بھائی ذکر شغل سے اللہ تعالیٰ تم کو اس سے بہتر علم عطا فرما دے گا مگر دل نے نہ مانا اور ذکر شغل چھوڑ کر چلے آئے کہ نقد را بہ نسیہ گذاشتن پر کون عمل کرے فلسفہ تو اس وقت موجود ہے اور علم باطن اب تک حاصل نہیں ہوا نہ معلوم ہو گا بھی یا نہیں غرض شیخ کو چھوڑ کر چلے آئے تھے لیکن فقط ان

کی خدمت میں جانے سے یہ فائدہ ہوا کہ مرتے وقت انہوں نے کیسی بڑی دستگیری فرمائی کہ عذاب ابدی سے بچا لیا۔ ایک اور شخص تھے حضرت حاجی صاحبؒ کے ایک جملہ سے انکا کام بن گیا تھا ان کو قبض شدید تھا وہ غایت مسرت سے یہ کہتے تھے۔

دوش وقت سحر از غصہ نجاتم دادند　　　　واندراں ظلمت شب آب حیاتم دادند
کیمیائیست عجب بندگی پیر مغاں　　　　خاک او گشتم و چندیں درجاتم دادند

کل رات صبح کے وقت غم وغصہ سے مجھ کو نجات دی رات کے اندھیرے میں مجھے آب حیات بخشی پیر کامل کی اطاعت عجیب کیمیا ہے اسکے قدموں میں رہا اس نے درجات پائے۔

حضرت جب وہ غائبین کی دستگیری فرماتے ہیں تو حاضرین کو کیسے محروم کردیں گے مولانا اسی کو فرماتے ہیں۔

غائباں راچوں نوالہ مید ہند　　　　حاضراں از غائباں لاشک بہند

غائبوں کو جیسے نوالہ دیتے ہیں اور حاضر غائبوں سے بے شک بہتر ہیں۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کو علم ہوتا ہے وقائع کا بلکہ جب خداتعالیٰ کو رحم آتا ہے تو کسی کے ایک کلمہ سے دور تک کام بن جاتا ہے چند روز کسی اللہ والے کے پاس جا کر رہو تو معلوم ہوگا کہ برکت عملی اور ساتھ میں علم حقیقی سب ان ہی کے پاس ہے اسی کو مولنا فرماتے ہیں۔

بینی اندر خود علوم انبیاء　　　　بے کتاب و بے معید واوستا

اپنے اندر علوم انبیاء، بغیر کتاب، بغیر مددگار، اور بغیر استاد کے محسوس کروگے۔

دیکھئے ان بزرگ نے پانی کا ایک چھینٹا دیا اور اس کے ساتھ ایک آواز بھی دی کہ یوں نہیں کہہ دیتا کہ خدا کو بے دلیل واحد مانتا ہوں۔ یہ کہنا تھا کہ شیطان وہاں سے بھاگا تو دیکھئے کہ دلائل نے کچھ کام نہ دیا البتہ سادہ ایمان نے کام دیا اور آخیر میں فلاسفہ بھی اسی طرف آجاتے تھے۔

امام رازی کا فرمان:

چنانچہ امام رازی بہت بڑے عالم اور فلسفی تھے مگر آخر میں ان کی تحقیق یہ تھی جس کو نظم میں فرماتے ہیں۔

نهاية اقدام العقول عقال　　　　وغاية سعي العالمين ضلال
ولم نستفد من بحثنا طول عمرنا　　　　سوى ان جمعنا فيه قيل وقال

مگر یہ حقیقت اس وقت منکشف ہوئی جب شیخ کے پاس جانے کا موقع نہ رہا۔ حقیقت میں علم یہ ہے یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ سلف کے علماء جو صحابہ بھی نہ تھے کیسے تھے پھر صحابہ کے علوم

کیسے ہونگے اور اس سے بڑھ کر انبیاء علیہم السلام کے علوم کیسے ہوں گے۔ (اشعار مذکورہ بالا کے پڑھنے کے بعد اتنا فرمانے پائے تھے کہ بعض سامعین نے درخواست کی کہ ان اشعار کا مطلب بیان فرما دیجئے پس فرمایا) امام رازی فرماتے ہیں کہ عقل نے بہت ترقی کی مگر ساری ترقی کی انتہا یہ تھی کہ عقل ایک عقال ثابت ہوئی یعنی مانع از حقیقت بڑے بڑے اہل علوم کے علم کا نتیجہ یہ ہوا کہ عقل کی رہبری سے راستہ نظر نہ آیا ساری عمر جو بحث کی وہ سب قیل وقال ہی تھی جس سے حقیقت واضح نہیں ہوئی یہ حاصل ہے ترجمہ کا (اس کے بعد فرمایا) میرا معمول یہ ہے کہ جس مضمون کو پہلے بیان کرتا ہوں اس کی تائید میں کوئی شعر عربی یا فارسی کا پڑھ دیتا ہوں اس کا ترجمہ نہیں کرتا ترجمہ کرنے سے لطف نہیں رہتا اور ترجمہ کی ضرورت بھی نہیں رہتی کیونکہ اس کا مطلب اور مقصود تو پہلے بیان ہو چکتا ہے۔ غرض امام رازی فرماتے ہیں کہ ساری عمر کی تحقیقات کا یہ نتیجہ نکلا کہ سب فضول قیل وقال ہے۔ علم حقیقت میں وہ ہے جس کو مولانا نظامی گنجویؒ فرماتے ہیں۔

زبان تازہ کردن بہ اقرار تو
نینگیختن عت از کار تو

تیرے اقرار سے زبان کو تر و تازہ کرنا ہے نہ کہ تیرے کاموں میں عت نکالنا ہے۔

یعنی علم یہ ہے کہ جو ارشاد ادھر سے ہو اس کا اقرار کر لینا۔ یوں نہ کہنا کہ یہ کیوں ہے؟

طالب علم اور سالک:

مولنا یعقوب صاحبؒ فرماتے تھے ہر طالب علم کہ چون وچرا نکند وہر درویشے کہ چون وچرا کند ہر دو را بہ چراگاہ باید فرستد یعنی طالب علموں کو احکام کے علل و نکات پوچھنے کی اجازت ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس پر بناء احکام رکھے یہ تو مصلحت اور حکمت ہے اس پر احکام کا مدار ہرگز نہیں ہاں فن دانی کی حیثیت سے اگر پوچھ لے تو مضائقہ نہیں کیونکہ طالب علم سمجھ سکتا ہے کہ کونسا موقع سوال کرنے کا ہے اور کونسا نہیں۔ وہ یہ تمیز کر سکتا ہے۔ چنانچہ طالب علم یہ سوال کبھی نہ کریگا کہ نماز پنج وقت کی کیوں ہے ہاں یہ پوچھے گا کہ قعدہ اخیرہ فرض کیوں ہے؟ کیونکہ یہ بحث علمی ہے اجتہادی مسئلہ ہے۔ عوام کو اس کی بھی اجازت نہیں۔ عوام کیلئے تو بس یہی ہے کہ جب معلوم ہو گیا کہ حکم شریعت کا ہے بلا چون وچرا عمل کریں۔ یہی مطلب ہے اس فقرہ کا کہ ہر درویشے کہ چون وچرا کند۔ درویش سے مراد فقط سالک ہی نہیں ہے بلکہ درویش سے مراد طالب عمل ہے۔ پھر وہ طالب عمل خواہ عامی ہو یا سالک۔ یہاں درویش سے سالک ہی مراد لینا غلط ہے کیونکہ اس جگہ درویش طالب علم کے مقابلہ میں ہے۔ اگر طالب عمل مراد نہ لیا جاوے تو کلام حاصر نہ ہوگا بلکہ ایک

قسم جو کہ نہ طالب علم ہے نہ سالک بلکہ عامی ہے خارج ہو جائے گی پس ثابت ہو گیا کہ درویش سے طالب عمل مراد ہے خواہ عامی ہو خواہ عالم ہو اور دوسرا جواب یہ ہے کہ درویش سے مراد سالک ہی ہو مگر ہر مسلمان درویش ہے اور سالک بھی۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں اللہ ولی الذین امنوا اللہ دوست ہے مومنوں کا اور دوستی دونوں طرف سے ہوتی ہے جیسے اللہ تعالیٰ مومنین کا دوست ہے مومنین بھی خدا کے دوست ہیں اور یہ ولایت عامہ کہلاتی ہے اس کے اعتبار سے ہر مسلمان ولی ہے جب سارے مسمان اولیاء ہیں تو درویش بھی ہیں جس کا حاصل ترجمہ طا سب عمل ہوا پس طالب عمل کو چون وچرا کی اجازت نہیں وہ فقط یہ پوچھ سکتے ہیں کہ ہمارے لئے کیا حکم ہے؟ بس یہ ہے حقیقت اس جمد کی۔

غرض مطلب یہ ہوا کہ اہل علم کو مصالح وحکم بتلانے کی اجازت ہے مگر غیر کو نہیں اور انہیں کو پوچھنے کی بھی اجازت ہے پھر اسی کی ساتھ یہ بھی ہے کہ ہر طالب علم کو بھی بتلا دینا ٹھیک نہیں طلبہ میں سے جو محقق ہوں صرف ان کو بتلائے باقی جو اس کے اہل نہ ہوں اور پوری سمجھ نہ رکھتے ہوں انہیں نہ بتلائے چنانچہ جن مولنا کا یہ مقولہ ہے کہ ہر طالب علم کہ چون وچرا کند اورا در چراگاہ باید فرستاد۔

میرے ہی سامنے کا ان کا یہ معاملہ بھی ہے کہ ایک طالب علم نے مولنا سے پوچھا تھا کہ ایام حیض میں نماز وروزہ دونوں کی ممانعت ہے پھر پاک ہونے کے بعد نماز کی تو قضا نہیں اور روزہ کی قضا لازم ہے اس میں کیا حکمت ہے فرمایا حکمت یہ ہے کہ اگر اس پر عمل نہ کرو گے تو اتنی جوتیاں لگیں گی کہ سر گنجا ہو جائے گا۔ سر کے بال اڑ جاویں گے اس جواب کی وجہ یہ تھی کہ سائل مہمل تھا اس کو بتلانا مضر تھا اور ان کا مہمل ہونا ان کے ایک شعر ہی سے معلوم ہوتا ہے جو انہوں نے بنایا تھا وہ شعر یہ ہے۔

خواہ مخواہ کی بات بھی مخفی بنے
جیسے حامل پیٹ سے سقطی جنے

یہ آپ کا شعر ہے الفاظ بھی بے جوڑ اور مراد بھی کسی کی سمجھ میں نہ آئے کہ کیا مراد ہے؟ آپ نے پوچھنے پر اس کا مطلب یہ بیان فرمایا تھا کہ عاشق ومعشوق جمع تھے رقیب کو ناگوار ہوا اس نے جدا کرنے کی یہ ترکیب کی کہ معشوق سے کہا ذرا یہاں آنا کچھ مخفی بات کہونگا حالانکہ خواہ مخواہ ہی بلایا کوئی بات نہ تھی مگر اس حیلہ سے وہ عاشق سے علیحدہ ہو گیا اس پر سب سامعین ہنس پڑے کہ اتنا لمبا مطلب مگر شعر کی اب بھی اس پر دلالت نہیں نہ دوسرے مصرع کا پہلے سے کچھ جوڑ معلوم ہوا۔ بس اس ہنسنے پر آپ خفا ہو گئے کہنے لگے جاؤ ہم تم سے نہیں بولتے اور چل دیئے۔ میں نے کہا دوسرے مصرع کو میں حل کر دوں گا مطلب یہ ہے کہ جیسے حامل کے پیٹ سے ساقط حمل نکلے تو وہ بے چاری خواہ مخواہ بدنام بھی ہو گئی اور بچہ بھی نہیں جنا۔

ان ہی حضرت کے مہمل ہونے کا ایک واقعہ سنئے ایک روز جلالین کی عبارت پڑھی آیت یہ تھی

حملنا کم فی الجاریۃ ترجمہ تو اس کا یہ ہے ہم نے سوار کیا تم کو کشتی میں مگر آپ نے یوں ترجمہ کیا ہم نے حاملہ بنایا تم کو لونڈی میں بندہ خدا نے **حملنا کم** کے ترجمہ میں محمول بھی نہ کیا حالانکہ ظاہر ہے کہ **کم** محمول ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ایسا مہمل شخص نماز اور روزے کا فرق کیا سمجھے گا؟ پس چونکہ یہ سائل مہمل تھا اسلئے اسکو جواب دیا اور دوسری مجلس میں سمجھدار لوگوں کے سامنے فرق بھی بیان کر دیا۔

عوام کے لئے جواب:

بہر حال محقق ہر ایک کو ایک جواب نہیں دیتا۔ اب ہمارے علماء اس کی رعایت نہیں کرتے سب کو حکمت اور اسرار بتلانے لگتے ہیں حالانکہ مخاطب سمجھتا بھی نہیں کہ انہوں نے کیا کہا میں ایک مرتبہ سہارنپور گیا تھا وہاں ایک شخص بہشتی زیور بغل میں دبائے ہوئے آئے اور ایک مسئلہ نکال کر مجھ سے کہنے لگے کہ یہ مسئلہ دیکھ لیجئے میں نے کہا کہ میری تو ساری کتاب دیکھی ہوئی ہے مجھے آپ کیا دکھلاتے ہیں۔ کہنے لگے یہ مسئلہ سمجھ میں نہیں آیا میں نے کہا کیا خود اس مسئلہ کا مفہوم سمجھ میں نہیں آیا یا اس کی دلیل سمجھ میں نہیں آئی۔ کہنے لگے مطلب تو سمجھ لیا دلیل سمجھ میں نہیں آئی میں نے کہا اس مسئلہ کے سوا باقی تمام فقہی مسائل کی دلیلیں آپ نے سمجھ لی ہیں یا اور بھی کچھ ایسے مسائل ہیں جن کی دلیل آپکو معلوم نہیں ہوئی اگر سب کی دلیلیں آپ کو معلوم ہو چکی ہیں تو مجھے سوالات کی اجازت دیجئے کہ میں کسی مسئلہ کی دلیل آپ سے دریافت کروں؟ کہنے لگے کہ بہت سے مسائل ایسے ہیں جن کی دلیل مجھے معوم نہیں۔ میں نے کہا پھر اس کو بھی اسی فہرست میں داخل کر لیجئے اسی کی دلیل جاننے کی کیا ضرورت ہے؟ بس اب ان کی منطق ختم ہو گئی اور کتاب بغل میں دبا کر رخصت ہو گئے بعد میں معوم ہوا کہ اس شخص نے کئی روز سے حضرات علماء سہارنپور کو تنگ کر رکھا تھا اور وہ حضرات خوش اخلاقی سے اس کو دلیل سمجھ رہے تھے۔ لیکن میں نے چار منٹ میں اس کو لاجواب کر کے اٹھا دیا۔

ایک سے نجات ہوئی تو ایک جنٹلمین صاحب آئے یہ ذرا مہذب تھے۔ کہنے لگے جناب سے کچھ عرض کرنا ہے۔ میں نے کہا فرمائیے۔ کہنے لگے بعض جہلاء علماء پر اعتراض کرتے ہیں اس سے رنج ہوتا ہے دل دکھتا ہے کہ ہمارے سامنے ہمارے بزرگوں کو برا بھلا کہا جاوے اس رسالہ میں یعنی بہشتی زیور میں ایک مسئلہ ہے جس کی وجہ سے جہلاء اعتراض کرتے ہیں اس لئے مناسب ہے کہ بہشتی زیور کے اس مسئلہ کے متعلق مخالفین کا جو اعتراض ہے اس کے جواب کیلئے ہم ایک مجلس منعقد کریں اور اس میں حق کو واضح کر کے سب کو سمجھا دیا جائے تاکہ علماء کو برا نہ کہیں۔ میں نے کہا جناب

کی خیر خواہی میں شک نہیں باقی قاعدہ شرعیہ وعقلیہ یہ ہے الاہم فالاہم یعنی اہم کو غیر اہم سے مقدم رکھنا چاہیے سو ایک جماعت تو وہ ہے جو علماء کی شان میں گستاخی کرتی ہے اس سے بدتر وہ جماعت ہے جو آئمہ مجتہدین پر طعن وتشنیع کرتی ہے اس سے بدتر وہ جو صحابہ کو سب وشتم کرتی ہے اس سے بدتر وہ لوگ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کرتے ہیں اس سے بدتر وہ جو خداتعالیٰ ہی کی نفی کرتے ہیں یعنی دہریہ پس کام ترتیب سے شروع کیجئے اول ان لوگوں کو سمجھا دیجئے جو خداتعالیٰ کی شان میں بے ادبی کرتے ہیں پھر ان کو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرتے ہیں پھر جو صحابہ کو برا کہتے ہیں پھر جو آئمہ دین کو برا کہتے ہیں پہلے آپ ان سب کا انتظام کر لیجئے پھر میں اخیر میں ایسی جماعت کا انتظام کر دوں گا جو بہشتی زیور پر طعن کرتے ہیں کہنے لگے واقعی بہشتی زیور کے مسئلہ کی تقدیم کی ضرورت تو نہیں لیکن اس میں ضرر بھی تو نہیں کہ ایک غیر اہم کو مقدم کرا دیا جاوے میں نے کہا یہ مشورہ ہے یا حکم۔ کہا مشورہ ہے میں نے کہا بس آپ مشورہ دے چکے آپ سبکدوش ہو گئے آگے میرا کام ہے عمل کروں یا نہ کروں آپ تشریف لے جایئے۔

غرض میں مذاق عوام کا اتباع نہیں کرتا۔ اندھے کے آگے روئیے اپنی آنکھیں کھوئیے۔

ایک سب انسپکٹر تھے قصبہ رامپور میں میرے پاس ان کا خط آیا کہ کافر سے سود لینا کیوں حرام ہے؟ میں نے جواب میں لکھا کافرہ سے زنا کرنا کیوں حرام ہے؟ انہوں نے لکھا کہ علماء کو اتنا خشک نہ ہونا چاہیے میں نے دل میں کہا جہلاء کو اتنا تر نہ ہونا چاہیے کہ ڈوب ہی جائیں ایک دفعہ رامپور میں وہی صاحب ملے اور کہا میں وہی ہوں جس سے اس قسم کی مکاتبت ہوئی تھی پھر انہوں نے پوچھا آپ نے ایسا جواب کیوں دیا میں نے کہا آپ سے جن لوگوں کا واسطہ پڑتا ہے وہ دو قسم کے ہیں ایک وہ جن سے آپ کی خصوصیت ہے اور دوسرے وہ جن سے اجنبیت ہے میں نے کہا کیا سب سے آپ کا ایک ہی قسم کا برتاؤ ہوتا ہے کہا سب سے ایک قسم کا برتاؤ نہیں ہوتا ہے میں نے کہا ہمارے یہاں بھی ایسا ہی ہے جن سے خصوصیت نہیں ان کو ضابطہ کا جواب دیا جاتا ہے۔ کیونکہ ان کی فہم کا اندازہ نہیں ہوتا اور جن سے خصوصیت ہے ان کو دوسرا جواب دیا جاتا ہے پہلا جواب ناشناسائی کی حالت کا تھا مگر اب آپ سے شناسائی ہو گئی ہے تو اب ایسا جواب نہ ملے گا مگر میں نے سوچا کہ ان کو بھی بالکل آزاد کرنا ٹھیک نہیں کہ جو جی میں آوے پوچھ بیٹھیں اس لئے ایک پخ لگائی میں نے کہا مگر اس ملاقات سے جیسا مجھ پر اثر ہوا ہے کہ ایسا جواب نہ آوے گا آپ پر بھی یہ اثر ہوگا کہ آپ بھی ایسے مہمل سوال نہ کریں گے ان پر اس کا بڑا اثر ہوا پھر بھی

انہوں نے ایسا سوال نہیں کیا یہ غرض عوام کیلئے یا تو پانچویں کتاب ہو یا یہ کہ ان کو جواب مت دو بلکہ دھکا دو یا خشک جواب دے دو جیسا میں نے دیا۔ ان لوگوں سے اسی طرح ملنا چاہیے۔ یہ لوگ پہلے ہی سے اعتراض لے کر علماء کے پاس جاتے ہیں۔ اب علماء دو قسم کے ہیں ایک تو وہ جو ان کو جواب دیتے اور دلیل و حکم سمجھائے جاتے ہیں یہ تو خلیق مشہور ہیں اور ایک وہ جو فضول قیل و قال نہیں کرتے وہ بد دماغ کہلاتے ہیں گو وہ واقع میں بادماغ ہی ہوں۔ صاحبو علماء کس کو سمجھائیں مخاطب میں قابلیت بھی تو ہو مگر اب تو یہ مرض ہو گیا کہ عوام اپنے کو ہر بات کے سمجھنے کے لائق سمجھتے ہیں اور اگر کسی بات کو نہ سمجھے تو اعتراض کر دیا کہ علماء ہم کو سمجھ نہیں سکتے۔

میں یہ تو نہیں کہتا کہ ہم کو سب اسرار معلوم ہیں بلکہ ہم صاف کہتے ہیں کہ بعض اسرار تو فقط اللہ ہی کو معلوم ہیں اور کسی کو معلوم نہیں بعض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہیں اوروں کو معلوم نہیں اور بعض اولیاء کو معلوم ہیں غیر اولیاء کو معلوم نہیں اور بعض علماء کو معلوم ہیں جہلاء کو معلوم نہیں۔ یہ نہیں کہ مولویوں کو سب ہی چیزیں معلوم ہیں مگر عوام کی طرح اتنے ناواقف بھی نہیں۔ ہزاروں باتیں ان کو معلوم ہیں مگر عوام کو نہیں بتلاتے ایک دولت مند ہے کروڑوں روپیہ اس کے پاس ہے مگر کیا ضرورت ہے کہ جس کے پاس روپیہ ہو وہ تمہیں اس کا پتہ بھی دیدے۔ ایک شخص کے پاس محل ہے بالاخانہ ہے تم نے مانگا تم کو نہ دیا تو کیا یہ کہا جاوے گا کہ اس کے پاس محل ہی نہیں ہے جھونپڑا ہے اس کہنے سے کیا وہ تم کو محل دے دے گا اچھا جھونپڑا ہی سہی۔ اس کو تو راحت میسر ہے اب خواہ کوئی نفی کر دے یا جھونپڑا سمجھے اس کا کیا نقصان ہے۔ اسی طرح اگر علماء کو عوام عالم نہ سمجھیں ان کا کیا نقصان ہے وہ تو راحت میں ہیں اور تمہارے اس جہل و نفی پر یوں کہتے ہیں۔

بامدعی مگوئید اسرار عشق و مستی   بگذار تا بمیرد در رنج خود پرستی

مدعی کے سامنے عشق و مستی کے اسرار مت بیان کرو اس کو خود پرستی اور رنج میں مرنے دو۔

ان کے پاس اسرار بہت ہیں مگر وہ ظاہر نہیں کرتے اسی کو عارف شیرازیؒ فرماتے ہیں۔

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز   ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

مصلحت نہیں کہ راز ظاہر ہو ورنہ رندوں کی مجلس میں کوئی خبر ایسی نہیں کہ ان کو نہ ہو۔

یعنی کون سی ضروری خبر ہے جو ان کو معلوم نہیں مگر بتلانے میں مصلحت نہیں اور وہ کیوں نہیں اس لئے کہ ان کا مخاطب کے دین پر اثر پڑتا ہے مصالح حکم ظاہر کرنے سے ان کا دین سست ہوتا ہے دین

کی قوت اسی میں ہے کہ ان کو کبھی مصالح نہ بتلاویں البتہ مصالح کا بھی ایک درجہ ہے مگر مصلحت مقصود نہیں۔ مقصود صرف ایک چیز ہے اس کے سامنے سب مصالح قابل پسینے کے ہیں مصالح پسینے ہی سے سالن میں مزہ آتا ہے وہ مقصود کون سی چیز ہے وہ چیز ہے جس کو شیرازیؒ فرماتے ہیں۔

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار   بگذارند و خم طرہ یارے گیرند

میں بڑی مصلحت یہ دیکھتا ہوں کہ دوست سب کو چھوڑ کر محبوب حقیقی کی طرف متوجہ ہو جائیں۔

مذہب عشق:

یعنی بڑی مصلحت یہی ہے کہ سب کو آگ لگا دو ایک ذات کے راضی کرنے کی فکر کرو۔ عاشق کا کام ہے کہ معشوق اس سے راضی ہو جائے معشوق اگر عاشق سے کہے اس نکڑ سے اس نکڑ تک ننگا پھر تو یہ عاشق یہ کہے گا کہ ہم نے تو مکان پر بھی کرتا تک نہیں اتارا کیوں ہماری ہیٹی کراتے ہو یعنی شرمندہ کرتے ہو بے عزت کرتے ہو۔ بخدا اگر عاشق ہے تو پوچھے گا بھی نہیں بے دھڑک ننگا ہو جائیگا اگر سچا عاشق ہے تو زبان حال سے یوں کہے گا۔

ناخوش تو خوش بود بر جان من   دل فدائے یار دل رنجان من

محبوب کی جانب سے جو امر پیش آئے گو وہ طبیعت کو ناخوش ہی کیوں نہ ہو مگر وہ میری جان پر خوش اور پسندیدہ ہے جو میری جان کو رنج دینے والا ہے اپنے دل کو اس پر قربان کرتا ہوں۔

اگر کوئی اس سے کہے کہ کام سمجھ سوچ کر کرو محض محبوب کے کہنے پر نہ چلو لوگوں سے پوچھ کر مشورہ کر کے کام کرنا چاہیے تو کہے گا بھائی کس سے پوچھوں یہ تو مذہب عشق کے خلاف ہے اس کا مذہب تو یہ ہے۔

دل آرامے کہ داری دل درو بند   دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

محبوب سے تم نے دل رکھا ہے تو پھر تمام دنیا سے آنکھیں بند کر لو۔

عاشق کا وہی مذہب ہے جو محبوب کہہ دے دوسرا عاشق کہتا ہے۔

ہمہ شہر پر ز خوباں منم و خیال ماہے   چہ کنم کہ چشم بد بیں نکند بکس نگاہے

سارا شہر حسینوں سے بھرا ہوا ہے اور میں ایک چاند کے خیال میں مست ہوں کیا کروں میں کاش کہ بد خو کی نظر کسی پر بھی نہ پڑتی۔

سارا شہر حسینوں سے بھرا ہوا ہے مگر مجھے تو ایک ذات کے سوا اور کوئی نظر نہیں آتا۔ ہم نے اپنے کو ایک ذات کے سپرد کر دیا ہم کو مشورہ کی ضرورت نہیں ہے۔ جب عشق مجاز کا یہ حال ہے تو عشق حقیقی کا کیا حال ہوگا؟ خود سمجھ لو۔ ممکن نہیں کہ خدا کا عشق ہو اور یہ حالت نہ ہو۔

اگر کہو خدا پر ہم عاشق ہی نہیں جو عاشق ہو اس کی حالت ایسی ہوگی ہم تو عاشق ہی نہیں۔ میں

کہتا ہوں تم غلط کہتے ہو تم اپنے کو مومن تو کہتے ہو تم نے **لا الہ الا اللہ** کہا ہے اور مومن کیلئے عاشق ہونا لازم ہے رجسٹری شدہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے **والذین امنوا اشد حبا للہ** (اور ایمان والے سب سے بڑھ کر اللہ سے محبت رکھتے ہیں) یہ شدت حب عشق نہیں تو کیا ہے؟ **آمنا** (ہم ایمان لاتے) کیلئے **عشقنا** (ہم نے عشق کیا) لازم ہے۔

اس کی ایسی مثال ہوئی جیسے کسی نے نکاح کے وقت کہا میں نے فلاں عورت کو قبول کیا۔ خبر بھی ہے اس کا کیا مطلب ہوا؟ اور کیا ہوگا یہ دولہا **قبلت** کہنے کے بعد ایک ماہ تک تو نوشاہ ہے یعنی نیا بادشاہ ہے کہ کسی قسم کا غم نہیں دعوتیں ہو رہی ہیں خوشیاں منا رہے ہیں اس کے بعد کیا ہوگا۔ حضرت علیؓ سے کسی نے شادی کے متعلق دریافت کیا تھا فرمایا **سرور شھر** ایک ماہ تک تو خوشی ہی خوشی ہے۔ دعوت ہوتی ہے۔ چاروں طرف سے سلام کلام ہوتے ہیں۔ سائل نے کہا **ثم ماذا** پھر کیا ہوگا فرمایا **لزوم مھر** یعنی اس کے بعد مہر لازم ہوگا وہ بھی عرب میں نہیں ہندوستان میں تو اس کو دین ہی نہیں سمجھتے سائل نے کہا **ثم ماذا** پھر کیا ہوگا فرمایا **غموم دھر** کہ پھر ساری عمر کا غم ہے آج آٹا نہیں ہے آج دال نہیں پوچھا **ثم ماذا** پھر کیا ہوگا فرمایا **کسور ظھر** یعنی پھر ہڈیاں ٹوٹنے لگیں گی کمر جھک جائیگی غرض ایک مہینہ تک تو بادشاہ تھے اب ابا جان نے گھر سے الگ کر دیا۔ اب بڑی مشکل اس کی خبر نہ تھی نواب صاحب کو اب بی بی کہتی ہے اناج لاؤ لکڑی لاؤ۔ گھی لاؤ اب میاں کہتے ہیں کہ تم نے یہ کیا بخ لگائی ہے۔ میں نے تجھے قبول کیا تھا۔ اناج لکڑی گھی کو تو نہیں قبول کیا تھا؟ بیوی نے کہا نادان مجھے قبول کرنا ان سب کو سر دھرتا ہے۔ لگی دونوں میں لڑائی ہونے۔ تو اب محلہ کے لوگ جمع ہو گئے اور اس وقت آپ بھی جو **آمنا** کیلئے **عشقنا** کو لازم نہیں مانتے تھے وہاں قاضی بن کر پہنچے۔ سو آپ بھی اور سب لوگ یہی کہیں گے کہ تو نے بیوی کو قبول کیا تھا وہ کہتا ہے ہاں مگر اناج لکڑی کو قبول نہ کیا تھا اس پر آپ کہیں گے کہ بھائی یہی تو غضب کی پوڑ یہ تم کی پوڑ یہ تھی جب تو نے ایجاب قبول کیا تو نے بھی دینا ہوگا لکڑی اور گھی بھی۔ غرض پورا نان نفقہ دینا ہوگا فرمایئے یہ فیصلہ صحیح ہے یا غلط؟! اگر صحیح ہے اور ضرور صحیح ہے؟ تو یہی فیصلہ آپ پر بھی جاری ہوگا کہ جب آپ نے اتنا کہا تو **انقیادو** اطاعت عشق ومحبت سب کو قبول کیا اب جاتے کہاں ہو؟ تم تو عاشق ہو گئے اور اس کے مذہب میں **لم** اور **کیف** نہیں ہوتا ہے اگر عشق سے گھبراتے ہو تو **آمنا** سوچ کے کہا ہوتا اس وقت خیال کرنا تھا۔ خوب کہا ہے۔ عارف شیرازیؒ نے۔

من از آں حسن روز افزوں کہ یوسف داشت دانستم
کہ عشق از پردہ عصمت بروں آرد زلیخا را

محقق نے تو اسی وقت سمجھ لیا تھا کہ آمنا کہا اور عشق کا طوق گردن میں ڈال لیا۔

اور یہ بھی ظاہر میں آج ڈالا ہے ورنہ وہ تو روز میثاق ہی سے پڑا ہوا ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں انا **عرضنا الامانة علی السموات والارض والجبال فابین ان یحملنها واشفقن منها وحملها الانسان انه کان ظلوماً جهولا** (ہم نے یہ امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی تھی۔ پس انہوں نے اس کی ذمہ داری سے انکار کر دیا تھا اور اس سے ڈر گئے۔ انسان نے اس کو اپنے ذمہ لے لیا بیشک وہ ظالم ہے اور جاہل ہے) یہی تو امانت ہے یعنی انقیاد و اطاعت، جس کی ایک تعبیر عشق ہے گو قرآن میں لفظ عشق نہیں ہے مگر جو الفاظ ہیں حقیقت تو ان کی عشق ہی ہے۔

جاہل صوفیاء:

اس پر استطراداً ایک بات یاد آ گئی وہ یہ کہ دنیا میں ایسے جاہل صوفی بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ قرآن میں لفظ عشق موجود ہے بھائی قرآن میں کہاں ہے وہاں سے آخر تک دیکھ جاؤ الفاظ قرآن تو محدود ہیں معانی البتہ غیر محدود ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دریا کو کوزہ میں بھر دیا ہے۔ جاہل صوفی جواب میں کہتا ہے کہ حم عسق یہ اصل میں عشق ہے کسی نے کہا کہ اس میں تو سین ہے اور عشق میں شین ہے تو آپ کہتے ہیں کہ اصل میں تو شین ہی تھا مگر چونکہ حضور پڑھے ہوئے تھے نہیں (نعوذ باللہ) اس لئے آپ سے شین ادا نہ ہو سکتا تھا اس لئے آپ کی رعایت سے سین نازل کیا گیا اب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی وہی اعتراض ہو گیا جو بلال پر تھا کہ سہد کہتے تھے مجھے اس روایت پر یقین نہیں ہے نہ معلوم کہاں کی روایت ہے اور اگر ثابت بھی ہو تو کچھ حرج نہیں کیونکہ وہ حبش کے رہنے والے تھے ان سے شین نہ نکلنا کچھ عجب نہیں مگر حضور تو عرب العرباء افصح البلغاء تھے آپ سے شین کا ادا نہ ہونا بہت تعجب کی بات ہے اگر ایسا ہوتا اور ایسی رعایت ہوتی تو معوذتین میں بھی شین نہ ہوتا من شر کی جگہ من سر ہوتا **من شر ما خلق ومن شر غاسق ومن شر النفثت ومن شر حاسد** (اندھیری رات کے شر سے جب وہ آ جائے اور گرہوں میں پڑھ کر پھونکنے والیوں کے شر سے اور حسد کرنے والے کے شر سے جب وہ حسد کرے) نہ ہوتا اور سارے قرآن میں بھی کہیں شین نہ ہوتا استغفر اللہ استغفر اللہ قرآن کا ناس کیا ہے۔ ان جاہلوں نے، دیکھئے کیا نکتہ نکالا ہے۔

اور یہ جاہل صوفی اس سے بھی بڑھ کر نکتے نکالتے ہیں۔ ہمارے یہاں ایک جاہل صوفی **والضحی واللیل اذا سجیٰ** (اور قسم ہے رات کی جب وہ قرار پکڑے) کے معنی بیان کرتا تھا اے نفس تیری بھی سجا (سزا) کوئی پوچھے یہاں نفس کہاں سے آ گیا؟ شاید اس کا ماخذ یہ ہو کہ لیل بھی کالی

ہوتی ہے اور نفس بھی کالا ہے۔ اس مناسبت سے بیل کے معنی نفس کے لئے اور اذا میں ہمزہ زائد آ گیا ہوگا اور ذا کے معنی ہیں یہی۔ کیونکہ اسم اشارہ ہے اور سجا معرب سزا کا بس تفسیر مکمل ہوگئی۔

ایسے ہی ایک اور قصہ ہے ہم نے اپنے چھوٹے ماموں صاحب سے سنا تھا کہ ایک بانوا فقیر نے ماموں صاحب سے پوچھا بتلا رزق بڑا ہے یا محمد؟ ماموں صاحب نے کہا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا رتبہ سب سے زیادہ ہے جن کے خاطر دونوں عالم پیدا ہوئے وہ اشرف المخلوقات ہیں اور رزق مخلوق ہے کہا جا بے پیرا معلوم ہوتا ہے پھر ڈنڈا گھما کر کہا **اشہد ان محمدا رسول اللہ** (میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں) دیکھا ان پہلے آیا اور محمد پیچھے۔ ان کہتے ہیں اناج کو یہ تحقیقات ہیں آج کل کے تصوف کی خدا بچاوے اس جہل سے۔

ایسے ہی نے تو کہا تھا کہ قرآن میں یہ آیا ہے کہ جو کچھ ہے بیوی کا ہے ماں کا کچھ حق نہیں اس لئے وہ اپنی ماں کو کچھ نہیں دیتا تھا بی بی کی خدمت کیا کرتا تھا جب پوچھا جاتا کہ ماں کو کیوں نہیں دیتے ہو تو وہ جواب دیتا ہے کہ قرآن میں ہے **اطعمھم من جوع**۔ (جس نے ان کو بھوک میں کھانا دیا) یعنی کھانا دو جوئے کو اور ماں کا کہیں ذکر نہیں اور جوئے کہتے ہیں ہندی میں بیوی کو کم بخت نے جوع کو جوئے بنایا۔ عربی میں ہندی ٹھونسی، لوگ اس کو حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کے پاس لے گئے آپ نے یہ استدلال سن کر بطور الزامی جواب میں فرمایا کہ تو نے سورۂ تبت بھی پڑھی ہے؟ ہاں فرمایا پڑھ جب اس نے کہا **ما اغنی عنہ مالہ وما کسب** (نہ اس کے مال اس کے کام آیا اور نہ اس کی کمائی) فرمایا دیکھ ما کسب سے کیا معلوم ہوا؟ یعنی ماں کا تو سب ہے اور جوئے کا فقط کھانا ہی کھانا ہے کہا ہاں ٹھیک ہے۔ بس ایسوں کا علاج یوں ہی ہوتا ہے۔ یہ جواب الزامی تھا۔ اسی کے اصول پر۔ اللہ بچاوے جہل سے اس نے **لایلاف** سے استدلال کیا تو شاہ صاحب نے **تبت یدا** سے جواب دیا غرض قرآن میں عشق کا لفظ نہیں ہے ہاں ایک ضعیف حدیث میں ہے **من عشق فکتم فمات فھو شہید** (اتحاف السادۃ المتقین ۷ ۴۳۹) یہ حدیث مقاصد حسنہ میں ہے مگر اس کی صحت میں کلام ہے۔ گر اس حدیث کو صحیح بھی مان لیا جاوے تو صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ عشق **قلت قد ورد لفظ العشق فی حدیث آخر اخرجہ الحاکم فی المستدرک فی مناقب خدیجہ رضی اللہ عنہا من طریق سفیان بن حسین عن الزہری مرسلاً قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الحمدللہ الذی اطعمنی الخمیر والبسنی الحریر وزوجنی خدیجۃ وکنت لہا عاشقا** (المستدرک

للحاکم۱۸۲۰۳) اھ ج ۳صفحہ۱۸۲ وسفیان ضعیف فی الزهری خاصة وهرمع ذالک مرسل ۱۲ اھ کا لفظ حدیث میں ہے مگر قرآن میں تو پھر بھی نہیں البتہ معنی موجود ہیں کہیں اس کو امانت کہا گیا کہیں حب سے تعبیر کیا گیا کہیں اطاعت کے عنوان سے بیان کیا گیا یہ اطاعت طوع سے ماخوذ ہے یعنی خوشی سے کام کرنا اور یہ شان عاشق ہی کی ہے کہ وہ ہر کام خوشی سے کرتا ہے گو کیسا ہی دشوار ہو کبھی طبعی ناگواری بھی ہوتی ہے مگر پھر عقلی خوشی سے کرتا ہے اور طبعی ناگواری منافی نہیں محبت کے ورنہ اسباغ الوضو علی المکارہ کیوں فرماتے معلوم ہوا کہ گرانی اور ناگواری طبعی خلاف عشق نہیں جیسا اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سردی وغیرہ میں اسباغ الوضوء ہے تو مکروہ یعنی طبعاً مگر عاشق بوجہ عشق کے محبت سے کرتا ہے۔ غرض قرآن میں معنی عشق تو ہیں گو لفظ دوسرا ہے مگر مقصود ایک ہے۔

عبار اتنا شتی وحسنک واحد   وکل الی ذالک الجمال یشیر

ہماری عبارتیں مختلف ہیں اور آپ کا حسن ایک ہے اور وہ سب آپ کے حسن وجمال کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

الغرض آپ حامل عشق ہو چکے ہیں جو چیز آسمان زمین نہ اٹھ سکے آپ نے اس کو اٹھایا اب اگر اس سے بھاگو گے تو تم سے خطاب کیا جاوے گا۔

تو بیک زخمے گریزانی زعشق   تو بجز نامے چہ میدانی زعشق

تو ایک زخم سے عشق سے بھاگتا ہے تو سوائے عشق کے نام کے اور کچھ نہیں جانتا

عارف شیرازیؒ اسی کو فرماتے ہیں۔

آسماں بار امانت نتوانست کشید   قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند

جس امانت کا بار آسمان نہ اٹھا سکا اس کا قرعہ فال مجھ دیوانے کے نام نکلا۔

دیوانہ کے لفظ میں اشارہ ہے کہ منشاء حمل امانت کا عشق تھا کیونکہ عشق سے آدمی دیوانہ ہو جاتا ہے پس جب امانت اٹھا چکے تو اب اس کے لوازم بھی ماننا پڑیں گے الشئی اذا ثبت ثبت بلوازمہ (جو کوئی چیز ثابت ہوئی اس کے لوازمات بھی) بقول عارف شیرازیؒ۔

یا مکن با پیل بانان دوستی   یا بنا کن خانہ برانداز پیل
یا مکش بر چہرہ نیل عاشقی   یا فرو شو جامہ تقویٰ بہ نیل

یا تو ہاتھی والوں سے دوستی نہ کرو یا پھر اپنا گھر ہاتھی کے اندازے کے مطابق بنا لو۔ یا تو چہرہ پر

عاشق کا نیل نہ لگایا پھر اپنا لباس تقوی دریائے نیل میں دھو دے۔

صاحبو! یا تو عشق یعنی ایمان کا نام نہ لو اور اگر لیا ہے تو اس کے لوازم کو بھی اختیار کرو لوازم یہ ہیں۔

حیات عشاق:

اگر مرد عشقی گم خویش گیر　　　وگرنہ رہ عافیت پیش گیر

اگر آدمی عشق میں خود کو گم کرے ورنہ راہ عافیت یہی ہے کہ اس کا نام نہ لے۔

یہ تعلق بالشرط ہے تخییر نہیں ہے یعنی یہ عشق اختیار کرو گے تو گم ہونا پڑے گا آگے خود رائے دیتے ہیں۔

مترس از محبت کہ خاکت کند　　　کہ باقی شوی چوں ہلاکت کند

محبت سے نہ ڈرو کہ یہ تمہیں ہلاک کر دے گی بلکہ جب ہلاک ہو گئے تو ابدالآباد کی زندگی مل جائے گی۔

اس لئے کہ عاشق ہلاک نہیں ہوتا ابدالآباد کی زندگی اس کو عطا ہوتی ہے یہ وہ چیز ہے جس کے متعلق ارشاد ہے **من عمل صالحاً من ذكر او انثى وهو مومن فلنحيينه حيوة طيبة** (جو شخص کوئی نیک کام کرے گا مرد ہو یا عورت بشرطیکہ صاحب ایمان ہو تو ہم اس شخص کو بالطف زندگی دیں گے) اس کے سامنے امراء بادشاہوں کی حیات کوئی چیز نہیں سب کا نام مٹ جاتا ہے مگر اہل اللہ کا ذکر زندہ رہتا ہے کیونکہ وہ حی وقیوم میں اپنے کو فنا کر چکے ہیں تو ان کو بھی حیات وقیوم سے ایک حصہ مل گیا اسی کو عارف شیرازی فرماتے ہیں۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق　　　ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

جس کو عشق حقیقی سے روحانی زندگی حاصل ہوگی تو اس کو مر جانے کے بعد بھی زندہ سمجھنا چاہیے۔

یعنی عشق سے زندہ ہو جاؤ پھر تو ابدالآباد کی حیات حاصل ہو جائے گی۔

اگر کوئی شبہ کرے کہ عشق کی کیا تخصیص ہے دوزخی کو بھی تو حیات ابدی نصیب ہوگی کیونکہ کوئی دوزخی بھی تو نہیں مرے گا قرآن میں ہے **خالدين فيها ابدا** (اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے) اس کا جواب یہ ہے کہ وہ زندگی نہیں ہے وہ تو موت سے بدتر ہوگی کہ نہ موت ہی ہے نہ حیات ہی ہے چنانچہ ارشاد ہے **لا يموت فيها ولا يحيى** (نہ اس میں مر ہی جائے گا اور نہ جئے گا) ایسی زندگی سے تو اگر ان کو موت ہی آجاتی تو جان بچ جاتی چنانچہ کفار اس زندگی سے موت کی تمنا کریں گے **ويقول الكافر يليتني كنت ترابا** (اور کافر کہے گا کہ کاش میں مٹی ہو جاتا) اور **يومئذ يود الذين كفروا وعصوا الرسول لو تسوى بهم الارض ولا يكتمون الله حديثا**

(اس روز جن لوگوں نے کفر کیا ہوگا اور رسول کا کہنا نہ مانا ہوگا وہ اس روز اس بات کی آرزو کریں گے کہ کاش زمین کے پیوند ہو جائیں) اگر یہ حیات حیات مطلوبہ ہوتی تو وہ موت کی تمنا کیوں کرتے؟ معلوم ہوا کہ یہ حیات حیات نہیں ہے حیات وہ ہے جس سے شیفتگی ہو محبت ہو جس سے قرب محبوب حاصل ہو تو یہ حیات خاص عشاق ہی کو حاصل ہوگی عشق کی برکت سے سو اگر عاشق ہو تو بس یہ مذہب رکھو زندگی کا مدار منافع دنیوی پر مت رکھا کرو۔ غرض مصالح کی تعیین سے یہ مفاسد پیدا ہوتے ہیں جن کو میں نے تفصیل سے بیان کر دیا ہے اتنے بسط کا ارادہ نہ تھا مگر بلا ارادہ بڑھ گیا کیا کیا جاوے۔

رشتہ درگردنم افگندہ دوست میبرد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

نہوں نے یہ حرکات پیدا کر رکھی ہیں جس طرف چاہتے ہیں متحرک کر دیتے ہیں

واللہ **یقبض ویبسط** وہ بے حد رزق کا بسط فرماتے ہیں کلام کا بھی فرما دیتے ہیں ہم تو مشین کی طرح ہیں۔

دوسرے یہ حضرت مخدوم صاحب کی بھی برکت ہے جن کے مزار کے قریب بیان ہو رہا ہے کہ تفصیل کے ساتھ بیان ہو گیا۔

فلسفی اور سالک کی غلطی:

میں یہ کہہ رہا تھا کہ احکام میں دنیوی منافع بھی ہوتے ہیں مگر مقصود نہیں ہوتے اس میں لوگوں کے عمل سے دو درجے ہیں ایک یہ کہ احکام کو مصالح پر مبنی کیا جاوے سو یہ تو مضر ہے کیونکہ جب وہ مصالح فوت ہو جائیں گے احکام کا بھی خاتمہ ہو جائیگا جیسا اوپر آ چکا ہے اور ایک یہ کہ احکام تو تابع ہوں خدا اور رسول کے ارشاد پر اور مصالح تبعاً اس پر خود مرتب ہو جاویں سو اس عنوان سے ان کا بیان کر دینا جائز ہے۔ پس ہمیں ان فضول تدقیقات سے کچھ فائدہ نہیں کہ یہ واجب کیوں ہے؟ یہ فرض کیوں ہے؟ یہ مستحب کیوں ہے؟ اس میں فائدہ ہی کیا ہے مقصود تو رضا حاصل کرنا ہے جس کا ظہور آخرت میں ہوگا۔ گو حصول یہاں بھی ہو جاتا ہے مگر یہاں ظہور نہیں ہوتا گو آثار و امارات سے یہاں بھی ہو جاتا ہے۔ پس فلسفی کی یہ غلطی ہے کہ احکام سے رضا کے سوا دوسری اشیاء کو مقصود سمجھتا ہے۔

اور اسی قبیل کی ایک غلطی سالک سے بھی ہوتی ہے جو ایک اعتبار سے فلسفی کی غلطی سے بھی اشد ہے کیونکہ فلسفی کا مقصود تو محض دنیا ہے وہ احکام شرعیہ کو بھی اسی نظر سے دیکھتا ہے مگر سالک تو احکام سے مقصود منافع دنیوی کو نہیں سمجھتا اس کی نظر میں دنیا مقصود نہیں ہوتی مگر پھر وہ ایسی غلطی کرتا ہے

جس سے عاجل کی مقصودیت کا ایہام ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ بعض لوگ ثمرات وکیفیات وانوار کو مقصود سمجھنے لگتے ہیں سو سمجھ لو کہ گو نیت انکی دنیا کی نہیں مگر لازم تو یہی آ گیا۔

باقی اہل تحریف کی تو نیت صاف دنیا ہی ہے چنانچہ ایک شخص نے ایک تفسیر لکھی ہے اس میں یہ لکھا ہے کہ جتنے احکام شرعی ہیں سب سے مقصود سیاست ہے یہاں تک لکھا ہے کہ نماز باجماعت اس لئے مشروع ہوئی تاکہ میدان جنگ میں پریڈ کرنے کی عادت ہو اور اس میں اس بات کی عادت ڈالی گئی کہ افسر کی اطاعت کس طرح کرنا چاہیے وہ جو کرے اس کے ساتھ ساتھ تم بھی اسی کا اتباع کرو تو جماعت اس لئے ہے تاکہ تم لڑائی کر سکو۔

غرض ہر حکم کے ساتھ لڑائی ہے وہ تفسیر ایسی ہی ہے جیسے کپاس کی کہانی ہوتی ہے کہ ہر جگہ یہی ٹیپ کا بند ہوتا ہے کپاس کی کہانی بوجھو گے اسی طرح یہاں تفسیر میں ہر جگہ جنگ ہی کا سبق ہے۔ نکاح وطلاق کے احکام میں بھی جنگ ہی کے احکام اس کو نظر آئے ہیں یہ فتنہ ایک مسلمانوں کے کالج سے اٹھا ہے نماز کے بعد روزہ کی باری آئی تو لکھا کہ روزہ کا حکم اس لئے ہے کہ ہم کو فاقہ کشی کی عادت ہو کیونکہ لڑائی میں فاقہ کشی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ حج اس لئے مشروع ہوا تاکہ سب کمیٹی ایک جگہ جمع ہو کر تبادلہ خیالات کرے تاکہ عالم میں نظام ہو۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہوگا کہ اب تک تو حکام کی نظر میں یہ تھا کہ مسلمانوں کے بعض امور مذہبی تو سیاسی ہیں اور بعض غیر سیاسی خالص عبادت محض ہیں اب جب ان کو معلوم ہوگا کہ یہ عبادات بھی سیاسی ہیں مذہبی نہیں ہیں تو اس سے بھی ان کو کھٹک پیدا ہوگی ان مصالح وحکم کے بدولت وہ مسلمانوں کی نماز روزہ کو بھی خطرہ کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ عدت طلاق کے بارہ میں لکھا ہے کہ جیسے عدت کا زمانہ زوج سے خالی ہوتا ہے اسی طرح بعض وقت حاکم سر پر نہیں ہوتا ہے اس وقت دوسرا حاکم تلاش کرنا چاہیے گویا احکام عدت میں اس وقت کے مناسب احکام بتلائے گئے ہیں۔ غرض ادھر ادھر سے سب کو چپکا کے وہی لڑائی، وہی لڑائی وہی لڑائی۔

یہ تو وہی قصہ ہوا جیسے کسی اوچھے آدمی کے پاس ایک دوشالہ تھا اس کے کسی دوست نے اپنے لڑکے کی شادی کے موقع پر اس سے مانگ کر دولہا کو اڑھا دیا۔ بعضے لوگ پوچھنے لگے کہ دولہا کونسا ہے؟ تو آپ کہتے ہیں کہ دولہا تو یہ ہے مگر دوشالہ میرا ہے دولہا کے باپ نے کہا یہ کیا لغو حرکت تھی دوشالہ جتلانے کی کیا ضرورت تھی کہا اچھا اب نہیں کہوں گا کوئی دوسرا پوچھتا ہوا آیا کہ دولہا کونسا ہے؟ تو آپ فرماتے ہیں کہ دولہا تو یہ ہے مگر دوشالہ میرا نہیں پھر شکایت کی گئی کہ یہ کیا واہیات ہے اس کے ذکر ہی کی کیا ضرورت ہے کہا اب نہیں کہونگا پھر ایک شخص پوچھنے لگا کہ دولہا کونسا ہے؟

آپ نے کہا دولہا تو یہ ہے مگر دوشالہ کا کچھ ذکر ہی نہیں۔ دولہا کے باپ نے دوشالہ اتار کر اس کے منہ پر پھینک مارا کہ لے تجھے اسی کا سبق رہ گیا ہر وقت دوشالہ ہر وقت دوشالہ۔

اسی طرح کی ایک اور حکایت یاد آئی کہ کسی اوچھے نے کسی کو ایک مرغی دی تھی اب ہر جگہ ہر بات میں مرغی کا ذکر تھا کہ یہ بات اس دن ہوئی تھی جس دن میں نے آپ کو مرغی دی تھی یا یہ کہ جس دن مرغی دی تھی اس سے ایک دن پہلے کا یہ قصہ ہے یا اس دینے سے دو دن پہلے یا پیچھے ایسا ہوا تھا غرض ہر بات میں مرغی۔ مرغی کیا ہوئی غدر ہی ہو گیا بعضے لوگ واقعات کا وقت بتلاتے ہوئے کہتے ہیں کہ غدر کے زمانہ میں یہ واقعہ ہوا یا غدر سے ایک سال آگے یا پیچھے۔ بس جس طرح دوشالہ اور مرغی کے قصہ میں ہر جگہ اور ہر وقت دوشالہ اور مرغی کا سبق رہ گیا تھا یوں ہی ان مفسر صاحب نے ہر جگہ لڑائی ہر جگہ لڑائی کا سبق یاد کر لیا ہے یہ خدمت کی قرآن کی۔ افسوس ان لوگوں نے یہ گت بنا رکھی ہے کلام اللہ کی اور عوام ہیں کہ ایسی تفسیروں پر لٹو ہیں مگر میں صاف کہتا ہوں کہ یہ تفسیر نہیں بلکہ قرآن کی تحریف ہے۔ نماز دنیا کیلئے ہرگز نہیں ہے وہ خدا ہی کیلئے ہے چونکہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے **اقم الصلوٰة لذکری** نماز کو میری یاد کیلئے بجا لاؤ۔ روزہ کے بارہ میں آیا ہے **کتب علیکم الصیام الی قولہ لعلکم تتقون** وہ بھی خدا ہی کیلئے ہے جس سے مقصود تقویٰ اور کمال دین ہے حج کے بارہ میں **وللہ علی الناس حج البیت** اس میں **للہ** صاف آیا ہے تو اصل مقصود تو یہ ہے کہ یہ سب کچھ محض رضائے حق کیلئے ہے۔

حقیقت بلاء ونعمت:

مگر یہ احکام اپنی خاصیت سے ایسے ہیں اور ان میں ایک جامعیت اور برکت ہے کہ ان سے منافع دنیوی بھی بلا قصد نصیب ہو جاتے ہیں مگر مختلف طور پر حاصل ہوتے ہیں حتیٰ کہ بعض اوقات حساً اور ظاہراً تو بلا ہوتی ہے مگر معنیً و باطناً نعمت ہوتی ہے یہ نکتہ حضرت حاجی صاحبؒ کے ارشاد سے معلوم ہوا۔ ایک بار فرمایا کبھی نعمت بصورت بلا ہوتی ہے چنانچہ خضر علیہ السلام کا کشتی کا توڑنا ظاہر میں بلا تھی مگر حقیقت میں نعمت تھی۔ نعمت کا خوبصورت بلا ہونا قرآن میں بھی آیا ہے **ولنبلونکم بشئ من الخوف والجوع ونقص من لاموال و لانفس والثمرات** ظاہر میں یہ بلائیں ہیں مگر صلاح اخلاق کے اعتبار سے یہ نعمتیں ہیں کہ ان سے تربیت باطنی ہوتی ہے۔ ایک بار حضرت اس مسئلہ کو اس طرح بیان فرما رہے تھے گویا اس کا مشاہدہ ہو رہا تھا۔ اس مجلس میں ایک شخص آ گیا جس کا ایک ہاتھ زخمی تھا اور وہ سیاہ ہو گیا تھا اس نے کہا حضرت بہت تکلیف ہے میرے لئے دعا کیجئے۔

ہم طالب علم لوگ شبہ کی پوڑیہ ہیں ہم نے دل میں کہا اب دیکھیں حضرت کیا کرتے ہیں اگر دعا نہ کی تو اس بے چارہ کی دل شکنی ہوگی تو یہ شان شیخ کے خلاف ہے اور اگر کی تو ابھی فرما چکے ہیں کہ بد بھی نعمت ہے تو اس صورت میں یہ دعا سلب نعمت کی دعا ہوگی تو یہ دعا کیا ہوئی مگر اللہ اکبر ان حضرات کو کون سکھلا دے ان کی تو وہ شان ہوتی ہے **ادبنی ربی فاحسن تادیبی وعلمنی ربی فاحسن تادیبی** تعلیمی حضرت نے اس کیلئے دعا کی اور مضمون دعا کا ایسا اختیار فرمایا کہ اگر ہم دس برس بھی سوچتے تب بھی نہ سوجھتا مگر حضرت نے بے ساختہ فرمایا کہ اے اللہ ہم جانتے ہیں کہ یہ بلا بھی نعمت ہے مگر اے اللہ ہم اپنے ضعف کی وجہ سے اس نعمت کا تحمل نہیں کر سکتے جیسے بھونی ہوئی بوٹی بھی نعمت ہے مگر شیر خوار بچہ اپنے ضعف کی وجہ سے تحمل نہیں کر سکتا پس اس نعمت مرض کو نعمت صحت سے مبدل فرما دیجئے میں نے اپنے دل میں کہا سبحان اللہ ان کو کون سکھلا دے؟ یہ عجب نہیں کہ ہمارے اس شک کو رفع کرنے کیلئے ہی حضرت نے دعا زور سے کی ہو غرض نعمت کبھی صورۃً بلا ہوتی ہے اور حقیقۃً رحمت جیسے آپریشن ہے کہ ہے تو لطف مگر بصورت قہر۔ اگر لطف نہیں تو ڈاکٹر اس پر انعام کیوں لیتا ہے اور آپ اس کو فیس اور انعام کیوں دیتے ہیں؟ صاف کہہ دیتے کہ ایک تو ہمارے بدن میں زخم کیا پھر اس پر انعام چاہتے ہو؟ مگر وہاں انعام دیکر بھی ہاتھ جوڑتے ہیں کہ حضور معاف کیجئے گا بہت قلیل ہدیہ ہے ہم آپ کو کچھ بھی نہ دے سکے۔ بلکہ بعض اوقات اگر مریض کو کلوروفارم نہ سونگھایا جاوے کیونکہ اس کا دماغ کمزور ہے تو وہ آپریشن کے وقت ہائے واویلا بھی کرتا ہے مگر دل میں اس سے خوش ہے کیونکہ اس کا انجام راحت ہے۔ ایسے ہی اللہ تعالیٰ کا معاملہ اپنے بندوں سے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ صورت تو غضب کی ہے مگر واقع میں ہوتی ہے رحمت۔

چنانچہ ایک رحمت کا ذکر اس آیت میں فرمایا گیا ہے **لیذیقھم بعض الذی عملوا لعلھم یرجعون** یعنی اللہ تعالیٰ اس واسطے بیمار کرتے ہیں تاکہ بندہ توبہ کرکے پاک وصاف ہو جاوے۔

اس پاک صاف ہونے پر ایک واقعہ یاد آ گیا ایک دفعہ ہم نے بچپن میں سر کے بال بڑھائے تھے مگر پڑھنے کے وقت تو پڑھنے سے فرصت نہ تھی اور چھٹی کے وقت کھیل سے فرصت نہ تھی اس لئے ان کے دھلوانے کی نوبت نہ آتی تھی۔ تائی صاحبہ ہر روز کہا کرتیں کہ آؤ سر دھو دوں بالوں میں تیل لگا دوں مگر ہم ایک نہ سنتے ایک دن انہوں نے پیچھے سے کھلی بھگو رکھی جب میں پڑھ کر آیا فوراً میرے سر میں کھلی لیپٹ دی اب میں سر دھلوانے پر مجبور ہو گیا اور بہت رویا چلایا تو یہ تھا لطف مگر بصورت قہر۔ اسی طرح کبھی اللہ تعالیٰ کا معاملہ ہوتا ہے۔ دیکھئے بچہ کی یہ حالت ہوتی ہے۔

طفل میلرزد زنیش احتجام

(بچہ نشتر لگوانے سے لرزتا ہے)

مگر ماں کی یہ حالت ہوتی ہے۔

مادر مشفق ازاں غم شادکام

(مگر مشفق ماں اس سے خوش ہوتی ہے)

چنانچہ ماں حجام کے سامنے بچہ کا سر دھر دیتی ہے کہ چیر دے اور بچہ روتا ہے مگر ماں باپ ہنستے ہیں کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ وہ ظالم ہیں؟ ان کو محبت نہیں اپنے بچہ سے؟ ضرور ہے مگر اس محبت کا تمہیں رنگ نہیں معلوم۔ جب بندوں کے معاملات میں ایسی نظیریں موجود ہیں تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ یہ بدگمانی کیوں ہے؟ کہ ہر بلا کو بلا ہی سمجھتے ہو نعمت نہیں سمجھتے۔

یہاں تک طالبان دنیا کی غلطیاں بیان کی گئی تھیں ایک یہ کہ نفع عاجل کو نفع سمجھتے ہیں حتیٰ کہ احکام سے بھی اسی کو مقصود سمجھتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ بلا کا نعمت ہونا انکی سمجھ میں نہیں آتا۔

اہل طریق کی غلطی کی تفصیل:

اب اسی کی نظیر بعض طالبان آخرت کی ایسی ہی غلطیوں پر متنبہ کرتا ہوں جس کا جملہ اوپر جس جگہ احکام سے سیاست کے مقصود ہونے کا خیال بعض لوگوں کا بیان کیا گیا ہے اس کے قبل متصل اہل طریق کی غلطی پر اجمالی تنبیہ کی گئی ہے اب اس کی قدرے تفصیل کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ اسی طرح سالک کو بھی اسی کے مشابہ ایک غلطی ہوتی ہے وہ یہ کہ ذکر اللہ اور طاعات وعبادات میں ایک نفع تو عاجل ہے اور ایک آجل یعنی ایک نقد ہے ایک ادھار ہے ادھار تو جنت اور نعمائے جنت لقاء وظہور رضا ہے اور نقد ذوق شوق اور انوار وغیرہ ہیں اس میں بھی بڑی حلاوت ہے یہ حلاوت سلاطین کو بھی نصیب نہیں ہوتی یہ وہ حلاوت ہے جس کے متعلق حافظ شیرازیؒ فرماتے ہیں۔

بفراغ دل زمانے نظرے بماہروے   بہ ازاں کہ چتر شاہی ہمہ روز ہائے وہوئے

ایک ساعت ایک لمحہ محبوب کو اطمینان سے دیکھنا دن بھر کی دار وگیر شاہی سے بہتر ہے

اور خاقانی فرماتے ہیں۔

پس از سی سال ایں معنی محقق شد بخاقانی   کہ یک دم با خدا بودن بہ از ملک سلیمانی

ایک لمحہ اللہ کے ذکر میں مصروف ہونا حضرت سلیمان علیہ السلام کی سلطنت سے بہتر ہے

مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے جو ملک تھا اس سے اچھا ہمارا

ذکر ہے کیونکہ ان کیلئے وہ ملک بھی ذکر تھا بلکہ مطلب یہ ہے کہ سلیمان علیہ السلام کا جو ملک تھا وہ اگر ہمیں مل جاوے تو ہمارے لئے ہمارا ذکر اس سے اچھا ہے۔

غرض یہ وہ حلاوت ہے جو بادشاہوں کو بھی نصیب نہیں ہوتی ہے۔ بعض اہل سلوک اس حلاوت کے طالب ہو جاتے ہیں۔ اگر کبھی یہ حلاوت نصیب نہ ہو یا کم ہو جائے تو پریشان ہوتے ہیں حتی کہ اس کی وجہ سے بعض لوگوں نے خودکشی تک کرلی ہے۔ پس اس حلاوت کا ظاہر تو دین ہے مگر واقع میں دین بالمعنی الاعم دو حصے ہیں ایک موعود ایک غیر موعود۔ سو مطلوب صرف موعود ہے اور وہ جنت و بقاء ہے اور غیر موعود مقصود نہیں اور ظاہر ہے کہ ذوق وشوق موعود نہیں ہے کیونکہ ذوق وشوق کا کہیں وعدہ نہیں لہٰذا وہ مطلوب بھی نہیں ہے ہاں اس کیلئے دعا کا مضائقہ نہیں سو ذوق وشوق کیلئے دعا تو کرو کہ خدا نصیب کرے مگر مطلوب کی توفیق ہوتے ہوئے غیر موعود کے نہ ہونے سے اپنے کو محروم نہ سمجھو یہ ناشکری ہے۔

دست بوسی چوں رسید از دست شاہ　　　پائے بوسی اندراں دم شد گناہ

جب بادشاہ چومنے کیلئے ہاتھ دیں اس وقت قدم بوسی کرنا گناہ ہے۔

بادشاہ اگر چومنے کیلئے ہاتھ دے پاؤں کیوں چومو؟ اسی طرح اگر تم کو رضا و اسباب رضا حاصل ہوں اور ذوق وشوق نہ ہو تو غم نہ کرو رضا کے مقابلہ میں ذوق وشوق کیا چیز ہے؟ تو سالکین سے یہ غلطی ہوئی ہے کہ وہ موعود و غیر موعود میں فرق نہیں کرتے ہیں گر ذوق وشوق نہیں ہوتا ہے تو سمجھتے ہیں کہ ہم گئے گذرے ہیں چنانچہ شکایت کرتے ہیں شیخ سے کہ ہم کو ذوق وشوق نہیں ہے۔ اے صاحب مزا مطلوب ہے یا خدا کی رضا؟ عارف شیرازیؒ فرماتے ہیں۔

فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب　　　کہ حیف باشد ازو غیر او تمنائے

فراق و وصل کیا ہوئے رضائے الٰہی طلب کرو اسکے علاوہ کوئی اور تمنا باعث افسوس ہے۔

چاہے ذوق ہو یا بدذوقی ہر حال میں اسی کے طالب رہو۔

بدرد و صاف ترا حکم نیست دم درکش　　　کہ آنچہ ساقی ما ریخت عین الطاف است

درد و صاف یعنی قبض و بسط تجویز کرنے کا تم کو کچھ حق نہیں ہے جو کچھ عطا ہو جائے تربیت باطنی کیلئے مصلحت اور وہی عین لطف ہے۔

ادھر سے جو کچھ عنایت ہو سر آنکھوں پر ہے قبض ہو تو سر آنکھوں پر بسط ہو تو سر آنکھوں پر مولانا اسی کو فرماتے ہیں۔

روزہا گر رفت گو رو باک نیست　　　تو بماں اے آنکہ چوں تو پاک نیست

ایام تلف ہونے پر حسرت نہ کرنا چاہیے اگر گئے بلا سے عشق جو اصلی دوست ہے اور سب خرابیوں سے پاک وصاف ہے اس کا رہنا کافی ہے۔

روز کہتے ہیں احوال ووادرات کو تو بماں کا مطلب یہ ہے کہ تو ہمارے ساتھ رہ آپ کی معیت ہونی چاہیے اور بس۔ ان شاکیوں کی نسبت حضرت سرمدؒ فرماتے ہیں۔

سرمد گلہ اختصاری باید کرد
یک کارازیں دوکاری باید کرد

سرمد شکایت مختصر کرد اور دو کاموں میں سے ایک کام کرو یا تو تن کو محبوب کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے وقف کردو یا محبوب سے قطع نظر کرو۔

مجذوب تھے اسلئے صاف صاف آزادی سے کہتے ہیں کہ دو میں سے ایک بات اختیار کرنا چاہیے۔

یا تن برضائے دوست می باید داد
یا قطع نظر زیاری باید کرد

یا تو تن محبوب کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے وقف کردو۔ یا محبوب سے قطع نظر کرو۔

یعنی قسمت سے جو ملے خواہ تمہاری مرضی کے موافق ہو یا ناموافق یا اس پر راضی رہو ورنہ دوسرا محبوب تلاش کرلو جو تمہاری مرضی کا تابع ہو اللہ تعالیٰ تو کسی کے تابع نہیں ہو سکتے

یا تن برضائے دوست می باید داد
یا قطع نظر زیاری باید کرد

یا تو تن محبوب کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے وقف کردو۔ یا محبوب سے قطع نظر کرو۔

اپنے کو ان کے سپرد کردو جو ملے اس پر راضی رہو۔

بوستان میں ایک حکایت ہے کہ ایک درویش کو غیب سے آواز آئی کہ تمہاری عبادت مقبول نہیں آواز اس طور سے آئی کہ ان کے ایک مرید نے بھی سنی مگر وہ پھر بھی تہجد کے وقت بوریا بدھنا لیکر کھڑے ہوئے۔ مرید نے کہا کہ جب ادھر سے قبول ہی نہیں پھر فائدہ کیا مصیبت اٹھانے سے؟ درویش رونے لگے فرمایا کہ بیٹا یہ سب کچھ سچ ہے مگر اس ایک در کے سوا اگر کوئی اور در ہوتا تو اس کو چھوڑ کر وہاں چلا جاتا مگر جب کوئی اور۔ در ہی نہیں تو کہاں جاؤں؟ انہیں اختیار ہے چاہے جگہ دیں چاہے نکال دیں معاً آواز آئی۔

قبول ست گرچہ ہنر نیستت
کہ جز ما پناہے دگر نیستت

قبول ہے اگرچہ کمال کی اس میں کوئی بات نہیں ہے سوائے اس بات کے کہ تم نے کہہ دیا کہ ہمارے سوا پناہ کی کوئی جگہ نہیں ہے۔

یعنی جاؤ ہم نے قبول کرلیا مگر ساتھ ہی ایک چرکہ بھی لگا دیا اگرچہ ہنر نیستت کہ گو تمہاری

عبادات قابل قبول نہیں مگر ہمیں رحم آتا ہے کہ اس کیلئے اور کوئی دروازہ نہیں ہمارے دروازہ پر پڑا ہوا ہے اس لئے قبول کر لیا۔ اسی واسطے منقادین نے کہا ہے۔

خسرو غریب ست وگدا فتادہ در شہر شما   باشد کہ از بہر خدا سوئے غریباں بنگری

خسرو غریب وگدا آپ کے کوچہ میں پڑا ہوا ہے خدا کیلئے غریبوں کی طرف بھی نظر فرمائیے۔ حق تعالیٰ کا یوں ہی رحم ہو جاتا ہے کہ کوئی ان کے دروازہ پر جا پڑے اور ان کی رضا کا طالب ہو اپنی رضا کا طالب نہ ہو یہ ہے مذہب عشاق کا۔ حضرت حاجی صاحبؒ سے جب کوئی اس قسم کی شکایت کرتا کہ ذکر سے نفع (یعنی ذوق وشوق وغیرہ) نہیں معلوم ہوتا اس وقت حضرت جو جواب دیتے ان جوابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امام وقت تھے وہ جواب یہ تھا کہ حضرت یوں فرماتے کہ میاں اللہ اللہ کرتے ہو شکر کرو۔

بلا بودے اگر ایں ہم نبودے

اگر یہ بھی نہ ہوتا تو سخت آفت ہوتی۔

اگر یہ بھی نہ ہوتا تو کیا ہوتا یہ نفع کیا کم ہے جو اپنے ذکر کی انہوں نے توفیق دی ہے اور یہ شعر فرماتے تھے۔

یابم اور ایا نیابم جستجوئے میکنم   حاصل آید یا نیاید آرزوئے میکنم

میں اسے پاؤں یا نہ پاؤں جستجو کرتا ہوں وہ مجھے حاصل ہو یا حاصل نہ ہو آرزو کرتا ہوں۔

ہمارا کام تو طلب ہے دینا نہ دینا ان کا کام ہے۔

میں نے حضرت مولنٰا محمد یعقوب صاحبؒ سے سنا کہ بندہ کا کام طلب ہے، وصول اس کا کام نہیں وہ غیر اختیاری ہے۔ تم طلب پیدا کرو جو تمہارا کام ہے اسی کو مولنٰا فرماتے ہیں۔

آب کم جو تشنگی آور بدست   تا بجوشد آبت از بالا و پست

پانی کی تلاش مت کرو بلکہ پانی کی پیاس پیدا کرو تاکہ پانی اوپر نیچے تمہارے لئے جوش مارنے لگے۔

اور اس کی وجہ کیا ہے۔

تشنگان گر آب جویند از جہان   آب ہم جوید بہ عالم تشنگان

پیاسے اگر دنیا میں پانی ڈھونڈتے ہیں تو پانی بھی دنیا میں پیاسوں کو تلاش کرتا ہے۔

یہ مت سمجھو کہ تم ہی کو ان کی محبت ہے پہلے ان کو تم سے محبت ہوئی پھر تم کو ان سے محبت ہوئی ہے۔ آگے اس کو صاف کر کے فرماتے ہیں۔

ہر کہ عاشق دیدش معشوق داں   کو بہ نسبت ہست ہم ایں وہم آں

جس عاشق کو دیکھو اسے معشوق سمجھو کہ ان کو ایک دوسرے سے باہم نسبت ہے۔

لیکن ایک فرق ہے عاشق و معشوق کی طلب میں گو بظاہر دونوں ایک دوسرے کو تلاش کرتے ہیں وہ فرق یہ ہے کہ عاشق تلاش کرے تو ممکن ہے کہ معشوق نہ ملے مگر معشوق کی تلاش سے ممکن نہیں کہ عاشق نہ ملے۔ اسی لئے کسی نے کہا ہے۔

خود بخود آں شہ ابرار ہبرمی آید   نہ بزور ونہ بہ زاری نہ بزری آید

کہا ہم (اپنی رحمت) تم پر نہ زبردستی چپکا دیں گے جبکہ تم اس کو ناپسند کرنے والے ہو

خود بخود شہ ابرار بندوں کی طرف توجہ فرماتے ہیں بغیر قوت بغیر رونے دھونے اور بغیر دولت وغیرہ کے۔

مگر طلب ہونا شرط ہے ورنہ غیر طالب کیلئے تو یہ ارشاد ہے **انلز مکموها وانتم لها کارهون** اور اگر طلب ہے تو اس کیلئے یہ بشارت ہے **من تقرب الی شبراً تقربت الیه ذراعا الحدیث** (مسند احمد ۲:۴۱۳) (جس نے میری طرف ایک بالشت کے برابر قرب اختیار کیا میں اس کے پاس ایک ہاتھ کے برابر آتا ہوں) خدا کا وعدہ ہے کہ طالب پر ادھر سے عنایت ہوتی ہے اگر ان کی عنایت نہ ہو تو اس کی قطع سے راستہ کبھی منقطع نہ ہو۔

میں اس کی ایک مثال دیا کرتا ہوں کہ ایک بچہ ایک فرلانگ کے فاصلہ پر ہے ماں باپ اس سے کہتے ہیں کہ چلو اور اپنے پاؤں سے مسافت طے کرو۔ وہ روتا ہے کہ ہم کو لے جاؤ یہ کہتے ہیں خود چلو تو اگر وہ ان کے کہنے سے چلا اور قدم بڑھایا اور گر گیا تو وہ دوڑ کر خود ہاتھ پکڑ لیتے اور گود میں اٹھ لیتے ہیں یہ نہیں کہ وہ شفیق نہیں رحیم نہیں وہ شفیق بھی ہیں مگر چاہتے ہیں کہ چلنا اور گرنا دیکھیں۔ جہاں وہ چلا اور گرنے لگا تو پھر ان سے رہا نہیں جاتا دوڑ کر گود میں اٹھا لیتے ہیں۔ ایسے ہی اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو دیکھتے ہیں کہ چلا یا نہیں؟ اگر نہیں چلا تو **انلز مکموها وانتم لها کارهون** (کیا ہم تمہیں (اپنی رحمت) زبردستی چپکا دیں گے جبکہ تم اسکو ناپسند کرتے ہو) اور اگر چلا تو **من تقرب الی شبرا تقربت الیه ذراعاً ومن تقرب الی ذراعا تقربت الیه باعا الحدیث** (مسند احمد ۲:۴۱۳) (جس شخص نے میری ایک بالشت قرب اختیار کرتا ہے تو میں اسکی طرف ایک ہاتھ کے برابر قرب اختیار کرتا ہوں اور جو ایک ہاتھ کے برابر قرب اختیار کرتا ہے میں دو ہاتھ کے برابر قرب اختیار کرتا ہوں) غرض وہ اگر دستگیری نہ فرماویں تو یہ راستہ ہرگز منقطع نہ ہو اسی کو فرماتے ہیں۔

نگردد قطع ہرگز جادۂ عشق از دویدنہا — کہ می بالد بخود ایں راہ چوں تاک از بریدنہا

محض دوڑنے سے طریق عشق ہرگز طے نہیں ہوتا اس لئے کہ مثل انگور کے کاٹنے سے خود بخود بڑھتا ہے۔

یہ راستہ کسی کے ختم کئے ختم نہیں ہوتا بس خدا ہی کے ختم کرنے سے ختم ہوتا ہے اور وہ ختم جب کرتے ہیں کہ تمہارے اندر طلب دیکھیں۔

ایک بادشاہ کا قصہ ہے کہ بالاخانہ پر بیٹھا تھا دریچہ سے دیکھا کہ ایک درویش جا رہے ہیں ان کو اپنے پاس بلایا کہ کچھ دریافت کرنا ہے۔ بزرگ نے فرمایا میں کیوں کر آؤں تم بلندی پر میں پستی میں اور محل شاہی کا دروازہ بہت دور بادشاہ نے فوراً ایک کمند لٹکا دی اور کہا اس کو پکڑ لیجئے پھر خود ان کو اوپر کھینچ لیا جب وہ اوپر آ گئے تو پوچھا کہ آپ خدا تک کس طرح پہنچے فرمایا جیسے تم تک پہنچا اگر ہم کوشش کرتے اور تم نہ کھینچتے کسی طرح وصول نہ ہوتا تم نے کھینچ لیا تو ذرا سی دیر میں وصول ہو گیا۔ اسی طرح خداتعالیٰ نے ایک کمند لٹکا دی ہے جو اس کو پکڑ لیتا ہے اس کو وہ خود کھینچ لیتے ہیں اور وہ کمند ہے قرآن جس کے بارہ میں ارشاد ہے واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً خداتعاں اگر نہ کھینچتے تو وصول ممکن نہ تھا۔ بندہ کا کام کمند پکڑ لینا ہے کھینچنا ان کا کام ہے بندے کا کام تلاش ہے وصول وہی عطا کریں گے۔ بہرحال اعمال سے نہ دنیوی نفع مطلوب ہے جیسا مدعیان عقل نے سمجھا اور نہ وہ باطنی احوال مطلوب ہیں جو موعود نہیں صرف ایک چیز مطلوب ہے جس کو لوگ مولویانہ بات سمجھتے ہیں یعنی رضا بس عمل کرتے رہو اور ان کی رضا کو مطلوب سمجھو اسی طرح ایک دن عنایت متوجہ ہو جائے گی۔

اندریں رہ میتراش و میخراش — تادم آخر دمے فارغ مباش
تادم آخر دمے آخر بود — کہ عنایت با تو صاحب سر بود

اس راہ سلوک میں ادھیڑ بن میں لگے رہو یعنی خوب کوشش کرو، آخر دم تک بے کار نہ رہو آخری وقت کوئی ایسی گھڑی ضرور ہوگی جس میں عنایت ربانی تمہاری ہمراز بن جائے گی۔

طلب اور سعی کو مت چھوڑو سب کچھ حاصل ہو جاویگا۔ خلاصہ یہ ہے کہ میں یہ کہہ رہا تھا کہ احکام شرعیہ سے جو ثمرہ مقصود ہے اس کا کامل ظہور تو ہوگا آخرت میں مگر حصول یہاں بھی ہوتا ہے اسی باب میں، دو فرقے غلطی میں پڑ گئے ایک اہل دنیا کہ مقصود ان کا دنیا ہے دوسرے غیر محقق اہل دین دونوں مختلف غلطیوں میں پڑ گئے جیسا مفصلاً مذکور ہوا اب ثابت ہو گیا کہ مقصود تمام احکام دین سے صرف رضائے حق ہے لیکن اتفاق سے احکام دین ایسے واقع ہوئے ہیں کہ ان سے

منافع دنیوی بھی حاصل ہو جاتے ہیں۔

چنانچہ اہل اللہ کو دیکھو ان کو دنیوی منافع بھی دنیاداروں سے زیادہ حاصل ہیں عیش و عشرت و مسرت جیسی ان کو حاصل ہے دنیا داروں کو اس کی ہوا بھی نہیں لگی۔ سو اس سے ہم کو بھی انکار نہیں کہ احکام میں منافع دنیوی بھی ہیں چنانچہ میں نے احکام کے یہ دنیوی منافع بیان بھی کئے ہیں یعنی بس وعظ الاتمام لنعمۃ الاسلام کے پہلے دونوں حصوں میں مگر وہ منافع اس درجہ میں نہیں ہیں کہ ان ہی کو مقصود بنایا جاوے ہاں منافع تابعہ ہیں۔

چنانچہ میں نے ایک جلسہ میں عقائد کے اور ایک جلسہ میں دیانات کے اور ایک جلسہ میں اخلاق کے محاسن و منافع بتلائے ہیں صرف معاملات و معاشرت کے منافع کا بیان باقی رہ گیا تھا آج ان دونوں کے متعلق بیان کا خیال تھا۔

تہذیب اخلاق:

ہاں کل اخلاق کے متعلق یہ کہنا بھول گیا تھا کہ حکماء نے بھی اقرار کیا ہے کہ تہذیب اخلاق جیسی شریعت نے کی ہے اس کے بعد کسی اور بیان کی ضرورت نہیں رہی چنانچہ مشاہدہ ہے حکماء کی کتابوں کو دیکھئے پھر قرآن و حدیث کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ تہذیب اخلاق میں شریعت نے اس قدر تدقیق کی ہے کہ حکماء اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچے چنانچہ شریعت میں طلب رضاء کی بھی تعلیم ہے جس کو فلاسفہ نے چھوا بھی نہیں۔ یہ رضا جز ہے سارے اخلاق کی اور جس کا ایک بین اور نقد نفع تو یہ ہے کہ جو خدا سے ہر حال میں راضی ہوگا اس کو کبھی پریشانی اور ناگواری نہ ہوگی۔

یہ کتنی راحت ہے اس سے بڑھ کر اور کیا راحت ہوگی جیسا مشاہدہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ صاحب شریعت کو ہر چیز میں راحت ہے۔

حضرت بہلول نے کسی بزرگ سے دریافت کیا کہئے کیا حالت ہے کہا اس شخص کی حالت کیا پوچھتے ہو کہ دنیا میں اس کے خواہش کے خلاف کوئی کام نہیں ہوتا ظاہر ہے کہ وہ ہر وقت خوش رہیگا یہی میری حالت ہے حضرت بہلول نے کہا یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ کوئی ایسا شخص ہو کہ کوئی بات اس کے خواہش کے خلاف نہ ہو۔ فرمایا یہ تو ظاہر ہے کہ کوئی کام بلا ارادہ حق نہیں ہوتا ہے۔ جو کچھ ہوتا ہے مشیت ایزدی سے ہوتا ہے پس اگر کسی نے اپنے ارادے کو خدا کے ارادے میں فنا کر دیا ہو تو جو کام خدا کی مشیت و ارادہ کے موافق ہوگا وہ اس کے ارادہ خواہش کے موافق بھی ہوگا مثلاً یہ شخص بیمار ہوا اور معلوم ہوا کہ خدا تعالیٰ کا یہی ارادہ ہے تو یہی اس شخص کی بھی۔ مرضی ہوگی

یعنی وہ یہ سمجھے گا کہ اگر ہمارا بیمار ہونا خدا کو پسند ہے تو ہم کو بھی پسند ہے اس لئے کوئی کام دنیا میں اس شخص کی مرضی کے خلاف نہیں ہوگا یہ ہے رضاء کی تعلیم جس میں بے شمار منافع ہیں۔

پھر شریعت نے اس میں بھی ایک دقیقہ رکھا ہے وہ یہ کہ رضاء کے اختیار کرنے میں بھی دو طرح کی نیت ہوتی ہے۔ ایک تو یہ کہ رضا اختیار کرنے سے راحت حاصل ہوتی ہے، حکمائے شریعت کہتے ہیں کہ یہ درجہ طلب رضا کا خفی شرک ہے کیونکہ یہ شخص طالب راحت ہے مقصود اس کا راحت ہے اور ظاہر ہے کہ راحت خدا نہیں بلکہ غیر خدا ہے تو یہ شخص غیر خدا کا طالب ہوا۔ اور ایک اس نیت سے رضا اختیار کرتا ہے کہ بندہ کے ذمہ خدا کا یہ حق ہے کہ وہ جو حکم کر دے اس پر بندہ راضی رہے سو یہ درجہ مطلوب ہے اور یہ شخص موحد کامل ہے مومن ہے عارف ہے اب بتائے ہے کوئی حکیم ارسطو۔ سقراط۔ بقراط اس دقیقہ کو سمجھنے والا؟ وہ تو اس گرد کو بھی نہیں پہنچے۔

دقائق شریعت:

میں نے ایک حکایت دیکھی ہے ایک بزرگ دوسرے بزرگ کی زیارت کو گئے حجرہ سے باہر ان کی آواز آرہی ہے انہوں نے کان لگا کر سنا تو وہ بزرگ پناہ مانگتے تھے لذت تفویض سے کہ مبادا ہم لذت کی وجہ سے تفویض و رضا اختیار کئے ہوئے ہیں۔ بتلاؤ اس دقیقہ کو کوئی حکیم سمجھ سکتا ہے؟

اور ایک حکایت ہے کہ جس سے ان محققین کی شان تدقیق معلوم ہوتی ہے ایک بزرگ قرآن شریف پڑھنے کیلئے بیٹھے پہلے **اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم** (میں شیطان مردود سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتا ہوں) پڑھا اس کے بعد کہا اے شیطان تو خوش نہ ہونا کہ میں تجھ سے ڈرتا ہوں۔ اس لئے پناہ مانگتا ہوں۔ نہیں نہیں ہرگز نہیں بلکہ محض خدا کا حکم بجا لانے کیلئے استعاذہ پڑھا ہے ورنہ میں تجھے اس قابل نہیں سمجھتا کہ تجھ سے ڈر کر پناہ مانگوں۔ خدا کے بغیر تو کیا کر سکتا ہے؟ تو نازمت کرنا اور واقعی ایسے بزرگوں کا وہ کیا کر سکتا ہے **انه لیس له سلطان علی الذین امنوا وعلی ربهم یتوکلون.** (بیشک وہ ان لوگوں کا بادشاہ نہیں جو ایمان لائے اور اپنے پروردگار پر توکل کرتے ہیں)

غرض بزرگوں کی حکایت سے حیرت ہوتی ہے کہ کہاں تک ان کی نظر پہنچی ہے امام غزالی کی ایک تدقیق یاد آ گئی ہے انہوں نے اپنی کسی کتاب میں لکھا ہے کہ ریاء مذموم کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ بندہ خدا سے ریاء کرے۔ سبحان اللہ یہ حضرات کیا غائر النظر ہیں اور خدا سے ریاء کی صورت یہ لکھی ہے کہ ایک شخص خلوت میں تو نماز پڑھتا ہے جلدی جلدی اور جلوت میں لمبی۔ پھر ایک دفعہ خیال ہوا کہ اللہ میاں کیا کہیں گے کہ خلوت میں تو تقصیر کرتا ہے اور جلوت میں تطویل۔ آپ نے

تنہائی میں بھی لمبی لمبی نماز شروع کردی تو اس شخص کا مقصود خدا کیلئے تطویل صلوۃ نہیں ہے بلکہ مخلوق کیلئے ہے دراصل اس کو تطویل جلوت ہی میں مقصود ہے مگر اس خیال سے کہ خدا تعالیٰ یوں نہ کہیں کہ ہمارے لئے تطویل نہیں کرتا ہے اسلئے خلوت میں بھی تطویل اختیار کی تاکہ جلوت میں تطویل کرسکے سو یہ کتنا بڑا خداع ہے ایسے ہی مخادعین کے حق میں کہا گیا ہے۔

زنہار ازیں قوم نباشی کہ فریبند　　　حق را بسجودے و نبی را بدرودے

تم ایسے لوگوں میں سے نہ بننا جو حق تعالیٰ شانہ کو ایک سجدے سے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک درود سے دھوکہ دیتے ہیں۔

تو کیا یہ علم کسی فلسفی کے پاس ہے جو غزالی کے پاس ہے ہرگز نہیں اور یہ انہوں نے شریعت ہی سے سمجھا ہے۔ شریعت کے احکام پر قربان جایئے اس میں وہ دقائق و اسرار ہیں جو کسی حکیم کے یہاں نہیں۔ فلاطون کو کسی نے خواب میں دیکھا پوچھا حکماء کون کون ہیں اور کچھ حکماء کے نام گنوائے کہا یہ کچھ بھی نہیں وہ دیوانے کیا جانیں کہ حکمت کیا چیز ہے پھر اہل حق میں سے کسی کا نام لیا تو کہا **اولئک هم الفلاسفة حقاً** واقعی فلسفی یہ ہیں مگر اب ہماری کیا حالت ہے اپنے گھر کی خبر نہیں دوسروں کے پیچھے پھرتے ہیں اور ان ہی سے علوم و تہذیب کو حاصل کرنا چاہتے ہیں حالانکہ وہ سب تمہارے گھر کے فقیر ہیں اس باب میں ہماری وہی مثال ہے۔

یک سبد پر نان ترا بر فرق سر　　　تو ہمی جوئی لب نان دربدر

ٹوکرہ روٹیوں کا سر پر رکھا ہوا ہے اور بھیک مانگتے پھرتے ہیں۔

یک سبد پر نان ترا بر فرق سر　　　تو ہمی جوئی لب نان دربدر
تا بہ زانوئی میان قعر آب　　　وز عطش وز جوع گشتی خراب

تیرے سر پر روٹیوں کا ایک ٹوکرا موجود ہے تو ایک روٹی کے ٹکڑے کیلئے مارا مارا پھرتا ہے تو زانو تک نہر میں کھڑا ہے پیاس اور بھوک سے خراب ہو رہا ہے۔

یعنی گھٹنے تک پانی میں ڈوبے ہوئے ہیں اور ہائے پانی ہائے پانی اور ہائے روٹی ہائے روٹی پکار رہے ہیں۔ ارے اوپر دیکھ روٹی کا ٹوکرہ سر پر ہے اور نیچے دیکھ پانی ہے ہمارے گھر میں اتنی بڑی دولت ہے پھر بھی ہم دوسروں پر حسرت کرتے ہیں تف ہے ہماری اوقات پر۔ کل میں یہ بات کہنا بھول گیا تھا آج اس کو بیان کردیا۔

محاسن معاملہ و معاشرت:

میں نے ابھی کہا ہے کہ عقائد و دیانات و اخلاق کے مصالح تو بیان ہو چکے ہیں معاشرت و معاملات کا بیان رہ گیا تو آج معاشرت و معاملات کے حکم اور مصالح کا بیان ہونا چاہیے اور ان دونوں میں ایک وجہ جامع بھی موجود تھی کہ دونوں کا تعلق عباد کے ساتھ ہے چنانچہ آج یہی ارادہ تھا کہ ان کا بیان استیعاب کے ساتھ ہو جائے گو قدرے بیان مجملاً ہو بھی چکا ہے مگر تمہید اتنی لمبی ہو گئی کہ اس میں وقت زیادہ گذر گیا پھر ایک اور کام نکاح کا بھی ہے لہذا آج بھی استیعاباً اس کا بیان نہ ہو سکے گا اور گو استیعاباً تو پہلے بھی نہ ہوتا مگر اجمال کے مقابلہ میں کچھ تفصیل ہوتی مگر چونکہ تمہید میں بہت وقت گذر گیا ہے لہذا اب مختصراً بیان ہوگا۔

تو سمجھ لو کہ معاملات و معاشرات کے سارے احکام کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی سے کسی کو ایذاء و ضرر نہ ہو خواہ جانی ہو یا مالی۔ اس کا لحاظ شریعت میں کمال درجہ پر کیا گیا ہے چنانچہ کتب فقہ میں لکھتے ہیں کہ تجارت میں کسی کو دھوکا نہ ہونا چاہیے اور لکھتے ہیں بائع مبیع کے عیوب نہ چھپائے تو دیکھئے اس راست گوئی میں دنیا کا کتنا نفع ہے۔

کانپور میں ایک بانس منڈی ہے بہت سے بانس بیچنے والے اس میں تجارت کرتے تھے ان میں سے ایک شخص ایسا سچا تھا کہ اس سے جس بانس کے متعلق دریافت کیا جاتا کہ یہ کتنے دن چلے گا وہ صاف کہہ دیتا کہ دو برس یا ایک برس یا چھ ماہ اسی طرح کہہ دیا کرتا مگر دوسرے دکاندار اپنے مال کی نسبت یہ کہہ دیتے کہ یہ مدت دراز تک چلے گا گویا اسرافیل علیہ السلام کے صور پھونکنے تک رہیگا۔ اس وجہ سے اوروں کی دکان پر خوب بکری ہوتی تھی اور ان کے یہاں بہت کم۔ بعضوں نے اس سے کہا کہ اس طرح کہنے سے مال بکیگا نہیں وہ جواب دیتا تھا کہ بکے یا نہ بکے میں اپنے مالک کو ناراض نہ کروں گا جھوٹ نہیں بولوں گا۔

آنکس کہ ترا شناخت جاں را چہ کند　　فرزند و عیال و خانماں را چہ کند

جس نے تیری معرفت حاصل کر لی وہ جہان کو کیا کرے گا بیٹے، خاندان، اولاد کو کیا کرے گا۔

غرض بلائے عشق نے اس کو مجبور کیا سچ بولنے پر مگر اسکے یہاں کچھ بکری نہ ہوتی تھی یوں ہی بیٹھا رہتا لیکن دنوں کے بعد قسمت نے پلٹا کھایا لوگوں نے جو تجربہ کیا تو دوسرے دکانداروں کی تعریف کے موافق مال نہ پایا خراب بانس نکلے اور یہ جتنے دن کہہ دیتے اس سے بھی کچھ زیادہ ہی چلتا اب خریدار جو گرے ان کی دکان پر تو بے چارے کو کام سے فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔ غرض سچ

بولنے سے برکت ہوتی ہے۔ چند دن تو نقصان معلوم ہوتا ہے مگر بعد میں نفع ہی نفع ہوتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ اگر مال میں عیب ہو تو صاف کہہ دے کہ اس میں یہ کھوٹ ہے۔ اس سے برکت ہوتی ہے **فان تبینا وصدقا بورک لہما وان کذبا وکتما محقت برکتہما.**

اگر عیب کو چھپایا یا جھوٹ بولا برکت مٹ جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کماتے ہیں مگر برکت نہیں دیکھتے یہ ایک چھوٹا سا دستور العمل ہے دین کا۔ دیکھئے اس میں کتنا نفع ہے دنیا کا۔

اسی طرح کسی معاملہ میں بھی دھوکا نہ ہونا چاہیے۔ بات بھی ہو تو اس میں بھی دھوکا نہ ہو۔ شریعت نے اس دھوکے سے روکنے کا اس قدر اہتمام کیا ہے کہ بعض مواقع پر قصداً کسی کی طرف سے دھوکا تو نہ تھا مگر واقع میں دوسرے کا ضرر تھا اور اس کو خبر بھی نہیں تھی کہ مجھ پر ظلم کیا جا رہا ہے تو یہ ایک درجہ دھوکا بہت خفی تھا بلکہ وہ آپ اس ضرر پر راضی بھی تھا مگر شریعت نے اس سے بھی منع کر دیا جیسے سود۔ اس میں چونکہ فی الواقع ضرر اور ظلم ہے اس لئے منع کر دیا گیا گو متعاقدین اس پر راضی تھے۔ سبحان اللہ کس قدر شفقت ہے شریعت کی جیسے بچہ سانپ پکڑنا چاہتا ہے تو ماں باپ اس سے روکتے ہیں۔ حالانکہ بچہ تو خوشی سے پکڑتا ہے کیونکہ وہ ضرر سے واقف نہیں اس لئے پکڑتا ہے۔ اب اگر کوئی یہ کہے کہ ماں باپ نے بیچ میں ٹانگ کیوں اڑائی؟ اس کو منع کیوں کرتے ہیں پکڑنا چاہتا ہے پکڑنے دیں۔ تو اس سے یہی کہا جائیگا کہ بات یہ ہے کہ ان کو بچوں سے محبت ہے اس لئے روکتے ہیں تاکہ اس کا ضرر نہ ہو۔ ایسے ہی خدا کو تم سے محبت ہے اس لئے جو چیز تمہارے لئے مضر ہے اس سے منع کرتے ہیں اگرچہ اس کے ضرر کی تمہیں خبر بھی نہیں۔

ایک قصہ مشہور ہے کسی کا جوان لڑکا دھوپ میں کھڑا تھا باپ نے کہا بھائی سایہ میں آ جاؤ کئی دفعہ کہا مگر وہ آتا نہیں تھا آخر جب دیکھا کہ وہ آتا نہیں تو اس نے خود اس کے بچہ کو اٹھا کر دھوپ میں دھر دیا اب تو آپ چلانے لگے کہ اس کو دھوپ سے الگ لے جاؤ۔ باپ نے کہا کہ جو نسبت اس کو تجھ سے ہے وہی نسبت تجھ کو مجھ سے ہے اسی طرح میں بھی تڑپ رہا تھا تو دیکھئے یہ جوان اپنے ضرر پر راضی تھا مگر باپ کو گوارا نہیں سو اسی طرح سود دینے اور لینے پر آپ گو راضی ہوں مگر وہ روکتے ہیں ان کو معلوم ہے کہ اس میں ضرر ہے اور واقعی سود کا ضرر بہت ہے۔

میرے ایک دوست نے سترہ سو روپیہ سودی لئے تھے اور یہ سب ہماری غفلت عن الدین کا ثمرہ و نتیجہ ہے اور بے فکری کا اگر شریعت کے پابند ہوتے تو اول تو سودی قرض لیتے ہی کیوں؟ اور اگر لیا تھا تو جلد سے جلد ادا کرنے کا اہتمام ہوتا مگر اب تو مسلمانوں میں غفلت ہے، نوابی ہے اور وہ مہاجن ہوتا نہیں وہ تو دل سے چاہتا ہے کہ برس دس برس تک قرض وصول نہ ہو تو اچھا ہے غرض

تھوڑی مدت میں سود در سود مل کر چالیس ہزار ہو گیا جس میں سب جائیداد نیلام ہو گئی۔ ان حضرت کو ایک اور بھی خبط تھا کہ اتنے روپیہ کے تو مقروض لیکن کہیں کوئی جائیداد بکتی تو فوراً خرید لیتے وہ بھی قرض لے کر۔ اگر کہا جاتا کہ قرض لے کر کیوں خریدتے ہو؟ جواب ملتا ہے ارے جائیداد ہمیشہ نہیں ملتی پھر سب اسی قرض میں اڑا دی۔

اس جواب پر ایک مشہور قصہ یاد آ گیا ایک بزرگ کرایہ کی بہلی میں جونپور سے دہلی گئے۔ وہاں پہنچ کر بہلی والے سے پوچھا کہ یہاں سے واپسی میں کتنے کرایہ پر جاؤ گے معلوم ہوا کہ جتنے میں آئی ہے اس سے آدھا کرایہ لے کر چلا جائیگا آپ اسی وقت جونپور واپس آ گئے کہ شاید پھر اتنے کرایہ پر گاڑی ملے یا نہ ملے۔ یہی اس جواب کا رنگ ہے کہ اب جائیداد سستی ملتی ہے خرید لو۔ مسلمانوں کا اس بے فکری نے ناس کر دیا۔ اس ضرر کو دیکھ کر شریعت نے سود کو حرام کر دیا۔

اور سنئے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر ایک جائیداد بیچنا چاہتے ہو تو اس کی قیمت سے دوسری جائیداد خرید لو ورنہ اس روپیہ میں برکت نہ ہوگی۔ کیونکہ نقد میں برکت نہیں ہوتی خرچ ہو جاتا ہے۔ دیکھئے شریعت نے ہماری دنیوی راحت کی کتنی رعایت کی کہ جائیداد بیچنے سے منع بھی نہیں کیا کیونکہ بعض دفعہ ایک جائیداد سے نفع نہیں ہوتا تو اس کی تو اجازت دی کہ بیچ دو مگر ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ جلدی کرو اور اس رقم سے دوسری جائیداد خرید لو یہ نہ کرو کہ جائیداد بیچ کر تجارت کرنے لگو کہ اس میں نفع زیادہ ہوگا شریعت نے اس میں دست اندازی اس لئے کی کہ اس میں بقاء کی صورت ہے جائیداد کو کوئی چور چرا نہیں سکتا، اور یوں جائیداد بیچ کر روپیہ سے تجارت کی جاوے یا گھر میں رکھا جاوے تو اس میں خوف ہے نقصان کا بھی اور چوری کا بھی چنانچہ ایک مقام پر ایسا واقعہ ہوا ہے۔ ایک مہاجن آدمی نے جائیداد بیچ کر کھدر کا کارخانہ کھولا۔ کپڑا بننے کا۔ تو ان حضرت نے چار ہزار کی جائیداد بیچی اور ایک ہزار سے کام شروع کیا تین ہزار گھر رکھے۔ جب کھدر کا زور شور کم ہوا کھدر میں تو یوں نقصان ہوا اور روپیہ چور لے گئے نہ جائیداد رہی نہ روپیہ رہا۔

وہی حال ہوا جیسے کسی چور کا قصہ ہے کہ ایک گھوڑا بہت قیمتی چرا کر لایا تھا ایک چور اس کے پیچھے بھی لگ گیا زمیندار بن کر اس کے پاس آیا کہ گھوڑا بیچتے ہو کہا ہاں اس نے کہا اچھا ذرا میں سوار ہو کر دیکھ لوں کہا دیکھ لو۔ اس نے اپنے جوتے تو اس کے حوالے کئے اور سوار ہو کر کچھ دور گیا پھر چلا آیا تاکہ اس کو شبہ نہ ہو۔ پھر کچھ دور گیا اور چلا آیا تیسری مرتبہ پھر کچھ دور گیا اور ایسا غائب ہوا کہ پھر پتہ ہی نہ دیا اب آپ اسکی جوتیاں لے کر گھر واپس آئے کسی نے پوچھا وہ گھوڑا کتنے میں دے دیا کہا جتنے میں لیا تھا اتنے ہی میں دے دیا یہ جوتیاں نفع میں ہیں۔

اسی طرح یہاں سب برابر ہوگیا اور کھنڈیاں نفع میں رہ گئیں اور پھر بھی فرق ہے کہ وہاں تو مفت کا گھوڑا تھا مگر یہاں تو سوں کی چیزیں اور روپیہ بھی جائیداد بیچ کر آیا تھا غرض نہ جائیداد ہی رہی نہ روپیہ رہا تو حضورؐ نے ہماری راحت کی کتنی رعایت کی ہے فرماتے ہیں کہ اگر ایک جائیداد بیچو تو دوسری جائیداد جلد خرید لو اور معاملات و معاشرت میں سے باب سفر کو دیکھو چنانچہ آداب سفر میں سے ایک یہ ہے کہ سفر میں چار آدمیوں کا ساتھ ہونا چاہیے علماء نے اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ اگر اس سے کم ہوں گے تو دو ہوں گے یا تین اگر دو ہوں تو اس میں یہ خرابی ہے کہ ایک کسی کام کو گیا دوسرا تنہا بیٹھے گھبرائیگا بھی اگر تین ہوں تو اس میں بھی بعض اوقات ایک تنہا ہوگا اور اگر چار ہوں گے تو ہر طرف دو دو ہوں گے گھبراہٹ کی کوئی بات نہیں ہوگی بیچ جانئے اگر عمر بھر کے تجربے جمع کئے جائیں تو وہ باتیں سمجھ میں نہیں آویں گی جو شریعت نے ملحوظ رکھی ہیں کیونکہ اس کی تعلیم تو اور ہی جگہ سے ہے **علمنی ربی فاحسن تعلیمی وادبنی ربی فاحسن تادیبی** (م جد حدیث فی موسوعۃ اطراف حدیث النبوی الشریف)

اور سنئے معاشرت میں ایک ادب یہ ہے کہ اگر تین آدمی ہوں تو دو شخص باہم سرگوشی نہ کریں کیونکہ تیسرا کبیدہ خاطر ہوگا کہ مجھ ہی سے اخفا مقصود ہے اور اگر چار آدمی ہوں تو دو کی سرگوشی میں تیسرا شخص یہ سمجھ سکتا ہے کہ شاید مجھ سے چھپاتا نہیں دوسرے سے چھپاتا ہو رنجیدگی نہ ہوگی ایک میرا واقعہ اسی طرح کا ہے۔

میرے پاس ایک نائب تحصیلدار آئے ان کو اپنے بچہ کی تعلیم کیلئے مدرس کی ضرورت تھی۔ مجھ سے تجویز کرنے کی درخواست کی مجھ سے یہ حماقت ہوئی کہ میں نے ایک مولوی صاحب سے جو مجھ سے پڑھ رہے تھے اس کے متعلق عربی میں گفتگو شروع کی تھوڑی ہی گفتگو کرنے پایا تھا کہ نائب صاحب نے کہا عربی میں بات کرنے سے معلوم ہوتا ہے شاید آپ مجھ سے مخفی رکھنا چاہتے ہیں سو میں عربی سمجھتا ہوں آپ اجازت دیجئے میں یہاں سے اٹھ جاؤں۔ میں بہت شرمندہ ہوا اور کہا ایسے مہذب سے میں کوئی راز مخفی نہیں رکھنا چاہتا غرض ناواقف کے سامنے دو آدمیوں کا عربی میں کلام کرنا بھی اسی ممانعت میں داخل ہے۔

نیز انہوں نے اس حدیث کو بھی سمجھ کہ اگر دو آدمی پوشیدہ باتیں کرتے ہوں تو کسی کو ان کی باتوں پر کان نہ لگانا چاہیے۔ فرمائیے کس قدر تدقیق ہے۔ غرض شریعت کا ایک ایک باب کھولو اور اس کے منافع و محاسن کو دیکھو تو خود فیصلہ کر لو گے کہ احکام شرع میں جو جو خوبیاں اور منافع ہیں اور کسی میں نہیں ہیں۔

شریعت وغیر شریعت میں فرق:

اگر تمہاری سمجھ میں شرع اور غیر شرع کا فرق نہ آوے تو ایک طریقہ فرق معلوم کرنے کا میں بتلاتا ہوں اور وہ بہت موٹی بات ہے وہ یہ کہ شرع کے خلاف تو بہت دفعہ کام کیا ہوگا ایک بار شریعت کے موافق بھی عمل کرلو تو ان دونوں میں رات دن کا فرق محسوس ہوگا۔ خلاصہ یہ ہے کہ اسلام میں ایسے احکام ہیں کہ ان کے اندر دنیوی راحت اور خوبی بھی ہے جب نعمت اسلام ایسی چیز ہے تو تم خود بھی اس پر عمل کرو اور دوسروں کو بھی ترغیب دو یہی عمل مقصود ہے اس امتنان سے **اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی** (آج کے دن میں نے تم پر تمہارا دین کمال کردیا اور میں نے تم پر اپنا انعام پورا کردیا) اب میں بیان کو ختم کرتا ہوں اور مطلع کرتا ہوں کہ خداوند تعالیٰ نے ہم کو بہت بڑی نعمت دی ہے ہم کو اس کی قدر کرنی چاہیے اور اس سے نفع حاصل کرنا چاہیے۔

محاسن نکاح:

میں نے درمیان میں آپکو مطلع کیا تھا کہ ایک نکاح ہوگا کہ سب صاحب ٹھہریں اور معلوم کریں کہ شریعت کی تعلیم اس کے متعلق بھی کتنی راحت کی ہے برخلاف ان رسوم کے جو ہم نے ایجاد کی ہیں کہ ان میں کتنی مشکلات ہیں۔ دیکھئے نکاح کتنا مختصر ہے کوئی چیز ایسی مختصر نہیں ہے۔

سب چیزوں میں پیسہ لگتا ہے مگر اس میں ایک پیسہ بھی صرف نہیں ہوتا آدمی کو سب سے پہلے رہنے کیلئے مکان کی ضرورت ہے دیکھئے اس میں پیسہ لگتا ہے پھر کھانے میں بھی پھر پینے میں بھی یعنی پانی تو سقے سے منگاتے ہیں مگر سقہ کو پیسے دینے پڑتے ہیں لیکن نکاح میں ایک پیسہ بھی نہیں لگتا کیونکہ نکاح کا رکن ہے الایجاب قبول۔ صرف زبان سے دو لفظ کہنا اس میں کیا لگا۔ اگر کہو کہ نکاح میں لگتا کیوں نہیں؟ چھوہارے تقسیم ہوتے ہیں اور مہر میں تو پیسہ ہی پیسہ لگتا ہے؟

جواب یہ ہے کہ چھوہارا تقسیم کرنا واجب نہیں، رہا مہر سو مہر اکثر ادھار ہوتا ہے اصل چیز جس سے مفر نہیں وہ عقد ہے اور عقد نکاح میں تو ایک پیسہ کا بھی خرچ نہیں البتہ عرب میں مہر فوراً دینا پڑتا ہے مگر یہاں تو کچھ نہیں ہاں جائیداد نیلام ہو تب مہر کا پتہ لگتا ہے پہلے سے کچھ بھی خبر نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل مہر بہت زیادہ باندھتے ہیں کیونکہ دینا تو ہے نہیں اور یہ تکثیر مہر عادۃ عامہ ہوگئی ہے۔

میں نے ایک جگہ سنا تھا کہ مہر سوا سیر کودوں ہوتا ہے ہم نے سمجھا بڑا ارزاں ہے بعد میں معلوم ہوا کہ مقصود اس سے سوا سیر کودوں کے دانوں کی گنتی کی برابر روپیہ ہے۔ ایک جگہ سنا۔ دس مٹکے کھٹمل

پسو پھر میں نے کہا اگر بادشاہ بھی جمع کرے تو وہ بھی اتنے پسو پھر جمع نہ کر سکے۔ غرض ایسا مہر مقرر کرتے ہیں کہ وہ دے ہی نہ سکے ہمیشہ شیطان کے پنجے میں پھنسا رہے اور بعض جگہ ڈیڑھ لاکھ سوا لاکھ مہر مقرر کرتے ہیں جیسا ہمارے قریب میں ایک قصبہ افغانوں کا ہے وہاں یہی دستور ہے۔ حالانکہ حدیث میں ہے کہ سب سے زیادہ برکت اس نکاح میں ہے جس میں مہر کم ہو۔

رہا ولیمہ سو وہ بھی سنت ہے واجب و فرض نہیں پھر وہ نکاح کے بعد کا قصہ ہے اور ولیمہ بھی پہلے زمانہ میں سنت تھا۔

رسوم تفاخر:

باقی اس وقت جو اکثر رسمی ولیمہ ہوتا ہے وہ محض تفاخر کیلئے ہے اس میں روپیہ بالکل برباد ہی جاتا ہے اور غور کیا جائے تو ہمارا زیادہ روپیہ تفاخر ہی میں برباد ہوتا ہے حتی کہ حیرت ہے کہ آج کل مرنے میں بھی فخر کا اہتمام ہے۔ میں نے حضرت مولٰنا دیوبندیؒ سے سنا تھا۔۔۔ کسی کتاب سے نقل فرمایا کہ ایک قبر پر لکھا تھا اے شخص عبرت حاصل کر میں ایسے شخص کا بیٹا ہوں جس کے قبضے میں ہوا تھی میں نے سمجھا یہ شخص حضرت سلیمان علیہ السلام کی اولاد میں سے ہوگا مگر اس کے قریب ہی دوسری قبر پر لکھا تھا اے ناظر دھوکہ میں نہ پڑنا یہ لوہار کا بیٹا تھا۔ راوی کہتا ہے کہ میں نے مردوں میں لڑائی اور تفاخر اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ خیر یہ فخر تو کسی زندہ کی تفریح تھی مگر موت کے متعلق واقعی فخر کا قصہ بھی بعض مقامات پر واقع ہوتا ہے چنانچہ فخر بہت کرے قبر تک پہنچ گئے۔ کیرانہ کا قصہ ہے کہ ایک گوجر بہت بڈھا تھا وہ بیمار رہوا اس کا بیٹا حکیم کے پاس آیا اور کہنے لگا اجی حکیم جی جس طرح ہو اب کی دفعہ تو میرے باپ کو اچھا ہی کر دو۔ پھر کہنے لگا اس کے مرنے کا تو غم نہیں غم اس کا ہے۔ اس سال چاول بہت مہنگا ہے اگر بڈھا مر گیا تو برادری کو کہاں سے کھلاؤں گا؟ اللہ اللہ کس قدر معاشرت بگڑی ہے کہ مردے کا تو غم نہیں زندوں کا غم ہے کہ وہ جو چڑھائی کریں گے ان کو کھلانا پڑیگا اس کیلئے روپیہ کی ضرورت ہوگی۔

ایسے تفاخر کا علاج ضلع بلند شہر میں ایک رئیس زادہ نے خوب کیا تھا۔ میں نے یہ قصہ سنا ہے اس رئیس زادہ کو دیکھا نہیں۔ قصہ یہ ہے کہ ان کے باپ کا انتقال ہوا۔ برادری کے لوگ جمع ہوئے۔ بڑے نے سب لوگوں کی دعوت کی۔ بڑی تعظیم و توقیر سے مہمانوں کو رکھا اور ایک بڑے خیمہ میں کھانے کا اہتمام کیا گیا جب مہمان جمع ہو گئے اور کھانا دسترخوان پر چنا گیا تو رئیس زادے صاحب تشریف لائے اور کہا صاحبو؟ کھانے کے قبل مجھے کچھ عرض کرنا ہے سب صاحب ذرا غور سے سنیں۔ آپ کو معلوم ہے

کہ آپ حضرات کس تقریب میں تشریف لائے ہیں وہ یہ کہ میرے والد صاحب کا انتقال ہوا ہے اور والد کے فوت ہونے سے اولاد کو جو صدمہ ہوتا ہے اس کو آپ بھی خوب جانتے ہیں اب انصاف سے کہیے کہ صدمہ زدہ کا کیا حق ہے آیا ہمدردی کرنا یا آستین چڑھا چڑھا کر کھانے کو اس کے گھر آ پڑنا۔ تمہیں کھانے کیلئے تیار ہو کر بیٹھنے پر شرم بھی آئی؟ بس میری گذارش ختم ہوگئی اب بسم اللہ کر کے کھانا شروع کیجئے اب لوگ کیا شروع کرتے سب کھڑے ہوگئے اور الگ بیٹھ کر عقلاء نے مشورہ کر کے اس رسم کو بالکل موقوف کر دیا اور کہا کہ لڑکے نے بالکل ٹھیک کہا سب دستخط کرو کہ آئندہ یہ رسم نہ ہو اس کو اٹھاؤ۔ آئے تو تھے قورمہ پلاؤ کھانے اب بے کھانا کھائے چلے گئے اس نے بھی کھانے پر اصرار نہ کیا بلکہ غرباء کو بلایا اور ان کو وہ سب عمدہ کھانا کھلا دیا جو ان کے باپ دادوں نے بھی نہ کھایا ہوگا۔ ان لوگوں نے دعائیں دیں۔ ایک شخص نے اس رئیس زادہ سے کہا کہ تم کو یہ کرنا تھا تو کھانا ہی نہ پکواتے۔ یہ کیا کہ کھانا تیار کرایا اور نہیں کھلایا اس نے کہا کہ اگر پہلے سے ایسا کرتا تو یہ کم بخت مجھے کنجوس کہتے کہ اس نے اپنی غرض کے واسطے شرع کو آڑ بنایا نیز یہ کہ مجھے تو کھلانا مقصود تھا مگر ان کو نہیں بلکہ غرباء کو۔ بھلا غرباء کیلئے ایسے کھانے کہاں پکتے غرض اب تو موت میں بھی فخر ہے جب موت میں فخر ہے تو شادی میں تو کیا کچھ نہ ہوگا لوگ کہتے ہیں کہ شادی بیاہ میں پہلے رسمیں تھیں اب کہاں؟ مگر میں کہتا ہوں کہ اب شرک کی رسوم تو کم ہوگئی ہیں مگر تفاخر کی رسوم اب تک موجود ہیں بلکہ زیادہ ہوگئیں یعنی اب وہ رسوم تو نہیں ہیں جن میں کفر و شرک تھا مگر تفاخر کی رسم موجود ہے بلکہ اور زیادہ فرعونیت ہے۔ ہر ایک شادی میں غریبوں کے یہاں بھی اتنے جوڑے ہوتے ہیں جو پہلے رئیسوں کو بھی میسر نہ ہوتے تھے۔

پہلے زمانہ میں ہمارے یہاں ایک رئیس تھے ان کے یہاں کچھ مراد آبادی برتن تھے سب لوگ شادی میں ان کے یہاں سے مانگ کرلاتے تھے اب تو یہ حالت ہے کہ ہر شخص ریشمی جوڑے تیار کرتا ہے جس میں گوٹہ لچکہ ٹھپہ کناری سب کچھ ہوتا؟ اور اس وقت تو خرید لیا پھر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسے دیمک کھاتی ہے۔

شادی و غمی میں اسوۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم:

ہم کہتے ہیں کہ جب ہم غلامانِ رسول ہیں اور حق تعالیٰ نے فرمایا **لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ** (تمہارے لئے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس بہترین نمونہ ہے) آپ ہمارے لئے نمونہ ہیں تو جس طرح آپ قولاً نمونہ ہیں ایسے ہی فعلاً بھی آپ نمونہ ہیں خوشی میں بھی نمونہ ہیں اور غمی میں بھی خوشی آپ نے کی یعنی نکاح کیا اور غمی بھی کی۔

اللہ میاں نے سب واقع کر کے دکھلا دیا تا کہ امت کو معلوم ہو کہ جیسے رسول نے کیا ہے ہم کو بھی ایسا ہی کرنا چاہیے چنانچہ جب آپ کے صاحبزادہ حضرت ابراہیم کا انتقال ہوا تو نہ کوئی مجمع ہوا نہ کوئی رویا نہ چلایا آنسو البتہ خود آپ کے بھی نکلے اتنی اجازت تھی آپ نے یہ بھی فرمایا تھا **انا بفراقک یا ابراهیم لمحزونون** (جامع المسانید ۲:۶۷۵) (اے ابراہیمؓ ہم تیری جدائی سے ضرور غمگین ہیں) یہ تو آپ نے غمی کر کے دکھلائی اور شادی کر کے اس طرح دکھلائی کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا نکاح ہوا اس میں نہ نائی خط لیکر آیا نہ ڈومنی آئی خود دلہا صاحب آئے اور انہوں نے خواستگاری کی اس میں نہ نشانی تھی نہ انگوٹھی نہ خط نہ شکرانہ نہ نائی کو روپیہ دیا جیسا آج کل جب نائی دولہن کی طرف سے بیاہ کی تاریخ کا خط لاتا ہے تو اس کے سامنے سو دو سو روپے پیش کئے جاتے ہیں اور وہ دو سو روپیہ میں سے ایک اٹھ لیتا ہے مگر جب اسکو ایک یا دو ہی دینا ہے تو اتنی رقم دکھلانا محض مکروفریب ہے مگر مکر بھی نہیں کیونکہ ساری برادری کو معلوم ہے کہ ساری رقم دینی مقصود نہیں تو پھر یہ لغو حرکت نہیں اور کیا ہے؟ ہم تو جب جانیں کہ وہ سب لے لے اور آپ اس سے خوشی سے کہہ دیں کہ بھائی سب لے جا تیری ساری عمر کیلئے کافی ہے مگر وہ بے چارہ بھی مجبور ہے ایک دو سے زیادہ لے ہی نہیں سکتا۔ پھر برادری کو جمع کیا جاتا ہے کہ نائی کو شکرانہ کھلا دو کیا اس کے منہ میں لقمے دیں گے نہیں بلکہ لقمے گنتے ہیں مگر وہ ایسا بہادر بلکہ بے حیا کہ سب کے سامنے بے تکلف کھا لیتا ہے خوب مشاق ہے یہ کیا فضول اور بے ہودہ رسم ہے۔

ہم ایک شادی میں دولہا کے سرپرست بن کر گئے تھے اور یہ پہلے سے قرار پا گیا تھا کہ کوئی رسم نہ ہوگی خیر عصر کے بعد نکاح تو ہو گیا اور مغرب کے بعد کھانا آیا تو نائی ہاتھ دھلا کر منتظر تھا کہ اب کچھ ملے گا مگر کچھ بھی نہ ملا کھانے کے بعد پھر منتظر رہا آخر ایک طباق میرے سامنے رکھ کر زبان سے کہا حضور ہمارا حق دیجئے۔ ہم نے کہا کہ کیسا حق قانونی حق یا رسمی میں نے کہا اپنے آقا سے کہو انہوں نے تمام رسموں کے بند ہونے کو کیوں منظور کر لیا تھا اس وقت ایک مولوی صاحب بھی کھانے میں تھے انہوں نے آہستہ سے کہا یہ تو رسم نہیں ہے بلکہ حق خدمت ہے۔ خدمت گذار کو تو دنیا مستحسن ہے مگر میں نے بلند آواز سے کہا کہ حق خدمت اپنے خادم کو دیا جاتا ہے یا دنیا بھر کے خادموں کو میرے نائی نے میری خدمت کی اس کو اگر ہم کچھ دیں تو اس کا حق ہو سکتا ہے دوسرے کے خدمت گذار کا ہم پر کیا حق ہے؟ اس تقریر سے مولوی صاحب کی آنکھیں کھل گئیں۔ خدا خدا کر کے رات گذری صبح ہوئی تو فرد خرچ کے متعلق گفت و شنید ہوئی اہل رسوم میں ایک فرد ہوتی ہے کمینوں کی جس میں ان

کا نیگ لکھا ہوا ہوتا ہے مگر کسی کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ ہمارے سامنے پیش کرے۔ میرے ایک دوست تھے ان کے ذریعہ سے پیش ہوئی انہوں نے کہا اس میں کیا رائے ہے میں نے کہا وہی رات کی رائے اور میں یہ بھی کہا کرتا ہوں کہ لوگوں کو شرم نہیں آتی فرد پیش کرتے ہوئے کہ نائی سے خود اپنا کام تو کرایا سقے سے پانی بھرایا اور اجرت دیں ہم۔ اپنے مہمان سے اجرت دلانا کس قدر بے غیرتی کی بات ہے۔ مگر ان رسموں کی پابندی میں عقل تو رخصت ہوئی ہی تھی غیرت بھی جاتی رہی۔ اب وقت آیا رخصتی کا۔ لڑکی والوں نے تقاضا کیا کہ پالکی یا میانہ لاؤ ہم رخصتی بدون پالکی یا ڈولہ کے نہ کریں گے میں نے کہا ہم رخصتی ہی نہیں چاہتے ساتھیوں نے کہا کیا رائے ہے کیا کرنا چاہیے میں نے کہا رائے یہ ہے کیونکہ نکاح تو ہو ہی چکا ہم اپنے گھر جاتے ہیں تم خود دولہن کو ہمارے پیچھے پیچھے لاؤ گے اب تو سیدھے ہوگئے پھر کہنے لگے جہیز کیلئے چھکڑا لاؤ میں نے کہا ہم جہیز ہی نہیں لے جاتے آخر چھکڑا بھی خود لائے عورتیں کوستی رہیں مگر ہم مظلوم تھے ظالم کے کوسنے سے مظلوم کا نقصان نہیں ہوتا۔ غرض ایسی برکت کا نکاح ہوا کہ دونوں طرف کا نفع ہوا ایک پیسہ خرچ نہ ہوا۔

اسی دولہا کے ایک دوسرے بھائی کا نکاح رسم کے ساتھ ہوا تو وہ قرضدار ہوگیا۔ میں نے کہا ایک نکاح ہوا تو اس میں قرض ہوا اگر دوسرا ہوا تو ختم ہی ہوجائیگا۔ اس قرضدار کی دلہن کوستی تھی ماں باپ کو بھی ساس سسر کو بھی کہ ان کا کیا نقصان ہوا ہم پر روٹی کی کمی ہوگئی۔ خیال فرمایئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہؓ کا نکاح کیا اور کرکے دکھلا دیا کہ نکاح اس طرح ہونا چاہیے۔ اس میں کوئی بکھیڑا نہیں ہوا۔ حضرت علیؓ کو بلایا اور کسی کو نہیں بلایا جو موجود تھے ان کے سامنے نکاح پڑھ دیا۔

اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ غالباً مواہب لدنیہ میں ہے کہ نکاح کے وقت حضرت علیؓ بھی موجود نہ تھے اس لئے آپ نے یوں فرمایا تھا ان رضی علیؓ کہ اگر حضرت علی راضی ہوں جب حضرت علیؓ آئے انہوں نے کہا رضیت کہ میں راضی ہوں جہاں دولہا کی بھی ضرورت نہ ہو وہاں برات تو کیا ہوتی مگر ہمارے یہاں تو سب نتھو خیرا کو موجود ہونا چاہیے کہتے ہیں اب تک فلانا تو آیا نہیں نکاح کیسے ہو وہ تو روٹھ جائیگا اس کو لاؤ مناؤ۔ بھائی اس بکھیڑے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ سیدھا نکاح ہوجانا چاہیے۔ اس کے بعد حضرت فاطمہؓ کو ام ایمنؓ کے ہمراہ حضرت علیؓ کے یہاں پہنچا دیا گیا۔ حضور ان کے یہاں رات کو تشریف لے گئے فرمایا فاطمہ پانی لاؤ۔ دیکھئے نئی دلہن ہیں وہ خود اپنے ہاتھ سے پانی لاتی ہیں اب تو نکاح سے پہلے دولہن کو مائیوں بٹھلاتے ہیں۔ اس بے چاری کو تو سرسام ہوجاتا ہے اختلاج قلب ہوجاتا ہے۔ اور اوپر سے تعلیم دیتی ہیں کھاؤ مت وہ بے چاری تو

ناتجربہ کار ہے ان کے کہنے سننے سے کھانا پینا چھوڑ دیا۔ آخر نتیجہ یہ ہوا کہ بیمار ہوگئی تو کہتے ہیں اللہ بخش آ گیا وہ کہاں آ گیا بھلا گنگوہ سے وہ یہاں آ گیا اس کو اور کوئی عورت ملی نہیں یہی ملی یہی پسند آ گئی۔ اب نہ دوا نہ دارو کیونکہ اللہ بخش کی دوا کیا ہو غریب ایک جیل خانہ سے چھوٹی تھی اب دوسرا جیل خانہ موجود ہے جیسے قیدیوں کو آگرہ سے جھانسی بدل دیتے ہیں۔ غرض مائیوں بٹھلانے میں دلہن کو تعلیم ہوتی ہے کہ کھجلی اٹھے تو کھجلانا نہیں پیشاب پاخانہ نہ کرنا اگر وہ پیشاب کرنا چاہے تو کہتی ہیں یہ کیسی بے حیا ہے کہ لوٹا لے کر چل پڑی۔

نانوتہ کا قصہ ہے کہ کسی نئی دولہن نے نائن سے کہا۔ پانی لا کر نماز پڑھوا دے مگر وہ بیٹھی رہی آخر وہ خود لوٹا لے کر پیشاب سے فارغ ہوئی پھر وضو کر کے نماز پڑھی پھر دوپٹہ اوڑھ کر بہو بن کر بیٹھ گئی عورتوں نے بہت بک بک کی کہ جب ایک دفعہ شرم اتار دی پھر شرم کی صورت بنانے سے کیا فائدہ مولنا مملوک علیؒ صاحب کو خبر ہوئی دروازہ پر تشریف لائے اور بہت شاباشی دی کہ نیک دلہن کو ایسا ہی ہونا چاہیے پھر دلہن کا منہ پر ہاتھ رکھواتی ہیں اور غریب کو دنیا اور دین کے سب کاموں سے معطل کر دیتی ہیں پھر اس میں شرط یہ ہے کہ کس سے مس نہ ہو ایک ہی نشست پر بیٹھی رہے۔ پھر ایک امتحان یہ کرتی ہیں کہ اس کی گدگدی اٹھاتی ہیں اگر بہو کو ہنسی آ گئی تو بے شرم ہے یہ کیسی خرافات ہے **لاحول ولا قوة الا باللہ** بھلا یہ رسوم حضور کے یہاں بھی ہوئی ہیں ہرگز نہیں حضرت فاطمہؓ تو اسی رات اپنے ہاتھ سے پانی بھر کر پیالہ میں لائی تھیں۔

ایک رسم یہ ہے کہ بہو ڈولہ سے خود نہیں اترتی بلکہ دوسرے اتارتے ہیں ہٹی کٹی موٹی ہتھنی سی لیکن گود میں چڑھی پھرتی ہے۔ کبھی گرتی بھی ہے چوٹ بھی کھاتی ہے۔ بعض جگہ دولہا بی بی کو اتارتا ہے **لاحول ولا قوة** ان لوگوں کو شرم بھی نہیں آتی۔ کیا یہ سب خرافات حضرت فاطمہؓ کے نکاح میں ہوا ہرگز نہیں غرض شادی ایسی کرو جیسی حضور نے کی غمی بھی ایسی ہی کرو جیسی آپ نے کی

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنہ کے یہی معنی ہیں اب دینے لینے کی رسم کا بیان رہ گیا اس میں بھی شریعت کی پابندی کرو۔ ایک بری لائی جاتی ہے۔ بھائی یہ بری کیسی ہے یہ ہنود کی رسم ہے بر کہتے ہیں خداوند کو اور یائے نسبتی ہے یعنی خاوند کے گھر کی چیز۔ یہ لفظ بتلا رہا ہے کہ کفار کی رسم ہے مسلمانوں کی رسم نہیں۔ مسلمانوں نے خدا کے احکام کو چھوڑ کر کفار کے رسوم کو لے لیا ہے حالانکہ مسلمانوں کی حالت یہ ہونی چاہیے تھی۔

ترکت اللات والعزیٰ جمیعاً
کذلک یفعل الرجل البصیر

میں نے لات اور عزی سب کو چھوڑ دیا اور ایسا ہی صاحب بصیرت شخص کرتے ہیں خدا کے احکام کو مضبوط پکڑ و اس میں دین کا بھی بھلا ہے اور دنیا کا بھی نفع ہے اب معلوم کراتا ہوں کہ یہاں جو نکاح ہوگا اس میں بہت سادگی ہوگی اگر اسی کا اتباع کر لو تو غنیمت ہے کوئی گری پڑی جگہ بھی نہیں ماشاءاللہ دونوں طرف مالدار ہیں اگر چاہیں تو بہت کچھ خرچ کر سکتے ہیں غریبوں کو اب یہ عذر بھی نہ رہا کہ شریعت پر عمل کرنے سے لوگوں میں سبکی ہوتی ہے اب تو سبکی بھی نہیں ہے کہ مالدار شریعت کے موافق شادی کر رہے ہیں۔ اس کو غنیمت سمجھو۔ بس اب ختم کرتا ہوں دعا کیجئے اللہ تعالیٰ ہمیں اسلام کے احکام پر عمل کرنے کی توفیق دیں اور ہمارے تمام دنیوی معاملات کو احکام کے موافق کر دیں آمین

واخرد عوانا ان الحمد لله رب العلمین

اشرف علی

۱۵۔ محرم ۵۶ھ

محاسن الاسلام

۲۸؍شوال المکرم ۱۳۴۱ھ بروز جمعرات۔ درگاہ حضرت شاہ جلال الدین کبیر الاولیاء مخدوم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ پانی پت میں یہ وعظ ارشاد فرمایا۔ سامعین کی تعداد تقریباً ۵۰۰ تھی۔ مولوی اطہر علی صاحب سلہٹیؒ نے ضبط کیا۔ اور ان کے مبیضہ سے مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے صاف فرمایا۔

سکون و وقار سے کام کرو۔ جہاں مباحثہ کی دوسری بھی طرف سے تحریک ہو۔ وہاں کرو۔ خود چھیڑ نہ اٹھاؤ۔ بلکہ صاف کہدو کہ ہم اپنا کام کریں۔ تم اپنا کام کرو۔ جس کا مذہب حق ہوگا۔ اس کی حقانیت خود واضح ہوجائیگی۔

واللہ! اسلام کی تعلیم وہ ہے کہ اس کی سادہ تعلیم کے مقابلہ میں کوئی تعلیم ٹھہر نہیں سکتی۔ اسلام کی دلربائی کی یہ شان ہے۔

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الحمدللہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونومن بہ ونتوکل علیہ و نعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ' ومن یضللہ فلا ھادی لہ' ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ' ونشھد ان سیدنا ومولٰنا محمداً عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہ وبارک وسلم.

اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطن الرجیم. بسم اللہ الرحمن الرحیم. قال اللہ تبارک وتعالیٰ ان الدین عند اللہ الاسلام. (ال عمران ۱۹)

ترجمہ: بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک دین (حق اور مقبول) صرف اسلام ہے۔

منشی عزیز الرحمن صاحب نے بعد وعظ کے اعلان کیا کہ جو لوگ دیہات سے آئے ہیں وہ کھانا کھا کر جائیں چنانچہ بہت سے ملکانے راجپوت بھی ٹھہر گئے اور اس وعظ کی برکت یہ ہوئی کہ ان لوگوں نے ساری عمر گائے کا گوشت نہ کھایا تھا مگر اس دن بہت شوق سے کھا گئے اور آپس میں وہ یہ باتیں کرتے تھے کہ دیکھا بھی ہمارا ہی مذہب سچا ہے بھلا آریوں میں بھی کوئی ایسا ہے جو اس طرح چار گھنٹے تک کھڑا ہو کر بیان کرتا رہے پھر ان کی سب باتیں سمجھ میں آتی ہیں دل کو بھی لگتی ہیں اور آریوں کی باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔ نہ معلوم کیا کہا کرتے ہیں بس جی ہم تو مسلمان ہی رہیں گے ہم شدھی نہ ہوں گے (معلوم ہوا کہ اس وقت بعض گاؤں شدھی ہونے والے تھے مگر وعظ کی خبر سن کر انہوں نے اس ارادہ کو ملتوی کر دیا کہ پہلے وعظ سن لیں دیکھیں مسلمان عالم کیا کہتا ہے وعظ سن کر اسلام پر جم گئے **ثبتھم اللہ وایانا علی دینہ القویم واماتنا وایاھم علیہ وحشرنا مع نبیہ الکریم.**

فضیلت اسلام اور تقسیم فضیلت

یہ ایک لمبی آیت میں سے چھوٹا سا ٹکڑا ہے اس کے متعلق اس وقت مجھے کچھ بیان کرنا ہے جس کا خلاصہ اسلام کی فضیلت ہے چنانچہ آیت ہی کو سن کر اکثر حضرات نے عموماً اور بعض حضرات نے خصوصاً اس مقصود کو سمجھ لیا ہوگا۔ ہر چند کہ اسلام کی فضیلت کا ہر مسلمان کو اعتقاد ہے مگر جو درجہ اس ک

فضیلت کا ہے اس درجہ کا استحضار بہت کم لوگوں کو ہے چنانچہ عنقریب واضح ہو جائیگا۔ پس یہ اشکال مندفع ہوگیا کہ یہ مضمون تو ہر شخص کو معلوم ہے پھر اس کے بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ وجہ اندفاع یہ ہے کہ جس درجہ کا علم ہونا چاہیے اس درجہ کا علم حاصل نہیں ہے اس لئے اس پر تنبیہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اسلام کی فضیلت اس درجہ کی ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی بھی فضیلت نہیں۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ فضیلت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ فضیلت ہے کہ اگر وہ حاصل نہ ہو تو ضرر کچھ نہیں یہ درجہ فضیلت استحباب کا ہے۔ ایک درجہ فضیلت کا وہ ہے کہ اگر اس کو حاصل نہ کیا جائے تو ضرر ہوتا ہے اس کا حاصل کرنا ضروری اور ترک کرنا ناجائز ہے۔ یہ فضیلت فرض کہلاتی ہے اور ایک درجہ اس سے بھی بڑھ کر ہے وہ یہ کہ تمام فرائض کی تحصیل کسی خاص فضیلت کی تحصیل پر موقوف ہو کہ بدون اس کے کوئی فرض ادا نہیں ہوسکتا۔ سب کی صحت اس پر موقوف ہے یہ درجہ بھی گو فضیلت فرض ہی کا ایک فرد ہے لیکن تمام افراد میں سب سے اعلیٰ ہے۔ یہ درجہ اسلام وایمان کو حاصل ہے کہ اس کا حاصل کرنا خود بھی فرض ہے اور تمام فرائض کا موقوف علیہ بھی ہے۔ اب سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ اسلام کی فضیلت کا کتنا بڑا درجہ ہے۔ آج کل عام طور پر مستحبات میں فرض سے زیادہ فضیلت سمجھتے ہیں۔ چنانچہ نوافل ومستحبات کا جو پابند ہو، اس کی بہت تعریف کی جاتی ہے، گو وہ فرائض کو اچھی طرح بھی نہ ادا کرتا ہو اور جو شخص محض فرائض وواجبات پر اکتفا کرتا ہو مگر ان کو اچھی طرح ادا کرتا ہو، اس کی زیادہ قدر نہیں کی جاتی نہ بہت تعریف ہوتی ہے۔ یوں سمجھتے ہیں کہ اونہہ یہ کرتا ہی کیا ہے۔ مگر حقیقت اس کے خلاف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فرض کی فضیلت مستحبات ونوافل سے بڑھی ہوئی ہے اور ثواب بھی اسی میں زیادہ ہے۔ اس سے بڑھ کر اس کی کیا فضیلت ہوگی کہ وہ ضروری ہے اور مستحب ضروری نہیں۔ تو فرض کا وہ درجہ ہے جو غذا کا درجہ ہوتا ہے اور نوافل ومستحبات کا درجہ چٹنی کے مثل ہے اور ظاہر ہے کہ غذا کو چٹنی سے زیادہ فضیلت ہے۔ محض چٹنی بدوں غذا کے بے سود ہے، اور غذا بدوں اس کے بے سود نہیں اس مسئلہ کو حدیث میں بھی صاف بیان کیا گیا ہے، (اشارة الی حدیث اخرجه البحاری عن ابی هریرة قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم ان الله تعالیٰ قال من عادی لی ولیا فقد اذنته بالحرب (السنن الکبریٰ للبیہقی ۳۳۶.۳، الصحیح للبخاری) وما تقرب الی عبدی بشئی احب الی مما افترضت علیه وما یزال عبدی یتقرب الی بالنوافل حتی اجبته الحدیث كذا فی المشكوة (ص ۱۲۵ ج ۱) مطبوعة المطبعة النظامية الدهلوية ۱۲ جامع) فقہاء

نے بھی اس کو طے کر دیا ہے اور صوفیہ نے بھی تصریح کی ہے کہ بہ نسبت نوافل کے فرائض سے قرب زیادہ ہوتا ہے اس سے ہماری غلطی معلوم ہوگئی کہ آج کل ان لوگوں کی زیادہ قدر ہے جو مستحبات میں مشغول ہوں، گو فرائض میں کوتاہی کرتے ہوں اور تعجب یہ ہے کہ فرض ادا کرنے والا بھی اپنے کو کچھ نہیں سمجھتا، یہ خیال کرتا ہے کہ میں کرتا ہی کیا ہوں صرف فرائض ادا کرتا ہوں اس میں در پردہ فرائض کا استخفاف ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس نعمت پر شکر ادا کرنیکی توفیق کم ہوتی ہے اور جو مستحب میں مشغول ہو گو فرائض ولایتی طریقہ سے ادا کرتا ہو۔ لوگ بھی اس کے معتقد ہیں۔ اور وہ خود بھی اپنا معتقد ہوتا ہے، سمجھتا ہے کہ میں رات کو جاگتا ہوں گو فرائض میں بھاگتا ہی ہو، بھاگنا یہ کہ صرف اٹھک بیٹھک کرتا ہے ارکان کو تعدیل سے ادا نہیں کرتا۔ اسی غلطی کا اثر یہ ہے کہ لوگوں کو نعمت اسلام کی قدر زیادہ نہیں اگر کوئی شخص دولت اسلام سے مشرف ہو اور دیگر فرائض وواجبات میں کوتاہی کرتا ہو تو وہ سمجھتا ہے کہ میرے پاس کیا ہے کچھ نہیں۔ حالانکہ اس کے پاس ایک بہت بڑی دولت ہے۔ یعنی اسلام، گو دوسرے فرائض میں کوتاہی کرنے سے اس کو گناہ ہو لیکن پھر بھی اس کے پاس ایک ایسی دولت ہے، کہ اگر اس کو صحیح سلامت اپنے ساتھ لے گیا تو انشاء اللہ نجات ہو جائے گی۔

تفسیر آیت کریمہ:

اسی مضمون کو اس آیت میں بیان فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ہے **ان الدین عند اللہ الاسلام** کہ دین خدا تعالیٰ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔ اہل علم اس کو سمجھتے ہیں کہ یہ ترکیب مفید حصر ہے جس سے گونہ قوت پیدا ہوگئی مضمون میں۔ اسی سے اسلام کی فضیلت ظاہر ہے کہ وہ ایسا دین ہے کہ خدا کے نزدیک وہی مقبول ہے۔ یہاں یہ شبہ ظاہر میں ہوسکتا ہے کہ ادیان تو بہت ہیں۔ پھر اس کا کیا مطلب کہ خدا کے نزدیک دین صرف اسلام ہی ہے، یوں فرمانا چاہیے تھا کہ دین حق صرف اسلام ہی ہے۔ مطلق دین کو اس میں منحصر کرنا کیسا؟ میں کہتا ہوں کہ حصر کے علاوہ یہ دوسرا مبالغہ ہے کیونکہ قاعدہ ہے۔ **المطلق اذا اطلق یراد بہ الفرد الکامل** کہ مطلق سے فرد کامل مراد ہوا کرتا ہے۔ بس ہر چند کہ مطلب تو یہ ہے کہ دین کامل اسلام ہی ہے اور یہ حصر بلا کلام صحیح ہے کیونکہ دوسرے بعض ادیان تو اصل ہی سے حق نہیں اور یا منسوخ ہیں مگر مطلق کو منحصر کرنے میں ایک قسم کا دعویٰ ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ اسلام ایسا کامل دین ہے جس کے سامنے اور مذاہب اس قابل نہیں ہیں کہ ان کو دین کہا جائے چنانچہ محاورات میں بولا جاتا ہے کہ بس حسین تو فلاں شخص ہے جس میں دعویٰ ہے کہ اس کا حسن ایسا کامل

ہے کہ دوسرے حسین اس قابل نہیں ہیں کہ ان کو اس کے سامنے حسین کہا جائے اس ادعا کی وجہ سے مطلق کا حصر کر دیا جاتا ہے یہی صورت اس جگہ ہے۔ پس حاصل یہ ہوا کہ گو ادیان اور بھی ہیں مگر اسلام ایسا کامل و مکمل دین ہے کہ اس کے سامنے دوسرے ادیان دین کہلانے کے مستحق نہیں ہیں یہ فضیلت تو اس آیت میں مذکور ہے اور دوسری جگہ ارشاد ہے **ومن يبتغ غير الاسلام ديناً فلن يقبل منه۔** جو شخص اسلام کے سوا کسی دین کو طلب کرے گا وہ ہرگز قبول نہ ہوگا۔ یہاں حقیقت کے موافق کلام فرمایا گیا ہے کہ دوسرے مذاہب کو بھی دین کہہ دیا گیا، مگر اسلام کے مقابلہ میں ان کو غیر مقبول قرار دیا گیا۔ یعنی اسلام کے بغیر کسی دین کے اختیار کرنے سے نجات حاصل نہیں ہو سکتی۔

خلاصہ: یہ کہ فضیلت کے اولاً دو درجے تھے ایک فرض کا ایک استحباب کا، پھر فرض میں بھی دو درجے ہیں۔ ایک وہ جو مطلق نجات کا مدار ہو دوسرے وہ جو نجات کامل کا مدار ہو اور ظاہر ہے کہ درجہ اول درجہ ثانی سے بڑھا ہوا ہے۔ کیونکہ ایک کام تو وہ ہے جس کے بغیر نجات تو ہو سکتی ہے مگر کامل نجات نہ ہوگی۔ مثلاً فوراً دخول جنت نہ ہوگا، کچھ دنوں کے بعد ہوگا اور ایک کام وہ ہے جس کے بغیر نجات ہو ہی نہیں سکتی، نہ کامل نہ ناقص۔ اسلام اسی درجہ کا فرض ہے کہ اس کے بغیر نجات کس طرح ہو ہی نہیں سکتی۔ اب یہ بات واضح ہو گئی کہ اسلام سے بڑھ کر کسی چیز کی فضیلت نہیں یہ تمام اعمال و فرائض میں سب سے بڑی نعمت ہے۔ مستحبات و سنن کے ترک سے تو عتاب ہوتا ہے مگر عتاب کا نہ ہونا بھی ممکن ہے اور فرائض و واجبات کے ترک سے عذاب ہوگا، اور ممکن ہے کہ بدوں عذاب ہی کے مغفرت ہو جاوے۔

مغفرت کبائر بلا عذاب:

اور ایسا ہوگا بھی یعنی یہ محض امکان عقلی ہی نہیں بلکہ اس کا وقوع بھی ہوگا۔ بعض گنہگار بدوں عذاب ہی کے بخش دیئے جائیں گے معتزلہ کے سوا کسی کا اس میں اختلاف نہیں ہے ان کے نزدیک گنہگار کو عذاب ہونا لازم ہے۔ تماشہ ہے نہ معلوم ان لوگوں کی عقل کہاں گئی؟ وہ خدا کے ذمہ عقاب و ثواب کو واجب کہتے ہیں۔ گویا خداتعالیٰ کو نعوذ باللہ قانون کا تابع کرتے ہیں۔ حالانکہ نہیں ہوتا بلکہ خود قانون اس کے تابع ہوا کرتا ہے۔ اگر ان کے نزدیک عذاب و ثواب کا وجوب عقلی ہے، اس سے واجب کا مضطر ہونا لازم آتا ہے اور اضطرار امارت حدوث سے ہے اور واجب اضطرار سے منزہ ہوتا ہے، اگر یہ وجوب شرعی ہے تو اس کیلئے دلیل شرعی کی ضرورت ہے، اگر وہ دلیل میں آیات وعید پیش کریں تو ہم آیات عفو و مغفرت و شفاعت کو پیش کریں گے جن سے معلوم ہوتا

ہے کہ حق تعالیٰ بہت سے گناہوں کو بدون عذاب کے بھی معاف کر دیتے ہیں چنانچہ ارشاد ہے **ان اللہ لا یغفران یشرک بہ ویغفر ماد ون ذالک لمن یشاء** (بیشک اللہ تعالیٰ نہیں بخشیں گے جو شرک میں مبتلا ہو اور اسکے علاوہ جسے چاہیں گے بخش دیں گے) باقی جن آیات میں افعال کبیرہ کا عقاب مذکور ہے وہاں استحقاق مراد ہے، لزوم وقوع مراد نہیں، یعنی کبائر سے وہ شخص عذاب کا مستحق ہو جاتا ہے، وقوع عقاب لازم نہیں۔ ممکن ہے حق تعالیٰ ویسے ہی بخش دیں باقی وقوع کے متعلق آیت **ان اللہ لا یغفر ک یشرک** (بیشک اللہ تعالیٰ شرک کو نہیں بخشتے) الخ سے صاف معلوم ہو گیا کہ سب گناہوں پر عذاب لازم نہیں بجز شرک و کفر کے کہ ان پر عذاب لازم ہے (یعنی شرعاً، غرض گناہ کبیرہ تو بدون عقاب کے معاف ہو سکتا ہے مگر کفر و شرک کا ارتکاب بدون عذاب کے نہیں رہ سکتا اس پر عذاب لازم ہے اور وہ بھی ابدالآباد کے لئے جس کا انقطاع کبھی نہ ہو گا یہ جرم کسی طرح معاف نہ ہو گا نہ عذاب سے نہ بغیر عذاب کے۔

مغفرت کبائر بلا عذاب پر شبہ کا جواب نمبر 1:

آج کل بعض لوگوں نے اسلام پر اعتراضوں کی فہرست میں ایک یہ اعتراض بھی داخل کیا ہے کہ مسلمانوں کے نزدیک کبائر بھی بدون عقاب کے معاف ہو سکتے ہیں تو اس اعتقاد کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو کبائر پر اقدام زیادہ ہے وہ بڑے سے بڑا جرم کر کے بھی نجات کے امیدوار رہتے ہیں۔ میں اس اعتراض کا جواب دینا چاہتا ہوں اس کا جواب یہ ہے کہ اقدام جرائم اگر اس عقیدہ اسلام کا ثمرہ ہوتا تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ جن لوگوں کو اسلام سے جتنا زیادہ تعلق ہے مثلاً علماء واتقیاء وصوفیاء ان میں یہ ثمرہ زیادہ ظاہر ہوتا۔ کیونکہ قاعدہ ہے کہ مذہب کے ثمرات کا ظہور ان ہی لوگوں میں زیادہ ہوتا ہے جن کو مذہب سے تعلق زیادہ ہے۔ حالانکہ ہم دیکھتے ہیں اور کفار بھی اس کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ جن لوگوں کو اسلام سے تعلق زیادہ ہے وہ جرائم کا ارتکاب تو کیا کرتے وہ تو شبہات سے بھی احتراز کرتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے ایک دوست کا، جو کہ بی اے ہیں، واقعہ ہے کہ وہ ایک بار ریل کا سفر کر رہے تھے، ان کے پاس اسباب پندرہ سیر سے زیادہ تھا، اسٹیشن پر تنگی وقت کی وجہ سے وہ اس کو وزن نہ کرا سکے۔ اس وقت تو جلدی میں سوار ہو گئے لیکن جب منزل مقصود پر اترے تو وہاں کے بابو سے جا کر اپنا واقعہ بیان کیا کہ میں جلدی میں اسباب کو وزن نہ کرا سکا۔ اب آپ اس کو وزن کر لیں اور جو محصول میرے ذمہ ہو اس کو وصول کر لیجئے۔ بابو نے انکار کیا کہ مجھ کو فرصت نہیں تم ویسے ہی لے جاؤ ہم تم سے محصول نہیں لیتے۔ انہوں نے کہا کہ صاحب آپ کو

اس معافی کا کوئی حق نہیں۔ کیونکہ آپ ریلوے کے مالک نہیں بلکہ ملازم ہیں آپ کو محصول مجھ سے لینا چاہیے مگر اس نے پھر بھی انکار کیا تو یہ اسٹیشن ماسٹر کے پاس گئے۔ اس نے بھی کہا کہ آپ بلا تکلف سامان لے جائیں ہم آپ سے محصول نہیں لیتے۔ انہوں نے اس سے بھی کہا کہ آپ کو معافی کا کوئی حق نہیں۔ اس کے بعد اسٹیشن ماسٹر اور اس بابو میں انگریزی میں گفتگو ہونے لگی۔ وہ یہ سمجھے کہ یہ مسافر انگریزی نہیں سمجھتا ہوگا (کیونکہ ان کی صورت ملانوں کی سی تھی)۔

غرض ان دونوں کی اس گفتگو میں یہ رائے قرار دی کہ یہ شخص شراب پئے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ باوجود ہمارے انکار کے یہ محصول دینے پر اصرار کرتا ہے۔

انہوں نے جواب دیا کہ صاحب! میں نے شراب نہیں پی بلکہ ہمارا مذہبی حکم ہے کہ کسی کا حق اپنے ذمہ نہ رکھو۔

اس پر وہ دونوں بولے کہ صاحب! ہم تو اس وقت اسباب وزن نہیں کر سکتے آخر یہ اسباب اٹھا کر پلیٹ فارم سے باہر لائے، اور سوچنے لگے کہ یا اللہ! اب میں ریلوے کے اس حق سے کس طرح سبکدوشی حاصل کروں۔ آخر خدا نے امداد کی، اور یہ بات دل میں ڈالی کہ جتنا اسباب زیادہ ہے اس کے محصول کے برابر ایک ٹکٹ اسی ریلوے کے کسی اسٹیشن کا لیکر چاک کر دیا جاوے۔ اس طرح ریلوے کا حق اس کو پہنچ جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا۔

میرے ایک دوست کا جو کہ ڈپٹی کلکٹر بھی تھے۔ واقعہ ہے کہ ان کا ایک بچہ ریل کے سفر میں ان کے ہمراہ تھا، جس کا قد بہت کم تھا کہ دیکھنے میں دس سال کا معلوم ہوتا تھا۔ مگر اس کی عمر تقریباً تیرہ سال کی تھی اور ریلوے کے قاعدہ سے اس عمر کے بچے کا ٹکٹ پورا لینا ضروری ہے انہوں نے اس کا ٹکٹ لینا چاہا تو ساتھیوں نے بہت منع کیا کہ اس کو تیرہ سال کا کون کہہ سکتا ہے آپ آدھا ٹکٹ لے لیجئے۔ کوئی کچھ نہ کہے گا انہوں نے کہا کہ بندے کچھ نہ کہیں گے تو کیا حق تعالیٰ بھی باز پرس نہ فرمائیں گے کہ تم نے دوسرے کی چیز میں تھوڑی اجرت پر بدوں اس کی اجازت کے کیوں تصرف کیا۔ غرض انہوں نے پورا ٹکٹ لیا اور ان کے ساتھی ان کو بیوقوف بناتے رہے مگر

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نشد　　　جو دیوانہ نہیں ہوا وہی دیوانہ ہے

بھلا اس کی نظیر کوئی قوم بھی دکھلا سکتی ہے کہ ایک شخص کو ریل بابو اور اسٹیشن ماسٹر خود کہہ دے کہ تم بلا تکلف اسباب لیجاؤ۔ ہم محصول نہیں لیتے اور پھر بھی وہ ان پر اصرار کرے کہ نہیں تم کو محصول لینا پڑے گا۔ تم کو معافی کا کوئی حق نہیں اور جب وہ کسی طرح وصول نہیں کرتے تو یہ محض خدا کے خوف سے ریلوے کا

ٹکٹ مقدار محصول کے برابر خرید کر چاک کرتا ہے۔ اور یہ صورت شبہات سے احتراز کرنے کی عام لوگوں کی نظروں میں ہے ورنہ حقیقت میں یہ شبہات کی قسم سے نہیں بلکہ صریح واجب کا امتثال ہے، پس اگر اس عقیدہ کا اثر اقدام علی الجرائم ہوتا تو علماء وصلحاء سب سے زیادہ بے باک اور جرائم پر اقدام کرنے والے ہوتے، حالانکہ مسلمانوں میں یہ طبقہ جو اسلام کے حقیقی مرتبہ کو پہچانتا ہے۔ سب سے زیادہ جرائم سے بچنے والا اور شبہات سے احتراز کرنے والا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ اس عقیدہ کا یہ اثر نہیں ہے جو ان معترضوں نے سمجھا ہے بلکہ اس کا اثر جرائم سے رکنا اور گناہوں سے نفرت پیدا ہونا ہے جس کی وجہ میں عنقریب بتلاؤں گا کہ اس عقیدہ کا اثر گناہوں سے نفرت پیدا ہونا کس طرح ہے مگر افسوس۔

چشم بد اندیش کہ برکندہ باد عیب نماید ہنرش درنظر

بُرا سوچنے والے کی خدا کرے آنکھ پھوٹ جائے کہ اس کو ہنر بھی عیب نظر آتا ہے

ایسا پاکیزہ مسئلہ جو جرائم کی جڑ کاٹنے والا ہے بد اندیش کو اقدام جرائم کا سبب معلوم ہوتا ہے۔ یہ جواب تو مشاہدہ کے متعلق ہے کہ حساً و مشاہدۃً اس عقیدہ کا یہ اثر جو تم بتلا رہے ہو غلط ثابت ہو رہا ہے۔

جواب نمبر 2:

اور جواب عقلی اس کا یہ ہے کہ یہ عقیدہ عقلاً اقدام جرائم کا سبب نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کا حاصل صرف یہ ہے کہ حق تعالیٰ جس کو چاہیں گے باوجود کبائر کے عذاب سے معاف کر دیں گے جس میں تعیین کسی کی نہیں ہے، یعنی کسی شخص کو معلوم نہیں کہ میرے متعلق مشیت الٰہی بصورت عفو ہے یا بصورت عذاب (نظرواً الی اصل الاستحقاق قانونا ۱۲ جامع) پھر اس صورت میں کوئی شخص بھی عذاب سے بے فکر نہیں ہو سکتا بلکہ ہر ایک کو یہ اندیشہ لگا ہوا ہے کہ شاید میرے ساتھ قانونی برتاؤ کیا جاوے۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک عنین شخص شرم وندامت کی وجہ سے خودکشی پر آمادہ ہو کر سنکھیا استعمال کرے اور اتفاقاً وہ سنکھیا کھا کر ہلاک نہ ہو بلکہ سنکھیا ہضم ہو کر اس کے اندر قوت مردی پیدا کر دے چنانچہ بعض جگہ ایسے واقعات ہوئے ہیں مگر کیا اس اتفاقی واقعہ سے کسی کو سنکھیا کھانے پر جرات ہو سکتی ہے، ہرگز نہیں بلکہ ہر عاقل سمجھتا ہے کہ زہر کا خاصہ تو ہلاک کرنا تھا مگر اتفاقاً اس شخص میں اس کی خاصیت کا ظہور نہ ہوا تو اس سے خاصیت نہیں بدل گئی اس لئے مردانگی بڑھانے کیلئے سنکھیا کھانے کی نہ کوئی اجازت دے سکتا ہے ورنہ ہر شخص اس پر جرات کر سکتا ہے۔ علی ہذا سب لوگوں کو معلوم ہے کہ بعض دفعہ حکام وسلاطین مراحم خسروانہ سے کسی قاتل کو رہا بھی کر دیتے ہیں مگر اس علم کی وجہ سے ہر شخص کو قتل پر جرات نہیں ہوتی کیونکہ وہ

جانتے ہیں کہ قتل کی اصل سزا تو قتل ہی ہے اور عمل بھی اکثر اسی قانون کے مطابق ہوتا ہے اور مراحم خسروانہ کوئی قانون نہیں بلکہ محض حاکم کی مشیت پر ہے۔ کچھ معلوم نہیں کہ وہ کس کے ساتھ مراحم خسروانہ کا برتاؤ کرے کس کے ساتھ نہ کرے۔ لہٰذا مراحم خسروانہ کے بھروسہ پر اقدام جرائم کی جرات نہیں ہوسکتی بعینہٖ اسی طرح کبائر کا بدون عذاب کے معاف ہو جانا بطور مراحم خسروانہ کے ہے۔ پس اس مسئلہ کو اقدام جرائم کا سبب کیونکر سمجھ لیا گیا؟ بھلا اگر کوئی شخص جنگل میں پاخانہ کرنے جائے اور استنجے کیلئے ڈھیلا توڑتے ہوئے اس کو زمین میں سے سونے کا گھڑا مل جاوے تو کیا اس اتفاقی بات پر بھروسہ کر کے کوئی شخص بھی تجارت وزراعت کے مستغنی ہو کر بیٹھ سکتا ہے کہ مجھ کو بھی اسی طرح پاخانہ کرتے ہوئے سونے کا گھڑا مل جاوے گا۔ ہرگز نہیں۔ اسی طرح اتفاقاً کسی مرتکب کبائر کا بدون عذاب کے بخش دیا جانا اتفاقی ہے۔ اس لئے یہ اقدام کا سبب ہرگز نہیں ہوسکتا مگر پھر بھی جو لوگ جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں وہ اپنی طبیعت کے خبث سے ایسا کرتے ہیں اس عقیدہ کو اس میں کیا دخل ہے؟

جواب نمبر 3:

پھر یہ جو بعض گنہگاروں کی مغفرت بدوں عقاب کے ہو جاتی ہے اس کی وجہ بھی معلوم ہے کہ یہ مغفرت کیونکر ہوگی یہ بھی کسی عمل صالح ہی کی وجہ سے ہوگی۔ ابوداؤد کی ایک حدیث سے ابھی یہ مسئلہ معلوم ہوا ہے وہ حدیث یہ ہے کہ ایک شخص نے کسی مقدمہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جھوٹی قسم کھائی اور اس طرح کہا **اشهد بالله الذی لا اله الا هو مافعلت ذالک** قسم اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں کہ میں نے ایسا نہیں کیا **فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم بلی قد فعلت ولکن غفرالله لک باخلاص قول لا اله الا هو** حضور نے فرمایا کہ تو نے یہ کام ضرور کیا ہے (اور تیری قسم جھوٹی ہے جس کا بہت بڑا گناہ ہوتا) لیکن حق تعالیٰ نے تجھے اس اخلاص کی برکت سے بخش دیا جو **لا اله الا هو** کہتے ہوئے تجھ سے صادر ہوا۔ نہ معلوم اس وقت کس دل سے اس نے خدا کا نام لیا تھا جو اس درجہ مقبول ہو گیا (یعنی اس نے خدا کا نام اس وقت کامل اخلاص سے لیا تھا اس کی برکت سے حلف کاذب کا گناہ معاف ہو گیا) اس کا یہ مطلب نہیں کہ حضور نے ڈگری اسی کی کردی بلکہ محض اس گناہ کی مغفرت کا بیان فرمانا مقصود ہے۔ کیونکہ جب وحی سے اس کا کاذب فی الحلف ہونا معلوم ہو گیا تو اب ڈگری اس کے حق میں کیونکر ہوسکتی تھی؟ تو دیکھیے گناہ کتنا سنگین تھا کہ جھوٹی قسم کھائی اور وہ بھی حضور کے سامنے کہ حضور کے سامنے جھوٹی قسم کھانا ایسا

ہے جیسا خدا کے سامنے اور ظاہر ہے کہ محل وزمان کی عظمت سے بھی فعل میں عظمت پیدا ہو جاتی ہے۔ زنا کرنا گناہ ہے مگر مسجد میں زنا کرنا اور بھی اشد ہے اور اگر کوئی نامعقول کعبہ میں ایسا فعل کرے تو بہت ہی سخت ہے، اسی طرح جھوٹی قسم کھانا گناہ ہے مگر حضور کے سامنے اس کا گناہ اور بڑھ جاتا ہے۔ کیونکہ آپ نائب خدا ہیں آپ کے سامنے جھوٹی قسم ایسی ہے، جیسے خدا کے سامنے ہو۔

شاید کوئی یہ کہے کہ ہم تو اس وقت بھی جو کچھ کرتے ہیں سب خدا ہی کے سامنے ہے اور جس جگہ جو کام ہوگا وہ خدا کے سامنے ہوگا تو چاہیے کہ ہر جگہ وہی گناہ ہو جو حضور کے سامنے جھوٹی قسم سے ہوتا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ اس وقت تم خدا کے سامنے ہو مگر خدا تمہارے سامنے نہیں اور میرا مطلب یہ ہے کہ حضور کے سامنے قسم کھانا ایسا ہے جیسا خدا تعالیٰ کو سامنے سمجھ کر قسم کھانا۔

خلاصہ یہ کہ قرب کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قرب حسی یہ تو جہاں ہوتا ہے طرفین سے ہوتا ہے اور ایک قرب علمی یہ ایک طرف سے بھی ہو سکتا ہے پس اس وقت جو تم خدا کے سامنے ہو یہ قرب علمی ہے کہ خدا تعالیٰ سے تمہارا کوئی حال مخفی نہیں وہ سب کچھ جانتے ہیں مگر اس حالت میں تم کو قرب حاصل نہیں، ورنہ ہر شخص کا مقرب ہونا لازم آئے گا اور قیامت میں جو تم خدا کے سامنے ہو گے وہ قرب جانبین سے ہوگا کہ تم بھی خدا تعالیٰ کے سامنے ہو گے اور خدا تعالیٰ بھی تمہارے سامنے ہوں گے **نحن اقرب الیہ من حبل الورید** (ہم اس کے شہ رگ سے زیدہ قریب ہیں) میں قرب علمی مراد ہے اسی لئے یہ نہیں فرمایا کہ تم بھی ہم سے قریب ہو بلکہ صرف اپنا قرب بیان فرمایا کیونکہ یہاں تماشہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ تو ہم سے قریب ہیں مگر ہم ان سے دور ہیں۔

یار نزدیک تر زمن بمن است
ویں عجب ترکہ من ازو دورم

دولت مجھ سے بہ نسبت زیادہ میرے قریب ہے اور یہ زیادہ تعجب کی بات ہے کہ میں اس سے دور ہوں۔

تو حضور کے سامنے جھوٹی قسم ایسی ہے جیسے قیامت میں خدا کے سامنے جھوٹی قسم کھانا جب کہ تم بھی حق تعالیٰ کو اپنے سامنے سمجھو گے۔

یہاں شاید کسی مخالف کو یہ شبہ ہو کہ کیا مسلمانوں کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا تعالیٰ کے برابر ہیں تو ان کو سمجھ لینا چاہیے کہ عبادت میں مسلمانوں کے نزدیک خدا کا کوئی شریک نہیں حضور بھی اس میں شریک نہیں ہیں اسی لئے حضور کو سجدہ کرنا نہ زندگی میں جائز تھا نہ اب آپ کی قبر کو سجدہ جائز ہے مگر اطاعت میں حضور کی اطاعت خدا لی اطاعت ہے نہ اس لئے کہ آپ شریک فی

اطاعت نہیں بلکہ اس لئے کہ آپ جو کچھ فرماتے ہیں وہ سب خدا کی طرف سے پیغام ہوتا ہے۔ تو آپ کا حکم درحقیقت آپ کا حکم نہیں بلکہ پیغمبر ہونے کی وجہ سے وہ خدا ہی کا حکم ہے۔ اس لئے یہ کہا جاتا ہے کہ آپ کے احکام کی اطاعت خدا کی اطاعت ہے **من یطع الرسول فقد اطاع اللہ** (جس شخص نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی) اور **ان الذین یبایعونک انما یبایعون اللہ** (بیشک جن لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی ہے بیشک انہوں نے اللہ سے بیعت کی) اور اس کی ایسی مثال ہے جیسے بادشاہ وزیر کو حکم دیتا ہے کہ رعایا میں یہ قانون شائع کر دو پس اس وقت وزیر کی زبان سے جو قانون شائع ہو رہا ہے وہ درحقیقت بادشاہ کا حکم ہے اس لئے وزیر کی اطاعت بعینہ بادشاہ کی اطاعت ہے۔ مگر اس سے ہرگز کوئی شخص یہ نہیں سمجھتا کہ وزیر بادشاہ کے برابر ہو گیا۔ اور اگر کوئی جاہل ایسا سمجھنے لگے اور آئندہ سے بجائے بادشاہ کے تخت کو بوسہ دینے کے وزیر کی کرسی کو بوسہ دینے لگے تو یقیناً وہ معتوب ہوگا۔

اسی طرح اگر آپ کسی مقدمہ میں ایک شخص کو وکیل کر دیں تو جو کچھ وہ کہتا ہے سب آپ کی طرف منسوب ہوتا ہے کہ گویا تم خود کھڑے ہو مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وکیل تمہارے برابر ہو گیا۔ تمہاری تمام جائیداد کا مالک ہو جاوے کہ اس میں جو چاہے تصرف کر دے۔ ہرگز نہیں۔ پس مسلمان رسول کی اطاعت کو خدا کی اطاعت اسی معنی کو کہتے ہیں جیسے وزیر کی اطاعت بادشاہ کی اطاعت ہوتی ہے اور وکیل کا قول موکل کا قول ہوتا ہے۔ خوب سمجھ لو اس سے شرکت ومساوات ہرگز لازم نہیں آتی۔ افسوس یہ ہے کہ مخالفین اعتراض کرتے ہوئے مسائل اسلامیہ کی حقیقت کو ذرا نہیں سمجھتے اور اگر سمجھتے ہیں تو منشاء اعتراض کا محض حسد ہے۔ ورنہ مسائل اسلامیہ پر کوئی اعتراض بھی وارد نہیں ہو سکتا۔ غرض ابوداؤد کی حدیث سے معلوم ہوا کہ بعض دفعہ کوئی گناہ بدون عذاب کے اس لئے معاف ہو جاتا ہے کہ اس شخص کے پاس ایک عمل صالح اس درجہ کا موجود ہے جو خدا کے یہاں بہت مقبول ہو چکا ہے اس کی برکت سے دوسرے گناہ معاف ہو جاتے ہیں تو اب کوئی شخص اس مسئلہ عفو ومغفرت کے بھروسہ کیونکر بے فکر ہو سکتا ہے کیونکہ یہ بات تو کسی کو معلوم نہیں کہ میرے پاس کوئی یہ عمل بھی ہے جو خدا تعالیٰ کے یہاں بہت زیادہ مقبول ہو چکا ہے کیا کسی کو اپنا کوئی عمل ایسا یاد ہے جو نہایت اخلاص سے ہوا ہو۔ اگر کوئی کہے کہ ہاں ہم کو بعض اعمال اپنے یاد ہیں جو ہم نے نہایت اخلاص سے کئے ہیں تو سمجھ لو کہ اخلاص کلی مشکک ہے جس کے تحت میں افراد متفاوتہ ہیں تو کسی عمل میں اخلاص ہو جانے سے یہ کیونکر معلوم ہو گیا کہ یہ اخلاص اس درجہ کا ہے جس سے سب گناہ معاف

ہوجاتے ہیں بہر حال بے فکری کسی حال میں نہیں ہوسکتی گو ناامیدی بھی نہ چاہیے۔

جواب نمبر۴:

چوتھا جواب یہ ہے کہ بعض گناہوں کا بدون عقاب کے معاف ہوجانا یہ حق تعالیٰ کا عفو وکرم ہے اس کو سن کر لوگوں کو معلوم ہوگیا کہ حق تعالیٰ بڑے ہی رحیم وکریم ہیں جو اپنے بندوں پر بے حد عنایت فرماتے ہیں اور قاعدہ کے طبائع سلیمہ میں عنایت وکرم سے اطاعت وعبادت کو ترقی ہوتی ہے نہ کہ سرکشی کو۔ اگر آقا کی عنایات زیادہ ہوں تو اس کی اطاعت کا شوق بڑھتا ہے۔ وہ نوکر بڑا ہی پاجی ہے جو آقا کی بے حد عنایات کے بعد بھی سرکشی ہی کرے طبائع سیمہ تو احسان وکرم وعنایات سے بندہ بیدرم ہوجاتی ہیں اس لئے یہ عقیدہ اقدام علی الجرائم کا سبب ہرگز نہیں بلکہ جرائم وسرکشی کا جڑ کاٹنے والا ہے جن لوگوں کی طبائع سلیم ہیں وہ خدا کی ان نعمتوں اور عنایتوں کو دیکھ کر اور زیادہ عبادت کرتے ہیں چنانچہ جو لوگ اسلام سے زیادہ تعلق رکھتے ہیں ان میں یہ اثر مشاہدہ ہے۔ اب اگر اس عقیدہ سے کسی میں اقدام جرائم کا وصف پیدا ہو تو کہا جائے گا کہ یہ اس عقیدہ کا اثر نہیں بلکہ اس شخص کی کجی طبع کا اثر ہے۔ جیسے بادشاہ کا کریم ہونا طباع سلیمہ کیلئے زیادت وفاداری کا سبب ہوتا ہے۔ گو بعض نالائق بادشاہ کے کرم کی وجہ سے جرائم پر بھی دلیر ہوجاتے ہیں۔ مگر کیا اس کا سبب بادشاہ کے کرم کو کہا جاوے گا یا ان کی بدطینتی کو؟ اس کا فیصلہ عقلاء خود کر سکتے ہیں۔

بعض لوگوں کو آیت **لا تقنطوا من رحمۃ اللہ ان اللہ یغفر الذنوب جمیعا** (اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو بیشک اللہ تعالیٰ سب گناہوں کو بخش دیں گے) سے دھوکہ ہوا ہے اور وہ بے فکر ہوگئے ہیں کیونکہ وہ اس کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ حق تعالیٰ یقیناً سب گناہوں کو معاف کردیں گے کیونکہ یہاں **لمن یشاء** کی قید نہیں ہے، سو ان کو سمجھ لینا چاہیے۔ کہ اول تو یہ آیت عام نہیں ہے بلکہ اس کا نزول ان لوگوں کے بارہ میں ہوا ہے جو کفر سے اسلام کی طرف آنا چاہتے تھے مگر ان کو اسلام سے یہ خیال مانع تھا کہ ہم نے حالت کفر میں بڑے بڑے جرائم کئے ہیں ان کا کیا حشر ہوگا۔ آیا اسلام کے بعد ان پر مواخذہ ہوگا یا نہیں؟ اگر مواخذہ ہو تو پھر اسلام سے ہی کیا فائدہ؟ چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ کفار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا **لو اسلمنا فما یفعل بذنوبنا التی اسلفنا** (اوکما قال) کہ اگر ہم اسلام لے آئیں تو ہمارے پہلے گناہوں کے متعلق کیا برتاؤ ہوگا۔

اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کے بعد پہلے گناہ جو حالت کفر میں

کئے گئے ہیں۔ سب معاف ہوجاویں گے پس اس میں جو مغفرت کا وعدہ حتمی ہے وہ عام نہیں۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اور لوگوں کے گناہ بدوں عقاب کے معاف نہ ہوں گے۔ نہیں دوسروں کے بھی معاف ہوں گے جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں لیکن ان کے لئے وہی وعدہ ہے جو دوسری آیت میں مذکور ہے۔ **ویغفر مادون اذالک لمن یشاء** (اور اس کے علاوہ جسے چاہیں گے بخش دیں گے) جس میں حتمی وعدہ نہیں بلکہ مشیت کی قید سے مشروط ہے اور اس آیت میں جو بلا قید مشیت وعدہ حتمی کیا گیا ہے یہ صرف نومسلموں کے لئے ہے کہ اسلام سے ان کے پہلے گناہ ضرور معاف ہوجاویں گے۔ جیسا کہ شان نزول سے معلوم ہو رہا ہے اور شان نزول مثل تفسیر کے ہے۔

شان نزول سے نصوص عامہ کی تخصیص:

شان نزول سے نصوص عامہ کی تخصیص ہوجاتی ہے۔ بہت سے نصوص بظاہر عام ہیں لیکن شان نزول سے ان کی تقیید کی جاتی ہے جیسے **لیس من البر الصیام فی السفر** (سنن ابی داؤد) بظاہر عام ہے کہ سفر میں روزہ رکھنا اچھا نہیں حالانکہ فتویٰ یہ ہے کہ اگر سفر میں مشقت نہ ہو تو روزہ رکھنا افضل ہے اور حدیث کو مقید کیا گیا ہے حالت مشقت کے ساتھ۔ کیونکہ حضورؐ نے یہ ارشاد ایسے موقع پر فرمایا تھا جبکہ آپ کا گذر ایسے شخص پر ہوا جو سفر میں روزہ دار تھا، اور ضعف کی وجہ سے بیہوش وبدحواس ہوگیا تھا کہ لوگ اس پر سایہ کر رہے تھے تاکہ دھوپ سے دماغ پر زیادہ گرمی نہ چڑھ جاوے۔ اس واقعے میں آپ کا یہ ارشاد فرمانا اس کا قرینہ ہے کہ مراد ایسا سفر اور ایسی حالت ہے کہ اس میں روزہ رکھنا خلاف افضل ہے۔ بلکہ اگر جان کا اندیشہ ہو تو حرام ہے۔

اگر کوئی یہ کہے کہ ہم اس آیت کو شان نزول سے مقید نہیں کرتے کیونکہ اصل قاعدہ تو یہ ہے **العبرۃ لعموم اللفظ لا لخصوص المورد** اور آیت میں **یا عبادی الذین اسرفوا علی انفسھم** (اے میرے وہ بندو جنہوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے) بظاہر سب کو عام ہے خواہ نومسلم ہوں یا مسلم قدیم تو میں کہتا ہوں کہ آپ شان نزول سے مقید نہیں کرتے تو دوسری آیت سے اس کو مقید کرنا پڑے گا اور ایک آیت کو دوسری آیت سے مقید کرنا اتحاد واقعہ میں لازم ہے اور ظاہر ہے کہ آیت **ان اللہ لا یغفران یشرک بہ ویغفر مادون ذالک لمن یشاء** (بیشک اللہ تعالیٰ اسے نہیں بخشیں گے جنہوں نے شرک کیا ہو اور اس کے علاوہ جسے چاہیں گے) اور آیت **یا عبادی الذین اسرفوا علی انفسھم** (اے میرے وہ بندو جنہوں نے اپنے اوپر زیادتی کی ہے) دونوں عصاۃ کے بارہ میں وارد ہوئی ہیں اور ایک جگہ مغفرت بقید مشیت

مشروط ہے اور دوسری جگہ مطلق ہے۔ تو مطلق کو مقید پر حمل کیا جاوے گا۔

رہا یہ سوال کہ جب دونوں جگہ مشیت کی شرط ہے تو ایک آیت میں اطلاق کیوں رکھا گیا اس میں نکتہ یہ ہے کہ ایک جگہ تو قاعدہ اور قانون کا بیان کرنا مقصود ہے۔ اس لئے وہاں تو قید کو ظاہر کر دیا کہ حق تعالیٰ بدوں عقاب کے بھی اگر چاہیں گے تو معاف کر دیں گے اور دوسری جگہ مایوسین کی یاس کا زائل کرنا مقصود ہے۔ وہاں شرط مشیت کے ظاہر کرنے سے یاس کا ازالہ نہ ہوتا۔ کیونکہ مایوس آدمی کو طرح طرح کے توہمات پیدا ہوا کرتے ہیں۔ شرط مشیت کے اظہار سے اس کو اور وساوس پیدا ہوتے کہ نہ معلوم میرے متعلق مشیت ہوگی یا نہیں تو اس کی یاس زائل نہ ہوتی۔ اس لئے وہاں قید کو بیان نہیں فرمایا تا کہ آیت کو سنتے ہی اس پر رجاء کا غلبہ ہو جاوے اور یاس کا غلبہ جاتا رہے اور واقعی مایوس کا علاج یہی ہے کہ اس کو ایک دفعہ کامل اطمینان دلا دیا جاوے۔ جب وہ حالت یاس سے نکل جائے پھر اس کو تدریجاً اصل قانون سے مطلع کر دیا جاوے۔

اس کو وہ لوگ سمجھ سکتے ہیں جن پر کبھی یہ حالت گذری ہو یہ تو حکمت ہے، اس اطلاق کی اور اس کی ضرورت بھی تھی کیونکہ اس میں مانع اسلام کو بھی مرتفع کیا گیا ہے۔

اگر یہ آیت نہ ہوتی تو کفار کو سخت وسوسہ لاحق ہوتا اور وہ اسلام سے محروم رہتے اور یہ وسوسہ واقع بھی ہو چکا ہے۔ لہٰذا ان کو مطمئن کر دیا گیا کہ تم بے فکر ہو کر اسلام لے آؤ۔ حق تعالیٰ تمہارے سب گناہ معاف کر دیں گے۔

گناہ سے ناامیدی اور نیکی سے امید:

اس تقریر سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ آیت **لاتقنطوا** میں صرف مایوسین کی یاس کا ازالہ مقصود ہے اور یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اعمال کی ضرورت اور گناہوں سے بچنے کا اہتمام لازم نہیں بلکہ لفظ **لا تقنطوا** ضرورت اعمال پر خود دلالت کر رہا ہے کیونکہ اس میں قنوط و یاس کی ممانعت ہے اور تجربہ ہے کہ معاصی میں قنوط و یاس پیدا کرنے کی خاصیت ہے، رجاء بدوں اعمال صالحہ کے پیدا نہیں ہوتی۔ مجرم کو اپنے جرم کا استحضار جس وقت ہوتا ہے اس وقت رجاء کا مضمون دل میں نہیں آ سکتا اور اگر کسی مجرم کو رجاء ہوگی بھی تو کسی عمل صالح کی برکت سے ہوگی کہ اس کے پاس کوئی نیک کام ضرور ہوگا۔ جب قنوط سے بچنا واجب ہے تو اسباب قنوط سے بچنا بھی واجب ہوگا **لان مقدمة الواجب واجب** سرکش غلام کو امید کا درجہ کبھی نصیب نہیں ہوتا۔ جب چاہے تجربہ کر لیا جاوے۔

حب مناجاة الحبیب باوجه   ولکن لسان المذنبین کلیل

محبوب کی پسندیدہ مناجات کے بہت طریقے ہیں لیکن گناہگاروں کی زبان بات کرنے سے قاصر ہے۔

واقعی مجرم کی زبان مناجات سے بھی بند ہو جاتی ہے غرض اور افعال تو ایسے ہیں کہ بدوں ان کے کبھی نہ کبھی مغفرت اور نجات ہو جائے گی خواہ بعد عقاب یا قبل عقاب۔ مگر اسلام وہ چیز ہے کہ اس کے بغیر مغفرت و نجات ممکن نہیں یہ مطلب نہیں کہ خدا اس پر قادر نہیں کہ کافر کی مغفرت کر دے بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ کافر کی مغفرت چاہیں گے نہیں۔ گو قادر ضرور ہیں۔ ورنہ تعذیب کافر پر خدا تعالیٰ کا مضطر ہونا لازم آئے گا اور اضطرار منافی وجوب ہے اور بدوں ایمان و اسلام کے حق تعالیٰ کا کسی کی مغفرت نہ چاہنا قرآن میں جا بجا مذکور ہے۔ چنانچہ ایک آیت تو وہی ہے **ان اللہ لا یغفران یشرک بہ**

مگر شاید کوئی اس پر یہ شبہ کرے کہ یہاں تو صرف شرک کا ذکر ہے کفر کا ذکر نہیں اور بعض کافر ایسے بھی ہیں جو مشرک نہیں بلکہ موحد ہیں۔ مگر اسلام سے اباء کرتے ہیں ان کی مغفرت نہ ہونا اس آیت میں کہاں مذکور ہے؟

تو سنیے دوسری جگہ مذکور ہے **ان الذین کفروا من اھل الکتاب والمشرکین فی نار جھنم خلدین فیھا اولئک ھم شر البریہ** اس میں کافر و اہل کتاب و مشرکین کا مقسم قرار دیا گیا ہے اور دونوں کے لئے خلود فی جہنم مذکور ہے جس سے کافر کی مغفرت نہ ہونا بھی معلوم ہو گئی اور یہ شبہ نہیں ہو سکتا کہ یہاں تو صرف خلود کا ذکر ہے۔ جس کے معنے مکث طویل کے ہیں اور اس کے لئے دوام لازم نہیں۔

جواب یہ ہے کہ دوام خلود کے منافی بھی نہیں۔ پس اگر کوئی قرینہ قائم ہو تو خلود سے دوام کا قصد ہو سکتا ہے اور یہاں خلود بمعنے دوام ہونے پر قرینہ قائم ہے۔ وہ یہ کہ مشرکین کے لئے خلود بمعنی دوام ہی ہو گا اور یہاں کافر و مشرک دونوں کا حکم مذکور ہے، جب مشرک کے لئے خلود بمعنی دوام ہے تو کافر کے لئے بھی دوام ہی ہو گا۔ ورنہ کلام واحد میں ایک لفظ سے جدا جدا معنی کا قصد لازم آئے گا۔ اور یہ ممتنع ہے۔

علاوہ ازیں یہ کہ بعض آیت میں کافر کے لئے خلود کو دوام سے موصوف بھی کیا گیا ہے چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہے **ان الذین کفروا قطعت لھم ثیاب من نار الی قولہ تعالی کلما ارادوا ان یخرجوا منھا من غم اعید وافیھا** اور ارشاد ہے **فالذین کفروا وصدوا عن سبیل اللہ ثم ماتو اوھم کفار فلن یغفراللہ لھم** پس اب کافر کا بھی ہمیشہ کے لئے معذب

ہونا صاف طور پر معلوم ہو گیا۔ جس سے اس کی عدم مغفرت بھی سمجھ میں آ گئی ہوگی۔

اور یہاں سے ایک اشکال کے مندفع ہونے پر تنبیہ کئے دیتا ہوں وہ یہ کہ خلود کے معنے مکث طویل ہونے سے اس آیت کی تفسیر واضح ہو گئی جو قاتل عمد کے بارہ میں وارد ہے **ومن یقتل مؤمناً متعمدا فجزائه جهنم خالداً فيها** کہ اس سے قاتل عمد کی توبہ کا مقبول نہ ہونا لازم نہیں آتا کیونکہ اس میں خلود بدوں قید دوام مذکور ہے اور خلود دوام کو مستلزم نہیں۔ یہ یہاں کوئی قرینہ ارادہ دوام کیلئے مرجح ہے۔ اسلئے مدلول آیت صرف اس قدر ہے کہ قاتل عمد کو زمانہ دراز تک عذاب جہنم ہوگا (مگر کسی وقت نجات ہو جائے گی، گو مدت دراز کے بعد ہو اور جب وہ مستحق نجات ہے تو اسکی توبہ بھی قبول ہونی چاہیے اس میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا اختلاف ہے کہ انکے نزدیک قاتل عمد کیلئے توبہ نہیں۔ مگر جمہور صحابہؓ کے نزدیک قبول ہے، پھر صحابہ کے بعد تابعین و تبع تابعین و آئمہ مجتہدین کا اس پر اجماع ہو گیا کہ اسکی توبہ مقبول ہو سکتی ہے۔ جب کہ قاعدہ شرعیہ سے ہو اور قاعدہ ہے کہ اجماع متاخر اختلاف متقدم کا رافع ہوتا ہے۔ لہٰذا اب یہ مسئلہ اجماعی ہے مگر کفار و مشرکین کیلئے دوسری بعض آیات میں خلود کیساتھ دوام بھی مذکور ہے اسلئے وہاں مغفرت کا کوئی احتمال نہیں۔ کیونکہ خلود کے معنی بہت دن رہنا ہے اور ابد وہ ہے جس کا کبھی انقطاع نہ ہو حاصل یہ ہوا کہ کفار و مشرکین جہنم میں ایسی دراز مدت کیلئے داخل ہوں گے جس کا انقطاع ہی نہ ہوگا اور ظاہر ہے کہ کفر کہتے ہیں خلاف اسلام کو خواہ اسکے ساتھ شرک بھی ہو یا نہ ہو۔ دونوں کیلئے سزا ابدالآباد جہنم ہے۔

کفر سے بڑا جرم:

جب ترک اسلام کی سزا یہ ہے تو اس سے اسلام کی عظمت وفضیلت اور اس کی ضرورت کا درجہ معلوم ہو گیا اور ترک اسلام کی دو صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ اول ہی سے اسلام قبول نہ کرے۔ دوسرے یہ کہ بعد قبول کر کے ترک کر دے۔ دونوں صورتوں میں یہی سزا ہے بلکہ دوسری صورت پہلی سے اشد ہے۔ چنانچہ قوانین سلطنت میں بھی باغی کی سزا ان لوگوں سے زیادہ ہوتی ہے جو پہلے ہی سے اس سلطنت کی رعایا نہیں ہیں بلکہ کسی مخالف سلطنت کی رعایا ہیں ایسے لوگوں پر اگر کبھی غلبہ ہو جاوے تو ان کو غلام بنا لیتے ہیں یا احسان کر کے رہا کر دیتے ہیں یا عزت کے ساتھ نظر بند کر دیتے ہیں مگر باغی کے لئے بجز قتل یا عبور دریائے شور کے کچھ سزا ہی نہیں۔

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ رعایا بن کر باغی ہو جانے میں سلطنت کی زیادہ توہین ہے اسی طرح اسلام لا کر مرتد ہو جانے میں اسلام کی سخت توہین ہے اور اس کی تعلیم کو دوسروں کی نظروں میں حقیر کرن

ہے۔ دیکھئے ایک تو وہ شخص ہے جس سے کبھی آپ کی دوستی نہیں ہوئی بلکہ ہمیشہ سے مخالفت ہے اس کی مخالفت سے آپ کا اتنا ضرر نہیں ہوتا اور کبھی وہ آپ کی مذمت و ہجو کرے تو لوگوں کی نظروں میں اس کی کچھ وقعت نہیں ہوتی سب کہہ دیتے ہیں کہ میاں اس کو تو ہمیشہ سے اس کے ساتھ عداوت ہے دشمنی میں ایسی باتیں کرتا ہے۔ اور ایک وہ شخص ہے جو سالہا سال آپ کا دوست رہا۔ پھر کسی وقت مخالف بن گیا۔ اس کی مخالفت سے بہت ضرر پہنچتا ہے اور وہ جو کچھ برائیاں آپ کی کرتا ہے۔ لوگ ان پر توجہ کرتے ہیں اور یوں سمجھتے ہیں کہ یہ شخص جو کہہ رہا ہے اس کا منشا محض عداوت نہیں ہے اگر دشمن ہوتا تو سالہا سال تک دوست کیوں بنتا؟ معلوم ہوتا ہے کہ اس کو دوستی کے بعد فلاں شخص کے اترے تپرے معلوم ہوگئے ہیں اس لئے مخالف ہوگیا (حالانکہ یہ ضرور نہیں ہے کہ جو شخص دوستی کے بعد دشمن بنا ہو وہ اترے تپرے معلوم کرنے کے بعد ہی دشمن بنا ہو۔ ممکن ہے کہ اس شخص نے دوستی ہی اس نیت سے کی ہو کہ لوگ دوستی کے زمانہ میں مجھے اس کا رازدار سمجھ لیں گے تو پھر مخالفت کی حالت میں جو کچھ کہوں گا اس کو یہ سمجھ کر قبول کر لیں گے کہ یہ شخص رازدار رہ چکا ہے اس کو ضرور کچھ ناگوار باتیں معلوم ہوئی ہیں۔ اس لئے مخالف ہوگیا چنانچہ بعض یہود نے اسلام کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنے کا ارادہ کیا تھا **وقالت طائفة من اهل الكتاب امنوا بالذی انزل علی الذین امنوا وجه النهار واكفروا اخره لعلهم یرجعون ۝** (اور اہل کتاب کی ایک جماعت نے کہا کہ جو کچھ ایمان والوں پر نازل کیا گیا دن کے شروع میں اس پر ایمان لاؤ اور دن کے آخر میں اس سے انکار کر دو شاید اس طرح وہ (سابقہ دین پر) لوٹ آئیں) پس ہر چند کہ دوست کی مخالفت میں یہ احتمال بھی ہے مگر) عادۃً لوگ دوستوں کی مخالفت سے عموماً جلد متاثر ہو جاتے ہیں (اور اس احتمال پر نظر نہیں کرتے) اس لئے عقلاً و شرعاً و قانوناً وہ شخص بہت بڑا مجرم شمار ہوتا ہے جو موافقت کے بعد مخالفت کرے اسی لئے شریعت میں مرتد کے لئے دنیوی سزا بھی سخت ہے اور عذاب آخرت بھی اشد ہے۔

اس تقریر سے آیت کے ترجمہ و تفسیر کا بیان تو ہوگیا کیونکہ اس آیت میں اصل مقصود اسلام کی فضیلت ہی کا بیان ہے مگر مجھے اس وقت صرف بیان فضیلت پر اکتفا مقصود نہیں بلکہ اس پر ایک دوسرے مضمون کو مرتب کرنا ہے جس کو آئندہ بتلاؤں گا۔

محدود کفر پر غیر محدود عذاب شبہ کا جواب:

اس سے پہلے ایک شبہ عقلی کا جواب دے دینا چاہتا ہوں۔ شبہ یہ ہے کہ شریعت میں کفر کی سزا دائمی عذاب جہنم کیوں ہے؟ حالانکہ سزا مناسب جنایت ہونی چاہیے۔ اور یہاں جنایت متناہی

ہے۔ کیونکہ عمر کافر کی متناہی ہے تو سزا بھی متناہی ہونی چاہیے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ تمہارا یہ مقدمہ تو مسلم ہے کہ سزا جنایت کے مناسب ہونی چاہیے مگر کیا تناسب کے یہ معنی ہیں کہ جنایت اور سزا دونوں کا زمانہ بھی مناسب ہو اگر یہی بات ہے تو چاہیے کہ جس جگہ دو گھنٹہ تک ڈکیتی پڑی ہو اور ڈاکو گرفتار ہو کر آئیں تو حاکم ڈاکوؤں کو صرف دو گھنٹہ کی سزا دے دے۔ اگر حاکم ایسا کرے تو کیا آپ اس کو انصاف مانیں گے؟ اور سزا کو جنایت کے مناسب مانیں گے؟ ہرگز نہیں اس سے معوم ہوا کہ سزا و جنایت میں مناسبت کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ دونوں کا زمانہ مناسب ہو بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ سزا میں شدت بقدر شدت جرم ہو۔ اب تم خود فیصلہ کرلو کہ شریعت نے کفر کی سزا میں جو شدت بیان کی ہے وہ شدت جرم کے مناسب ہے یا نہیں اور یہ جرم شدید ہے یا نہیں؟

جواب ۲ جزا و سزا میں نیت کا دخل:

شاید آپ کہیں کہ جرم شدید تو ہے مگر نہ ایسا شدید کہ اس کی سزا ابدالآباد جہنم ہو میں کہوں گا کہ یہ خیال آپ کو اس لئے پیدا ہوا کہ تم نے صرف فعل کی صرف ظاہری صورت پر نظر کی ہے۔ حالانکہ سزا و جزا کا مدار محض اس کی ظاہری صورت پر نہیں ہے بلکہ نیت کو بھی اس میں بہت بڑا دخل ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اصل مدار نیت ہی پر ہے۔ چنانچہ اگر ایک شخص دھوکہ سے شراب پی لے تو اس کو گناہ نہیں ہوا گو صورت گناہ موجود ہے۔ کیونکہ نیت نہ تھی۔ اور اگر ایک شخص شراب پینے کے لئے دوکان پر جائے اور دوکاندار بجائے شراب کے کوئی شربت اس کو دے دے جسے یہ شراب سمجھ کر پی لے تو اس کو گناہ ہوگا کیونکہ اس کی نیت تو شراب پینے ہی کی تھی۔ اسی لئے فقہاء نے فرمایا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے مجامعت کرے مگر وہ اندھیرے میں یہ سمجھتا ہے کہ یہ میری بیوی نہیں بلکہ کوئی اجنبی عورت ہے تو اس کو گناہ ہوگا۔ اسی طرح اگر مجامعت میں تصور کسی اجنبیہ کا کرے یعنی بیوی سے مجامعت کرتے ہوئے یہ تصور کرے کہ میں گویا فلاں اجنبیہ سے مجامعت کر رہا ہوں اور اس کی صورت ذہن میں حاضر کر کے اس سے لذت لے۔ تب بھی گناہ ہوگا اور اگر شب زفاف میں عورتوں نے اس کے پاس غلطی سے بجائے اس کی بیوی کے کسی دوسری عورت کو بھیج دیا جس کے ساتھ یہ شخص یہ سمجھ کر ہمبستر ہوا کہ یہی میری بیوی ہے تو اس کو گناہ نہ ہوگا اور یہ وطی زنا شمار نہ ہوگی بلکہ وطی بالشبہ ہوگی جس سے ثبوت نسب بھی ہو جاتا ہے اور عدت بھی لازم ہوتی ہے۔ جب یہ بات معلوم ہوگئی تو سمجھو کہ

ظاہر میں کفر کا فر متناہی ہے مگر اس کی نیت یہ تھی کہ اگر زندہ رہا تو میں ابداً آباد اسی حالت پر رہوں گا۔ اس لئے اپنی نیت کے موافق اس کو ابداً آباد جہنم کا عذاب ہوگا اور اسی طرح مسلمان کا اسلام گو بظاہر متناہی ہے مگر اس کی نیت یہ ہے کہ اگر میں ہمیشہ زندہ رہوں تو ہمیشہ اسلام پر مستقیم رہوں گا اس لئے اس کے لئے ابداً آباد ثواب جنت ہے۔

اتلاف حقوق الٰہی کی سزا جواب ۳:

اور یک دقیق جواب یہ ہے کہ کفر سے حقوق الٰہی کی تفویت ہے اور حقوق الٰہی غیر متناہی ہیں تو ان کی تفویت کی سزا بھی غیر متناہی ہونی چاہیے اور اسلام میں حقوق الٰہی کی رعایت ہے اور وہ غیر متناہی ہیں تو ان کی رعایت کا بدلہ بھی غیر متناہی ہونا چاہیے۔ الحمدللہ اب یہ اشکال بالکل مرتفع ہوگیا۔

اب میں اس مقصود کو بیان کرنا چاہتا ہوں جو فضیلت اسلام پر مجھے متفرع کرنا ہے اور وہ دو مقصود ہیں ایک راجع ہے اپنی طرف دوسرا راجع ہے دوسروں کی طرف یعنی ایک مقصود لازم ہے ایک متعدی۔

نعمت اسلام کی ناقدری:

اس آیت سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ اسلام کی نعمت جو ہم کو حق تعالیٰ نے عطا فرمائی ہے یہ بہت بڑی نعمت ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں اس کا مقتضی یہ ہے کہ ہم کو اس نعمت کا شکر ادا کرتے رہنا چاہیے مگر ہماری حالت یہ ہے کہ ہم ادنیٰ ادنیٰ نعمت پر تو شکر کرتے ہیں مگر اسلام عطا ہونے پر شکر بہت کم لوگ کرتے ہیں۔ اور نعمت کا ادنیٰ و اعلیٰ ہونا باعتبار اضافت و نسبت کے ہے کہ بعض نعمتیں بعض کے مقابلہ میں ادنیٰ ہیں اور بعض اعلیٰ ہیں ورنہ فی نفسہ کوئی نعمت ادنیٰ نہیں خدا کی نعمتیں سب بڑی ہی ہیں۔

آسماں نسبت بعرش آمد فرود   لیک بس عالی ست نزد خاک تود

آسمان عرش کے مقابلہ میں تو بہت نیچا ہے لیکن خاک کے تودے سے بہت اونچا ہے

نعمت اسلام پر شکر:

غرض ہم لوگ شادی پر شکر کرتے ہیں کہ خدا کا شکر ہے کہ لڑکی یا لڑکے کا نکاح بخوبی ہوگیا۔ اس پر احباب بھی مبارکباد دیتے ہیں۔ خود بھی ہر شخص کا دل اس نعمت سے شاداں و فرحاں ہوتا ہے۔ اسی طرح تنخواہ ملنے پر نوکری مل جانے پر شکر کرتے ہیں روٹی کھا کر بھی اللہ

تیرا شکر کہہ لیتے ہیں ہر چند کہ ہمارا یہ شکر اس قابل نہیں کہ اسکو شکر کہا جاوے۔ کیونکہ اکثر ہم لوگ دل سے شکر نہیں کرتے صرف زبان سے اللہ تیرا شکر بے ساختہ نکل جاتا ہے۔ اور اگر دل سے بھی نکلتا ہو تب بھی وہ شکر ناقص ہی ہے کیونکہ شکر کے تین درجے ہیں۔ دل سے زبان سے افعال واعمال سے ہم لوگ اول تو محض زبان ہی سے شکر کرتے ہیں۔ اور اگر کوئی دل سے بھی کرتا ہو تو افعل سے شکر کرنے والے تو بہت کم ہیں۔ اور اگر کوئی اعمال سے بھی شکر کرتا ہو جب بھی خدا کی نعمت کا حق ہم سے ادا نہیں ہو سکتا حق تعالی کی ہر نعمت بہت بڑی ہے ایک کا شکر بھی کما حقہ، دشوار ہے۔ خصوصاً جب کہ یہ دیکھا جائے کہ خدا تعالی کا یہ انعام ہمارے اوپر ایسی حالت میں ہوا ہے کہ ہم انعام کے قابل نہ تھے، بلکہ سزا کے قابل تھے۔ ہمارے ساتھ جو خدا کا معاملہ ہے۔ اس کے مقابلہ میں خدا تعالی کے ساتھ جو ہمارا برتاؤ ہے اس کو کسی اور آقا کے ساتھ کر کے دیکھا جائے تب حقیقت معلوم ہو کہ ہم حقیقت میں زمین کے اندر گاڑ دیئے جانے کے قابل تھے مگر پھر بھی وہاں سے انعام ہی ہوتا ہے۔

پھر نعمت بھی ایک نہیں بلکہ **واسبغ علیکم نعمہ ظاھرۃً وباطنۃ**، حق تعٰ کی طرف سے ہم کو ظاہری و باطنی نعمتیں بے شمار عطا ہوتی ہیں۔ باطنی نعمت سے وہ مراد نہیں، جس کو تصوف کی اصطلاح میں باطنی نعمت کہا جاتا ہے۔ تاکہ یہ شبہ بید ہو کہ ہم سب اہل باطن صوفی ہو گئے بلکہ مطلب یہ ہے کہ بعض نعمتیں محسوس ہیں، بعض غیر محسوس ہیں۔ نعمت ظاہرہ سے محسوس مراد ہیں اور باطنہ سے غیر محسوس۔ جس کی ایک فرد وہ بھی ہے جس کو صوفیہ کی اصطلاح میں نعمت باطنی کہتے ہیں۔ مگر سب میں اس کا وجود ضروری نہیں۔ کیونکہ یہاں یہ مطلب تھوڑا ہی ہے کہ تمام نعم ظاہرہ اور تمام نعم باطنہ ہر شخص کو عطا ہوئی ہیں۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کو نعم ظاہرہ و باطنہ سے کچھ حصہ ضرور ملا ہے۔ جس کیلئے یہ لازم نہیں کہ ہر شخص میں سب کی سب مجتمع ہوں۔ بہرحال ہر شخص کو ظاہری اور باطنی نعمتیں بمقدار کثیر حاصل ہیں تو جب ایک نعمت کا شکر ہم سے ادا نہیں ہو سکتا تو مقدار کثیر کا شکر کیونکر ادا ہو سکتا ہے؟ یہ تو حقیقت کے اعتبار سے ہے۔

مگر حق تعٰ کی رحمت ہے کہ وہ ہم سے شکر حقیقی کا مطالبہ نہیں کرتے بلکہ اسی قدر کا مطالبہ فرماتے ہیں جتنا ہم سے ہو سکتا ہے مگر افسوس کہ ہم اتنا بھی نہیں کرتے کوئی محض شکر لسانی پر اکتفا کرتا ہے۔ کوئی محض قلبی پر، کوئی دونوں کو جمع کرتا ہے تو اعمال میں کوتاہی کرتا ہے مگر خیر جیسا شکر بھی ہم کرتے ہیں وہ دنیوی نعمتوں کے ظہور کے وقت ظاہر ہوتا ہے نعمت اسلام پر کوئی شکر نہیں کرتا

بتلایئے یہاں اتنا مجمع موجود ہے ہر شخص اپنے دل میں غور کرے کہ چوبیس گھنٹے میں کوئی ساعت بھی ایسی ہوتی ہے جس میں ہر شخص خدا تعالیٰ کا اس لئے شکر کرے کہ اس نے ہم کو مسلمان بنایا اسلام و ایمان عطا کیا۔ مسلمانوں کے گھر پیدا کیا۔ غالباً کوئی شخص بھی ایسا نہ نکلے گا الا ماشاء اللہ۔ تو یہ ہماری کتنی بڑی کوتاہی ہے کہ ایسی نعمت پر شکر کی توفیق ہم کو نہیں ہوتی۔ جس سے بڑی کوئی نعمت نہیں اور مرنے کے بعد ہمیشہ کی نجات کا مدار اسی پر ہے۔ بھلا اگر یہ نعمت سلب ہو جائے خدانخواستہ تو پھر ہمارا کہاں ٹھکانا رہے گا جب یہ اتنی بڑی نعمت ہے تو اس کا شکر ادا نہ کرنا بھی غفلت ہے۔

تدبیر حسن خاتمہ:

امام ابوحنیفہؒ کا ارشاد ہے کہ اگر ایمان پر خاتمہ چاہتے ہو تو ہمیشہ نعمت ایمان پر خدا کا شکر کرتے رہو۔ کیونکہ حق تعالیٰ کا وعدہ ہے **لئن شکرتم لازیدنکم** اگر تم میرا شکر کرو گے تو میں نعمت کو بڑھاؤں گا اسے زیادہ کروں گا۔ سبحان اللہ یہ نہیں فرمایا **لئن شکرتم لا اسلبنکم یالا انقصنکم** کہ اگر شکر کرو گے تو میں نعمت سلب نہ کرونگا یا کم نہ کرونگا بلکہ **لا زیدنکم** فرمایا جس میں زیادت کا وعدہ ہے وعدہ زیادت سے نقصان کی نفی ہوگئی اور نفی نقصان سے سلب کی نفی بدرجہ اولیٰ ہوگئی کیا بلاغت ہے کہ ایک لفظ ایسا فرمادیا جس سے نقصان و سلب دونوں کی نفی بھی ہوگئی اور ترقی کا وعدہ بھی ہوگیا۔ کوئی کلام ایسا بلیغ ہے جس کے ایک لفظ سے اتنے معانی حاصل ہوتے ہوں اگر خدا فہم دے تو قرآن کا لفظ لفظ اعجاز سے بھرا ہوا ہے جب شکر پر وعدہ زیادت ہے تو جو شخص نعمت ایمان پر شکر ادا کرتا رہے گا اس کا ایمان کبھی زائل یا کم نہ ہوگا بلکہ دن بدن بڑھتا رہے گا۔ پس یہ درود دستور العمل بنانے کے قابل ہے اگر اپنا ایمان دنیا سے سلامت لے جانا چاہتے ہو تو ایمان کا شکر کبھی نہ بھولو۔ (**اللھم فلک الحمد ولک الشکر علیٰ ما اولیتنی من نعمۃ الاسلام ولک الحمد ولک الشکر علیٰ ما اکرمتنی بنعمۃ الایمان. اللھم توفنا مسلمین والحقنا بالصالحین عیر خزایا ولا مفتونین امین ۱۲ جامع**) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم تھا کہ میری امت غافل ہے یہ از خود ایمان و اسلام کا شکر بہت کم ادا کرے گی۔

دعاء بعد طعام میں شکر اسلام کی تعلیم:

اس لئے حضورؐ نے بعض دعائیں ہم کو ایسی تعلیم فرمائیں جن میں اسلام کا شکر بھی ادا ہو جاتا ہے مثلاً کھانے کے بعد کے لئے یہ دعا تعلیم فرمائی **الحمدللہ الذی اطعمنی وسقانی**

وجعلنی من المسلمین (المستدرک للحاکم ۱:۵۴۵) خدا کا شکر ہے جس نے مجھ کو کھلایا اور پلایا اور مجھے مسلمانوں میں داخل کیا۔ کھانے کے میل میں اسلام پر شکر کی تعلیم فرمانے میں ایک نکتہ ہے وہ یہ کہ اس میں اشارتاً بتلایا گیا ہے کہ تم ایسے نہیں ہو جو مستقلاً اسلام کا شکر ادا کرو۔ اس لئے بچوں کی طرح روٹیوں کے بعد شکر اسلام کی تعلیم فرمائی کہ میاں اور کسی وقت شکر نہ کرو، تو روٹیاں کھانے کے بعد تو اسلام کا شکر ادا کرلیا کرو۔ کیونکہ اس وقت ایک ظاہری نعمت تمہارے سامنے ہوتی ہے۔ اس کا شکر تو تم طبعاً ادا کر ہی ہوگے۔ اس کے ساتھ ساتھ نعمت اسلام کا شکر بھی ادا کرلو۔ جس سے یہ سب کھانا پینا بھی نعمت ہوگیا اور اسلام کی بدولت آخرت میں بھی تم کو یہ نعمتیں نصیب ہوں گی اگر نعمت اسلام نہ ہوتی تو کھانا پینا سب وبال جان ہوتا اور اس کی لذت چند روزہ ہوتی۔ پس روٹیوں کے ساتھ شکر اسلام تعلیم فرمانا ایسا ہے جیسے بچوں کو بتاشہ میں دوا دیتے ہیں۔ افسوس ہم ایسے غافل ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو بچوں کی طرح بھلا پھسلا کر شکر اسلام کی تعلیم فرمارہے ہیں۔ اور اسی طرح اپنے کھانے کے میل میں کھانے کے بعد حضور نے ایک اور مفید دعا بھی تعلیم فرمائی ہے کہ جب کسی دوسرے کے گھر کھانا کھاؤ تو یوں کہو **اللھم اطعم من اطعمنی واسق من سقانی** (الصحیح لمسلم: ۱۶۲۶) یعنی دعوت کرنے والے کو دعا دو کہ اے اللہ جس طرح اس نے ہم کو کھلایا پلایا ہے آپ بھی اس کو ہمیشہ کھلاتے پلاتے رہیں (یا جنت کے طعام وشراب سے ممتاز فرمائیں۔) حضور کی تو یہ تعلیم ہے مگر یہاں یہ عادت ہے کہ کھلانے والے کو دعا تو کیا دیتے اس کا شکر تو کیا ادا کرتے الٹا کھانے میں عیب نکالتے ہیں خصوصاً رسوم کے کھانوں میں تو اکثر یہی ہوتا ہے۔ ایک جینئے اپنی لڑکی کی شادی میں بہت بڑی بارات بلائی تھی اور دعوت کا سامان بہت بڑھیا کیا تھا۔ اس کے علاوہ چلتے ہوئے ہر باراتی کو ایک ایک اشرفی بھی دی تھی یہ سب کچھ کر کے اس کو خیال ہوا کہ آج بارات والے میری خوب تعریف کرتے جائیں گے۔ وہ اپنی تعریف سننے کے لئے اس راستہ میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ جہاں سے بارات گذر رہی تھی مگر وہاں بالکل سناٹا تھا۔ کسی نے بھی تو بنئے کی دریا دلی کی داد نہ دی آخر بہت دیر کے بعد ایک گاڑی میں سے آواز آئی کہ کوئی شخص دوسرے سے کہہ رہا ہے کہ بھائی! لالہ جی نے بڑی حوصلہ کی دعوت کی۔ اچھے اچھے کھانے کھلائے اور چلتے ہوئے ایک ایک اشرفی دی تو دوسرا کیا کہتا ہے کیا میاں کیا کیا؟ سسرے کے یہاں اشرفیوں کے کوٹھے بھرے پڑے ہیں۔ دو دو بانٹ دیتا تو اس کے کیا کمی آجاتی؟

لیجئے ایک ایک اشرفی بانٹ کر تو سر کا خطاب ملا۔ زیادہ بانٹتا تو نہ معلوم کیا خطاب ملتا؟

حب جاہ کی حقیقت:

اسی لئے محققین نے کہا ہے کہ اس شخص سے زیادہ کوئی احمق نہیں جو طالب جاہ ہو۔ کیونکہ یہ کمال محض وہمی انتزاعی ہے اور انتزاعی بھی ایسا جو اس شخص کے ساتھ خود قائم نہیں۔ بلکہ دوسرے کے خیال کے ساتھ قائم ہے۔ کیونکہ جاہ نام ہے دوسروں کی نظروں میں معزز ہونے کا جس کا مدار محض دوسرے کے خیال پر ہے جو کہ اپنے وجود میں خود اس دوسرے کے تابع ہے۔ وہ جب چاہے بدل دے تو ساری جاہ خاک میں مل جاتی ہے۔ مگر طالب جاہ خوش ہے کہ آہا لوگ مجھے اچھا کہتے ہیں۔ جیسے چوہا خوش ہوتا ہے کہ بنئے کی دوکان میں میرے واسطے غلہ آیا ہے؟ جی ہاں ذرا منہ تو ڈالو ابھی چوہے دان آتا ہے جس سے ساری خوشی کرکری ہو جائے گی۔

اسی طرح دوسرے شخص کا اپنا خیال بدل دینا یہ جاہ کے لئے چوہے دان ہے ایک نقص تو جاہ میں یہ ہے کہ وہ سراسر دوسرے کے تابع ہے وہ ایسا کمال نہیں جو اپنے قبضہ کا ہو۔ دوسرا نقص یہ ہے کہ اس سے نفع جو حاصل ہوتا ہے وہ محض وہمی ہے یعنی بڑائی اور عزت؟ کیونکہ عزت و بڑائی سے نہ گھر میں روپیہ آتا ہے نہ جائیداد بڑھتی ہے۔ محض دل خوش کر لو ورنہ جاہ سے تو اچکن میں ایک بٹن بھی نہیں لگتا۔ اور جو لوگ جاہ سے نفع مالی حاصل کرتے ہیں جیسے بعض لوگ بڑا بن کر غریبوں سے بیگار لیتے ہیں یا جا و بے جا فرمائشیں کرتے رہتے ہیں۔ ان کی جاہ بہت جلد زائل ہو جاتی ہے۔ غرض اس سے بدوں خیالی نفع کے اور کچھ فائدہ نہیں۔

ایک رئیس نے دیوبند میں بڑی دھوم دھام کی دعوت کی تھی۔ جس میں بڑا روپیہ صرف ہوا تھا۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمتہ اللہ علیہ نے دعوت کے بعد ان رئیس صاحب کو اس فراخ حوصلگی کی داد اس طرح دی کہ شیخ صاحب واقعی آپ نے بڑے حوصلہ کا کام کیا۔ مگر افسوس یہ ہے کہ اتنا روپیہ خرچ کر کے آپ نے ایک چیز خریدی جو بازار میں پھوٹی کوڑی کو بھی نہیں بک سکتی۔ یعنی نام۔ اور اگر بدنامی ہو گئی تو وہ خیالی جاہ بھی جاتی رہی۔ بس جاہ کی ایک مثال ہے جیسے کوئی منہار پوٹلا باندھے ہوئے چوڑیوں کا لیجا رہا تھا۔ ایک گنوار نے لاٹھی کا کھودا مار کر پوچھا کہ میاں اس میں کیا ہے؟ (گانوں والوں کی عادت ہے کہ وہ لاٹھی مار کر پوچھا کرتے ہیں) اس منہار نے جواب دیا کہ اس میں ایسی چیز ہے کہ ایک کھودا اور مار دو تو کچھ بھی نہیں۔ اسی طرح جاہ ایسی چیز ہے کہ ذرا سی ٹھیس میں جاتی رہتی ہے۔ اس لئے جو لوگ نام کے واسطے روپیہ برباد کرتے ہیں وہ

بڑی غلطی کرتے ہیں اور اس سے بڑھ کر غلطی کھانے والوں کی ہے کہ وہ دوسروں کا مال کھا کر شکر نہیں ادا کرتے، نہ اسے دعا دیتے ہیں۔

ہاں آج کل مردوں کو فاتحہ میں دعا دی جاتی ہے وہاں بھی کھلانے والوں کو کوئی دعا نہیں دیتا۔ حالانکہ پہلے کھلانے والے کو دعا دینی چاہیے۔ اگر وہ نہ کھلاتا تو مردوں کو ثواب کیسے پہنچتا؟ بلکہ کھانے والوں کو بھی دعا دینی چاہیے اور ان کا مشکور ہونا چاہیے کیونکہ وہ نہ کھاویں تب بھی مردوں کو ثواب نہیں پہنچ سکتا۔

میرٹھ میں ایک لطیفہ ہوا کسی جگہ مردوں کی فاتحہ دی جا رہی تھی اور ایک لمبی فہرست پڑھی جا رہی تھی جس میں نمبروار مردوں کے نام درج تھے۔ جب فہرست کے ختم ہونے میں دیر لگی تو ایک صاحب بولے کہ میاں اس میں ہمارا نام بھی تو لکھا ہوتا کیونکہ خدا کی قسم اگر ہم نہ کھاویں تو ان میں سے ایک کو بھی تو ثواب نہ ملے گا اس پر سب لوگ ہنس پڑے اور وہ فہرست مختصر کی گئی۔

ان رسوم میں ایک بات ایسی ضرور موجود ہوتی ہے جو ان کے لغو و باطل ہونے پر خود دلالت کرتی ہے۔ چنانچہ کھانے سے پہلے مردوں کے نام ترتیب وار لیے جانا۔ یہ محض لغو حرکت ہے‘ آخر یہ نام کسے سنائے جا رہے ہیں۔ اگر کھانے والوں کو سنائے جاتے ہیں کہ تم ان لوگوں کی نیت کر کے کھانا‘ تو ظاہر ہے کہ کھانے والے جب ہاتھ دھو کر بیٹھتے ہیں ان کو سوا کھانے کے اور کچھ یاد نہیں رہتا اور نہ اتنی لمبی فہرست یاد رہ سکتی ہے اور اگر خدا کو سنانا ہے تو اس کا لغو ہونا بالکل ظاہر ہے۔ خدا تعالیٰ کو تو ہر شخص کی نیت کا حال معلوم ہے۔ ان کو سنانے کی کیا ضرورت ہے؟ مگر پھر بھی بعض لوگ اپنی اغراض کے لیے فاتحہ وغیرہ کو دلائل سے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

چنانچہ ایک صاحب کہنے لگے کہ مولوی خواہ مخواہ فاتحہ کا انکار کرتے ہیں حالانکہ سورۂ فاتحہ خاص اسی واسطے اتری ہے۔ چنانچہ اس کا نام ہی فاتحہ ہے۔ سبحان اللہ! کیا پاکیزہ دلیل ہے۔ پھر یہ لوگ علماء سے بحث کر کے دقائق علمیہ کو سمجھنا چاہتے ہیں اور جب نہیں سمجھتے تو علماء پر الزام لگاتے ہیں۔ یہ ہم کو سمجھا نہیں سکتے۔ غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو کھانے کے بھی سب آداب بتلائے ہیں۔ جن میں ضمناً اسلام پر بھی شکر کی تعلیم فرمائی۔

شکر کے معنی:

اب سمجھیے کہ شکر کے معنی ہیں قدردانی کے۔ اسی واسطے خدا تعالیٰ کا نام شکور ہے کہ وہ اعمال کی قدر کرتے ہیں۔ قدر کی دو صورتیں ہیں۔ اگر یہ شخص حاجت مند ہے تو اس کی قدر تو یہ ہے کہ

اس سے منفعت حاصل کرے اور منعم کا احسان مند رہے اور اگر حاجت مند نہیں ہے تو اس کی قدر یہ ہے کہ اس فعل کی جزا و صلہ عطا کرے چنانچہ حق تعالیٰ کو شکور اسی معنی کے اعتبار سے کہتے ہیں۔ ان کی قدردانی یہی ہے کہ وہ بندوں کے اعمال کا صلہ دیتے ہیں اور بندہ کی قدردانی یہ ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی نعمتوں سے وہ منافع حاصل کرے جن کے لئے وہ موضوع ہیں۔ مثلاً روٹی کی قدر یہ ہے کہ اسے کھاؤ، پانی کی قدر یہ ہے کہ پیو اور برف کی قدر یہ ہے کہ اس سے ٹھنڈک حاصل کرو۔ اگر کوئی شخص برف کو پانی میں گھول کر معمولی برتن کے اندر رکھ دے تو کہا جاتا ہے کہ اسے برف کی قدر نہیں ہے یعنی جس منفعت کے لئے وہ موضوع تھی اس سے وہ نفع حاصل نہ کیا۔ اس لئے ناقدری کی۔ اسی طرح اسلام کا شکر یہ ہے کہ اس کی قدر کرو اور قدر یہ ہے کہ اس کی برکات و منافع حاصل کرو۔

منافع اسلام:

اب سنو کہ اسلام کے منافع کیا ہیں سو سمجھنا چاہیے کہ اسلام کے دو درجے ہیں ایک درجہ تلفظ و اقرار شہادتین کا ہے کہ خدا کو وحدہٗ لاشریک لہٗ سمجھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا قرار کرے یہ تو ادنیٰ درجہ ہے۔

اور ادنیٰ درجہ کے معنی یہ ہے کہ ایسا ضروری ہے کہ اس کے بغیر نجات ہو ہی نہیں سکتی یہ تو برکت ادنیٰ درجہ سے حاصل ہو جاتی ہے کہ اس کی بدولت کسی نہ کسی وقت جہنم سے چھٹکارہ ہو جاوے گا۔

اور ایک درجہ اس سے اعلیٰ ہے کہ شہادتین کا اقرار کر کے فرائض و واجبات اسلامیہ کی پابندی بھی کی جائے۔ اس سے نجات کامل حاصل ہوتی ہے کہ بدوں عذاب کے جنت میں جانا نصیب ہوتا ہے اور بڑے بڑے درجات ملتے ہیں تو معلوم ہوا کہ نجات کامل کے لئے تکمیل اسلام کی ضرورت ہے اور ظاہر ہے کہ ہر شخص نجات کامل ہی کا متوقع ہوتا ہے۔ مقدمات میں ہر شخص کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ کسی طرح بدوں سزا و جرمانہ کے رہائی ہو جاوے۔ اس کا متوقع کوئی نہیں ہوتا کہ بس رہائی ہو جاوے خواہ سزا ہی کے بعد سہی۔

اسی طرح ہر مطلوب میں انسان کو درجہ کمال ہی مطلوب ہوتا ہے تو اسلام میں بھی درجہ کمال مطلوب ہونا چاہیے۔ دیکھئے مکان دو قسم کے ہیں۔ ایک تو وہ ہے جس میں گوندے کی دیواریں ہیں، نیچی چھت ہے، نہ ہوا کا آرام نہ دھوپ کا، پاخانہ باورچی خانہ سب ایک ہی جگہ آس پاس ہیں۔ اور ایک وہ مکان ہے جس کا صحن وسیع ہے۔ ہوا کا بھی آرام ہے اور دھوپ کا بھی، دیواریں بھی مضبوط

ہیں، چھت بھی اونچی ہے۔ غسل خانہ بھی ہے، ہوا کے لئے روشندان اور کھڑکیاں بھی ہیں، تمام ضروریات اعلیٰ پیمانے پر ہیں۔ پھر اس میں زینت وآرائش بھی ہر قسم کی ہے۔ خود فیصلہ کر لیجئے کہ مطلوب کون سا مکان ہوگا۔ اسی طرح کپڑا ایک تو وہ ہے جو بدنما صورت ہونے کے ساتھ اتنا کم ہے جس کو کفن کی طرح لپیٹ لیا جاوے (یعنی بدن ڈھانکنے سے قاصر ہے) ایک وہ کپڑا ہے جس سے بدن بخوبی چھپ سکتا ہے۔ خوش نما خوبصورت ہے عمدہ سلا ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر شخص کو ایسا ہی کپڑا مطلوب ہوگا نہ کہ پہلا۔ تو دنیوی امور میں درجہ کمال کا طالب ہے۔ درجہ نقصان پر کوئی اکتفا نہیں کرتا بلکہ کمال کی کوشش کرتا ہے مگر دینی کاموں میں ہماری یہ حالت ہے کہ درجہ نقصان پر راضی ہیں۔ حصول کمال کی کوشش نہیں کرتے۔ چنانچہ بہت لوگ اسلام میں درجہ ادنیٰ یعنی تلفظ شہادتین پر اکتفا کیے ہوئے ہیں اور نماز وغیرہ کی پرواہ نہیں کرتے۔

تکمیل اسلام:

اس میں علاوہ اس خرابی کے کہ ان کا اسلام ناقص ہے اور فرائض ترک کرنے سے عذاب ہونے کا اندیشہ ہے۔ بڑی خرابی یہ ہے کہ ایسے مسمانوں پر دشمنوں کے دندان آز تیز ہوتے ہیں۔ تجربہ ہے کہ مخالف کو اس مسلمان کے بہکانے کی جرأت ہوتی ہے جس کا اسلام ناقص ہے کافر اسی مسمان کو اپنے پھندے میں لانے کی کوشش کر سکتا ہے جس کا اسلام کامل نہیں بلکہ برائے نام ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ جن لوگوں کا اسلام کامل ہے ان پر میرے اغواء کا اثر نہیں ہو سکتا۔ ہاں جو لوگ نام کے مسمان ہیں کہ سوائے اپنے کو مسلمان کہنے کے اور کوئی بات اسلام کی ان کے اندر موجود نہیں، وہ جلد ہمارے بہکانے میں آ سکتے ہیں۔ اس لئے وہ ایسے لوگوں پر اپنے دانت تیز کرتے ہیں۔

چنانچہ آج کل جو فتنہ ارتداد چل رہا ہے۔ اس کے شکار ایسے ہی مسمان ہو رہے ہیں جن کو نہ کلمہ توحید یاد ہے، نہ نماز روزہ کے پابند ہیں، نہ صورت وضع مسلمانوں جیسی ہے، نہ معاشرت مسلمانوں جیسی ہے، صورت سے کوئی شخص ان کو مسلمان نہیں کہہ سکتا مگر چونکہ وہ اپنے کو مسمان کہتے ہیں اور ان کے آباؤ اجداد بھی مسلمان تھے اس لئے شرعاً وہ مسلمان ہیں اور ان کے اسلام کی حفاظت ہمارے ذمہ ضروری ہے۔ بہر حال تکمیل اسلام کی ضرورت عذاب سے بچنے کے لئے تو ہے ہی، مخالفوں کے پھندوں سے بچنے کے لئے بھی اس کی ضرورت ہے۔ اگر دفعۃً پوری تکمیل نہ ہو سکے تو چند باتوں کی ضرورت تو بہت سخت ہے۔ ایک یہ کہ سب مسلمان نماز کی پابندی شروع کر دیں۔ تجربہ ہے کہ نمازی کو کوئی شخص بہکانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ جن مسمان کو کفار نماز کا پابند دیکھتے ہیں اس سے بالکل

مایوس ہو جاتے ہیں کہ یہ کبھی ہمارے بہکانے میں نہیں آ سکتا کیونکہ وہ اس کو پکا مسلمان سمجھتے ہیں۔ پس خدا کیلئے تم نماز کی پابندی تو ابھی سے شروع کر دو یہ اسلام کا بڑا پہرہ دار ہے۔ واقعی **ان الصلوٰۃ تنھی عن الفحشآء والمنکر** (بیشک نماز بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے) کی ایک تفسیر ابھی سمجھ میں آئی۔

مشہور تفسیر تو یہ ہے کہ نماز مسلمانوں کو برے کاموں سے روک دیتی ہے اس پر ظاہر میں اشکال پڑتا ہے کہ ہم تو بہت نمازیوں کو برے کام کرتے دیکھتے ہیں۔ اس کا جواب دیا گیا ہے کہ نماز سے برے کام ضرور کم ہو جاتے ہیں۔ اگر اس شخص کی نماز کامل ہے۔ خشوع وخضوع وجملہ آداب کے ساتھ ہے۔ تب تو یہ شخص بالکل برے کاموں سے محفوظ ہو جائے گا اور اگر اس کی نماز ناقص ہے تو جیسی نماز ہے اسی کے مناسب برے کام چھوٹ جائیں گے۔ غرض جس درجہ کی نماز ہوگی اس درجہ کی نہی عن الفحشاء ہوگی۔ تجربہ کر لیا جاوے کہ دو جماعتوں کا امتحان کر کے دیکھو۔ ایک وہ جو بالکل بے نمازی ہے دوسری وہ جو نمازی ہے (گو ان کی نماز کسی درجہ کی ہو) یقیناً نمازی جماعت کے اندر برے کام کم ہوں گے اور بے نمازیوں میں ان کی نسبت سے زیادہ ہوں گے۔ تو مشہور تفسیر پر اشکال واقع ہوتا تھا جس کا جواب دینے کی ضرورت ہوئی۔ مگر جو تفسیر اس وقت القاء ہوئی ہے اس پر کوئی اشکال نہیں پڑتا وہ یہ کہ نماز اہل فحشاء ومنکر کو نمازی کے پاس آنے اور اس کے بہکانے سے روک دیتی ہے۔

اس کی تائید ایک حدیث سے ہوتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اذان سے شیطان گوز مارتا ہوا بہت دور بھاگ جاتا ہے اور اس کا اقرار کفار کو بھی ہے۔ چنانچہ مندر کے پاس اذان دینے سے وہ لوگ روکتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ آذان کی آواز سے ہمارے دیوتا بھاگ جاتے ہیں۔

ایک راجہ کے یہاں ہندو پنڈتوں نے استغاثہ دائر کیا تھا کہ مسلمانوں کی مسجد مندر کے پاس ہے۔ جس میں وہ اذان دیتے ہیں ان کو اس سے منع کیا جائے کہ زور سے اذان نہ کہا کریں۔ ہمارے دیوتا بھاگ جاتے ہیں۔ راجہ نے وزیر سے کہا کہ ہمارا ایک گھوڑا توپ کی آواز سے چونکتا تھا تو ہم نے اس کی چمک نکالنے کیلئے یہ تدبیر کی تھی کہ اس کو توپ کے پاس رسوں سے بندھوا کر خوب توپ چلانے کا حکم دیا تھا جس سے اس کی چمک جاتی رہی تھی۔ تو ہمارے دیوتا اگر اذان سے بھگتے ہیں تو یہ ہم کو بہت مضر ہے۔ مسلمان جب چاہا کریں گے ان کو بھگا دیا کریں گے۔ لہذا ان کی چمک نکالنی چاہیے اور مسلمانوں سے کہنا چاہیے کہ خوب

زور سے اذان دیں یہ تو ہمارے ہی واسطے مفید ہے۔

غرض جب کفار کے دیوتا اذان سے بھاگ جاتے ہیں تو جس گاؤں میں اذان ہوگی وہاں کفار بھی نہ آسکیں گے اور اگر آویں گے بھی ان کے حوصلہ پست ہو جائیں گے۔ پس یہ تفسیر اس آیت کی بہت عمدہ لطیف ہے اور واقعی اس پر کوئی بھی اشکال نہیں چنانچہ اس وقت جو لوگ بھی دشمنوں کے بہکانے سے مرتد ہوئے ہیں یہ وہی لوگ ہیں جن کو نماز سے کچھ علاقہ نہ تھا اس لئے مسلمانوں کو چاہیے کہ فتنہ ارتداد سے بچنے کے لئے خود بھی نماز کی پابندی شروع کریں اور دیہات میں بھی مسلمانوں کو نمازی بنانے کی کوشش کریں۔ حفاظت اسلام کے لئے ایک تو یہ عمل ضروری ہے۔

دوسرا کام یہ کریں کہ کسی بزرگ اللہ والے سے تعلق پیدا کرلیں یعنی اس سے بیعت ہو جائیں یہ عمل بھی حفاظت اسلام کے لئے بڑا سنگین پہرہ دار ہے۔

میرے ایک دوست کانپور میں تھے (جو مجھ سے بیعت بھی ہیں) ان کے پڑوس میں مشن کا ایک عیسائی رہتا تھا۔ وہ کم بخت روز ان سے مذہبی گفتگو کرتا تھا اور اسلام سے بہکانا چاہتا تھا ایک دن ان دوست نے باتوں باتوں میں اس سے یہ کہہ دیا کہ میں حضرت مولٰنا رشید احمد صاحبؒ کا معتقد ہوں۔ بس یہ سن کر پھر کبھی وہ ان کے پاس آ کر نہ پھٹکا اور دوسروں کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ عیسائی یہ کہتا تھا کہ جو لوگ بزرگوں سے تعلق رکھتے ہیں ان پر ہمارا داؤ نہیں چلتا۔ واقعی حدیث میں آیا ہے کہ مسلمان کو جماعت میں شامل ہونا چاہیے کیونکہ بھیڑیا اسی بکری کو پھاڑتا ہے جو گلہ سے الگ ہو جاوے۔

مشہور ہے کہ بھیڑیا گلہ پر حملہ نہیں کرتا بلکہ جب کوئی بکری گلہ سے الگ ہوتی ہے۔ اسے پھاڑ کھاتا ہے۔ پس مسلمانوں کو چاہیے کہ اللہ والوں سے تعلق پیدا کریں اور ان کے سلسلہ میں داخل ہو جاویں۔ اس عمل میں دفع بلاء کی بڑی برکت ہے۔ پھر تم کو کوئی بہکانے نہ آوے گا اور اگر کوئی آوے تو تم اس سے کہہ دو کہ ہم تو فلاں بزرگ سے بیعت ہیں جو طریقہ ان کا ہے وہی طریقہ ہمارا ہے۔ اگر تم کو کچھ کہنا ہے تو ان سے جا کر کہو، ان کو سمجھالو، اگر وہ اپنا طریقہ بدل دیں گے تو ہم بھی بدل سکتے ہیں ورنہ ہم تو ان کے ساتھ رہیں گے۔ پس بزرگوں کا نام سن کر پھر کبھی وہ تم کو بہکانے نہ آوے گا اور بزرگوں سے تعلق پیدا کر کے مہینہ دو مہینہ میں ان کے پاس بھی جانا چاہیے۔ ان کی صحبت سے نور ایمان کو ترقی اور اسلام کو پختگی حاصل ہوگی۔ پس حفاظت اسلام کے لئے یہ دو عمل ہوئے۔ ایک نماز دوسرے کسی بزرگ سے تعلق پیدا کرنا۔

ایک تیسرا ضروری عمل اور ہے وہ گائے کا گوشت کھانا ہے۔ گائے کا گوشت کھانے والے کو

کوئی ہندو نہیں بہکا سکتا۔ بکری کا گوشت کھانے تک تو بکری کا احتمال رہتا ہے مگر گائے کا گوشت کھانے کے بعد پھر کچھ ڈر نہیں رہتا اور اگر اس کو ذبح کرنے لگو تو پھر تمہاری صورت دیکھ کر ہندو بھاگنے لگیں گے۔ چنانچہ ہندوستان میں جن لوگوں کا پیشہ گائے ذبح کرنا ہے ان پر ہندوؤں کو کسی وقت یہ طمع نہیں ہو سکتی کہ وہ ہمارے بہکانے میں آ سکتے ہیں۔

ایک ظرافت کا قصہ ہے ایک دفعہ ریل کے سفر میں ہمارے ایک دوست نے گائے کے ہڈے سے پستول کا کام لیا تھا۔ ریل میں مسافروں کا ہجوم بہت تھا ایک ایک ڈبہ میں چالیس سے اوپر آدمی بھرے ہوئے تھے۔ جب پھر بھی آمد کم نہ ہوئی تو ان حضرت نے کھانے کا دسترخوان بچھا لیا جس میں گائے کا گوشت تھا۔ ہندو آتے اور گائے کا گوشت دیکھ کر رام رام کہتے ہوئے وہاں سے چل دیتے۔ جب کھانا کھا چکے تو ہمارے دوست نے ایک بڑا سا ہڈا ہاتھ میں لے لیا اور جو ہندو آتا اسے وہ ہڈا دکھا دیتے کہ یہاں جگہ نہیں، آگے جاؤ۔ اس ہڈے کی صورت دیکھتے ہی کوئی ہندو وہاں نہ ٹھہرتا۔ اس لئے اس کا نام پستول رکھا گیا تو جس چیز کی صورت سے کفار بھاگتے ہیں اس کو تم کھانے لگو گے تو پھر وہ تمہارے پاس کب آنے لگے۔ بس گائے کا گوشت کھانے سے تو تم بے فکر ہو کر جنت کے گاؤ تکیہ سے کمر لگا کر بیٹھ جاؤ گے۔

بخدا تجربہ نے بتلا دیا کہ ہندوستان میں گائے کا گوشت کھانا ہی کامل مسلمان ہونا ہے۔ بدون اس کے یہاں اسدم کی تکمیل نہیں ہوتی۔ چنانچہ جو لوگ گائے کا گوشت نہیں کھاتے ہندو ان کے فعل کو اپنی دلیل میں پیش کرتے ہیں۔ ان کی حالت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ مسمان خوشی سے نہیں ہوئے اسی لئے اسلام کے بعد بھی اپنی اصلی حالت پر قائم رہے۔ گویا ہندوؤں نے اس قول میں خود اقرار کر لیا کہ کامل مسلمان وہی ہے جو گائے کا گوشت کھاتا ہے اور جو گائے کا گوشت نہیں کھاتا اس کو وہ لوگ بھی ہندوؤں سے قریب اور مسمانوں سے بعید سمجھتے ہیں پھر اب ذبیحہ گاؤ کے شعار اسلام ہونے میں کیا شبہ رہا۔ شعار اسلام کے اور کیا سینگ ہوتے ہیں۔

بس جو چیز عام طور پر اسلام و کفر میں امتیاز پیدا کرنے والی ہو وہی شعار اسلام ہے اور ظاہر ہے کہ ہندوستان میں مسمان کو ہندوؤں سے امتیاز گائے کے ذبح اور اس کا گوشت کھانے ہی سے ہوتا ہے اور اس وقت تجربہ نے بتلا دیا کہ جو لوگ اس شعار اسلام کے تارک تھے، زیادہ تر وہی فتنہ ارتداد کے دام میں مبتلا ہو رہے ہیں اور جو اس شعار کو اختیار کئے ہوئے ہیں ان کی طرف کوئی رخ بھی نہیں کرتا تو یہ علاوہ شعار اسلام ہونے کے بڑا سنگین پہرہ دار بھی ہے جیسے ابھی میں نے قصہ

بیان کیا کہ ہمارے ایک دوست نے گوشت کے ہڈے کو پستول بنایا تھا واقعی یہ پستول سے بھی زیادہ کارآمد ہے کہ مشرکین اس کی صورت سے بھاگتے ہیں۔

کتابی علم:

مگر افسوس کہ آج کل بعض علماء کو بھی ذبح گاؤ کے شعار اسلام ہونے میں شک ہے۔ مگر یہ وہ علماء ہیں جو محض الفاظ کے جاننے والے ہیں اور دین کی فہم سے بالکل کورے ہیں۔ گو بات تو کہنے کی نہیں مگر ضرورت کی وجہ سے کہتا ہوں کہ آج کل بہت سے عالم محض الفاظ کے عالم ہیں جن کا فہم درست نہیں محض کتابیں ختم کر کے عالم کہلانے لگے بعض کی تو یہ حالت ہے کہ درسیات سے فارغ ہو گئے ہیں مگر کتابیں سمجھ کر نہیں پڑھیں اور جنہوں نے کتابیں سمجھ کر پڑھی ہیں ان کا علم بھی ہنوز کتابی علم ہے جو اسرار شریعت سمجھنے کے لئے ناکافی ہے یاد رکھو اس سے کچھ کام نہیں چلتا کہ دو چار آدمی تم کو مولٰنا اور مولوی کہنے لگے۔

بنمائے بصاحب نظرے گوہر خود را　　　عیسٰی نتواں گشت بتصدیق خرے چند

اپنا موتی کسی صاحب نظر کو دکھلاؤ کیونکہ چند گدھوں کی تصدیق سے تم عیسٰی نہیں ہو سکتے۔
جہلاء کی تعظیم وتکریم اور ان کے مولوی کہنے سے تم سچ مچ مولوی نہیں ہو سکتے بلکہ ضرورت اس کی ہے۔

قال را بگذار مرد حال شو　　　پیش مرد کاملے پامال شو۔

باتیں چھوڑو اپنے اندر حال پیدا کرو۔ کسی اللہ والے شیخ کامل کے سامنے پامال ہو جاؤ۔

نور فہم تقویٰ اور حال سے پیدا ہوتا ہے اور حال پیدا ہوتا ہے کسی کی جوتیاں سیدھی کرنے سے۔ کیونکہ یہ نفس بدوں اس کے سیدھا نہیں ہوتا۔ جب تک اپنے کو کسی کامل کے اس طرح سپرد نہ کرو گے کہ وہ تمہاری ذات میں جو چاہے تصرف کر سکے اس وقت تک شہوات واغراض نفسانیہ سے نجات نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے علماء نے دین کو اغراض کے تابع کر رکھا ہے کہ جب موقع ومحل دیکھا اسی کے موافق فتوے تراش لئے۔ بھلا ایسا علم بھی کچھ کام دے سکتا ہے یہ علم ابن آدم پر خدا کی حجت ہے، جس کی وجہ سے آخرت میں جہلاء سے زیادہ اس پر مواخذہ ہوگا۔ بعض لوگوں کو معالجہ نفس کا کچھ خیال بھی ہوتا ہے تو وہ یہ غلطی کرتے ہیں کہ اپنی رائے اور اپنے اجتہاد سے عمل شروع کرتے ہیں اور کتابیں دیکھیں مجاہدات وریاضیات میں مشغول ہو جاتے ہیں مگر یاد رکھو کہ کتابی نسخوں سے شفاء حاصل نہیں ہو سکتی اگر اس طرح شفا ہو جایا کرتی تو دنیا میں ایک بھی مریض نہ رہتا۔

کیونکہ طب کی بے شمار کتابیں موجود ہیں اردو میں بھی ان کے ترجمے ہوگئے ہیں۔ جن میں ہر قسم کے امراض کا علاج درج ہے۔ بس ہر شخص کتابیں دیکھ کر علاج کرلیا کرتا۔ طبیبوں کی ضرورت نہ ہوا کرتی مگر تجربہ شاہد ہے کہ اس طرح شفاء حاصل نہیں ہوتی۔ بدوں رجوع الی الطبیب کے چارہ نہیں۔ یہی حال معالجہ نفس کا ہے کہ اس میں بھی بدوں کسی ماہر طبیب روحانی کے کامیابی نہیں ہوتی جو لوگ خود بخود کام شروع کرتے ہیں ان کی حالت یہ ہے کہ جہاں کچھ سرسراہٹ معلوم ہوئی وہ اپنے کو کامل سمجھنے لگے۔ حالانکہ سرسراہٹ کو کامیابی سے کچھ بھی علاقہ نہیں بس میں وہی پھر کہوں گا۔

بنمائے بصاحب نظرے گوہر خودرا

اپنا موتی کسی صاحب نظر کو دکھلاؤ۔

کسی کامل کو اپنا رہبر بناؤ۔ اس کے سامنے اپنی چاندی سونا پیش کرو، وہ کسوٹی پر رکھ کر دیکھے گا۔ اس وقت حقیقت منکشف ہوگی، ورنہ ظاہر میں تو کھوٹی اور کھری چاندی یکساں ہی معلوم ہوا کرتی ہے۔

بلکہ بعض دفعہ کھوٹی چاندی بڑی بھڑکدار ہوتی ہے اور کھری چاندی میلی کچیلی خراب ہوتی ہے مگر آگ میں تپانے سے کھوٹی چاندی کی ساری بھڑک دور ہوکر اندر سے تانبا وغیرہ نکل آتا ہے اور کھری چاندی آگ میں ڈالتے ہی میل کچیل سے صاف ہوکر عمدہ نکلتی ہے۔ اس لئے کسی کی ظاہری ریاضت ومجاہدہ سے دھوکہ نہ کھانا چاہیے۔ اور صوفیوں کو اپنے احوال یا کیفیات یا سرسراہٹ سے اپنا معتقد نہ ہونا چاہیے بہت لوگ اس غلطی میں پڑے ہوئے ہیں کہ وہ اپنے کو صاحب نسبت سمجھتے ہیں مگر واقع میں ان کو نسبت مع اللہ حاصل نہیں کیونکہ نسبت نام ہے تعلق طرفین کا چنانچہ اہل علم جانتے ہیں کہ نسبت کے لئے طرفین سے تعلق کی ضرورت ہے ایک طرفہ تعلق کو نسبت نہیں کہا کرتے پس بہت لوگ ایسے ہیں کہ ان کو تو خدا سے تعلق ہے کہ اس کی یاد اور ذکر میں مشغول ہیں ملکۂ یادداشت بھی حاصل ہے جو کہ تھوڑی سی مشق سے حاصل ہوجاتا ہے، مگر خدا تعالیٰ کو ان سے تعلق نہیں تو بات کیا ہے کہ ان لوگوں کو خدا کے ساتھ محض یاد کا تعلق ہے اور یہ تعلق یکطرفہ ہے۔ عمل واطاعت سے تعلق دو طرفہ ہوتا ہے۔ جب انسان عمل واطاعت کا اہتمام کرتا ہے۔ اس وقت حق تعالیٰ کو بھی اس سے تعلق ہوجاتا ہے اور اطاعت فقط نماز ونوافل اور روزہ میں منحصر نہیں بلکہ ہر حالت کے متعلق احکام موجود ہیں۔ لین دین اور معاشرت ومجالست میں بھی اطاعت لازم ہے جب تمام احوال میں اطاعت کی جائے اس وقت دو طرفہ تعلق ہوتا ہے ورنہ وہ محض یک طرفہ تعلق ہے جو اس کا مصداق ہے۔

وقوم یدعون وصال لیلی　　ولیلی لا تقربهم بذا کا

لیلیٰ کے وصال کا دعویٰ کرنے والی بہت سی قومیں ہیں لیکن محض انکے دعویٰ سے لیلیٰ قریب نہیں ہو جائے گی۔

کہ بہت لوگ وصال لیلیٰ کے مدعی ہیں۔ مگر لیلیٰ ان کو منہ بھی نہیں لگاتی۔ وصال پر تو کیا راضی ہوتی۔ اسی واسطے محققین نے فرمایا ہے کہ اس راستہ میں بدوں رفیق کے چلنا دشوار ہے قدم قدم پر ٹھوکریں لگتی ہیں۔ کتابی علم اس راہ میں ہرگز کافی نہیں بلکہ یہاں تو اس کی ضرورت ہے۔

جملہ اوراق وکتب درنار کن سینہ را از نور حق گلزار کن

جملہ ورقوں اور کتابوں کو آگ میں ڈال دو اور اپنے سینہ کو نور حق سے گلستاں بناؤ۔

اس پر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ ان شاعر صاحب نے تو کتابوں کے جلانے کا حکم کر دیا بھلا ہم فقہ وتفسیر وحدیث کی کتابیں کس طرح جلا دیں؟ اس میں تو کتابوں کی اہانت ہے۔

اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ یہاں حقیقۃً جلانا مقصود نہیں بلکہ یہ ایک محاورہ ہے جس کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ ان چیزوں سے ذہن کو خالی کر لو اور واقعی چند روز کے لئے تمام علوم سے ذہن کا خالی کر لینا اس راہ میں ضروری ہے کیونکہ صاف تختی پر نقوش خوب لکھے جاتے ہیں جو تختی پہلے ہی سے نقوش میں بھری ہوئی ہے اس پر کوئی نیا نقش کیونکر جم سکتا ہے یہ تو ظاہری تاویل تھی۔ مگر میں طلبہ کی خاطر اس کی ایک اور تفسیر بیان کرتا ہوں کیونکہ یہ فرقہ بڑا وہمی ہے ان کی ایسی ظاہری باتوں سے تسلی نہیں ہوتی تو میں کہتا ہوں کہ اچھا صاحب آپ محاورہ کی تاویل نہ کیجئے اور مطلب یہی سمجھئے کہ تمام اوراق وکتب کو آگ میں جلا دو۔ مگر یہ بھی معلوم ہے کہ یہاں آگ سے مراد کونسی آگ ہے شاید تم نے اسی ظاہری آگ کو مراد سمجھا ہوگا۔ اسی لئے توہین کتب کا شبہ ہوا مگر یہی غلط ہے۔

سخن شناس نہ، دلبرا خطا ایں جا است

محبوب سخن شناس نہیں غلطی اس جگہ یہی ہے

صاحب! یہاں نار سے نار عشق مراد ہے اور مطلب یہ ہے کہ محض اوراق وکتب پر اکتفا نہ کرو بلکہ ان سب کو حاصل کر کے پھر سب کو نار عشق الٰہی میں پھونک دو۔ بتلایئے اب تو کچھ توہین نہیں ہوئی، شاید تم یہ کہو کہ پھر اگلے مصرع میں نور حق سے کیا مراد ہے؟ میں کہتا ہوں کہ نور حق اور نار عشق دو نہیں ہیں بلکہ ایک ہی چیز ہے جس کو ابتداء وانتہاء کے اعتبار سے نار ونور کہا گیا ہے عشق الٰہی ابتدا میں سوز وگداز وتپش کے ساتھ شروع ہوتا ہے پھر اخیر میں جب تمکین حاصل ہوتی ہے تو وہی نار نور وگلزار بن جاتی ہے۔ نور کوئی دوسری شئے نہیں ہے بلکہ وہی نار جب ٹھنڈی کر دی

جائے نور ہو جاتی ہے **قلنا یا نار کونی بردا وسلا ماعلی ابراھیم** (ہم نے کہا اے آگ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ٹھنڈی اور سلامتی والی ہو جا) تو نار ابراہیم وگلزار ابراہیم دو چیزیں تھوڑا ہی ہیں بلکہ وہی نار جو اول بصورت نار تھی اور حقیقت کے لحاظ سے بھی محرق تھی۔ ابراہیم علیہ السلام کے گرتے ہی ٹھنڈی ہو کر گلزار بن گئی۔ پس اس طریق میں ہر سالک کو ابراہیم وگلزار ابراہیم کا لطف حاصل ہوتا ہے۔ غرض میں یہ کہہ رہا تھا کہ آج کل بہت علماء لفظوں کے عالم ہیں اس لئے ان کا علم ناقص ہے ان کو تقویٰ وحال پیدا کر کے اپنے علم کی تکمیل کرنی چاہیے ایسے ہی ناقص علماء نے ذبیحہ گاؤ کے شعار اسلام ہونے کا انکار کیا ہے وہ اس کو شعائر دین میں سے نہیں سمجھتے مگر جن کو خدا نے نور فہم دیا ہے۔ وہ اس حقیقت کو سمجھ گئے اور انہوں نے اس کو شعار اسلام میں داخل سمجھا۔ چنانچہ حضرت مجدد صاحب قدس اللہ سرہ، کا بھی یہی ارشاد ہے کہ ”ذبح بقرہ در ہندوستان از اعظم شعار اسلام است،، (ہندوستان میں گائے ذبح کرنا بہت بڑے شعائر اسلام سے ہے)

اور آج کل کی حالت دیکھ کر مجدد صاحب کے اس قول کی پوری تصدیق ہوتی ہے کہ واقعی جو لوگ گائے کا گوشت نہیں کھاتے ان کو ہندو بھی پورا مسلمان نہیں سمجھتے۔ بلکہ اپنی برادری کا بھائی سمجھتے ہیں۔ ایسی حالت میں اس شعار اسلامی کا انکار وہی کر سکتا ہے جو نور فہم سے بالکل کورا ہو۔

ایک عالم نے میرے سامنے اعتراض کیا کہ دیکھئے صاحب فلاں مولٰنا نے ذبیحہ گاؤ کو شعار اسلام کہہ دیا۔ میں نے کہا وہ کیا کہتے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو شعار اسلام فرمایا ہے۔ کہنے لگے حضور نے کہاں فرمایا۔ میں نے کہا۔ مسلم کی روایت ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ **من صلی صلوتنا واستقبل قبلتنا واکل ذبیحتنا فذلک المسلم الذی لہ ذمۃ اللہ وذمۃ رسولہ الحدیث** (لم اجد الحدیث فی ”موسوعۃ أطراف الحدیث النبوی الشریف) (جو ہماری نماز پڑھے ہمارے قبلہ کی طرف منہ کر کے اور ہمارا ذبیحہ کھاتے وہ مسلمان ہے اس کیلئے اللہ اور اسکے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کافی ہے) اس میں حضورؐ نے مسلمان کی علامتیں بیان فرمائی ہیں کہ جس شخص میں یہ علامتیں موجود ہوں۔ اس کو مسلمان سمجھنا چاہیے کہ جو ہماری نماز پڑھے اور ہمارے قبلہ کا استقبال کرے اور ہمارا ذبیحہ کھائے وہ مسلمان جس کے لئے خدا ورسول کی پناہ وعہد ہے۔ پس جہاں آپ نے صلوٰۃ واستقبال قبلہ کو علامت اسلام قرار دیا ہے وہیں اکل ذبیحتنا بھی فرمایا ہے تو جو اعتراض آپ کو ان مولٰنا صاحب پر ہے کہ انہوں نے کھانے پینے کی چیز یا ایک جانور کے ذبح کو شعار اسلام کہہ دیا وہی اعتراض حدیث پر وارد ہوتا ہے کہ حضور نے

صلوٰۃ واستقبال قبلہ کے ساتھ اکل ذبیحہ کو کیسے بیان فرمادیا۔

شاید کوئی یہ کہے کہ اس میں تو مطلق ذبیحہ مسلم کے کھانے کو علامت اسلام بتلایا گیا ہے اس سے ذبیحہ بقر کا کھانا علامت اسلام معلوم نہیں ہوتا کیونکہ اس میں بقر کا لفظ وارد نہیں ہوا۔ میں کہتا ہوں کہ فہیم شخص کے لئے تو ذبحستا ہی بقرہ پر دلالت کرنے کے لئے کافی ہے چنانچہ عنقریب آتا ہے اور بدفہم کے لئے خود لفظ بقرہ کا مذکور ہونا بھی ناکافی ہے۔

چنانچہ میرٹھ میں ایک وکیل صاحب نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ اسلام میں گائے کا ذبیحہ کہیں نہیں بلکہ بکری کا ذبیحہ ثابت ہے۔ چنانچہ دیکھیے اس عید کا نام ہی بکرعید ہے۔ یعنی بکرے کی عید، اس ظالم نے بقر کو بکرے کی عربی سمجھا۔ واقعی جب ایسے ایسے ذہین دنیا میں ہونگے تو پھر ذبیحہ گاؤ کی دلیل شریعت میں کیوں ملے گی۔ اسی طرح اگر آپ بھی لفظ بقر حدیث میں ہونے کے بعد بھی تاویل کرنے لگیں تو پھر اس کا جواب بجز اس کے اور کیا ہوگا کہ۔

جواب جاہلاں باشد خموشی

جاہلوں کا جواب خاموشی ہے

خوشامد کی خرابی:

اور یہ ساری خرابی خوشامد کی ہے کہ یہ لوگ ہندوؤں سے اتحاد کرنے کے لئے ایسی لچر باتیں نکالتے ہیں۔ آج کل اتحاد واتفاق کا بہت جوش ہے۔ اسی جوش میں ایسے عالی مضامین اور باریک نکات سوجھتے ہیں۔ چنانچہ مظفر نگر میں ایک ہندو نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ جب تک ہم میں اتفاق نہ ہوگا کامیابی نہیں ہوسکتی۔ پھر کیا جانتے بھی ہو کہ ہم کے معنی کیا ہے؟ ہم کے معنی ہندو اور مسلمان۔ ہا سے مراد ہندو اور میم سے مسلمان، پھر کہا کہ ہمارے ہندو بھائی ناخوش نہ ہوں کہ ہا تو ذراسی ہے اور میم لمبا ہے۔ بات یہ ہے کہ ہندو تو ہندوستان ہی کے اندر اندر ہیں یہ کہیں باہر سے نہیں قومیت اسلامی کی یہی حمایت ہے کہ تم اسلامی تعلیم کو دوسرے مذاہب کی تعلیم کے آگے اور اسلامی علماء کو دوسری قوموں کے افراد کے سامنے ذلیل وپست کردو۔ اللہ یہی لوگ اسلام ومسلمانوں کو ذلیل کرتے ہیں اور یہی قومیت اسلامی کو برباد کرتے ہیں۔ ان تحریکات سے خدا تو ان کو مطلوب ہے ہی نہیں مگر جس قومیت کا یہ رات دن رونا روتے ہیں اس کی بھی جڑیں اکھاڑ رہے ہیں۔ قومیت کی حفاظت کا طریقہ یہ ہے کہ اپنی قوم کو دوسروں سے مستغنی ثابت کرو، خود محتاج نہ ہو، دوسری کو اپنا محتاج بناؤ۔ اپنی تعلیم کے مقابلہ میں کسی کی تعلیم کو ترجیح نہ دو اور ثابت کر دکھاؤ کہ

اسلامی تعلیم سے بہتر کوئی تعلیم نہیں۔

نیز اپنے علماء کے سامنے دنیا بھر کے عقلاء کو پست اور نیچا دکھا دو اور اس کے لئے کچھ تم کو کرنا نہیں پڑے گا۔ میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ الحمد للہ اسلام میں وہ لوگ موجود ہیں جن کے سامنے دنیا بھر کے سیاست دان طفل مکتب ہیں۔ قرآن وحدیث کے برابر سیاسی اور تمدنی تعلیم کون سی کتاب میں ہے ذرا کوئی لا کر تو دکھائے پھر جو لوگ قرآن وحدیث کے حقیقی طور پر سمجھنے والے ہیں ان کے برابر کوئی بھی عاقل یا سیاست دان ہو سکتا ہے۔ ہرگز نہیں۔ بخدا ہرگز نہیں مگر یہ ساری خرابی ان علماء کی ہے جو ہر بات میں ان لیڈروں کے ساتھ ہو لیتے ہیں اور لیڈروں کی طرح خود بھی کافروں کی سیاستدانی کے معتقد ہیں ان کی علانیہ مدح کرتے اور ممبر پر بیٹھ کر وعظوں میں تعظیم سے ان کا نام لیتے ہیں۔ اور یہ وہ علماء ہیں جنہوں نے کسی صاحب دل کی جوتیاں سیدھی نہیں کیں محض کتاب پڑھ کر عالم ہو گئے ہیں مگر۔

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند   نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند
ہزار نکتہ باریک تر زمو اینجاست   نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

دلبری ہر وہ شخص نہیں جانتا جو چہرہ کو چمکا لے اور نہ ہر وہ شخص سکندری جانتا ہے جو اپنے پاس آئینہ رکھتا ہے۔ یہاں بال سے زیادہ باریک ہزاروں نکتے ہیں قلندری ہر وہ آدمی نہیں جانتا جو اپنا سر منڈا لے۔

علم اس کا نام نہیں ہے کہ الفاظ یاد کر لئے علم اور ہی کسی چیز کا نام ہے۔

شاہد آں نیست کہ موئے ومیانے دارد
بندہ طلعت آں باش کے آنے دارد

محبوب وہ نہیں کہ اچھے بال اور پتلی کمر والا ہو بلکہ محبوب وہ ہے کو جو کچھ آن رکھتا ہو۔

ضرورت صحبت:

جس عالم میں ایک خاص آن ہو اس کا غلام بننا چاہیے وہ آن کیا ہے عشق ومعرفت وتقویٰ چند روز ایسے کسی عالم کی جوتیوں میں جا کر رہو اور اس کے سامنے اپنے لفظی علم کو فنا کر دو۔ پھر علم کی دولت نصیب ہوگی اور کامل کے سامنے لفظی علم کو فنا کرنے کی ضرورت اس لئے ہے کہ۔

پیش یوسف نازش وخوبی مکن   جز نیاز و آہ یعقوبی مکن
ناز را روئے بباید ہمچو ورد   چوں نداری گرد بدخوئی مگرد
عیب باشد چشم نابینا و باز   زشت باشد روئے نازیبا و ناز

یوسف علیہ السلام کے سامنے ناز و انداز مت دکھاؤ بلکہ انکے سامنے حضرت یعقوب علیہ السلام کی طرح عجز و انکساری کو۔ ناز کرنے کو گلاب جیسا چہرہ ہونا چاہیے جب تم ایسا چہرہ نہیں رکھتے تو بدخوئی کے پاس بھی نہ جاؤ۔ نابینا آنکھ کا کھلا رہنا عیب ہے، بدشکل کا ناز کرنا برا معلوم ہوتا ہے۔

یعنی جب تمہارے اندر حسن نہیں ہے تو یوسف کے سامنے ناز مت کرو۔ آہ و نیز سے پیش آؤ۔ جبھی امید ہے کہ وہ تم کو منہ بھی لگائے گا اور اگر تم نے اس زشت روئی کی حالت میں اس کے سامنے اپنے علوم پر ناز شروع کردیا تو وہ اپنے علم سے ذرا سا حصہ بھی تم کو نہ دے گا اور صاف کہہ دے گا۔

بامدعی مگوئید اسرار عشق و مستی　　　بگذارتا بمیرد در رنج خود پرستی

صرف زبانی دعوئی کرنے والوں سے عشق کے بھید مت کہو کرشمہ قدرت دامن دل کو کھینچتا ہے کہ دیکھنے کی یہی جگہ ہے۔

اب تو کثرت سے وہ لوگ ہیں جو کمال نہیں رکھتے مگر ایک کمال کی نقل کر کے دعوی کمال کا کرتے ہیں۔

ایسوں کی مثال میں ایک حکایت یاد آئی کہ ایک شخص (احمق) نے کسی ولایتی کو دیکھا جو اپنے گھوڑے کو پیار و شفقت کے ساتھ دانہ کھلا رہا تھا اور وہ گھوڑا کبھی ادھر منہ پھیر لیتا، کبھی ادھر، اور وہ کہتا کھاؤ بیٹا کھاؤ۔ انہوں نے اپنے دل میں سوچا کہ افسوس میری بیوی میری اتنی قدر بھی نہیں کرتی جتنی یہ شخص گھوڑے کی قدر کرتا ہے اب کے گھر جا کر ہم بھی ان ہی نخروں کے ساتھ کھانا کھایا کریں گے۔ چنانچہ گھر تشریف لائے اور بی بی کو حکم دیا ہمارے لئے دانہ بھگو دے پھر شام کو گھوڑے کی طرح کھڑے ہو کر حکم دیا کہ اگاڑی پچھاڑی کھونٹوں سے باندھ دے اور دم کی جگہ ایک جھاڑو بندھوائی اور حکم دیا کہ ہم کو دانہ کھلا دے اور جب ہم نخرے کریں تو ہماری خوشامد کرے اور کہے بیٹا آئے اور مسلمان عرب و ایران وغیرہ بہت دور سے آئے ہیں تو ان کی مسافت بہت لمبی ہے۔ اس لئے ان کے واسطے میم اختیار کیا گیا اور اس کو لمبا لکھا گیا۔

مگر اس شخص نے مسلمانوں کی بابت یہ خیال نہ کیا کہ شاید وہ یہ شبہ کرنے لگیں کہ ہا کو پہلے لکھا گیا اور میم کو پیچھے اور ہا کو میم کے سر پر سوار کیا گیا۔ اس کی کیا وجہ؟

شاید اس کا یہ جواب دیا جاوے کہ ہندو یہاں پہلے سے رہتے ہیں اور مسلمان بعد میں آئے ہیں اس لئے ہا کو پہلے اور میم کو پیچھے لایا گیا۔ مگر یہ شبہ پھر بھی باقی رہا کہ ہا کو میم کے سر پر سوار کیوں

کیا گیا؟ اس کو پہلے ہی لکھا ہوتا مگر میم سے الگ لکھا ہوتا مگر شاید اتحاد واتفاق ظاہر کرنے کے لئے خلط کی ضرورت پڑی ہو۔ اس لئے ایسا کیا گیا۔

واہیات خرافات یہ آج کل کے نکات ہیں جن کے سر نہ پاؤں مگر لوگ ہیں کہ ان مضامین پر لٹو ہیں اور ستم یہ کہ مسلمان بھی اس تقریر کے مداح تھے بلکہ یہاں نکات ومعارف ایسے ایسے عالی ہیں کہ دوسری قوموں کو ان کی ہوا بھی نہیں لگی۔ اسلامی علوم ونکات کے ہوتے ہوئے یہ واہیات باتیں اس قابل ہیں کہ مسلمان ان کی تعریف کریں؟

مگر ہماری قوم میں ایک مرض یہ بھی ہے کہ یہ دوسری قوموں کے افعال کی مدح کیا کرتے ہیں اور اپنے گھر کی چیزوں پر ان کو ترجیح دیتے ہیں چنانچہ ایک زمانہ انگریزوں کی پرستش کا تھا اس وقت تک ان کے افعال ومعاشرت کی مدح سرائی ہوتی تھی اور مسلمانوں کے طرز معاشرت پر ان کے طرز معاشرت کو ترجیح دی جاتی تھی۔ اب ہندوؤں کی پرستش کا دور ہے اب ان کی باتوں کی مدح وثنا ہوتی ہے۔ غرض یہ ہمیشہ دوسروں ہی کی پرستش میں رہیں گے۔ ان میں یہ حوصلہ نہیں رہا کہ اپنی دولت کے سامنے کسی کی چیز کو بھی منہ نہ لگادیں بلکہ سب کو اسی کے سامنے جھکانے کی کوشش کریں۔ افسوس ایسے مسلمان تو اب زمین کے اندر پہنچ گئے بس اب تو ایسے مسلمان رہ گئے ہیں کہ ایک صاحب کا مقولہ اخباروں میں شائع ہوا تھا کہ اگر نبوت ختم نہ ہوگئی ہوتی تو فلاں شخص (ایک ہندو کی طرف اشارہ ہے، نبوت کا مستحق تھا۔ افسوس اس شخص کو مسلمانوں میں کوئی اس قابل نہ ملا تھا ایک ہندو ہی اس قابل ملا تھا۔

اے صاحبو! میں پوچھتا ہوں کہ آخر یہ کونسا اسلام ہے جس میں نبی ہونے کے لئے ایمان کی بھی شرط نہیں۔ پھر لوگ کہتے ہیں کہ ہندو مسلم اتحاد کی مخالفت نہ کرو جس اتحاد کا یہ نتیجہ ہو کہ مسلمان اس سے الحاد کی طرف جائیں اس اتحاد پر صد نفریں ہے پھر کوئی ان لیڈر صاحب سے پوچھے کہ جب تمہارے نزدیک ہندو بھی قابل نبوت ہو سکتا ہے تو تم نے اس قضیہ شرطیہ کو کیوں تکلیف دی کہ اگر نبوت ختم نہ ہوگئی ہوتی۔ کیونکہ ایسی نبوت تو ختم نہیں ہوئی اس لئے کہ ختم تو وہ چیز ہوتی ہے جو پہلے شروع بھی ہو چکی ہو۔ اور ایسی نبوت تو آج تک شروع ہی نہیں ہوئی جس میں اسلام وایمان کی بھی قید نہ ہو۔ جب وہ شروع ہی نہیں ہوئی تو ختم بھی نہیں ہوئی بلکہ یہ تو تم نے نبوت کی نئی قسم نکالی ہے اس کے لئے یہ شرط بڑھانا کہ اگر نبوت ختم نہ ہوئی ہوتی محض حماقت ہے۔ تم کو یہ کہنا چاہیے تھا کہ نبوت اسلام تو ختم ہو چکی اب میں نبوت کی ایک دوسری قسم ایجاد کرتا ہوں جس میں اسلام

وایمان کی بھی قید نہیں اور اس قسم کا پہلا ہی فلاں شخص ہے۔

غرض عیب کرنے کے لئے بھی ہنر چاہیے۔ کفریہ کلمہ بھی زبان سے نکالا اور وہ بھی ایسے بے تکا جس کے سر نہ پاؤں اور کمل یہ کہ ایسے کلمات کہہ کر بھی یہ یوگ لیڈر اور مسلمانوں کے مقتداء بنے ہوئے ہیں کوئی عالم یا جاہل اس شخص کو متنبہ نہیں کرتا کہ ان کلمات ناشائستہ سے ایمان میں فرق آ گیا۔ تم اپنے ایمان کی سلامتی کی فکر کرو۔ اگر وہ اس سے توبہ نہ کرے تب تو ظاہر ہے اور اگر توبہ کرے جب بھی یہ لوگ یڈر اور مقتداء بننے کے قابل نہیں۔ کیونکہ ایسے کلمات سے معوم ہوگیا کہ یہ لوگ اسلام کی تعیم سے بالکل کورے اور نرے جاہل ہیں۔ سو توبہ کر کے گناہ تو معاف ہو جائے گا مگر ایک منٹ کی توبہ سے علم تو حاصل نہ ہو جائے گا۔

غرض مسلمانوں کے اندر یہ بڑا مرض پیدا ہو گیا ہے کہ ان کو دوسری قوموں کی چیزیں زیادہ وقیع معلوم ہوتی ہیں اور اپنے علماء کو چھوڑ کر یہ دوسری قوموں کے افراد کی عظمت کرنے لگتے ہیں اور پھر دعوی کرتے ہیں کہ ہم قومیت اسلامی کے حامی ومحافظ ہیں۔ ڈلے پتھر۔ کیا محبت دنیا ان کے قلب سے بالکل نکل گئی۔ انصار مدینہ نے مہاجرین کے ساتھ جو سلوک کیا اس سے ان کے قلوب بھی محبت الٰہی سے لبریز اور محبت دنیا سے پاک ہو گئے تھے۔ چنانچہ انصار نے خوش خوش ان حضرات کو اپنے مکانات واموال میں شریک کرنا چاہا بلکہ بعض صحابہ نے تو یہاں تک کیا کہ ایک مہاجر صحابی سے کہا کہ تم میرے بھائی ہو گئے ہو اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اپنا تمام مال آدھوں آدھ تقسیم کر کے نصف خود لے لوں اور نصف تم کو دے دوں اور میرے پاس دو بیبیاں ہیں ان میں سے جون سی تم کو پسند ہو۔ میں اسے طلاق دے کر ابھی الگ کر دوں عدت گذرنے کے بعد تم اس سے نکاح کر لینا۔ مہاجری نے ان کو دعا دی کہ خدا تمہارے مال وعیال میں برکت دے مجھے اس کی ضرورت نہیں تم مجھے بازار کا رستہ بتا دو (میں تجارت کر کے اپنا گذر کروں گا) غرض واقعہ ہجرت سے مہاجرین وانصار دونوں کا امتحان ہو گیا جس میں وہ کامل اترے۔ اس کے بعد ان کو اجازت قتال دی گئی کہ اب یہ جو کچھ کریں گے محض خدا کے لئے کریں گے جوش غضب اور خواہش انتقام وشفاء غیض نفس کے لئے کچھ نہ کریں گے۔ اس وقت یہ اس قابل ہوں گے کہ حمایت الٰہی ان کا ساتھ دے اور ملائکہ رحمت ان کی مدد کریں چنانچہ حضرات صحابہؓ کے واقعات اس پر شاہد ہیں کہ وہ جو کچھ کرتے تھے خدا کے لئے کرتے تھے حتی کہ مثنوی میں مذکور ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علیؓ نے ایک یہودی کو معرکہ قتال میں پچھاڑا اور ذبح کا ارادہ کیا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ اس

کم بخت نے آپ کے چہرہ مبارک پر تھوکا۔ اب چاہیے تھا کہ حضرت علیؓ اس کو فوراً ہی ذبح کر ڈالتے مگر تھوکنے کے بعد آپ فوراً اس کے سینہ پر سے کھڑے ہو گئے اور فوراً اسے چھوڑ دیا۔ وہ یہودی بڑا متعجب ہوا کہ میری اس حرکت کے بعد تو ان کو چاہیے تھا کہ مجھے کسی طرح جیتا نہ چھوڑتے۔ مگر انہوں نے برعکس معاملہ کیا۔ آخر اس سے نہ رہا گیا اور حضرت علیؓ سے اس کی وجہ پوچھی کہ اگر آپ نے مجھ کو کافر سمجھ کر قتل کرنا چاہا تھا تو تھوکنے کے بعد کیوں رہا کر دیا۔ اس فعل سے نہ میرا کفر زائل ہوا نہ عداوت سابقہ ختم ہوئی بلکہ اور زیادہ ہو گئی تھی۔

حضرت علیؓ نے فرمایا کہ واقعی اس فعل کے بعد میرا رہا کر دینا بظاہر عجیب ہے مگر بات یہ ہے کہ اول جب میں نے تجھ پر حملہ کیا تو اس وقت بجز رضائے حق کے مجھے کچھ مطلوب نہ تھا اور جب تو نے مجھ پر تھوکا تو مجھے غصہ اور جوش انتقام پیدا ہوا۔ میں نے دیکھا کہ اب میرا تجھے قتل کرنا محض خدا کے لئے نہ ہوگا بلکہ اس میں نفس کی بھی آمیزش ہوگی اور میں نے نہ چاہا کہ نفس کے لئے کام کر کے اپنے عمل کو ضائع کروں اس لئے تجھے رہا کر دیا۔ وہ یہودی یہ سن کر فوراً مسلمان ہو گیا اور سمجھ گیا کہ واقعی یہی مذہب حق ہے۔ جس میں شرک سے اس درجہ نفرت دلائی گئی ہے کہ کوئی کام نفس کے لئے نہ کرو بلکہ محض خدا کے لئے ہر کام کرو۔ دوستی اور دشمنی میں بھی نفس کی آمیزش سے روکا گیا ہے۔

اب ہماری یہ حالت ہے کہ جو لوگ خدمت اسلام کا دعوی کرتے ہیں ان میں اکثر وہ لوگ ہیں جو نفس کے واسطے کام کرتے ہیں اپنے ذرا ذرا سے کارناموں کو اچھالتے اور اخباروں میں شائع کرتے ہیں۔ احکام الٰہی کی پرواہ نہیں کرتے۔ بس ان کا مقصود یہ ہے کہ کام ہونا چاہیے خواہ شریعت کے موافق ہو یا مخالف۔ چندہ میں جائز و ناجائز کی پرواہ نہیں صرف میں حلال و حرام کا خیال نہیں۔ پھر حمایت الٰہی ان کے ساتھ کیوں کر ہو بلکہ اب تو یہ کہا جاتا ہے کہ میاں مسئلہ مسائل کو ابھی رہنے دو۔ اس وقت تو کام کرنا چاہیے بعد کو مسئلے مسائل دیکھے جائیں گے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ (ہم سب اللہ کیلئے ہیں اور اللہ ہی کی طرف لوٹنے والے ہیں) ان صاحبوں کو یہ خبر نہیں کہ مسئلے مسائل کے بغیر تو مسلمان کو نہ دنیوی فلاح ہو سکتی ہے نہ اخروی اور سب سے زیادہ اخلاص نیت کی ضرورت ہے جس کا یہاں صفر ہے۔

ہمارے بزرگان دین جو بحمد اللہ اب بھی موجود ہیں وہ محض خدا کے واسطے کام کرتے ہیں اسی لئے وہ کسی کام میں شریعت سے ایک انچ بھی بڑھنا نہیں چاہتے اسی طرح جو ان حضرات کے صحبت یافتہ ہیں وہ بھی نفس کے لئے کام نہیں کرتے۔ بزرگوں کی صحبت سے اگر اصلاح کامل بھی نہ ہو تو کم از کم اپنے عیوب ہی پر نظر ہونے لگتی ہے یہ بھی کافی ہے اور مفتاح طریق ہے۔ جس شخص کو اپنے

عیوب پر بھی نظر نہ ہو اس سے بڑھ کر محروم کھاؤ۔ چنانچہ ان سب احکام کی تعمیل کی گئی۔ آپ دانہ کھانے میں جوا چھلے کودے۔ کیونکہ گھوڑا بن رہے تھے۔ پیچھے کہیں چراغ رکھا تھا۔ وہ جھاڑو میں لگ گیا اور اگاڑی پچھاڑی بندھی ہونے کے سبب ہاتھ پاؤں بیکار ہو چکے تھے آگ بڑھنے لگی۔ بی بی بھی احمق کی احمق ہی تھی۔ محلہ میں دوڑی گئی کہ لوگو میرا گھوڑا جل گیا۔ اس کے یہاں گھوڑا کہاں؟ سب سمجھے مسخرا پن ہے کوئی نہ آیا۔ گھوڑے صاحب اپنے گدھے پن سے جل کر رہ گئے۔

خلاصہ یہ ہے کہ کاملین کے سامنے اپنے دعوؤں کو فنا کرنے کی ضرورت ہے مگر اب تو فنا در کنار ان کی موافقت سے بھاگتے ہیں اور بجائے ان کے کفار کا اتباع کرتے ہیں چنانچہ بعضے نام نہاد علماء ہندوؤں کے ساتھ ان تحریکات میں شریک ہوئے ہیں اور یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ اپنی روش پر چلنے سے تو کچھ زیادہ قدر نہیں ہوتی۔ نہ زیادہ دولت ملتی ہے۔ لاؤ وہی طریقہ اختیار کریں جو ہندوؤں نے اختیار کیا ہے شاید اس طرح کچھ زیادہ وقعت مل جائے اور اگر انہوں نے سوراج لے لیا تو اس میں ہمارا بھی حصہ رہے گا اگر ہم الگ رہے تو بالکل محروم رہیں گے؟ افسوس؟ مسلمان ہو کر غیر پر نظر؟ بڑی شرم کی بات ہے ان لوگوں نے یہ خیال نہ کیا کہ جو طریقہ کفار کے لئے حصول عزت کا ہے مسمان کے لئے وہ طریقہ نہیں ہے۔ مسلمان کبھی دوسری قوموں کا اتباع کر کے ترقی نہیں کر سکتا اگر وہ مسلمان ہے۔ مسلمان کی ساری عزت اسی میں ہے کہ وہ اپنے طریقہ پر قائم رہے اور کسی حال میں احکام شریعت سے تجاوز نہ کرے۔ اسی سے فلاح ہوتی ہے گو سامان کم ہو اور اس کے خلاف میں فلاح نہیں گو سامان زیادہ ہو۔

دیکھئے اس کی تائید میں ایک باریک نکتہ بتلاتا ہوں وہ یہ کہ مسلمانوں کو مکہ میں رہتے ہوئے قتال کی اجازت نہیں ہوئی۔ مدینہ میں پہنچ کر اجازت ہوئی۔ اس کی کیا وجہ ہے۔ ظاہر میں یہ سمجھتے ہیں کہ قلت جماعت وقلت اسباب اس کا سبب تھا یہ خلاف تحقیق ہے۔ کیونکہ مدینہ ہی میں پہنچ کر کیا جماعت بڑھ گئی تھی؟ کفار کا پھر بھی غلبہ تھا۔ مدینہ کی تمام جماعت تمام عرب کے مقابلہ میں کیا چیز تھی۔ بلکہ اگر یہ دیکھا جائے کہ تمام کفار عالم کے مقابلہ میں یہ اجازت ہوئی تھی۔ تب تو مدینہ کیا سارا عرب بھی قلیل تھا۔ اسی طرح مدینہ پہنچ کر سامان میں کیا زیادتی ہو گئی تھی۔ کفار ہمیشہ نہایت ساز وسامان سے مقابلہ کرتے تھے اور مسمانان مدینہ کی یہ حالت تھی کہ بعض مواقع میں ایک ایک سواری میں سات آٹھ آدمی شریک ہوتے تھے بعض دفعہ چند آدمیوں میں ایک ہتھیار مشترک ہوتا تھا پس یہ کہنا بالکل واقع کے خلاف ہے کہ مدینہ میں جا کر جماعت وسامان کی زیادت اس اجازت

کا سبب ہوئی۔ نصوص سے خود معلوم ہوتا ہے کہ مسمانوں کی جماعت کفار کے مقابلہ میں اکثر مواقع میں اس قدر کم ہوتی تھی کہ ملائکہ کا جوڑ لگایا جاتا تھا۔ چنانچہ ارشاد ہے **وانزل جنود الم تروها** (اور لشکروں کو اتارا جس کو تم نے نہیں دیکھا) اور ارشاد ہے **بلی ان تصبرو اوتتقوا ویاتوکم من فورهم هذا یمددکم ربکم بخمسة الاف من الملئکة مسومین** (ہاں کیوں نہیں اگر مستقل رہو گے اور متقی رہو گے اور وہ لوگ تم پر ایک دم سے آ پہنچیں گے تو تمہارا رب تمہاری امداد فرمائے گا پانچ ہزار فرشتوں سے جو خاص وصف بنائے ہوں گے) اور یہ صورت ملائکہ کی مکہ میں رہتے ہوئے بھی ممکن تھی مگر پھر بھی اس صورت کو اختیار کر کے وہاں اجازت نہ دی گئی تو اس کی کوئی اور وجہ بتلانی چاہیے۔ اہل ظاہر اس کی شافی وجہ نہیں بتلا سکتے۔

محققین نے فرمایا ہے کہ اصل بات یہ تھی کہ مکہ میں عام مسلمانوں کے اندر اخلاق حمیدہ اخلاص وصبر وتقویٰ کامل طور پر راسخ نہ ہوئے تھے۔ اس وقت اگر اجازت قتال کی ہو جاتی تو سارا مقابلہ جوش غضب وانتقام للنفس کے لئے ہوتا محض اخلاص واعلاء کلمۃ اللہ کیلئے نہ ہوتا اور اس حالت میں وہ اس قابل نہ ہوتے کہ ملائکہ کی جماعت سے ان کی امداد کیجاوے اور حمایت الٰہی ان کے شامل حال ہو۔ چنانچہ آیت مذکورہ میں **بلی ان تصبروا وتتقوا** (ہاں کیوں نہیں اگر مستقل مزاج اور متقی رہو گے) یہ شرط بتلا رہی ہے کہ حمایت الٰہی اسی وقت متوجہ ہوتی ہے جب کہ مسلمان صبر وتقویٰ میں راسخ ہوں (اور تقویٰ کے معنی ہیں احتراز **عمانهی الله عنه وامتثال ما امر به** جس میں اخلاص اور احتراز **عن الریاء وعن شائبة النفس** بھی داخل ہے ۱۲ جامع اور مدینہ میں پہنچ کر یہ اخلاق راسخ ہو گئے تھے مہاجرین کو مکہ میں رہنے کی حالت میں کفار کی ایذاء پر صبر کرنے سے نفس کی مقاومت سہل ہو گئی نیز قوت غضب نفسانی ضعیف بلکہ زائل ہو گئی تھی۔ پھر ہجرت کے وقت جب انہوں نے اپنے وطن واہل وعیال ومال ودولت سب پر خاک ڈال دی تو ان کی محبت الٰہی کامل ہو گئی اور

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت　　سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

دشمن کا ایسا نصیب نہ ہو کہ تیری تلوار سے ہلاک ہو تیری خنجر آزمائی کیلئے دوستوں کا سر سلامت رہے۔

اور اس میں راز یہ ہے کہ اہل اللہ نے ایک سے تعلق جوڑ لیا ہے بس ان کو اگر خوف ہے تو اسی کا ہے۔ امید بھی ہے تو اسی سے ہے۔ اس لئے ہر حال میں وہ خوش رہتے ہیں۔ کسی بڑے سے بڑے واقعہ میں وہ خلاف حق کچھ نہیں کرتے چاہے کام ہو یا نہ ہو۔

غرض حاصل ہو یا فوت ہو۔ جیسے حضرت علیؓ نے عین موقع پر یہودی کو چھوڑ دیا تھا حالانکہ ظاہر اس میں اپنی جان کا خطرہ تھا کہ دشمن رہا ہو کر پھر مقابلہ پر آمادہ ہوگا۔ مگر ان کو خطرہ کی کچھ پرواہ نہ ہوئی ان کا تو مذاق یہ تھا۔

دلآرامے کہ داری دل درو بند دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

اے دل تو اپنے مقصد میں لگا رہ اور سارے جہان سے آنکھیں بند کر لے۔

اور یہ حال تھا۔

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار بگذارند و خم طرۂ یارے گیرند

میرے نزدیک مصلحت یہ ہے کہ یار لوگ تمام کاموں کو چھوڑ کر محبوب حقیقی کے تصور میں لگ جائیں۔

اور جن کو خدا کے ساتھ یہ تعلق حاصل نہیں ان کی یہ حالت ہے کہ آج ان کے کچھ فتوے ہیں اور کل کو جہاں اغراض بدلیں، ساتھ کے ساتھ ان کے فتوے بھی بدل گئے۔ ارے یہ کیا قصہ ہے یہ کیسا اسلام ہے؟ جو اغراض کے تابع ہے مسلمان کو تو ایسا ہونا چاہیے کہ۔

یکے خوان و یکے دان و یکے گو

ایک ہی کو پڑھو، ایک ہی کو دیکھو اور ایک ہی کو کہو (یعنی اللہ تعالیٰ)

مسلمان کو تو ایسا ہونا چاہیے کہ اس ذات کے ساتھ علاقہ رکھے، جو ہمیشہ باقی رہنے والی ہے اور اغراض فانیہ کی نفی کرنی چاہیے اور ان کے متعلق لا احب الآفلین کہہ دینا چاہیے۔

خلیل آسا در ملک یقین زن صدائے لا احب الآفلین زن

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح یقین کا دروازہ ہو جا اور غروب ہو جانے والوں کو میں پسند نہیں کرتا کہ آواز لگاتی جا۔

پہلے سب علماء کا فتویٰ تھا کہ ریل میں بدوں ٹکٹ کے سفر کرنا حرام ہے مگر اب یہ حالت ہے کہ اس کو جائز کر دیا گیا۔ بہت لوگ جو علماء وطلباء کہلاتے ہیں بے ٹکٹ سفر کرنے لگے۔ میرے پاس ایک طالب علم کا خط آیا کہ میں بدوں ٹکٹ کے ریل میں سفر کرنے کو جائز سمجھتا ہوں اور میرے باپ اس سے منع کرتے ہیں۔ ان کے باپ انگریزی خواں دنیادار تھے اللہ اکبر کبھی وہ زمانہ تھا کہ عربی خواں اس سے منع کرتے تھے اور انگریزی خواں جائز کہتے تھے۔ اب یہ حالت ہے کہ عربی خواں جائز کہتا ہے اور انگریزی خواں منع کرتا ہے۔ بات یہ ہے کہ وہ انگریزی داں کسی دانا (عارف) کا ذبح کیا ہوا تھا۔

نورِ فہم:

میں قسم کھا کر کہتا ہوں اور اس سے زیادہ اور کوئی ذریعہ اطمینان دلانے کا میرے پاس نہیں ہے کہ نورِ فہم بدوں کسی باقی باللہ فانی فی اللہ کی صحبت کے حاصل نہیں ہوتا۔ اس کے بدوں وہ علم ایسا ہوتا ہے جیسے طوطے کو بعض لوگ قرآن کی سورتیں یا فارسی جملے یاد کرا دیتے ہیں۔ ایسا علم صرف زبان پر ہوتا ہے دل میں اس کا اثر نہیں پہنچتا۔ وقت پر سارا علم غائب ہو جاتا ہے۔ محض اغراض نفسانی کی حفاظت کا خیال غالب ہو جاتا ہے جیسے طوطا اگر بلی کے منہ میں آجاوے تو سوائے ٹیں کے اور سارا علم اس کا کافور ہو جاتا ہے چنانچہ ایک ظریف شاعر نے ایک طوطے کی تاریخ موت لکھی ہے۔

میاں مٹھو جو ذاکر حق تھے   رات دن ذکر حق رٹا کرتے
گربہ موت نے جو آ دابا   کچھ نہ بولے سوائے ٹے ٹے ٹے

کمال یہ کیا کہ تاریخ موت ٹے ٹے ٹے ہی سے نکلتی ہے یعنی ۱۲۳۰ھ

اسی طرح اللہ کا ہو رہے تب اسلام کامل ہوتا ہے ورنہ وقت پر سب لکھا پڑھا غائب ہو جاتا ہے صاحبو! بدوں صحبت اہل اللہ کے توحید بھی کامل نہیں ہوتی کیونکہ توحید کی حقیقت یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی سے خوف و طمع نہ ہو۔

موحد چہ برپائے ریزی زرش   چہ فولاد ہندی نہی برسرش
امید و ہراسش نباشد زکس   ہمیں است بنیاد توحید و بس

مؤحد اور عارف کے قدموں میں چاہے سونا ڈال دو یا اس کے سر پر تلوار رکھ دو۔ امید اور خوف اس کو بجز خدا کے کسی سے نہیں ہوتا۔ توحید کی بنیاد بھی اسی پر ہے۔

مگر ہماری یہ حالت ہے کہ ہم اسلام کے درجہ ناقص پر کفایت کرتے ہیں۔ اس کی کوئی نہیں۔ بس پھر تو وہی حالت ہوتی ہے کہ جیسا موقعہ دیکھا ویسا کر لیا۔ اپنی اغراض کے موافق فتوی نکال لیا جیسا کہ ان مولوی صاحب نے حدیث میں اکل ذبیحتنا سن کر بھی یہی کہا کہ اس سے تو ذبیحہ گاؤ کا شعار اسلام ہونا معلوم نہیں ہوتا۔ ان کے اندر نرا جوش تھا۔ کسی کے پاؤں تلے ملے نہیں گئے تھے اس لئے جوش غالب رہا فہم درست نہ ہوا۔ فہم درست ہوتا ہے اس سے کہ۔

قال را بگذار مرد حال شو   پیش مرد کاملے پامال شو

قال کو چھوڑو اپنے اندر حال پیدا کرو کسی شیخ کامل کے سامنے پامال ہو جاؤ۔

مگر ہائے یہ کس سے ہو۔ اس وقت تو مولنا کہلاتے ہیں لوگ تعظیم کرتے ہیں ہاتھ پیر چومتے

ہیں اور اب ایسی جگہ جائیں گے جہاں نالائق کا خطاب ملے۔ بیوقوف بنائے جائیں۔ بات بات پر روک ٹوک کی جائے مگر یہ صرف چندروز کی مشقت ہے پھر ساری عمر کی راحت ہے۔ چندروز کی روک ٹوک سے جب نفس کی اصلاح ہو جائیگی اور خداتعالیٰ سے تعلق درست ہو جائیگا تو وہ دولت عطا ہوگی جس کے سامنے سلطنت ہفت اقلیم بھی گرد ہے۔

چند روزے جہد کن باقی بخند

چندروز محنت کرو پھر راحت سے رہو۔

جس شخص کے اندر مادہ فاسدہ کا غلبہ ہوتا ہے اس کے لئے ضرور مسہل کی ضرورت ہے مگر مسہل ساری عمر کا نہیں ہوتا چندروز کیلئے ہوا کرتا ہے پھر خمیرہ گاؤزبان کھلایا جاتا ہے۔

قلبی دولت:

جس کو یہ دولت نصیب ہوگئی ہے اس سے پوچھو خدا کی قسم اہل اللہ کے برابر کسی کو راحت نہیں۔ ان کو وہ دولت عطا ہوئی ہے جس کی وجہ سے نہ ان کو کسی خوف کی چیز سے خوف رہتا ہے نہ طمع کی جگہ طمع ہوتی ہے اور اگر یہ بات نصیب نہیں تو اس شخص کی پریشانی کی کوئی حد نہیں۔

ہیچ کنجے بے دو دبے دام نیست   جز بخلوت گاہ حق آرام نیست

کوئی گوشہ دوڑ دھوپ اور بغیر دام کے نہیں ہے سوائے خلوت گاہ حق کے کہیں آرام نہیں ہے۔

واقعی خلوت گاہ حق ہی میں آرام مل سکتا ہے اور کہیں راحت نہیں۔ اسی کو فرماتے ہیں **الا بذکر اللہ تطمئن القلوب** (جان لو کہ دلوں کو اطمینان اللہ کے ذکر سے ہی ہوتا ہے) میں یہ نہیں کہتا کہ اہل اللہ کو پریشان کن واقعات پیش نہیں آتے۔ نہیں واقعات ان کو بھی پیش آتے ہیں اور ان کو تکلیف بھی ہوتی ہے۔ مگر وہ کلفت لذیذ ہوتی ہے جیسے کباب مرچوں بھرا لذیذ ہوتا ہے گوناک آنکھ سے آنسو بھی بہتے رہتے ہیں اور جیسے تمباکو۔ جو لوگ تمباکو کھانے والے ہیں ان سے پوچھو کیسا لذیذ ہوتا ہے۔ دوسروں کو تو ایک چٹی سے چکر آجاتا ہے مگر جو اس کے عادی ہیں ان کو خبر بھی نہیں ہوتی بلکہ اور مزا آتا ہے اور جتنا کڑوا تیز ہوا تنا ہی ان کو لطف آتا ہے۔

ایک شخص کی حکایت ہے کہ وہ ایک دوکان سے تمباکو لینے گیا اور دوکاندار سے کہا کہ خوب کڑوا تمباکو دینا۔ اس نے دکھلایا کہ میرے یہاں سب سے کڑوا یہ ہے۔ اس نے کہا کہ نہیں اس سے بھی کڑوا دو تو دوکاندار کیا کہتا ہے کہ توبہ توبہ! بس اس سے کڑوا خدا کا نام۔

یہ شخص اس کلمہ سے کافر نہیں ہوا کیونکہ اس کے نزدیک کڑوا ہونا کمال تھا۔ اس لئے مطلب یہ

ہوا کہ یہ تمبا کو بہت کامل ہے۔ بس اس سے زیادہ کامل خدا کا نام ہے تو اس کے کلام میں کڑوا بمعنی کامل ہے۔ البتہ یہ عنوان نہایت قبیح ہے تو دیکھئے اس شخص کے نزدیک تمبا کو کڑوا ہونا کیسا کمال مطلوب تھا۔ غرض ایسی نظائر دنیا میں موجود ہیں کہ ایک چیز بعض لوگوں کے نزدیک باعث کلفت ہے اور دوسرے کے نزدیک لذیذ ہے اسی طرح مصائب سے عام لوگوں کو کلفت ہوتی ہے مگر اہل اللہ کو اس میں بھی لذت آتی ہے گو ظاہر میں تکلیف ہو جیسے کوئی محبوب اپنے عاشق کو زور سے دبائے اور ایسا دبائے کہ اس کی پسلیاں دکھنے لگیں ظاہر میں گو اس کو تکلیف ہوگی مگر اس کی لذت کو کوئی اس کے دل سے پوچھے اس کا دل تو یوں کہہ رہا ہوگا۔

ناخوش تو خوش بود بر جان من   دل فدائے یار دل رنجان من

محبوب کی جانب سے جو امر پیش آئے گو وہ طبیعت کو ناخوش ہی کیوں نہ ہو مگر وہ میری جان پر خوش اور پسندیدہ ہے جو میری جان کو رنج دینے والا ہے میں اپنی جان اس پر قربان کرتا ہوں۔

تجھے جو چیز ناپسند ہے وہ بھی اچھی معلوم ہوتی ہے میرا دل بے قرار تو یار پر فدا ہے۔

اور اگر محبوب اس سے یہ کہے کہ تجھے تکلیف ہوتی ہو تو میں تجھے چھوڑ کر رقیب کو دبانے لگوں تو وہ یوں کہے گا۔

فانھم لا یعلمون (الٰہی میری قوم کی آنکھیں کھول دے کیونکہ یہ مجھ کو پہچانتے نہیں ہیں۔ اس لئے میرے ساتھ ایسا برتاؤ کر رہے ہیں اگر یہ مجھ کو پہچان لیتے تو ہرگز میرے ساتھ یہ معاملہ نہ کرتے ۱۲)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تو بڑی شان ہے آپ کے غلامان غلام بھی امت کے حال پر ایسے شفیق و مہربان ہوئے ہیں کہ اپنے ایذا رسانوں کے لئے ہمیشہ دعا ہی کرتے تھے۔ حضرت ابراہیم بن ادہم جب غار نیشاپور سے نکلے ہیں تو انہوں نے حج کا ارادہ کیا اور چونکہ یہ حج نفلی تھا اس لئے تکمیل سلوک کے بعد انہوں نے حج کا قصد کیا۔ اس سے پہلے نہیں کیا کیونکہ تکمیل سے پہلے نفس گندگیوں سے ملوث ہوتا ہے تو اس پاک دربار کے اندر یہ ناپاکیاں لے کر نہ جانا چاہیے۔ جب نفس تمام گندگیوں سے پاک صاف ہو جاوے اس وقت اس قابل ہوتا ہے کہ اس دربار میں حاضر ہو۔ ہاں فرض حج اس سے مستثنیٰ ہے۔ بعض لوگ تو مکہ ایسے جاتے ہیں کہ ایک نواب کو گورنمنٹ نے جلاء وطن کیا اور ان سے پوچھا گیا کہ کہاں رہنا چاہتے ہو؟ انہوں نے مکہ تجویز کیا کہ مجھے مکہ بھیج دیا جائے اب وہاں ان کی یہ حالت تھی کہ روزانہ سڑک پر کھڑے ہوئے عورتوں کو گھورتے تھے۔ اسی طرح بعض لوگ حج کا ارادہ محض سیر و سیاحت کی نیت سے کرتے ہیں۔ اس لئے ان لوگوں کو سفرنامے لکھنے

اور راستہ کے حالات قلمبند کرنے کا شوق ہوتا ہے۔ اس کو حضرت عراقی فرماتے ہیں۔

بطواف کعبہ رفتم بحرم رہم ندارد　　کہ برون در چہ کردی کہ درون خانہ آئی
زمین چو سجدہ کردم ز زمین ندا برآمد　　کہ مراخواب کردی تو بسجدۂ ریائی

میں کعبہ کے طواف کیلئے گیا تو مجھے رستہ نہ دیا گیا کہ تو نے کعبہ کے باہر ہی کیا کیا کہ اندر آ رہا ہے جب میں نے زمین پر سجدہ کیا تو زمین پکاری کہ تو نے مجھے سجدہ کر کے خراب کر دیا۔

اور ایسے ہی لوگوں کو شیخ مسعود بک خطاب فرماتے ہیں۔

اے قوم بحج رفتہ کجائید کجائید　　معشوق درینجاست بیائید بیائید

اے لوگو حج کو کہاں جاتے ہو معشوق یہاں ہے۔ ادھر آؤ، ادھر آؤ۔

مطلب یہ ہے کہ جس حالت سے تم حج کو جا رہے ہو اس حالت میں رضائے محبوب اور وصال تم کو حاصل نہ ہوگا۔ ابھی تم کو اپنے گھر ہی میں کسی شیخ کے پاس رہ کر اصلاح نفس میں مشغول ہونا چاہیے۔

اور یہ مت سمجھو کہ شیخ حج سے روک رہے ہیں نہیں بلکہ وہ تمہارے ایمان کی حفاظت کر رہے ہیں۔ بعض لوگ حج کو جاتے ہیں مگر ایمان کو مکہ ہی میں چھوڑ آتے ہیں۔ ان میں راستہ میں تکالیف کی جب برداشت نہیں ہوتی تو خدا اور رسول پر اعتراض کرتے ہیں اور حج کو فضول بتلاتے ہیں۔ بتلاؤ ان کا ایمان کہاں رہا۔ ایسے لوگوں سے یہی کہا جائیگا کہ تم ہندوستان میں رہ کر پہلے کسی شیخ سے نفس کی اصلاح کا نسخہ لے کر پی لو۔ جب وہ اجازت دے تب حج کرنا۔ البتہ حج فرض کے لئے جانے کی تو ہر حال میں اجازت ہے۔ ہاں حج نفل سے اس کو منع کیا جائیگا۔ کیونکہ بعض لوگ نفل حج کے لئے بہت سے فرائض ترک کر دیتے ہیں۔ چنانچہ جہاز کے اندر آپ کو ایسے حاجی بہت ملیں گے جو دوسرے تیسرے حج کو جا رہے ہوں گے مگر نماز ندارد۔

ہمارے ساتھ ایک سید صاحب عرب تھے وہ جہاز میں نماز نہ پڑھتے تھے اور روتے تھے کہ یہاں پاخانہ میں پانی شرشر چلتا ہے جس سے چھینٹیں پڑ کر کپڑے ناپاک ہو جاتے ہیں۔ میں نماز کیسے پڑھوں۔ میں نے کہا۔

چوں طمع خواہد زمن سلطان دین　　خاک برفرق قناعت بعد ازیں

مجھ سے شہنشاہ دین اگر طمع کا خواہاں ہو تو پھر ایسی قناعت پر خاک

اگر خزانہ شاہی میں کھوٹے روپے منظور ہوتے ہوں تو ہم کون ہیں جو یوں کہیں کہ نہیں حضور تم

تو کھرے ہی دیں گے، کھوٹے کبھی داخل نہ کریں گے۔ جب حق تعالیٰ کی طرف سے ہم کو حکم ہے کہ جہاز میں تم وسوسہ اور شبہ کی وجہ سے نماز ترک نہ کرو۔ پڑھتے رہو۔ تو ہم کو وسوسہ کی کیا ضرورت ہے؟ بس اگر کہیں ناپاکی آنکھوں سے نظر آ جاوے اس کو پاک کر دو۔ اگر نظر نہ آوے تو وہم کی کیا ضرورت ہے مگر وہ سید صاحب روتے تو بہت تھے جہاز میں نماز ایک دن نہ پڑھتے تھے۔ یاد رکھو بدوں عمل کے رونا کچھ مفید نہیں۔ بعض لوگ صرف وعظ میں رونے کو کافی سمجھتے ہیں مگر یہ تو ایسا ہوا جیسا گنگا کا اشنان کہ ذرا سا پانی بدن پر ڈال لیا اور سب پاپ بہہ گئے۔ لیکن یہ تو ہندوؤں کا اعتقاد ہے۔ مسلمان کا عقیدہ تو یہ ہے۔

تکمیل کی فکر نہیں کرتے۔ نہ نماز کی فکر ہے نہ روزہ کی۔ اسی قصہ پر یہ بیان چلا تھا۔ پس ہم کو تکمیل اسلام کی فکر چاہیے۔ اسلام کامل یہ ہے کہ انسان پورا اللہ والا ہو جاوے۔ جس کا ایک شعبہ یہ ہے کہ دین کو دنیا اور اغراض کے تابع نہ بنایا جاوے۔ اس وقت دین کی فہم حاصل ہوگی اور جس کے اوپر اغراض نفسانی کا غلبہ ہوگا اسے دین کی سمجھ حاصل نہ ہوگی۔ ایسے ہی علماء کا یہ خیال ہے کہ ذبیحہ گاؤ شعار اسلام نہیں اب میں حدیث سے اس کا شعار اسلام ہونا ثابت کرتا ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ **من صلی صلوتنا واستقبل قبلتنا واکل ذبیحتنا فهذا هو المومن الذی له ذمة الله ورسوله فلا تحقروه فی ذمة** (''لم اجد الحدیث فی موسوعۃ أطراف الحدیث النبوی الشریف'') (او کما قال) **اکل ذبیحتنا** میں اضافت تخصیص ہے جیسا کہ **من صلی صلوتنا واستقبل قبلتنا** میں بھی ایسی ہی اضافت ہے کیونکہ نماز تو یہود و نصاریٰ کے مذہب میں بھی ہے اسی طرح استقبال قبلہ بھی ان کے مذہب میں موجود ہے تو اضافت تخصیص سے یہ مطلب حاصل ہوا کہ جو شخص ایسی نماز پڑھے جو اسلام کے ساتھ خاص ہے اور اس قبلہ کا استقبال کرے جو مسلمانوں کے ساتھ مخصوص ہے وہ مسلمان ہے۔ تو یہی مطلب ذبیحتنا کی اضافت سے بھی حاصل ہوگا کہ جو شخص وہ ذبیحہ کھائے جو اہل اسلام کے ساتھ مخصوص ہے تو ایسے ذبیحہ کا کھانا اسلام کی علامت ہے۔ اب بتلاؤ کہ ہندوستان میں ایسا خاص ذبیحہ کونسا ہے جو اہل اسلام کے ساتھ خاص ہے ظاہر ہے کہ وہ بجز ذبیحہ گاؤ کے اور کوئی نہیں تو پھر اس کے شعار اسلام ہونے میں کیا شبہ رہا۔ بس میں تو یہ کہتا ہوں کہ مسلمانوں کو اس کی کوشش کرنی چاہیے کہ جن گاؤں والوں پر ارتداد کا خطرہ ہو۔ ان کو گائے کا گوشت کھلانا شروع کریں پھر وہ ایسا پہرہ دار ہو جائیگا کہ کفار وہاں سے بھاگ جائیں گے۔ گائے کا گوشت کھا لینے کے بعد ان کو ان گاؤں والوں کی طرف سے مایوسی ہو جائے گی۔ اس مضمون سے

دوسری قوموں کی دل آزاری مجھے مقصود نہیں ہے بلکہ ہم تو اپنے بھائیوں کی اصلاح کا طریقہ بتلا رہے ہیں۔ دوسروں سے ہم کو کیا غرض؟ دل آزاری یا مقابلہ کرنا سیاستدانوں کا طریقہ ہے ہم لوگوں کو سیاسی تدابیر سے کوئی سروکار نہیں ہم تو محض مذہبی احکام بیان کرتے ہیں۔ تو ایک مقصود تو میرا اس وقت یہ تھا کہ ہم لوگوں کو اپنے اسلام کی تکمیل میں سعی کرنا چاہیے۔

تبلیغ اسلام:

دوسرا مقصود یہ ہے کہ جب اسلام ہی دین کامل ہے تو جن لوگوں کے پاس یہ نعمت نہیں ہے ان کے پاس بھی اس کو پہنچانا چاہیے۔ کیونکہ اول تو یہ بات مروت اور ہمدردی کے خلاف ہے کہ ایک نافع چیز سے خود ہی انتفاع کیا جائے اور دوسروں کو محروم رکھا جائے۔ مثل مشہور ہے کہ۔

حلوا بہ تنہا نبایست خورد

حلوہ اکیلا نہ کھانا چاہیے۔

دوسرے ہم کو شرعاً بھی اس کا حکم ہے کہ جن لوگوں کو اسلام کی خوبیاں معلوم نہیں ہیں۔ ان کے سامنے اس کے محاسن کو بیان کریں تو اب دو قسم کے لوگ ہیں ایک تو وہ جن کے پاس نعمت اسلام ہے مگر ادھوری ہے ان کو تو پورا مسلمان بنانے کی سعی کی جائے۔ اس شعبہ کا نام میں تکمیل اسلام رکھتا ہوں۔ دوسرے وہ جن کے پاس یہ نعمت نہیں ہے ان کو اسلام پہنچانا چاہیے۔ اس شعبہ کا نام میں تبلیغ اسلام رکھتا ہوں۔ اس میں بہت زمانہ سے مسلمان کوتاہی کر رہے ہیں۔ اس فرض کو بھی نے بھلا دیا۔ حالانکہ انبیاء علیہم السلام کا اصل کام یہی تھا۔ وہاں پڑھنا پڑھانا اور کتابوں کا درس کہاں تھا انبیاء علیہم السلام کا اصل کام تبلیغ ہی تھا۔ اب ہماری یہ حالت ہے کہ بہت لوگ تو اس کو معمولی کام سمجھتے ہیں اور جو اس کی ضرورت و مرتبہ کو کچھ سمجھتے بھی ہیں۔ وہ بھی ایسی جگہ جا کر تبلیغ کرتے ہیں جہاں ان کی خاطر و مدارت ہوتی ہے۔ کفار میں جا کر کوئی تبلیغ نہیں کرتا کیونکہ وہاں خاطر مدارت کہاں؟ بلکہ بعض دفعہ برا بھلا سننا پڑتا ہے۔ اس وجہ سے لوگ کفار کو تبلیغ کرتے ہوئے رکتے ہیں۔ افسوس انبیاء علیہم السلام کی تو یہ حالت تھی کہ جن لوگوں نے ان کے خون بہائے سر پھوڑے، دانت توڑے لوہے کا خود سر میں گھسا دیا، ان کو بھی تبلیغ کرتے رہے۔ تمام تکالیف جھیلتے رہے، مگر تبلیغ سے نہیں رکے اور بڑا کمال یہ کہ ایسی ایسی تکالیف سہنے پر بھی کفار کے حق میں بددعا نہیں کی۔ شفقت کا یہ عالم تھا کہ ایسے دشمنوں کے واسطے بھی ان کے منہ سے یہ دعا ہی نکلتی تھی رب اهد قومی (الصحیح لمسلم ۱۶۴)

عرفی اگر بگریہ میسر شدے وصال   صدسال میتواں بہ تمنا گریستن

اے عرفی اگر رونے سے وصال محبوب میسر آ جائے تو وصال کی تمنا میں سو سال بھی رو سکتے ہیں۔ رونے سے بدوں عمل کے کچھ نہیں ہوتا اور اگر عمل ہو اور رونا نہ آوے تو اس سے کچھ نقصان نہیں ہوتا۔

میرے ایک دوست نے لکھا کہ مجھے رونا نہیں آتا۔ میں نے لکھا پھر کیا حرج ہے تمہارا دل تو رو رہا ہے تم اس کے مصداق ہو۔

اے خنک آں دل کہ آں بریان اوست

اے ٹھنڈک اس دل پر خوش ہو جو بھنا ہوا ہے۔

غرض نفل حج کے لئے جانے سے پہلے نفس کی اصلاح ضرور کر لینی چاہیے۔ مکہ ایسی حالت میں جاوے کہ وہاں پہنچ کر ہندوستان یاد نہ آوے۔ نہ وہاں کی تکالیف سے گھبرا کر یہاں کی راحتوں کا خیال آوے۔ ہمارے حاجی صاحب کا ارشاد ہے کہ مکہ میں رہنا اور دل ہندوستان میں اٹکا ہو۔ اس سے تو یہ بہتر ہے کہ ہندوستان میں رہے اور دل مکہ سے وابستہ ہو کر دیکھئے کب زیارت نصیب ہو۔ کس دن جانا ملے۔

اسی واسطے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی عادت تھی کہ حج سے فارغ ہونے کے بعد درہ لے کر لوگوں سے کہتے پھرتے تھے کہ بس حج ہو چکا۔ اب اپنے اپنے گھر کا راستہ لو **یا اهل الیمن یمنکم ویااهل الشام شامکم ویااهل العراق عراقکم** (اے یمن والو تم یمن جاؤ، اے شام والو تم شام جاؤ، اور اے عراق والو تم عراق جاؤ) واقعی حضرت عمر رضی اللہ عنہ بڑے حکیم تھے۔ وہ جانتے تھے کہ حج کے بعد قدرتی طور پر وطن کا اشتیاق دلوں میں پیدا ہو جاتا ہے۔ تو اب ایسی حالت میں مکہ کے اندر قیام کرنا باطن کے لئے مضر ہے اس دربار میں اپنے گھر کو یاد کرتے ہوئے نہ رہنا چاہیے کہ یہ بڑی گستاخی ہے۔

مدینہ منورہ میں ایک صاحب نسبت بزرگ کی زبان سے اتنی بات نکل گئی کہ شام یا ہندوستان کا دہی یہاں کے دہی سے اچھا ہوتا ہے۔ حضور صلی اللہ عیہ وسلم نے عالم رویا یا عالم واقعہ میں فرمایا کہ نکل جاؤ ہمارے یہاں سے وہیں جا کر رہو جہاں کا دہی اچھا ہے۔

صاحبو! یہ نقصان ہوتا ہے اس دربار میں پہنچ کر اپنے گھر بار کو یاد کرنے کا۔

شفقت اولیاء اللہ:

اور اسی واسطے حضرت ابراہیم بن ادھم نے تکمیل سے پہلے حج کا ارادہ نہیں کیا جب سلوک

کامل ہو گیا تب حج کو چلے۔ راستہ میں سمندر تھا۔ ایک جہاز میں سوار ہوئے۔ وہاں ایک رئیس رند مشرب بھی پہلے سے سوار تھا۔ اس کے ساتھ گانے بجانے والے بھنڈ بھی تھے۔ پہلے زمانہ کے روساء ان خرافات میں تو مبتلا ہوتے تھے مگر آج کل کے رئیسوں سے پھر بھی اچھے ہوتے تھے کیونکہ آج کل کے تعلیم یافتہ روساء گو ان ظاہری خرافات سے بری ہیں مگر ان میں باطنی خرافات کوٹ کوٹ کر بھری ہیں۔ وہ کیا تکبر، غرور، حسد، بمروتی اور بے رحمی اور پہلے روساء میں یہ باتیں نہ ہوتی تھی۔ وہ دل کے بہت نرم ہوتے تھے۔ مروت اور رحم اور ہمدردی ان کے اندر بہت ہوتی تھی۔ اپنے کو خاکسار سمجھتے تھے۔ متواضع ہوتے تھے اور آج کل کے تعلیم یافتہ ایسے متکبر ہوتے ہیں کہ انگریزی پڑھ کر اپنے کو دین کا بھی محقق سمجھنے لگتے ہیں احکام شرعیہ میں رائے دیتے ہیں۔ مولویوں کی تو ہستی کیا ہے رسول کی بات کو بھی رد کر دیتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو ایک حکم عام بیان فرمائیں اور یہ بلا دلیل محض اپنے اجتہاد سے اس کو اس زمانہ کے لئے خاص بتائیں۔ پہلے رئیسوں میں یہ باتیں نہ ہوتی تھیں۔ باوجودیکہ وہ آج کل کے رئیسوں سے زیادہ دین کا علم رکھتے تھے۔ کیونکہ اس زمانہ میں انگریزی پڑھنے کا نام تو علم تھا ہی نہیں۔ قرآن و حدیث فارسی کی کتابوں کا پڑھنا پڑھانا علم شمار ہوتا تھا اور ان کتابوں میں دین ہی کی باتیں ہوتی ہیں۔ مگر پھر بھی اس زمانہ کے روساء سے دین میں دخل اندازی منقول نہیں ہے اور اگر کسی سے منقول بھی ہے تو وہ بھی کسی عالم کے بہکانے سے خود ان کو ایسی جرات نہ ہوتی تھی۔

غرض بھنڈوں نے ایک دن کہا کہ آج تو ہم اس طرح نقل کرنا چاہتے ہیں کہ کسی شخص کے ساتھ مذاق کریں اس کے چپت اور دھول ماریں۔ اس لئے کوئی شخص اس کام کے لئے تجویز کیا جاوے وہاں بجز ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ کے کوئی شخص ایسا غریب نظر نہ آیا جس کو تختہ مشق بنایا جاوے اللہ اللہ۔

ایں چنیں شیخ گدائی کو بکو   عشق آمد لا ابالی فاتقوا

ایسا فقیر صفت شیخ، عشق بڑا لاابالی ہے ڈرتے رہو۔

چنانچہ ان کو لے چلے اور وہ ساتھ ہو لئے۔ وہ اس لئے ساتھ ہو لئے کہ۔

از خداداں خلاف دشمن و دوست   کہ دل ہر دو در تصرف اوست
گر گزندت رسد ز خلق مرنج   کہ نہ راحت رسد زخلق نہ رنج

دوستوں اور دشمنوں کے مخالف ہو جانے کو بھی خدا کی طرف سے جانو، دونوں کے دل اس

کے قبضہ قدرت میں ہیں۔ اگر خلق خدا سے تجھے کوئی تکلیف پہنچے تو رنج مت کر کیونکہ مخلوق (بغیر حکم خدا) نہ راحت پہنچا سکتی ہے نہ تکلیف۔

وہ تو یہ سب معاملہ خدا کی طرف سے سمجھتے ہوئے تھے اور زبان حال سے یہ کہتے جا رہے تھے۔

بجرم عشق توام می کشند و غوغائیست   تو نیز بر سر بام آ کہ خوش تماشائیست

تیرے عشق کے جرم میں تکلیف اٹھا رہے ہیں اور شور مچا رہے ہیں۔ تو بھی کوٹھے پر آ جا بہت اچھا تماشہ ہے۔

وہاں نقل شروع ہوئی اور حضرت ابراہیم کو چپتانے لگے۔ جب حضرت ابراہیم کا امتحان ہو چکا تو اب غضب الٰہی کو جوش ہوا۔ حق تعالیٰ اپنے دوستوں کا امتحان کرنے کے لئے بعض دفعہ مخالفوں اور دشمنوں کو ان پر مسلط کر دیتے ہیں مگر پھر بہت جلد مخالفوں پر غضب وقہر کا نزول ہونے لگتا ہے۔ یہ مت سمجھو کہ ہم کو مخالفت کرتے ہوئے اتنے دن ہو گئے اور کچھ نہیں ہوا۔ اہل اللہ کا ستانا خالی نہیں جاتا۔

علم حق با تو مواسا ہا کند   چونکہ از حد بگذری رسوا کند

خدا کا حلم تجھے ڈھیل دیتا رہتا ہے تاکہ جب تو حد سے گزر جائے تو تجھے ذلیل کرتے۔

اور اسی حالت میں حضرت ابراہیم کو الہام ہوا کہ تم ذرا زبان ہلا دو تو ہم ابھی ان سب کو غرق کر دیں۔ اب ان کا ظرف دیکھئے اگر ہم جیسے ہوتے تو نہ معلوم کیسی تیز بددعا کرتے وہ عرض کرتے ہیں کہ حضور جب میری خاطر سے آپ ان کے حق میں میری بددعا قبول فرمانے کا وعدہ فرماتے ہیں تو میری خاطر آپ ان کی آنکھیں ہی نہ کھول دیں کہ جس باطنی بلاء میں یہ غرق ہو رہے ہیں۔ اس سے ان کو نجات مل جائے۔ دعا قبول ہوئی اور ان سب لوگوں کی قلبی آنکھوں پر سے غفلت کے پردے ہٹا دیئے گئے اور سب کے سب ولی ہو گئے۔ اب جو آنکھیں کھلی ہیں اور حضرت ابراہیم کا درجہ و حال معلوم ہوا اور اس پر اپنی حرکتوں کو دیکھا تو بے اختیار سب قدموں میں گر پڑے۔

سبحان اللہ کیسی شفقت تھی کہ ایسے گستاخ لوگوں پر بھی بددعا نہ کی گئی اور سنیئے ابھی قریب زمانہ میں ایک بزرگ مولنا محمد یعقوب صاحب دہلوی گذرے ہیں۔ جن کے دیکھنے والوں میں سے شاید اب بھی کوئی زندہ ہو مکہ کو ہجرت فرما گئے تھے۔ ان کا قصہ ہے کہ ایک بار وہ مکہ کے بازار میں کسی دکان پر کچھ خرید رہے تھے۔ آپ کی عادت تھی کہ جتنی رقم ہوتی تھی سب ایک تھیلی میں رکھتے تھے اور بازار میں ساری تھیلی لے جاتے اور جب اس میں سے کچھ نکالنا ہوتا تو ساری تھیلی دکان پر الٹ کر جتنے کا سودا لینا ہوتا۔ لیکر باقی تھیلی میں ڈال لیتے۔ غرض روپیہ کی حفاظت وغیرہ کا کچھ خیال

نہ تھا۔ نہ یہ فکر تھی کہ لوگ تھیلی کی جمع دیکھ کر میرے درپے ہو جائیں گے سبحان اللہ! یہ باتیں ہیں جو کرامات سے بھی زیادہ ہیں۔

غرض ایک دن اسی طرح سودا لے رہے تھے۔ ایک بدو نے تھیلی کو تاک لیا جس وقت آپ بازار سے لوٹے اور اس گلی میں داخل ہوئے جس میں آپ کا مکان تھا۔ وہاں بجز مولٰنا کے اور اس بدو کے اور کوئی نہ تھا بدو نے یہ موقعہ غنیمت سمجھا اور تھیلی کو مولٰنا کے ہاتھ سے چھین وہ جا یہ جا۔ آپ نے کچھ التفات بھی نہ فرمایا۔ سیدھے اپنے گھر میں چلے گئے۔

اب خدا کی قدرت دیکھئے کہ اس بدو نے جو اس گلی سے نکلنا چاہا تو حق تعالیٰ نے راستہ بند کر دیا۔ وہ چل پھر کر پھر اسی موقعہ پر آ پہنچا جہاں سے تھیلی لے کر چلا تھا۔ چند بار ایسا ہوا کہ وہ وہاں سے چلتا اور پھر وہیں آ موجود ہوتا۔ اب وہ سمجھا کہ یہ شخص خدا کا مقرب ہے شاید اس نے میرے واسطے بددعا کی ہے جو مجھ کو راستہ نہیں ملتا۔ اس لئے اس نے مولٰنا کے دروازہ پر آ کر پکارنا شروع کیا **یا شیخ یا شیخ خذمنی صرتک** (اے شیخ مجھ سے اپنی تھیلی لے لو) مگر مولٰنا نے ایک آواز کا بھی جواب نہ دیا۔ تو اس بدو نے دوسری ترکیب کی کہ چلانا شروع کیا کہ اے لوگو! دوڑو مجھے ظالم سے بچاؤ۔ اس آواز پر لوگ جمع ہو گئے اور پوچھا کہ تجھ پر کس نے ظلم کیا ہے؟ کہنے لگا کہ اس گھر میں جو رہتا ہے اس نے مجھ پر ظلم کیا ہے؟ اس کو بلاؤ ذرا گھر سے باہر نکلیں۔ لوگوں نے کہا کہ وہ تو بڑے نیک آدمی ہیں وہ کسی پر ظلم نہیں کر سکتے۔ بدو نے کہا واللہ مجھ پر انہوں نے بڑا ظلم کیا ہے تم ان کو بلاؤ تو آخر لوگوں نے مولٰنا کو آواز دی کہ ذرا گھر سے باہر تشریف لائیں۔ آخر مولٰنا جیران (پڑوسیوں) کی رعایت سے باہر تشریف لائے تو لوگوں نے بدو سے پوچھا کہ بتلا انہوں نے تجھ پر کیا ظلم کیا ہے؟ کہنے لگا کہ میں نے ان کی تھیلی چھین لی تھی۔ جب میں اس کو لے کر چلا تو راستہ مجھ پر بند ہو گیا۔ میں اس کوچہ سے باہر نکلنا چاہتا تھا مگر چل پھر کر اسی جگہ آ موجود ہوتا جہاں اب کھڑا ہوں۔ میں نے اس شخص کو آواز دی کہ اپنی تھیلی مجھ سے لے لو تو اس نے میری آواز کا جواب بھی نہ دیا۔ یہ ظلم انہوں نے میرے اوپر کیا ہے کہ نہ تو تھیلی واپس لیتے ہیں نہ مجھ کو راستہ ملتا ہے۔ اب تم لوگ ان سے کہو کہ مجھ سے اپنی تھیلی واپس لے لیں اور مجھے اس بلاء سے نجات دیں۔ لوگوں نے مولٰنا سے عرض کیا کہ حضرت اپنی تھیلی واپس لے لیجئے اور اس غریب پر رحم کیجئے۔

اب عجیب بات دیکھئے کہ مولٰنا فرماتے ہیں یہ تھیلی تو میری نہیں ہے اور بدو کہتا تھا کہ واللہ یہ ان ہی کی ہے میں نے ان کے ہاتھ سے چھینی ہے۔ مولٰنا نے فرمایا کہ ہاں چھیننے سے پہلے تو میری

تھی مگر چھیننے کے بعد میری نہیں رہی بلکہ تیری ملک ہو چکی ہے کیونکہ جب تو نے اس کو چھینا تھا میں نے اسی وقت حق تعالیٰ سے عرض کر دیا تھا کہ میری وجہ سے اس شخص کو عذاب نہ کیا جاوے۔ میں نے یہ تھیلی اس کو ہبہ کر دی ہے اور قبضہ اس کا ہے ہی۔ بس اس کی ہو گئی۔ اس لئے اب یہ میری نہیں رہی میں اس کو واپس نہیں لے سکتا اور گو قبول ابھی تک واقع نہ ہوا تھا مگر واہب تو اپنی طرف سے اخراج عن الملک کا سامان پورا کر چکے اس لئے اپنے حق میں معاملہ ہبہ کا کیا یہ غایت احتیاط ہے) لوگ حیران رہ گئے کہ کیسا عجیب ماجرا ہے آخر بدو نے کہا کہ اگر تم تھیلی کو واپس نہیں لیتے تو میرے واسطے دعا ہی کر دو کہ مجھے راستہ مل جاوے۔ مولٰنا نے دعا فرما دی اور وہ خوش خوش اپنے گھر چلا گیا۔ صاحبو! حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غلامان غلام کی یہ شفقت ہے اپنے ایذا دینے والوں پر پھر حضور کی شفقت کا کیا حال ہوگا واقعی سچ ہے۔

نماند بعصیاں کسے درگرو   کہ دارد چنیں سید پیشرو

کوئی گنہگار بھی باقی نہ رہا جسے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جیسا پیشوا مل گیا۔

جب حضور کی یہ شفقت ہے تو انشاءاللہ ہم گنہگار بھی آپ کے طفیل سے پار ہو جائیں گے اور تبلیغ اسلام کا کام زیادہ تر شفقت سے ہوا ہے جس کے امت کے حال پر شفقت ہوگی۔ وہی تبلیغ کے مصائب کو خوشی سے برداشت کر سکے گا۔ اب چونکہ ہم لوگوں میں شفقت نہیں ہے اس لئے تبلیغ میں کمی ہو رہی ہے۔ ہم لوگ جو جھوٹے سچے مولوی کہلاتے ہیں۔ ہم بھی وعظ کہنے وہیں جاتے ہیں جہاں کھانے کو عمدہ عمدہ غذائیں ملیں۔ نخروں سے بلائے جائیں۔ کرایہ ڈبل ملے۔

ایک بار میں ایک انجمن کے جلسہ میں بلایا گیا۔ جب ان لوگوں نے مجھے کرایہ دینا چاہا تو بہت رقم پیش کی۔ میں نے کہا کہ اتنی رقم میں کیا کروں گا؟ میرے تو چند روپے صرف ہوئے ہیں۔ ان کو اس جواب پر بڑی حیرت ہوئی۔ پھر کھانے کے اندر انہوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ آپ چائے پئیں گے۔ میں نے کہا نہیں، پان کھائیں گے؟ میں نے کہا نہیں۔ مجھے ان میں سے کسی کی عادت نہیں۔ پوچھا کھانا خاص کس قسم کا کھائیں گے؟ میں نے کہا کہ اپنے گھر پر دال روٹی کھاتا ہوں، وہی کھاؤں گا۔ ان کو ہر بات پر تعجب ہوتا تھا۔ آخر میں نے پوچھا کہ آپ کو حیرت و تعجب کیوں ہے اور یہ سوالات آپ مجھ سے کیوں کرتے ہیں۔ ہنسنے لگے کہ صاحب یہاں ایک واعظ صاحب ابھی آئے تھے جنہوں نے بڑے عیب نکالے۔ بہت نخروں سے کھانا کھاتے تھے۔ دو دن میں گیارہ روپے کے پان کھائے (خیر کھاتے تو کیا ہوں گے مگر حاضرین کو کھلائے جس کا ان کو کوئی

حق نہ تھا جب کہ میزبان کو گراں ہوا) اس لئے ہم کو آپ کی ہر بات پر تعجب ہوتا ہے کہ آپ تو کرایہ بھی بہت کم بتلاتے ہیں اور دال روٹی کے سوا کسی چیز کی درخواست نہیں کرتے۔ نہ چائے کی نہ پان کی۔ میں نے کہا بھائی وہ بڑے درجہ کے آدمی تھے ان کا ویسا ہی خرچ بھی تھا میں تو گاؤں کا رہنے والا ہوں۔ چھوٹے درجہ کا آدمی ہوں۔ ویسا ہی میرا مختصر خرچ ہے۔ غرض ان وجوہ سے تبلیغ کا کام رک گیا' کیونکہ جن کفار میں تبلیغ کی ضرورت ہے یا جن نومسلموں کو کفر سے بچانا ضروری ہے۔ ان کی حالت یہ ہے کہ ہم سے ان کو پرہیز ہے وہ ہم کو خود تو کیا بلاتے۔ جانے کے بعد ٹھہرنے کو جگہ بھی نہیں دیتے۔ نہ کھانے کو پوچھتے ہیں نہ پانی کو۔ بھلا وہ تم کو ڈبل کرایہ اور چائے پان کہاں دیں گے۔ پھر ایسی جگہ کون جائے اور یہ تکلیفیں کون جھیلے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام دوسری جگہ تو کیا پھیلتا۔ جہاں اسلام پہلے سے تھا وہاں سے بھی نکلنے لگا۔

مگر آج کل ایک قصہ کی وجہ سے لوگوں کو پھر تبلیغ پر کچھ توجہ ہوئی ہے اور اس کی ضرورت کا احساس ہوا ہے۔ مگر مجھے یہ امید اپنے بھائیوں سے نہیں ہے کہ وہ اس پر دوام کریں کیونکہ ان میں نرا جوش ہی جوش ہوتا ہے استقلال نہیں ہے اور جوش کا قاعدہ ہے کہ وہ زیادہ دیرپا نہیں ہوتا کاش اگر ان میں جوش کے ساتھ استقلال بھی ہوتا تو کیا اچھا ہوتا؟ مگر ان کا جوش بھی مستقل نہیں ہوتا صرف چند روزہ ہوتا ہے مگر خیر اس جوش کا پیدا ہونا بھی خدا کی رحمت ہے اس سے ہم کو کام لینا چاہیے۔

تدبیر تبلیغ:

جس کا طریقہ یہ ہے کہ اس جوش کی حالت میں ہوش سے کام لے کر ایسی تدبیریں نکالیں' جس سے تبلیغ کا کام ہمیشہ چلتا رہے اور محض زمانہ جوش تک منحصر نہ رہے۔ جس کی صورت آسان یہ ہے کہ جس طرح مسلمانوں نے اسلامی مدارس تعلیم عربی کے لئے قائم کر رکھے ہیں جو بدون کسی جوش کے زمانہ دراز سے چلے آ رہے ہیں اسی طرح کچھ مستقل مدارس محض تبلیغ کے لئے قائم کر دیں جن میں صرف اس کام کی تعلیم دی جائے اور مبلغین تیار کئے جائیں۔ مدارس عربیہ کے ساتھ اس کام کو ملحق نہ کیا جاوے۔ اس سے تعلیم علوم دین کے کام میں نقص پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ چنانچہ تجربہ سے معلوم ہو جائے گا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ آج کل تعلیم یافتہ مسلمانوں میں اور عوام میں دو قسم کے لوگ ہیں ایک وہ جو فکر معاش وغیرہ سے فارغ ہیں وہ تو اس وقت سے اپنے کو تبلیغ کے لئے وقف کر دیں اور جو لوگ فکر معاش سے فارغ نہ ہوں۔ مگر اس وقت کسی اور کام میں بھی مشغول نہیں وہ بھی اس کام میں

لگ جائیں اور اہل تمول ان کی اعانت کریں اور جو لوگ ملازمت وغیرہ یا درس وتدریس میں مشغول ہیں وہ اپنے کام کو ترک نہ کریں مگر تعطیل کے زمانہ میں یا کچھ رخصت بلا وضع تنخواہ مل سکے تو رخصت لے کر ان ایام میں تبلیغ کا کام کیا کریں اس طرح ہزاروں مبلغ مفت مل جائیں گے مگر اس کی ضرورت ہے کہ ہر شخص اس کام کی اہمیت کا احساس کر کے اس پر توجہ کرے۔

ایک صورت چندہ کی ہے کہ عام لوگ چندہ دیں اور خاص لوگ تبلیغ کا کام کریں مگر یہ صورت بہت بدنام ہوگئی ہے اور ہم نے خود اس کو بدنام کیا ہے کہ مخلوق کا روپیہ لے کر کام کچھ بھی نہ کیا اور روپیہ کھا پی کر سب برابر کر دیا۔ ورنہ یہ صورت بہت اچھی ہے اور آسان بھی۔ تمام قومیں مذہبی کام اس طرز سے کر رہی ہیں مگر میں اس صورت کی رائے نہیں دیتا۔

میرے نزدیک چندہ کی بہتر صورت یہ ہے کہ ہر رئیس اپنی حیثیت کے موافق ایک مبلغ کا خرچ اپنے ذمہ رکھ لے یا چند روسا مل کر ایک مبلغ کا خرچ اپنے ذمہ رکھ لیں اور ہر مہینہ اس کو تنخواہ خود دے دیا کریں۔ کسی انجمن وغیرہ میں چندہ بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ مگر یہ ضروری ہے کہ مبلغ کا انتخاب خود نہ کریں بلکہ علماء سے مشورہ کر کے کسی کو ملازم رکھیں۔ لیکن اس کے ساتھ ملازم کا سا برتاؤ نہ کریں بلکہ اس کو اپنا مخدوم سمجھیں۔

اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو جو انجمنیں تبلیغ کا کام کر رہی ہیں ان کی ہی اعانت مال سے کرتے رہیں۔ اگر اس کے کارکن خیانت کریں گے خدا کے یہاں بھگتیں گے مگر جس کی خیانت کا علم ہو جائے اس کو پھر چندہ نہ دیں بلکہ اب اس کو دیں جس کی خیانت کا ہنوز علم نہیں ہوا۔ وعلیٰ ہذا۔

اور جو لوگ مالی اعانت نہ کر سکیں وہ دعا کرتے رہیں یہ بھی بڑی امداد ہے

لا خیل عندک تھدیھا ولا مال
فلیسعد النطق ان لم یسعد الحمال.

تیرے پاس ہدیہ میں پیش کرنے کیلئے ہدیہ ہے نہ مال، تو اگر مال سے مدد نہ کر سکا تو زبان سے ہی کلمہ خیر کہہ دے۔

اور جس سے دعا بھی نہ ہو سکے تو للہ وہ اس پر ہی عمل کریں۔

مرا بخیر تو امید نیست بد مرساں

یعنی وہ خدا کے واسطے اس کام میں روڑے تو نہ اٹکائیں۔ آج کل ایسے بھی مسلمان ہیں جو تبلیغ کے کام میں روڑے اٹکاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ کام چھوڑ دو۔ اس سے ہندو مسلم اتحاد

میں فرق آتا ہے اناللہ وانا الیہ راجعون ان کے یہاں اب بھی ہندوؤں سے اتحاد ہی چلا جارہا ہے مگر مزہ یہ ہے کہ اتحاد تو جانبین سے ہوا کرتا ہے مگر ان کا اتحاد یک طرفی ہے کہ ہندو تو ان کی ذرا بھی رعایت نہیں کرتے۔ جہاں ان کو موقع ملتا ہے مسلمانوں کو مرتد کر لیتے ہیں۔ آبروریزی یا جان و مال کے درپے ہو جاتے ہیں مگر ان حضرت کا اتحاد اب بھی باقی ہے۔ بھلا ان سے کوئی پوچھے کہ جب مسلمانوں کو ہندو مرتد بنا رہے ہیں تو کیا مسلمانوں کو مرتد ہونے دیا جائے؟ ان کو سنبھالنے کی کوشش نہ کی جائے۔ اگر ان کی یہی رائے ہے تو اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ چاہے ایمان جاتا رہے مگر اتحاد نہ جائے تو ایسے اتحاد پر لعنت ہے جس کے واسطے ایمان و اسلام کی بھی پرواہ نہ رہے۔ جن صاحبوں کی یہ رائے ہے وہ خود تبلیغ نہ کریں۔ مگر جو لوگ یہ کام کرنا چاہتے ہیں ان کو یہ کس لئے روکتے ہیں؟

پس مسلمانوں کو اللہ کے نام پر یہ کام شروع کرنا چاہیے اور ان لوگوں کی باتوں پر توجہ نہ کرنا چاہیے۔ تبلیغ میں بحث و مباحثہ یا لڑائی کی ضرورت نہیں۔ سکون و وقار سے کام کرو۔ جہاں مباحثہ کی دوسری طرف سے تحریک ہو، وہاں کرو۔ خود چھیڑ نہ اٹھاؤ۔ بلکہ صاف کہہ دو کہ ہم اپنا کام کریں۔ تم اپنا کرو۔ جس کا مذہب حق ہوگا اس کی حقانیت خود واضح ہو جائے گی۔

تعلیم اسلام کی خوبی:

واللہ اسلام کی تعلیم وہ ہے کہ اس کی سادہ تعلیم کے مقابلہ میں کوئی تعلیم ٹھہر نہیں سکتی۔ اسلام کی دلربائی کی یہ شان ہے۔

زفرق تابقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا است

سرتاپا جدھر بھی نگاہ ڈالتا ہوں کرشمہ قدرت دامن دل کو کھینچتا ہے کہ دیکھنے کی یہی جگہ ہے

اسلام کے محاسن تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کا تو وقت نہیں رہا مگر اختصاراً میں چند محاسن بتلاتا ہوں۔ اسی سے باقی کو سمجھ لیا جائے۔

قیاس کن زگلستان من بہار مرا

باغ سے ہی اسکی بہار کا اندازہ کرلیا جائے

اسلام کا ایک حسن یہ ہے کہ اس کو اپنی اشاعت کے لئے نہ زر کی ضرورت ہے نہ زور کی۔ بلکہ اسلام کی تعلیم خود قلوب کو اپنی طرف کشش کرتی ہے۔ جس کا تجربہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ جس مجمع

میں ہندو مسلمان دونوں موجود ہوں۔ وہاں پہلے ایک ہندو سے کہا جائے کہ وہ اپنے مذہب کی باتیں بیان کرے۔ اس کے بعد کسی عالم سے کہا جاوے کہ وہ اسلام کی باتیں بیان کرے۔ دونوں حالتوں میں مجمع کی حالت دیکھ لی جائے کہ ان پر کس تعلیم کا اثر زیادہ ہوتا ہے۔ ہم نے ریل میں خود تجربہ کیا ہے کہ جب کبھی ہم چند احباب آپس میں معمولی باتیں اصلاح اعمال وغیرہ کے متعلق کرتے تھے تو ہندو غور سے ان باتوں کو سنتے اور آپس میں کہتے تھے کہ ان لوگوں کی باتوں کی طرف دل کھنچتا ہے تو دوسرا جواب دیتا تھا کہ ان کی باتیں سچی ہیں اور سچائی کی طرف دل کھچا ہی کرتا ہے۔

ایک مرتبہ ریل میں ہم باتیں علمی کر رہے تھے۔ وہاں ہندو بھی موجود تھے۔ جب اسٹیشن آ گیا اور ہم اترنے لگے تو ایک ہندو کہنے لگا کہ آپ تو سارا نور اپنے ساتھ لے چلے جب تک آپ ریل میں رہے ایک نور ہمارے ساتھ تھا۔ آخر کیا بات تھی؟ صاحبو! کافر کو بھی اسلام کی باتوں میں نور کا احساس ہوتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہم جب کسی کو اسلام کی دعوت دیتے ہیں تو اس کو نہ روپیہ کا لالچ دیتے ہیں۔ نہ اپنی طرف کشش کرنے کے لئے جبر کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ کانپور میں ایک عیسائی میرے پاس آیا کہ مجھے مسلمان کر لو اور میرے واسطے دو سو روپیہ چندہ کرا دو تا کہ میں اس سے تجارت شروع کر کے معاش پیدا کر سکوں۔ میں نے کہا کہ تم دو سو روپیہ کہتے ہو میں ایک روپیہ بھی چندہ سے جمع نہ کروں گا اور نہ ہم کو اس کی ضرورت ہے۔ اگر تم اسلام کو حق سمجھ کر اپنی نجات کے واسطے اختیار کرتے ہو تو ہمیں تم سے یہ کہنے کا حق ہے کہ تم اس دولت کا نشان بتلانے کے معاوضہ میں ہم کو کچھ دو نہ کہ الٹا تم ہم سے مانگتے ہو۔ ہم اس کا وعدہ ہرگز نہ کریں گے۔ چاہے اسلام لاؤ یا نہ لاؤ۔ چونکہ وہ سچے دل سے مسلمان ہونا چاہتا تھا اس لئے اس نے کہا کہ میں اپنا قول واپس لیتا ہوں اور میں آپ سے ایک پیسہ بھی نہیں مانگتا میں تو صرف مسلمان ہونا چاہتا ہوں اور روزی کا خدا مالک ہے۔ جب اس نے کہا تب میں نے اسے مسلمان کیا (یہاں سے مخالفین اسلام کے اس اعتراض کا جواب ہو گیا کہ اسلام مال کے لالچ سے پھیلایا گیا ہے جسکی دلیل یہ ہے کہ مؤلفۃ القلوب کے لئے اسلام میں ایک خاص حکم وارد ہے۔ ان لوگوں نے تالیف قلب کی حقیقت نہیں سمجھی۔ اسلام میں تالیف قلب کا یہ مطلب نہیں ہے کہ لوگوں سے یوں کہا جائے کہ تم اسلام قبول کرو ہم تم کو اتنا روپیہ دیں گے یا زمین و جائیداد دیں گے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اسلام قبول کرے یا قبول کرنا چاہتا ہو اس کے ساتھ ہمدردی اور محبت کا برتاؤ کیا جاوے اور اگر وہ محض روپیہ کے لالچ سے اسلام لانا چاہتا ہو تو اس صورت میں اس سے صاف کہہ دینا چاہیے کہ ہم روپیہ دینے کا وعدہ نہیں

کرتے اور نہ اس وعدہ پر تم کو مسلمان کر سکتے ہیں۔ اگر تم اسلام کو حق سمجھتے ہو تو اسلام لاؤ اور جو ہمارا حال ہے اسی حال پر تم بھی رہو۔ محنت و مزدوری کرو اور کھاؤ۔ کماؤ۔ ۱۲ جامع۔) پھر اسلام کے بعد چونکہ وہ ہمارا بھائی ہو گیا اور بھائی کی اعانت و امداد انسانیت و مروت کا مقتضا ہے، تو پھر ہم نے اس کی خدمت بھی کی۔ مگر اسلام لاتے وقت صاف انکار کر دیا۔

دوسرے یہ کہ اسلام میں دو چیزیں ہیں اصول و فروغ، عقائد کو اصول کہتے ہیں اور اعمال کو فروغ۔ اور اس پر سب عقلاء کا اتفاق ہے کہ ہر مذہب کی خوبی کا مدار اس کے اصول کی پاکیزگی پر ہے۔ جس کے اصول پاکیزہ اور حق ہیں اس کے فروغ بھی پاکیزہ ہوں گے۔ اس لئے مخالفین کے سامنے ہم کو سب سے پہلے اصول اسلام کی پاکیزگی ثابت کرنا چاہیے۔ کیونکہ اصول عقلی ہوتے ہیں ان پر عقلی دلائل قائم کر کے خصم کو محجوج کر سکتے ہیں اور فروع کا عقلی ہونا لازم نہیں۔ یعنی یہ ضروری نہیں کہ ان کا ثبوت عقل سے ہو بلکہ بہت سے فروع سمع و نقل سے ثابت ہوتے ہیں۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ فروع عقل کے خلاف نہ ہوں۔ سو بحمد اللہ اصول اسلام سب عقلی ہیں اور فروع عقل کے خلاف نہیں ہیں۔ پس سب سے پہلے کفار کے سامنے توحید و رسالت کو ثابت کیا جائے۔ جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو تسلیم کر لیں گے تو اس کے بعد جس فرعی مسئلہ کی وہ دلیل مانگیں اس کے جواب میں اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فلاں ارشاد سے ثابت ہے۔ خواہ صراحۃً یا دلالۃً اس کے بعد اگر وہ یہ کہے کہ یہ حکم عقل کے خلاف ہے تو ہمارے ذمہ اس کا اثبات ہوگا کہ یہ حکم خلاف عقل نہیں ہے کیونکہ خلاف عقل محال ہوتا ہے یا قبیح اور یہ حکم نہ مستلزم محال ہے نہ اس میں کوئی قبح ہے۔ اس طریقہ سے گفتگو مختصر اور سہل ہو جاتی ہے۔

بہرحال اصول اسلام سب عقلی ہیں جن میں توحید اصل الاصول ہے۔

توحید کی خوبی:

اب اسلام کی خوبی دیکھئے کہ اس میں توحید ایسی کامل ہے کہ دنیا کے کسی مذہب کی توحید ایسی کامل نہیں چنانچہ غیر اللہ کو سجدہ کرنا اسلام میں حرام ہے۔

ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک صحابی نے عرض کیا کہ میں نے فارس و روم کے لوگوں کو دیکھا ہے کہ وہ اپنے بادشاہوں کو سجدہ کرتے ہیں تو ہم بھی آپ کو سجدہ کیا کریں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی حرمت کو کس عمدہ طریقہ سے بیان فرمایا۔ جس سے اس فعل کی لغویت بخوبی ظاہر ہو گئی۔ فرمایا یہ تو بتلاؤ اگر تم میرے مرنے کے بعد میری قبر پر گذرو تو کیا میری قبر کو بھی سجدہ کرو

گے۔ حضرات صحابہ کیسے سلیم العقل تھے۔ جواب دیا کہ۔ نہیں۔ فرمایا تو پھر اب ہی کیوں سجدہ کرتے ہو۔ خوب سمجھ لو کہ غیر خدا کو سجدہ کرنا حرام ہے اور اگر میں خدا کے سوا کسی کے لئے سجدہ جائز کرتا تو عورتوں کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہروں کو سجدہ کیا کریں (حضور نے اس جواب میں بتلا دیا کہ جو چیز فانی ہے اور اس کے ظہور فنا کے بعد تم اس کو سجدہ کرنا گوارا نہیں کرتے۔ وہ اس وقت بھی سجدہ کے قابل نہیں۔ کیونکہ وہ اس وقت بھی فانی ہے۔ حضرات صحابہ سلیم العقل تھے۔ اور بات کو سمجھ گئے کہ مرنے کے بعد انسان سجدہ کے قابل نہیں ۱۲ جامع اگر آج کل کے لوگ ہوتے تو کہتے حضور ہم تو آپ کی قبر کو ایک بار کیا چار مرتبہ سجدہ کریں گے۔ اس واقعہ سے اسلام کی توحید کا کامل ہونا معلوم ہو گیا اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود اشاعت اسلام سے اپنی تعظیم کرانا نہ تھا کیونکہ جو شخص بڑا بننا چاہتا ہے وہ تو خود اس کی کوشش کیا کرتا ہے کہ لوگ میرے سامنے جھکیں مگر حضور کی یہ حالت ہے کہ لوگ از خود آپ کو سجدہ کرنا چاہتے تھے اور آپ نے ان کو اس سے منع کیا اور صرف منع ہی نہیں کیا بلکہ اپنا فانی ہونا ان پر ظاہر کر دیا۔

مگر پھر بھی بعض جہلاء وکفر کا حضور پر یہ اعتراض ہے کہ آپ (نعوذ باللہ) بڑا بننا چاہتے تھے اور دلیل میں یہ واقعہ لکھا ہے کہ حضور نے حج کے موقعہ پر ایک صحابی کو اپنے موئے مبارک دیئے تھے کہ مسلمانوں میں ان کو تقسیم کر دو۔ اس پر وہ جاہل لکھتا ہے کہ دیکھئے حضور نے اپنے بال اس لئے تقسیم کرائے تا کہ لوگ ان کو تبرک سمجھ کر تعظیم سے رکھیں تو گویا آپ نے بڑا بننا چاہا۔

استغفر اللہ! یہ آج کل کی فہم و عقل ہے۔ افسوس اس شخص کو عبادت و محبت کے مقتضیٰ میں بھی فرق معلوم نہیں۔ واقعی کفار کو محبت و عشق کا چرکہ نہیں لگا۔ اسی واسطے وہ ایسے واقعات کی حقیقت نہیں سمجھتے۔ جی تو یہ چاہتا ہے کہ ان لوگوں کو جواب بھی نہ دیا جاوے اور یہ کہہ دیا جاوے۔

بامدعی مگوئید اسرار عشق و مستی　　بگذار تا بمیرد در رنج خود پرستی

عشق کے بھید مدعی کے سامنے مت کہو، اسکو چھوڑ دو تا کہ غرور اور گھمنڈ میں مر جائے۔

مگر تبرعاً میں اس کا جواب دیتا ہوں تا کہ کسی مسلمان کو اگر اس اعتراض سے شبہ پڑ گیا ہو تو وہ اس جواب سے تسلی حاصل کر سکے۔

بات یہ ہے کہ سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بال کن لوگوں میں تقسیم کرائے تھے۔ آپ نے ان لوگوں میں اپنے بال تقسیم کر دیئے تھے جن کی محبت کی یہ حالت تھی۔ جب آپ وضو کرتے تھے تو وضو کا ایک قطرہ بھی زمین پر نہ گرنے دیتے تھے بلکہ آپ کا تھوک

اور سارا وضو کا پانی اپنے ہاتھوں میں لیتے تھے۔ منہ کو ملتے اور اسے آنکھوں سے لگاتے تھے۔ اور ہر شخص اس کی کوشش کرتا تھا کہ سب سے پہلے آپ کی وضوء کا پانی اور آپ کا تھوک میرے ہاتھ میں آئے۔

چنانچہ اس کوشش میں ایک دوسرے پر گرا پڑتا تھا اور ان کی محبت کا یہ حال تھا کہ ایک بار حضور نے پچھنے لگوائے اور اس کا خون ایک صحابی کو دیا کہ اس کو کسی جگہ احتیاط سے دفن کر دو۔ صحابی کی محبت نے گوارا نہ کیا کہ حضور کا خون زمین میں دفن کیا جائے۔ انہوں نے الگ جا کر اسے خود پی لیا (اس پر یہ اعتراض نہ کیا جائے کہ (نعوذ باللہ) صحابی بہت ہی بے حس تھے کہ ان کو تھوک ملتے ہوئے اور خون پیتے ہوئے گھن نہ آتی تھی۔ بات یہ ہے کہ ان امور کا تعلق عشق و محبت سے ہے اور اس کی حقیقت عاشق ہی سمجھ سکتا ہے جس کا مذاق یہ ہوتا ہے۔

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن ندہم   گوش را نیز حدیث تو شنیدن ندہم

مجھ کو آنکھوں پر رشک آتا ہے کہ ان کو محبوب کا رخ انور نہ دیکھنے دوں اور ان کانوں کو اس کی باتیں سننے دوں۔

صاحبو! اگر آپ کو کبھی کسی سے عشق ہوا ہو تو آپ کو معلوم ہوگا کہ عاشق بعض دفعہ محبوب کی زبان اپنے منہ میں لے کر چوستا ہے اور عشاق لعاب دہن محبوب کی مدح میں دفتر کے دفتر اشعار میں لکھ گئے ہیں تو کیا یہ لوگ بے حس ہیں؟ ہرگز نہیں۔ اگر یہ بے حس ہیں تو یوں سمجھئے کہ ساری دنیا بے حس ہے۔ کیونکہ محبت میں ہر شخص یہی کرتا ہے۔ کوئی عاشق اس سے بچا ہوا نہیں۔ اسی طرح اگر کسی کے محبوب کے بدن میں سے خون بہنے لگے تو عشاق اس جگہ منہ لگا کر خون کو چوستے ہیں تاکہ محبوب کو زخم کی تکلیف کا احساس نہ ہو یا کم ہو جائے۔ معلوم ہوا کہ محبوب کا خون چوسنا بھی کوئی گھن کی چیز نہیں۔ عاشق کو اس سے جو حظ ہوتا ہے۔ اس کے دل سے پوچھنا چاہیے۔ پھر جب ادنیٰ محبوب کا لعاب دہن اور خون گھن کی چیز نہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تھوک اور پسینہ اور خون تو کیونکر گھن کی چیز ہو سکتا ہے؟ کیونکہ حضور کی حالت یہ تھی کہ قدرتی طور پر آپ کا تمام بدن خوشبودار تھا۔ آپ کے پسینہ میں اس قدر خوشبو تھی کہ عطر کی خوشبو اس کے سامنے بے حقیقت چیز تھی۔ آپ کا لعاب دہن نہایت خوشبودار اور شیریں تھا۔ یہی حال آپ کے خون کا تھا تو ایسی چیز سے کون شخص گھن کر سکتا ہے۔ مگر کفار کو ان امور کی کیا خبر، نہ ان کو عشق و محبت کی ہوا لگی ہے نہ حضور کے حالات سے اطلاع ہے ۱۲ جامع) بہر حال صحابہ آپ کے ایسے عاشق تھے کہ وضو کا پانی بھی زمین پر نہ گرنے دیتے تھے اور اس کو ہاتھوں ہاتھ لینے کے لئے ایک دوسرے پر گرتے پڑتے

تھے تو ایسی جماعت سے یہ کیا امید تھی کہ وہ آپ کے بالوں کو زمین میں دفن ہونے دیں گے کیونکہ یقیناً بال کا درجہ وضو کے پانی سے زیادہ تھا۔ اس کو محض جسم سے تلبس ہوا تھا اور یہ تو بدن کا جزو ہے۔ پس اگر آپ اپنے بالوں کو دفن کراتے تو یقیناً صحابہ زمین میں سے ان کو نکالنے کی کوشش کرتے۔ پھر اس میں ہر شخص یہ کوشش کرتا کہ میرے ہاتھ زیادہ بال آئیں تو ایک دوسرے پر گرتا اور عجب نہیں کہ قتال کی نوبت آ جاتی۔ اس لئے حضور نے اس نزاع وقتال سے صحابہ کو بچانے کے لئے اپنے بال خود ہی تقسیم کرا دیئے اور دفن نہ کرائے۔

بتلایئے اب اس میں کیا اشکال ہے۔ پس معلوم ہو گیا کہ آپ کا اپنے بال تقسیم کرانا اپنی تعظیم وعبادت کے لئے نہ تھا بلکہ صحابہ کی محبت پر نظر کرتے ہوئے ان کے نزاع وقتال کے رفع دفع کرنے کے لئے تھا۔ اگر معاذ اللہ حضور میں ذرا برابر بھی بڑائی وتکبر کا خیال ہوتا تو آپ عمدہ لباس پہنتے، عمدہ مکان بناتے، نفیس نفیس کھانے کھایا کرتے۔ آپ کے پاس خزانہ جمع ہوتا، مگر تاریخ شاہد ہے اور احادیث میں صحیح طریقہ سے ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا لباس موٹا جھوٹا ہوتا تھا۔ آپ کے مکانات سب کچے تھے۔ آپ اپنے پاس کچھ بھی جمع نہ رکھتے تھے۔ یہ نہیں کہ آپ کے پاس مال آتا نہ تھا۔ نہیں بعض جنگ میں اتنا مال آیا کہ اس کی شمار نہیں ہو سکتی تھی۔ بکریوں سے جنگل کے جنگل بھر گئے اور آپ نے سب بکریاں ایک اعرابی کو اس کے سوال پر عطا فرما دیں اور اونٹ اس قدر تھے کہ آپ نے کسی کو سو کسی کو دو سو عنایت فرمائے۔ جب بحرین کا جزیہ آیا تھا تو اتنا روپیہ تھا کہ مسجد کے اندر سونے کا ڈھیر لگ گیا مگر آپ نے تھوڑی دیر میں سب کا سب صحابہ کو تقسیم فرما دیا اور اپنے واسطے ایک درہم بھی نہ رکھا تو کیا بڑائی چاہنے والا یہ گوارا کر سکتا ہے کہ خود تو خالی ہاتھ رہے اور مخلوق کو مالا مال کر دے۔

پھر آپ کی حالت یہ تھی کہ راستہ میں جب چلتے تھے تو صحابہ کو اپنے سے آگے چلنے کا حکم کرتے تھے اور خود پیچھے چلتے۔ بعض دفعہ کوئی صحابی سواری پر سوار ہوتے اور آپ ان کے ساتھ ساتھ پیدل چلتے۔ وہ اترنا چاہتے اور آپ منع فرماتے۔ اکثر آپ اپنا سودا بازار سے خود لے آیا کرتے تھے۔ اگر کوئی شخص کسی کام میں آپ سے امداد لینا چاہتا تو آپ کا ہاتھ پکڑ کر جہاں چاہتا لے جاتا اور آپ اس کا کام کر دیتے تھے۔ گھر میں آ کر آپ اپنے گھر کے کام بھی کرتے تھے۔ کبھی بکریاں کا دودھ خود نکال لیا۔ کبھی جوتا اپنے ہاتھ سے گانٹھ لیا۔ کبھی آٹا گوندھ دیا۔ آپ بعض دفعہ زمین پر بیٹھ جاتے۔ بوریہ پر لیٹ جاتے تھے۔ جس سے آپ

کے پہلو پرنشان ہو جاتے۔ بعض دفعہ کسی یہودی کا آپ پر قرض ہوتا اور وہ تقاضا کرنے میں سختی کرتا، برا بھلا کہتا اور حضرات صحابہ کو یہودی پر غصہ آتا۔ وہ اس کو دھمکانا چاہتے تو آپ صحابہ کو منع فرماتے اور یہ ارشاد فرماتے کہ حق دار کو کہنے سننے کا حق ہے۔ اس جاہل معترض سے کوئی پوچھے کہ کیا بڑائی اور عظمت چاہنے والوں کے یہی حالات ہوا کرتے ہیں؟ افسوس اس نے ایک بال تقسیم کرنے کا واقعہ لے لیا اور ان تمام واقعات سے اندھا ہو گیا۔ سو میری تقریر سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ بال تقسیم کرنے کا واقعہ بھی بڑائی یا عظمت کے لئے نہ تھا بلکہ اس میں وہی تمدنی اور سیاسی مصلحت تھی جو میں نے ابھی ذکر کی۔

دوسرے حضور نے اپنے بال تقسیم فرما کر قیامت تک کے لئے یہ بات بتلادی کہ میں فانی ہوں اور بشر ہوں کیونکہ بال تو متغیر وحادث ہیں۔ کبھی وہ سر کے اوپر ہیں کبھی استرے سے مونڈ کر جدا کئے جاتے ہیں تو جو شخص حضور کے بالوں کو دیکھے گا (چنانچہ بعض جگہ بحمد اللہ اب تک آپ کے بال محفوظ ہیں اور لوگ ان کی زیارت کرتے ہیں) تو وہ حضور کے فانی وبشر ہونے پر استدلال کرے گا اور سمجھ جائے گا کہ آپ انسان تھے۔ خدا نہ تھے۔ تو اس سے آپ نے مسلمانوں کی توحید کو کامل فرمایا نہ کہ اپنی عظمت وبڑائی چاہی۔

چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

جب حقیقت نظر نہ آئی اسے افسانہ بنالیا۔

شعبہ معبودیت کعبہ:

باب توحید میں مخالفین کو استقبال قبلہ پر بھی اعتراض ہے کہ مسلمان کعبہ کی پرستش کرتے ہیں۔

جواب یہ ہے کہ ہم کعبہ کی پرستش نہیں کرتے بلکہ عبادت خدا کی کرتے ہیں اور صرف منہ قبلہ کی طرف کرتے ہیں اور اس کے لئے ہمارے پاس بہت سے دلائل ہیں ایک یہ کہ ہم خود اس کی معبودیت کی نفی کرتے ہیں اور ظاہر ہے کہ کوئی عابد اپنے معبود کی معبودیت کی نفی نہیں کیا کرتا۔

دوسرے یہ کہ نماز پڑھتے ہوئے اگر کسی کے دل میں کعبہ کا خیال بھی نہ آئے مگر کعبہ کی طرف منہ رہے تو نماز درست ہے۔ چنانچہ بہت لوگ ایسے ہیں کہ وہ مسجد میں آکر نماز شروع کر دیتے ہیں اور کعبہ کا کچھ بھی خیال ان کو نہیں آتا ان کی نماز درست ہے اگر ہم کعبہ کی عبادت کرتے تو اس کی نیت کرنا شرط ہوتا۔ مگر ایسا نہیں ہے۔

تیسرے یہ کہ اگر کسی وقت کعبہ نہ رہے جب بھی نماز فرض رہے گی اور اسی طرف منہ کیا جائے

گا، جہاں کعبہ موجود ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مسلمان کعبہ کے اینٹ پتھروں کو نہیں پوجتے، ورنہ انہدام کعبہ کے بعد نماز موقوف ہوجاتی۔

چوتھے یہ کہ اگر کوئی شخص سقف کعبہ پر نماز پڑھے تو اس کی نماز درست ہے۔ اگر کعبہ مسلمانوں کا معبود ہوتا تو اس کے اوپر چڑھ کر نماز صحیح نہ ہوتی کیونکہ اب کعبہ اس کے سامنے نہیں ہے۔ دوسرے معبود کے اوپر چڑھنا گستاخی ہے۔ اس حالت میں کسی طرح نماز درست نہ ہونا چاہیے تھی۔ مگر فقہاء نے تصریح کی ہے کہ کعبہ کی چھت پر بھی نماز صحیح ہے تو کیا معبود کے اوپر چڑھا بھی کرتے ہیں؟ ہاں معترضین نے اپنے اوپر قیاس کیا ہوگا کہ وہ گائے بیل کو دیوتا و معبود بھی سمجھتے ہیں پھر ان کے اوپر سوار بھی ہوتے ہیں مگر اس کا خلاف عقل ہونا ظاہر ہے۔

ایک اعتراض تقبیل حجر پر بھی ہے کہ مسلمان اس کو بوسہ دیتے ہیں تو گویا نعوذ باللہ اس کی عبادت کرتے ہیں۔

جواب یہ ہے کہ تقبیل حجر عظمت سے نہیں بلکہ محبت سے ہے جیسے بیوی بچوں کو بوسہ لیا کرتے ہیں اگر بوسہ دینا عبادت وعظمت کی دلیل ہے تو لازم آئے گا کہ ہر شخص اپنی بیوی کی عبادت کرتا ہے اور اس کا لغو ہونا بدیہی ہے معلوم ہوا کہ تقبیل عبادت و تعظیم کو مستلزم نہیں بلکہ کبھی محبت سے بھی تقبیل ہوا کرتی ہے۔

رہا یہ سوال کہ پھر تم حجر اسود سے محبت کیوں کرتے ہو۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ہمارے گھر کی بات ہے اس کے متعلق مخالف کو سوال کرنے کا حق نہیں۔ دیکھئے اگر کوئی شخص عدالت میں یہ دعویٰ دائر کرے کہ فلاں مکان میری ملک ہے تو اس سے اس پر ثبوت طلب کیا جائے گا۔ لیکن جب وہ ثبوت پیش کردے تو خصم کو اس سوال کا حق نہیں کہ اچھا مکان تو تمہارا ہی ہے مگر یہ بتلا دو کہ اس گھر میں کیا کیا سامان ہے؟ یا کوئی شخص بیوی کا بوسہ لے تو اس سے یہ سوال تو ہوسکتا ہے کہ تم اس کا بوسہ کیوں لیتے ہو۔ لیکن جب وہ یہ بتلائے کہ محبت کی وجہ سے میں بوسہ لیتا ہوں تو پھر اس سوال کا کسی کو حق نہیں کہ تم کو بیوی سے محبت کیوں ہے اور تم دن رات میں اس کے کتنے بوسے لیتے ہو؟ اورراس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اس کی وجہ بتلا نہیں سکتے کہ ہم کو حجر سے محبت کیوں ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ مخالفین کے اعتراضات کا جواب اسی حد تک دینا چاہیے جہاں تک ان کو سوال کا حق ہے اور جو سوال ان کے منصب سے باہر ہو اس کا جواب نہ دینا چاہیے بلکہ صاف کہہ دینا چاہیے کہ تم کو اس سوال کا کوئی حق نہیں۔ مخالفین کا دماغ ہر بات کی حقیقت سمجھنے کے قابل

نہیں۔ امور دقیقہ کو ان کے سامنے نہ بیان کرنا چاہیے۔

بعض لوگ اس پر تعجب کرتے ہیں کہ وہ بات کون سی ہے جس کو ہم نہیں سمجھ سکتے آخر ہم بھی تو انسان ہیں۔ اگر باریک بات ہمارے سامنے بیان کی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس کو نہ سمجھ سکیں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر یہی بات ہے تو پھر میں ایک ریاضی دان سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اقلیدس کی کوئی شکل ایک گھس کھودے کو سمجھا دیں جس نے اقلیدس کے مبادی واصول موضوعہ کو کبھی سنا بھی نہ ہو۔ یقیناً وہ اقرار کرے گا کہ میں ایسے شخص کو اقلیدس کے اشکال نہیں سمجھا سکتا آخر کیوں؟ کیا وہ انسان نہیں؟ مگر بات وہی ہے کہ بعض امور کے لئے مبادی ومقدمات کا سمجھنا ضروری ہوتا ہے اس لئے ان کو وہی سمجھ سکتا ہے جس کے ذہن میں تمام مبادی ومقدمات حاضر ہوں۔ ہر شخص ان کو نہیں سمجھ سکتا۔ اور یہ بالکل موٹی بات ہے۔ مگر حیرت ہے کہ آج کل کے عقلاء کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی۔

میرے پاس ایک ماسٹر صاحب آئے اور انہوں نے تقدیر کے متعلق ایک دقیق سوال مجھ سے کیا۔ میں نے کہا آپ اس کا جواب سمجھ نہیں سکتے۔ بہت دقیق ہے جو آپ کی فہم سے باہر ہے۔ ان کو اس جواب پر حیرت ہوئی اور شاید وہ یہ سمجھے ہوں کہ مولوی میرے سوال کے جواب پر قادر نہیں ہیں۔ اس لئے میں نے کہا کہ اگر آپ کو اس کا جواب سننے کا شوق ہے تو اس کی صورت یہ ہے کہ کسی طالب علم کو میرے پاس لایا جائے جس کے ذہن میں اس علم کے مقدمات حاضر ہوں۔ جس سے اس سوال کا تعلق ہے۔ وہ مجھ سے یہی سوال کرے میں اس کے سامنے جواب کی تقریر کردوں گا۔ آپ بھی سن لیجئے گا۔ اس وقت آپ کو یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ آپ اس کا جواب سمجھ سکتے ہیں یا نہیں اور یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ ہم لوگوں کے پاس اس کا جواب ہے۔ مگر آج کل تعلیم یافتہ جماعت یہ سمجھتی ہے کہ جب ہم سیاسیات دنیویہ کو خود سمجھتے ہیں تو سیاسیات ملیہ کو بھی بخوبی سمجھ لیں گے۔ مگر میں سچ کہتا ہوں کہ سیاسیات ملیہ کے سمجھنے کی ان میں خاک بھی قابلیت نہیں۔ بس وہ یورپ ہی کی سیاسیات کو شاید سمجھ لیتے ہوں گے بلکہ میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ سیاسیات ملیہ سمجھنے کی قابلیت اہل علم میں بھی سب کو نہیں۔ چنانچہ اب ان کی سیاسی غلطیوں کا انکشاف ہو رہا ہے۔ کل جن چیزوں کو وہ حرام کہہ رہے تھے آج ان کے جواز کا فتویٰ دیا جا رہا ہے۔ کل تک گاڑھا پہننا واجب وضروری تھا۔ ولایتی کپڑا پہننا قابل مواخذہ تھا۔ آج کچھ بھی نہیں۔ سب خاصی طرح ولایتی مال خریدنے لگے اور ساری ترک موالات ختم ہوگئی اور تالع یہ ہے کہ آج کل جو یہ تحریک انسداد فتنہ ار

تداد چل رہی ہے اس کے متعلق ایسے بعض علماء نے ایک اشتہار میں شائع کیا ہے کہ یہ تحریک چونکہ خالص مذہبی تحریک ہے اس لئے اس میں ہر طبقہ کو شریک ہونا چاہیے۔ اس سے معلوم ہوا کہ پہلی تحریکات خالص مذہبی نہ تھیں اس میں غیر مذہب کا بھی دخل تھا دل میں تو ان تحریکات کی حقیقت کو وہ سمجھ ہی رہے تھے مگر الحمدللہ برسوں کے بعد اب زبان سے بھی اقرار کرلیا کہ یہ پہلی تحریکات خالص مذہبی نہ تھیں پھر نہ معلوم ان میں شرکت نہ کرنے والوں کو کافر وفاسق کیوں بنایا گیا تھا۔ یقیناً جو امر مذہب وغیر مذہب سے مرکب ہوگا وہ فرض وواجب کبھی نہیں ہوسکتا مگر ستم یہ ہے کہ ان لوگوں نے تحریکات سابقہ کی شرکت کو فرض وواجب بنا رکھا تھا۔

صاحبو! مذہب میں بھی سیاسیات کا بہت بڑا حصہ ہے مگر وہ سب مذہب کے تابع ہے اور وہ سیاسیات خالص مذہبی سیاسیات ہیں ان میں غیر مذہب کا دخل ہرگز نہیں ہوسکتا اگر ان حضرات کے نزدیک پہلی تحریکات مذہبی سیاسیات میں داخل تھیں تو ان کے اس قول کا کیا مطلب ہے کہ تحریک انسداد تداد خالص مذہبی تحریک ہے اس میں سب کو شریک ہونا چاہیے۔ اس سے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ پہلی تحریک خالص مذہبی نہ تھیں تو پھر وہ مذہبی سیاسیات میں بھی داخل نہ تھیں۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ مخالفین کا جو سوال ان کے منصب سے باہر ہو اس کا جواب نہ دینا چاہیے بلکہ صاف کہہ دینا چاہیے کہ تم کو اس سوال کا حق نہیں ہے اس میں تم اپنے منصب سے آگے بڑھ رہے ہو مگر آج کل بعض لوگ اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ مخالف کی ہر بات کا جواب دیں خواہ اس کا سوال بجا ہو یا بے جا۔ یہ بڑی غلطی ہے۔ اس طرح تو کبھی گفتگو کا سلسلہ ختم نہ ہوگا۔

پس اگر مخالفین ہم سے یہ کہیں کہ تم کعبہ کی طرف منہ کرتے ہو اس سے اس کی عبادت لازم آتی ہے۔ اس کا جواب دینا ہمارے ذمہ ضروری ہے۔ چنانچہ میں نے چند جوابات دے دیئے ہیں کہ ہماری نماز نہ کعبہ کے وجود پر موقوف ہے، نہ اس کی نیت ضروری ہے، نہ اس کی دیواروں کا ہونا ضروری ہے بلکہ اس کی چھت پر بھی نماز ہوسکتی ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوگیا کہ ہم اس کی عبادت نہیں کرتے۔ اس کے بعد اگر وہ یہ کہیں کہ اچھا پھر تم اس کی طرف منہ کیوں کرتے ہو؟

اس سوال کا جواب ان کو نہ دیا جائے گا بلکہ ہم صاف کہہ دیں گے کہ جب یہ ثابت ہوگیا کہ ہم کعبہ کی عبادت نہیں کرتے تو اس سوال کا آپ کو کوئی حق نہیں۔ یہ ہمارے گھر کی بات ہے تم گھر والے بن جاؤ اس وقت تم کو گھر کی باتیں بھی بتا دیں گے۔ ہمارے جی کی خوشی ہم نے جس طرف چاہا نماز میں منہ کرلیا۔ تم اس میں دخل دینے والے کون ہوتے ہو؟ علیٰ ہذا اگر

وہ یہ کہیں کہ تم حجر کی تقبیل کر کے اس کی عبادت کرتے ہو اس کا جواب ضرور دیا جائے گا کہ ہم عبادت نہیں کرتے بلکہ محبت سے بوسہ دیتے ہیں جیسے تم اپنی بیوی کو بوسہ دیا کرتے ہو اگر وہ یہ کہیں کہ اچھا یہ بتلادو کہ تم کو حجر اسود سے محبت کیوں ہے اسکا جواب نہ دیا جائے گا بلکہ صاف کہہ دیں گے کہ جس طرح ہم کو آپ سے اس سوال کا حق نہیں کہ آپ کو اپنی بیوی سے محبت کیوں ہے؟ اسی طرح آپ کو اس سوال کا بھی حق نہیں۔

حکمت استقبال قبلہ:

اس پر شاید سامعین یہ کہیں کہ اچھا مخالفوں کو نہ بتلاؤ ہم کو تو بتلادو ہم تو گھر کے آدمی ہیں۔ سو آپ کو بے شک اس کی وجہ بتلائی جائے گی۔ میں نے اس وقت خاص خاص قواعد بتلائے ہیں کہ مخالفین سے کس طرح گفتگو کرنا چاہیے اور ان کے کس سوال کا جواب دینا چاہیے کس کا نہیں اور کون سی بات ان سے کہنی چاہیے اور کون سی نہیں۔

اب آپ کو بتلاتا ہوں سنیے استقبال قبلہ کا راز یہ ہے کہ عبادت کی روح دل جمعی اور یک سوئی ہے۔ بدوں یکسوئی اور دل جمعی کے عبادت کی صورت ہی صورت ہوتی ہے روح نہیں پائی جاتی اور یہ ایسی بات ہے جس کو تمام اہل ادیان تسلیم کرتے ہیں اب سمجھیے کہ اجتماع خواطر میں اجتماع ظواہر کو بہت بڑا دخل ہے۔ اسی لئے نماز میں سکون اعضاء کا امر ہے۔ التفات وعبث سے ممانعت ہے۔ صف کے سیدھا کرنے کا امر ہے۔ کیونکہ صف کو ٹیڑھا کرنے سے قلب پریشان ہوتا ہے۔ عام قلوب کو اس کا احساس کم ہوگا کیونکہ ان کو دل جمعی اور یک سوئی بہت کم نصیب ہے مگر جن کو نماز میں دل جمعی کی دولت نصیب ہے ان سے پوچھئے کہ صف ٹیڑھی ہونے سے قلب پر کیا اثر ہوتا ہے۔ صوفیہ قسم کھا کر کہتے ہیں کہ صف غیر منتظم سے قلب کو خلجان و پریشانی ہوتی ہے اس دل جمعی کے لئے سجدہ گاہ پر نظر جمانے کی تاکید ہے کیونکہ جگہ جگہ نظر گھمانے سے بھی قلب کو یکسوئی حاصل نہیں ہوتی۔ اور یہی اصل ہے تمام اشغال صوفیہ کی جو مراقبات واشغال تعلیم کرتے ہیں۔ ان سے محض یہی یک سوئی وجمعیت قلب پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے۔

اور یہی اصل تھی قیام مولد کی۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ صوفیہ نے (جیسے امام غزالیؒ وغیرہ) آداب وجد میں لکھا ہے کہ جب کسی شخص پر وجد طاری ہو اور وہ کھڑا ہو جائے تو سب حاضرین کو اس میں اس کی موافقت کرنا اور سب کو کھڑا ہونا چاہیے تاکہ اوروں کو بیٹھا ہوا دیکھ کر صاحب وجد کو خلجان نہ ہو اور اس کے وجد میں انقباض نہ آئے۔ تو مولد بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی صاحب وجد نے

غلبہ وجد میں قیام کیا ہوگا۔ حاضرین نے موافق ادب مذکور کے قیام میں اس کی موافقت کی ہوگی۔ بس لوگوں نے آئندہ قیام مولد کو لازم اور ضروری ہی سمجھ لیا۔ جس سے وہ قابل منع ہو گیا۔ غرض اس کا انکار نہیں ہو سکتا کہ اجتماع خاطر میں اجتماع ظاہر کو بہت بڑا دخل ہے۔ پس نماز میں اگر ایک خاص جہت مقرر نہ ہوتی تو کوئی کسی طرف منہ کرتا کوئی کسی طرف منہ کرتا۔ اس اختلاف جہات وتباعین ہیئات سے تفرق قلب ہوتا لہٰذا یکسوئی کے لئے ایک خاص جہت مقرر کر دی گئی۔

رہا یہ کہ وہ کعبہ ہی کی جہت کیوں مقرر ہوئی کوئی اور جہت کیوں نہ ہوئی۔ اس سوال کا کسی کو حق نہیں کیونکہ یہ سوال تو اس دوسری جہت میں بھی ہو سکتا ہے کہ یہی کیوں ہوئی دوسری کیوں نہ ہوئی۔ دیکھئے عدالت وقت مقرر کرتی ہے کہ کچہری کا وقت فلاں وقت سے فلاں وقت تک ہے۔ تو آپ یہ سوال تو کر سکتے ہیں کہ وقت مقررہ کرنے کی کیا ضرورت ہے جس کا جواب یہ دیا جائے گا تا کہ کام کرنے والے سب کے سب معاً حاضر ہو سکیں اور رعایا اہل حاجت کو وقت مقررہ ہونے سے اطمینان ہو جاوے کہ عدالت کا یہ وقت ہے۔ تو اس کے علاوہ اوقات میں وہ اپنے دوسرے کام کر سکیں۔ اگر وقت مقرر نہ ہو تو ہر شخص کو تمام دن عدالت میں ہی رہنا پڑتا کہ نہ معلوم حاکم کس وقت آ جاوے۔ باقی اس سوال کا کسی کو حق نہیں کہ گورنمنٹ نے دس بجے سے چار بجے تک ہی کا وقت کیوں مقرر کیا؟ کوئی اور وقت مقرر کر دیا ہوتا کیونکہ وہ کوئی بھی وقت مقرر کرتی یہ سوال تو کبھی ختم نہ ہو سکتا تھا۔

علیٰ ہذا ہم کو یہ بتلانے کی ضرورت نہیں کہ جہت کعبہ ہی کو استقبال کے لئے کیوں مخصوص کیا گیا۔ ہاں اس کا راز ہم نے بتلا دیا کہ خاص جہت کی تعیین میں کیا مصلحت ہے یہ جواب تو ضابطہ کا ہے اور طالب کے لئے جواب یہ ہے کہ حق تعالیٰ کو معلوم ہے کہ ان کی (یعنی حق تعالیٰ کی) توجہ کس طرف زیادہ ہے۔ جس کی طرف ان کی توجہ زیادہ تھی اس کو جہت صلوٰۃ مقرر فرما دیا رہا یہ کہ کیسے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کی توجہ کعبہ کی طرف زیادہ ہے۔ سو جن کی آنکھیں ہیں وہ جانتے ہیں کہ واقعی کعبہ پر تجلیات الٰہیہ بہت زیادہ ہیں اور توجہ سے یہی مراد ہے اور وہی تجلیات روح کعبہ اور حقیقت کعبہ ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ کعبہ ظاہری کی چھت پر بھی نماز ہو جاتی ہے کیونکہ اس وقت گو صورت کعبہ سامنے نہیں مگر حقیقت کعبہ یعنی تجلی الٰہی تو سامنے ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مسلمان دراصل تجلی الٰہی کا استقبال کرتے ہیں کعبہ کی دیواروں کا استقبال نہیں کرتے مگر چونکہ تجلی الٰہی کا احساس ہر شخص کو

نہیں ہوتا اس لئے حق تعالیٰ نے اس خاص بقعہ کی حد مقرر فرمادی۔ جس پر ان کی تجلی دوسرے مکانوں سے زیادہ ہے۔ پس یہ عمارت محض اس تجلی اعظم کی جگہ دریافت کرنے کے لئے ہے ورنہ خود عمارت مقصود بالذات نہیں چنانچہ انہدام عمارت کے بعد نماز کا موقوف ہونا اور کعبہ کی چھت پر نماز کا درست ہونا (اسی طرح اگر اندھیرے میں جہت کعبہ معلوم نہ ہو اور اپنے گمان پر کسی طرف منہ کر کے نماز پڑھ لی اور بعد میں معلوم ہو کہ نماز قبلہ کی طرف نہیں ہوئی بلکہ اور کسی طرف کو ہوئی ہے۔ اس صورت میں اسلام کا حکم ہے کہ نماز درست ہوگئی۔ اس سے بھی معلوم ہوگیا کہ مسلمان کعبہ کی پرستش نہیں کرتے ورنہ اس صورت میں بطلان صلوٰۃ کا حکم ہوتا بلکہ تعیین جہت کی وہی حکمت ہے جو اوپر مذکور ہوئی۔) اس کی دلیل ہے۔ فقہاء نے اس راز کو سمجھا ہے اسی لئے وہ فرماتے ہیں کہ قبلہ وہ ہوا ہے جو کعبہ کی محاذات میں آسمان تک اور اس سے نیچے زمین کے اسفل طبقات تک ہے لیکن چونکہ عمارت کعبہ کو اور اس جگہ کو تجلی الٰہی سے تلبس ہے۔ اس تلبس کی وجہ سے اس میں بھی برکت آگئی اور یہی تجلی اہل لطائف کے نزدیک معنی ہے۔

الرحمن علی العرش استویٰ کے یعنی عرش پر تجلی رحمانیت ہوتی ہے یہ معنی ہرگز نہیں کہ عرش پر خدا تعالیٰ بیٹھے ہیں اور وہ ان کا مکان ہے۔ کیونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ مکان کو مکین کے برابر یا کم از کم اس کے متقارب ہونا چاہیے۔ اگر کوئی شخص زمین پر بیٹھے اور اس کے نیچے رائی کا دانہ آجائے تو زمین کے خاص حصہ کو تو اس کا مکان کہا جائے گا رائی کے دانہ کو کوئی شخص اس کا مکان نہ کہے گا کیونکہ انسان سے اس کو کچھ بھی نسبت نہیں پھر وہ اس کا مکان کیونکر ہوسکتا ہے اسی طرح یہاں سمجھئے کہ عرش حق تعالیٰ کا مکان نہیں ہوسکتا کیونکہ عرش محدود ہے اور ذات خداوندی غیر محدود ہے محدود کسی طرح غیر محدود کا مکان نہیں ہوسکتا پس **استویٰ علی العرش** کے معنی وہی ہیں کہ حق تعالیٰ کی تجلی صفت رحمانیت کے اعتبار سے اس پر ہوتی ہے۔ اسی واسطے **الرحمن علی العرش استویٰ** (وہ بڑی رحمت والا عرش پر قائم ہے) فرمایا۔ **اللہ علی العرش استویٰ** نہیں فرمایا کیونکہ اللہ علم ذات ہے اور الرحمن اسم صفت ہے اس سے معلوم ہوگیا کہ عرش محل ذات نہیں بلکہ مظہر صفت رحمت ہے کہ وہاں تجلی رحمت اور مکانات سے زیادہ ہے تو یہ استقبال قبلہ کا راز ہوا۔

تقبیل حجر:

رہا تقبیل حجر کا راز تو میں کہہ چکا ہوں کہ اس کا منشا عظمت و عبادت نہیں بلکہ محض محبت اس کا منشاء ہے چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس حقیقت کو مجمع عام میں ظاہر فرمایا ایک بار آپ طواف کر رہے

تھے۔ اس وقت کچھ لوگ دیہات کے موجود تھے۔ جب آپ نے تقبیل حجر کا ارادہ کیا تو حجر کے پاس ذرا ٹھہرے اور فرمایا **انی لا علم انک لحجر لا تضرو لاتنفع دلولا انی رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبلک ماقبلتک** یعنی میں جانتا ہوں کہ ایک پتھر ہے جو نہ کچھ نفع دے سکتا ہے نہ ضرر دے سکتا ہے اور اگر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھے بوسہ دیتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو میں کبھی تجھے بوسہ نہ دیتا۔ کیا خشک معاملہ کیا ہے حجر اسود کے ساتھ۔ بھلا اگر یہ مسلمانوں کا معبود ہوتا تو کیا اس سے یہی خطاب کیا جاتا کہ نہ تو نفع دے سکتا ہے نہ ضرر پہنچا سکتا ہے؟

اس سے صاف معلوم ہوگیا کہ اس تقبیل کا منشا محض محبت ہے اور محبت کی وجہ یہ ہے کہ حضور نے اس کو بوسہ دیا ہے۔ حضور کا فضلہ بھی کسی جگہ گرا ہو تو ہم کو اس جگہ سے محبت ہوگی۔ چہ جائیکہ وہ جگہ جہاں حضور کے ہاتھ لگے ہوں اور اس سے بڑھ کر یہ کہ آپ کا دہان مبارک لگا ہو۔

در منزلیکہ جاناں روزے رسیدہ باشد
با خاک آستانش داریم مرحبائے

جس جگہ محبوب ایک دن کیلئے بھی پہنچا ہوگا اس آستانہ کی خاک کو بھی ہم مرحبا کہتے رہیں گے۔

رہا یہ کہ حضور نے اس کو کیوں بوسہ دیا اس سول کا کسی کو حق نہیں اور نہ ہم کو اس کی وجہ بتلانا ضروری ہے۔ ہاں اتنی بات یقینی ہے کہ حضور نے بطور عبادت وعظمت کے بوسہ نہیں دیا ورنہ حضرت عمرؓ اس بے باکی کے ساتھ لاتضرو لاتنفع نہ فرماتے۔ وہ حضور کے مزاج شناس تھے۔ جب انہوں نے حجر کیساتھ یہ معاملہ کیا تو یقیناً اس تقبیل کا منشاء عبادت ہرگز نہیں اور تبرعاً اس کا جواب بھی دیئے دیتا ہوں کہ ممکن ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حجر کے اندر تجلیات الٰہیہ کا بنسبت دوسرے حصص بیت کے زیادہ ہونا منکشف ہوا ہو۔ پس منشاء اس تقبیل کا تلبس زائد ہے تجلیات الٰہیہ سے اور جس چیز کو محبوب کے انوار سے زیادہ تلبس ہو اس کا بوسہ دینا اقتضائے محبت ہے (قال الشاعر)

امر علی الدیار دیار لیلی   اقبل ذا الجدار وذاالجدارا
وملحب الدیار شغفن قلبی   ولکن حب من سکن الدیارا

مجنوں کہتا ہے کہ جب میں لیلی کے کوچہ سے گزرتا ہوں تو کبھی اس دیوار کو چومتا ہوں کبھی اس دیوار کو مجھے دراصل ان گلی کوچوں کے در و دیوار سے محبت نہیں مجھے تو اس کوچہ میں رہنے والی سے محبت ہے۔

اس جگہ شاید کسی کو یہ اشکال پیش آئے کہ جس وقت حضرت عمرؓ نے حجر اسود کے متعلق یہ فرمایا

تھانی لا علم انک لحجر لا تضرو لا تنفع اس وقت حضرت علیؓ وہاں موجود تھے انہوں نے فرمایا **بلی اند ینفع انی سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہ یشھد لمن قبل یوم القیامۃ** (او کماقال) کیوں نہیں وہ نفع دے گا میں نے حضور سے سنا ہے کہ جو لوگ اس کو چومتے ہیں قیام کے دن یہ ان کے واسطے گواہی دے گا تو اس سے حجر کا نافع ہونا معلوم ہوا اور یہ معارض ہے حضرت عمرؓ کے قول کے۔

خوب سمجھ لیجئے کہ اگر حضرت علیؓ سے یہ قول بسند صحیح ثابت ہو تو حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کے قول میں تعارض کچھ نہیں بلکہ حضرت علیؓ کا قول حضرت عمرؓ کے قول کا مکمل ہے اور اس کی حقیقت کو ظاہر کرنے والا ہے۔ کیونکہ جب حضرت عمرؓ نے یہ فرمایا۔ کہ میں جانتا ہوں کہ تو نہ ضرر دے سکتا ہے نہ نفع تو اس پر یہ شبہ وارد ہوتا ہے کہ پھر یہ تقبیل محض لغو ہے۔ جس کام میں کچھ نفع بھی نہیں اس کا کرنا فضول ہے۔ حضرت علیؓ نے اس شبہ کو رفع فرما دیا اور بتلا دیا کہ حضرت عمرؓ ایک خاص نفع وضرر کی نفی فرماتے ہیں۔ یعنی جو نفع وضرر معبود کا خاصہ ہے حجر اسود میں وہ نہیں ہے باقی مطلق نفع کی نفی مقصود نہیں۔

چنانچہ حجر میں ایک نفع ہے کہ وہ شاہد بنے گا قیامت میں اپنے بوسہ دینے والوں کے لئے اور ظاہر ہے کہ شاہد کا درجہ حاکم سے کم ہوتا ہے۔ شاہد کے قبضہ میں نفع وضرر نہیں ہوتا وہ تو صرف واقعہ بیان کر دیتا ہے اب آگے حاکم کی رائے پر فیصلہ کا مدار ہے نفع وضرر وہی دے سکتا ہے۔ حاکم اصل اور شاہد تابع ہوتا ہے پس حجر کا شاہد ہونا خود اس کی عبادت کی نفی کرتا ہے۔

چنانچہ شاہد تو انسان بھی ہو سکتا ہے چنانچہ قیامت میں بہت سے انسان بھی شاہد ہوں گے پس حضرت عمرؓ کا مطلب یہ ہے کہ وہ نفع وضرر تیرے قبضہ میں نہیں ہے اس سے تو شبہ عبادت کی نفی ہو گئی اور حضرت علیؓ کا مطلب یہ ہے کہ وہ نفع تیرے اندر موجود ہے جو مخلوق سے مخلوق کو پہنچا کرتا ہے۔ یعنی شاہدیت اس سے لغویت تقبیل کی نفی ہو گئی خوب سمجھ لو۔

تکمیل توحید:-

دوسری تکمیل توحید کی اسلام میں یہ ہے کہ تصویر کو حرام کر دیا گیا۔ تصویر کا بنانا بھی حرام ہے اور گھر میں رکھنا بھی حرام ہے حالانکہ تصویر قابل پرستش نہیں۔ نہ تو کفار تصویر کو پوجتے ہیں بلکہ وہ تو مجسم مورتوں کو پوجتے ہیں۔ اس وقت بھی کفار کی یہی حالت ہے اور پہلے بھی یہی دستور تھا چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں **اتعبدون ماتنحتون** (کیا تم ان چیزوں کو پوجتے ہو جن کو خود تراشتے ہو) یہ نہیں فرمایا **اتعبدون ماتصورون** (کیا تم اسکی عبادت کرتے ہو جس کی تصویریں بناتے

ہو) مگر بایں ہمہ اسلام نے شرک سے اتنا بچایا ہے کہ تصویر کو بھی حرام کر دیا۔ کیونکہ گو اس کی عبادت نہیں ہوتی مگر مفضی الی العبادۃ ہونے کا احتمال اس میں ضرور ہے کیونکہ جب تصویر کی اجازت ہوتی تو لوگ حضور کی صحابہ و بزرگان دین کی تصویریں بھی اتارتے اور عادۃً تصویر کا اثر قلب پر وہی ہوتا ہے جو صاحب تصویر کا اثر ہوتا ہے تو وہ تصویروں کی تعظیم بھی کرتے۔ پھر رفتہ رفتہ جہلاء شرک میں مبتلا ہو جاتے چنانچہ پہلے زمانہ میں اسی سے شرک کی بنیاد قائم ہوئی۔

اور تصویر کا اثر صاحب تصویر کے برابر ہونے کا مجھے ایک واقعہ یاد آیا جو مجھ سے کانپور میں ایک مسافر نے نقل کیا تھا کہ ایک مرتبہ مجمع غلاۃ مبتدعہ کے بطور استہزا کے ایک نقل کی جس میں ظالموں نے امام حسینؓ امام حسنؓ، حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم حتیٰ کہ اللہ میاں کی بھی تصویر بنائی تھی۔ اس مجمع میں کوئی دیہاتی سنی بھی جا پھنسا تھا۔ سب سے پہلے امام حسینؓ کی تصویر لائی گئی۔ لوگوں نے مفتی مجلس سے پوچھا کہ ان کے بارہ میں کیا حکم ہے؟ اس نے کہا کہ یہ حضرت قیامت تک کے لئے ہم پر مصیبت ڈال گئے ہیں کہ اپنے ساتھ سارے خاندان اہل بیت کو مروا ڈالا جن کو ہر سال ہم روتے ہیں۔ اگر یہ تقیہ کر لیتے تو کچھ بھی نہ ہوتا۔ لہٰذا ان کو لے جاؤ اور قتل کر ڈالو۔ اس کے بعد امام حسنؓ لائے گئے پوچھا ان کے واسطے کیا حکم ہے؟ کہا انہوں نے اپنے کو خلافت سے معزول کر کے (حضرت معاویہؓ کو خلافت دیدی۔ جس سے یزید کو خلافت پہنچ گئی۔ یہ سب انہی کا فساد ہے ان کو بھی قتل کرو۔ اسکے بعد حضرت علیؓ کی تصویر لائی گئی کہا سارے فتنہ کی جڑ یہی ہیں۔ انہوں نے خواہ مخواہ (حضرت) معاویہؓ سے لڑائی کی۔ جن سے ان کا خاندان اہل بیت کا دشمن ہو گیا۔ تقیہ کر لیتے تو کچھ بھی نہ ہوتا ان کو بھی ختم کرو۔ پھر حضرت فاطمہؓ کی تصویر لائی گئی۔ کہا ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے معلوم ہو چکا تھا کہ حسینؓ کربلا میں شہید ہوں گے۔ انہوں نے اپنے ابا جان سے دعا نہ کرائی کہ میری اولادیں تباہ نہ ہوں ان کو بھی صاف کرو۔ پھر نعوذ باللہ حضور کی تصویر لائی گئی کہا ارے یہ تو سب کچھ کر سکتے تھے ایک بددعا کر دیتے تو یزید کی کیا مجال تھی جو اہل بیت پر یہ مصیبت ڈالتا۔ پھر جو حکم اوروں کے لئے ہوا تھا آپ کی تصویر کے لئے بھی وہی ہوا۔ بے چارہ دیہاتی مسلمان یہ سب کچھ دیکھتا رہا اور دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا رہا۔ آخر سب کے بعد ایک بہت بڑی تصویر لائی گئی۔ مفتی نے پوچھا کہ یہ کون ہیں کہا گیا کہ یہ اللہ میاں ہیں (نعوذ باللہ) اس نے کہا سارا فساد تو ان ہی کا ہے ان کو سب کچھ قدرت تھی مگر انہوں نے اہل بیت کا ساتھ نہ دیا یزیدیوں کا ساتھ دیا اور اہل بیت کو ان کے ہاتھ سے

مرواڈالا پھران کے واسطے بھی وہی حکم ہوا جو اوروں کے لئے ہوا تھا۔ اس وقت بے چارے مسلمان سے رہا نہ گیا وہ یہ سمجھا کہ اگر اللہ میاں نہ ہوتے تو بارش کون برسائے گا؟ روزی کون دے گا؟ جنت کون دے گا؟ بے چارہ غلبہ جوش میں اٹھا اور دوڑ کے اس تصویر کو اٹھا کر لے بھاگا؟ بدعتی اس کے پیچھے پیچھے لاٹھیاں لے کر دوڑے کہ کون اجنبی ہماری محفل میں آ گیا مگر وہ دیہاتی مضبوط تھا۔ ایسا بھاگا کہ کسی کے ہاتھ نہ آیا۔ قریب ہی اہل حق کے دیہات تھے اس نے وہاں جا کر پکارا کہ مجھے بچاؤ لوگ جمع ہو گئے بدعتی مجمع کو دیکھ کر لوٹ گئے اب لوگوں نے اس سے کہنا شروع کیا کہ تو ان کم بختوں میں کہاں جا پھنسا تھا۔ خیر خدا کا شکر ہے کہ اس نے تجھے بچا لیا کہنے لگا وہ خدا مجھے کیا بچاتا۔ میں نے ہی خدا کو بچا لیا (توبہ توبہ لوگوں نے کہا کم بخت یہ کیا بکتا ہے۔ کہنے لگا دیکھو یہ خدا میرے ساتھ موجود ہے یہ لوگ ان کو قتل کرتے تھے میں اٹھا کر لے بھاگا اور ان کی جان بچائی۔ لوگ ہنسنے لگے اور اسے سمجھایا کہ بیوقوف یہ خدا نہیں ہے۔ یہ تو بنائی ہوئی تصویر ہے خدا کو بھلا کون دنیا میں دیکھ سکتا ہے اور وہ بے جان تھوڑا ہی ہے کہ نہ بولتا ہو نہ بات کرتا ہو۔ پھر وہ کسی کے ہاتھ کیوں آنے لگا۔ کس کی مجال ہے جو خدا تعالیٰ کو آنکھ بھر کر بھی دیکھ سکے وہ دیہاتی بے چارہ جاہل تھا مگر خدا کا محب۔ اس لئے وہ اس قول سے کہ میں نے خدا کو بچایا ہے۔ کافر نہیں ہوا وہی قصہ ہو گیا جو شبان موسیٰ علیہ السلام کا قصہ تھا اخلاص و محبت کی وجہ سے اس کی یہ جہالت معاف ہو گئی۔ اس قصہ سے آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ تصویر کا اثر قلب پر کیسا ہوتا ہے اسی لئے شریعت نے اس کو حرام کر دیا۔ مگر آج کل مسلمانوں کا کچھ ایسا مذاق بدلا ہے کہ تصویر سے ذرا بھی اجتناب نہیں رہا۔ حتیٰ کہ مسائل کی کتابوں میں بھی تصویریں بننے لگیں۔ جہاں وضوء کا بیان ہے وہاں ایک تصویر آدمی کی اور لوٹے کی بنا دی ہے۔ گویا وہ بیٹھا ہوا وضوء کر رہا ہے وعلیٰ ہذا۔ اگر یہی مذاق رہا تو چند دنوں کے بعد قرآن میں بھی تصویر ہونے لگے گی۔ جب مسلمانوں کی یہ حالت ہو تو مخالفین اسلام کو ہم کیا جواب دیں مگر ہم تو اب بھی جواب دیں گے کیونکہ اسلام میں تو ممانعت ہی ہے۔ اسلام اپنے پیروؤں کے اعمال کا ذمہ دار تھوڑا ہی ہے۔

نماز کی خوبی:

ایک خوبی اسلام کی یہ ہے کہ نماز کو کس خوب صورتی کے ساتھ شروع فرمایا ہے اس کی نظیر کوئی مذہب نہیں دکھا سکتا۔ شروع سے لے کر آخر تک خدا کی حمد و ثنا تکبیر و تعظیم ہی ہے۔ کبھی رکوع

ہے۔ کبھی سجدہ، کبھی قیام ہے کبھی قعود۔ گویا عاشق اپنے محبوب کی خوشامد کر رہا ہے نہ کسی طرف دیکھتا ہے نہ کسی سے بات کرتا ہے۔ کبھی محبوب کے سامنے ہاتھ جوڑتا ہے کبھی جھکتا ہے کبھی پاؤں پڑتا ہے کبھی ادب سے بیٹھ کر عرض معروض کرتا ہے۔ غرض عجیب عبادت ہے۔

زکوٰۃ کی خوبی:

ایک خوبی اسلام میں یہ ہے کہ غرباء کے لئے امراء پر زکوۃ کو فرض فرما دیا جس میں صرف چالیسواں حصہ دینا پڑتا ہے اور کھیتی میں دسواں یا بیسواں حصہ۔ یہ ایسی مقدار ہے جس میں دینے والے پر کچھ بھی بار نہیں اور اگر پابندی سے سب ادا کریں تو اہل اسلام کے تمام فقراء و معذورین کے لئے کافی ہے۔ کوئی بھی بھوکا ننگا نہ رہے مگر افسوس لوگ پابندی سے زکوۃ نہیں نکالتے۔ پھر لطف یہ کہ زکوۃ دینے سے مال میں برکت بھی ہوتی ہے۔ کمی نہیں آتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پختگی کے ساتھ فرمایا ہے کہ صدقہ سے مال میں کمی نہیں آتی۔ آخرت کا ثواب تو ملے ہی گا۔ زکوۃ سے دنیا میں بھی مال بڑھتا ہے آفات سے محفوظ رہتا ہے چنانچہ تجربہ کر کے دیکھ لیا جاوے۔

حج کی خوبی:

پھر ایک عبادت حج کی مقرر فرمائی جس کی بناء یہ ہے کہ چونکہ بدوں حال کے قال بیکار ہے۔ دل پر بھی چرکہ لگانے کی ضرورت تھی اس لئے عشق و محبت کا چرکہ دل پر لگانے کے لئے یہ ایک عبادت ایسی بھی شروع ہوئی جس میں ابتداء سے انتہا تک جنون عشق کی کیفیت ہوتی ہے یعنی حج۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ سب باتیں ظاہری ہی ہیں نہیں صاحب ان کا دل پر بڑا اثر ہوتا ہے۔ احرام کی کیفیت دیکھ کر دشمنوں پر بھی اثر ہوتا ہے کہ بادشاہ اور غلام سب کے سب ننگے سر ہیں۔ چادر لنگی پہنے ہوئے ہیں۔ ناخن بڑھے ہوئے بال پریشان ہیں۔ نہ خوشبو لگا سکتے ہیں۔ نہ ناخن کتر سکتے ہیں، نہ خط بنوا سکتے ہیں۔ اٹھتے بیٹھتے **لبیک اللھم لبیک** پکارتے ہیں۔ جب حاجی لبیک کہتے ہیں تو پتھر بھی موم ہو جاتا ہے۔ پھر جب مکہ پہنچتے ہیں اور کعبۃ اللہ پر نظر پڑتی ہے تو نظر کے ساتھ ہی انکھوں سے گھڑوں پانی بہنے لگتا ہے۔ کیا سب باتیں ہی باتیں ہیں۔ کوئی تو چیز ہے جو یوں بے تاب کر ڈالتی ہے۔ یہ رونا نہ معلوم خوشی کا ہے یا غم کا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہمارے حاجی صاحب نے ارشاد فرمایا تھا کہ یہ رونا گرم بازاری عشق کا ہے۔ جس کا ذکر ان اشعار میں ہے۔

بلبلے برگ گلے خوش رنگ در منقار داشت واندراں برگ ونوا صد نالہائے زار داشت
گفتمش در عین وصل ایں نالہ وفریاد چیست گفت مارا جلوہ معشوق دریں کار داشت

ایک بلبل ایک خوبصورت پھول کی پتی چونچ میں لئے ہوئے تھی اور اس پتی میں سینکڑوں نالوں کی صدائیں رکھے ہوئے نالے کر رہی تھی۔ میں اس سے عین وصال کے وقت گیا کہ یہ نالہ وفریاد کیسا۔ اس نے جواب دیا کہ جلوہ معشوق نے اسی کام کار کھا ہے۔

غرض حج ایسی عجیب عبادت ہے کہ اگر اس کو طریقہ سے ادا کیا جاوے تو انسان ایک ہی حج میں واصل ہو جاتا ہے۔ مگر بعضے حاجی ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ایک مسافر مسجد میں پڑا سو رہا تھا کسی چور نے اس کا چادرہ کھینچا تو وہ کہتا ہے حاجی صاحب چادر نہ کھینچو۔ کسی نے کہا کہ تجھے اس کا حاجی ہونا کیسے معلوم ہوا؟ کہا معلوم تو نہیں ہوا مگر ایسے کام حاجی ہی کیا کرتا ہے۔ تو بعضے حاجی ایسے بھی ہوتے ہیں کہ حج سے پہلے تو وہ کچھ ڈھکے منڈے نیک بھی تھے اور حج کے بعد کھلم کھلا بدمعاش ہوگئے۔ بات یہ ہے کہ حجر اسود کسوٹی ہے اس کو چھونے کے بعد انسان کا اصلی رنگ ظاہر ہو جاتا ہے جو حالت پہلے سے مخفی تھی وہ اب کھل جاتی ہے۔ اگر طبیعت میں نیکی تھی تو پہلے سے زیادہ نیک ہو جاتا ہے اگر بدی تھی تو اب وہ بدی کھل جاتی ہے بہت لوگ ظاہر میں نیک معلوم ہوتے ہیں مگر کسوٹی پر لگانے سے کھرا کھوٹا معلوم ہو جاتا ہے۔

نقد صوفی نہ ہمہ صافی و بے غش باشد اے بسا خرقہ کہ مستوجب آتش باشد
خوش بود گر محک تجربہ آید بمیاں تا سیہ روئی شود ہر کہ درو غش باشد

صوفی کی موجودہ حالت اگر بالکل درست نہ ہو وہ صوفی نہیں اگرچہ وہ خرقہ پہن لے۔ اے شخص بہت سے خرقہ پوش آگ میں جلانے کے قابل ہیں۔

شاید تم یہ کہو کہ اچھا ہوا تم نے یہ بات ظاہر کر دی۔ اب تو ہم حج ہی کو نہ جائیں گے۔ نہیں صاحب! حج کو جاؤ مگر اکسیر بن کر جاؤ اور لو میں تم کو اکسیر بننے کا طریقہ بھی بتلاتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ کسی کیمیا گر سے تعلق پیدا کر لو۔

کیمیائیست عجب بندگی پیر مغاں خاک او گشتم وچندیں درجاتم دادند

میخانہ کی پیر مغاں کی اطاعت بھی کیا عجیب چیز ہے کہ میں انکے قدموں کے رہنے میں اس درجہ پر پہنچ گیا ہوں۔

کیمیا گر سے میری مراد یہ لنگوٹی باندھنے والے نہیں ہیں بلکہ باطن کے کیمیا گر مراد ہیں جن کو

اہل اللہ کہتے ہیں ان کی شان یہ ہوتی ہے۔

آہن کہ بپارس آشنا شد   فی الحال بصورت طلا شد

لوہا جونہی پارس سے ملا فوراً سونا بن گیا۔

پارس ایک پتھر ہوتا ہے اس کی خاصیت یہ ہے کہ جہاں لوہے کو اس سے مس کیا فوراً سونا ہو جاتا ہے۔ اہل اللہ کی تو یہ خاصیت مشاہد ہے۔ پارس میں یہ بات ہو یا نہ ہو اہل اللہ کی صحبت سے توبہ نصوح حاصل ہو جاتی ہے جس سے پہلی تمام گندگیاں دھل جاتی ہیں۔ پس تم کو چاہیے کہ کسی اللہ والے سے تعلق پیدا کر کے حج کو جاؤ اس کی صحبت سے تم کو توبہ خالص عطا ہو گی۔ توبہ کر کے جاؤ گے تو پھر حج کا اثر یہ ہو گا کہ پہلے سے زیادہ تم کو اعمال صالحہ کی توفیق ہو گی۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ مرید ہو کر جاؤ۔ اس کی ضرورت نہیں صرف تعلق محبت اور چند روزہ صحبت کی ضرورت ہے۔

حسن معاملہ:

معاملات میں اسلام کا حسن ہے کہ مخلوق کو دھوکہ فریب دینا حرام ہے چاہے مسلمان کو دھوکہ دے یا کافر کو **من غشنا فلیس منا** (جو ہمیں دھوکہ دے وہ ہم میں سے نہیں) ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بازار میں گذرے تو گیہوں کے ایک ڈھیر میں آپ نے ہاتھ ڈالا تو اس میں اوپر تو سوکھے ہوئے گیہوں تھے اور اندر بھیگے ہوئے تھے اس وقت آپ نے فرمایا **من غشنا فلیس منا** (**الصحیح لمسلم ۱۶۴**) اور اس شخص سے فرمایا کہ بھیگے ہوئے گیہوں اوپر کرو تا کہ لوگوں کو دھوکہ نہ ہو۔ اسی طرح جن صورتوں سے معاملات میں نزاع پیدا ہو ان کو سب کو ناجائز کر دیا۔ **نهى عن بيع الغرر** (سنن أبي داود ۳۳۷۶) اسی طرح سود و ربا کو مطلقاً حرام کیا گیا کیونکہ اس سے قرض لینے والا بہت جلد تباہ ہو جاتا ہے۔

حسن معاشرت:

معاشرت کی خوبی یہ ہے کہ سب سے پہلے تواضع کی تعلیم دی گئی ہے **من تواضع لله رفعه الله** تواضع کے یہ معنی ہیں کہ اپنے کو سب سے کمتر سمجھے۔ حتیٰ کہ جانوروں سے بھی کمتر سمجھے کیونکہ اگر نجات ہو گی تب تو اپنے کو ان سے افضل کہنے کا حق ہے اور اگر خدانخواستہ نجات نہ ہوئی تو جانوروں سے بھی بدتر ہوئے کیونکہ وہ غضب الٰہی سے محفوظ ہیں کیا اس تواضع کی نظیر کوئی دکھا سکتا ہے **الحمد لله** اسلام میں اس کی صدہا نظائر موجود ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تواضع کا حال اوپر مذکور ہو چکا ہے اور جو لوگ آپ کے سچے نائب ہیں وہ بھی اسی مذاق کے ہوتے ہیں اور تواضع حسن معاشرت کی جز

ہے۔ معاشرت میں خرابی اسی سے آتی ہے کہ میں اپنے کو بڑا سمجھتا ہوں اور تم اپنے کو اور جب دونوں اپنے کو دوسرے سے کمتر سمجھیں گے تو پھر نزاع کی نوبت ہی نہ آئے گی اور اگر آئے گی بھی تو وہ حد سے متجاوز نہ ہوگی۔ آج کل لوگ اتفاق اتفاق پکارتے پھرتے ہیں۔ ہمارے حاجی صاحب فرماتے تھے کہ اتفاق کی جڑ تو ان لوگوں میں ہے نہیں محض باتوں سے اتفاق پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اتفاق کی جڑ تواضع ہے۔ جو لوگ متواضع ہوں گے۔ ان میں آپس میں نزاع ہو ہی نہیں سکتا اور بدوں تواضع کے کبھی اتفاق پیدا نہیں ہوسکتا۔ واقعی عجیب گر کی بات ہے۔

ایک خوبی معاشرت کی یہ ہے کہ استیذان کا مسئلہ مشروع کیا گیا ہے کہ بدوں اجازت واطلاع کے اپنے گھر میں بھی نہ آئے۔ شاید کوئی پردہ دار ہو۔ اس کی پردہ دری ہوگی جب اپنے گھر کا یہ حکم ہے تو دوسروں کا تو کیا پوچھنا اور زنانہ تو زنانہ مردانہ میں بھی جب قرائن سے معلوم ہو کہ مجلس خاص ہے مثلاً کوئی شخص پردے چھوڑ کر بیٹھا ہو تو بدوں اس کی اجازت کے اندر نہ جاؤ۔ گو مکان مردانہ ہی ہو۔

اخلاق کی خوبی یہ ہے کہ اصلاح نفس کا جس قدر اہتمام اسلام میں ہے کسی مذہب میں بھی نہیں۔ جاہ طلبی نام آوری ریاکاری سے سخت ممانعت ہے۔ حسد، بغض وغیرہ پر سخت سخت وعیدیں وارد ہیں۔ معاشرت میں ایک حکم یہ ہے کہ اپنے غلاموں کی ستر خطائیں روز معاف کیا کرو اس سے زیادہ خطائیں ہوں تو کچھ سزا دو۔ بھلا غلاموں کے ساتھ یہ برتاؤ کوئی غیر مسلم کرسکتا ہے۔ غلام تو کیا اولاد کے ساتھ بھی کوئی ایسا برتاؤ نہیں کرسکتا۔ مگر افسوس باوجود اس قدر رعایت کے پھر بھی مخالفوں کو اسلام کے مسئلہ غلامی پر اعتراض ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اسلام نے تو غلاموں سے وہ برتاؤ کیا ہے کہ ان کے باپ بھی ان کے ساتھ ویسا نہیں کرسکتے تھے۔ مسئلہ غلامی سے وہ برتاؤ کیا ہے کہ ان کے باپ بھی ان کے ساتھ ویسا نہیں کرسکتے تھے۔ مسئلہ غلامی کی اصل یہ ہے کہ اس میں مخلوق کی جان بچائی گئی ہے کیونکہ جب ایک دشمن مسلمانوں کے مقابلہ میں فوج کشی کرتا ہو اور اس کے ہزاروں لاکھوں آدمی مسلمانوں کے ہاتھ میں قید ہوں تو اب کوئی ہمیں بتلا دے کہ ان قیدیوں کو کیا کرنا چاہیے ایک صورت تو یہ ہے کہ ان سب کو رہا کردیا جائے۔ اس کا حماقت ہونا ظاہر ہے کہ دشمن کی ہزاروں لاکھوں کی تعداد کو اپنے مقابلہ کے لئے مستعد کرلیا۔ ایک صورت یہ ہے کہ سب کو فوراً قتل کردیا جاوے اگر اسلام میں ایسا کیا جاتا تو مخالفین جتنا شوروغل مسئلہ غلامی پر کرتے ہیں اس سے کہیں زیادہ اس وقت کرتے کہ دیکھئے کیسا سخت حکم ہے کہ قیدیوں کو فوراً قتل کردیا جاوے ایک صورت یہ ہے کہ سب کو کسی جیل خانہ میں بند کردیا جاوے اور وہاں رکھ کر ان کو روٹی کپڑا دیا

جاوے۔ یہ صورت آج کل کی گو بعض متمدن سلطنتوں میں پسندیدہ ہے مگر اس میں چند خرابیاں ہیں ایک یہ کہ اس سے سلطنت پر بڑا بار عظیم پڑتا ہے اور ان سے کمائی کرانا خود غرضی کی صورت ہے۔ پھر جیل خانہ کی حفاظت کے لئے ایک خاص فوج مقرر کرنا پڑتی ہے۔ قیدیوں کی ضروریات کے لئے بہت سے آدمی ملازم رکھے جاتے ہیں۔ یہ سارا عملہ بیکار محض ہوتا ہے۔ سلطنت کے کسی اور کام میں نہیں آسکتا۔ قیدیوں ہی کی حفاظت کا ہو رہتا ہے۔ پھر تجربہ شاہد ہے کہ جیل خانہ میں رکھ کر چاہے آپ قیدیوں کو کتنی ہی راحت پہنچائیں اس کی ان کو کچھ قدر نہیں ہوتی۔ کیونکہ آزادی سلب ہونے کا غیظ ان کو اس قدر رہتا ہے کہ وہ آپ کی ساری خاطر مدارات کو بیکار سمجھتے ہیں۔ تو سلطنت کا اتنا خرچ بھی ہوا اور سب بے سود کہ اس سے دشمن کی دشمنی میں کمی نہ آئی۔ پھر قید خانہ میں ہزاروں لاکھوں قیدی ہوتے ہیں وہ سب کے سب علمی وتمدنی ترقی سے بالکل محروم رہتے ہیں اور یہ سب سے بڑا ظلم ہے۔ اسلام نے اس کے بجائے یہ حکم دیا کہ جتنے قیدی گرفتار ہوں سب لشکروں کو تقسیم کردو ایک گھر میں ایک غلام کا خرچ معلوم بھی نہ ہوگا اور سلطنت بار عظیم سے بچ جائے گی پھر چونکہ ہر شخص کو اپنے قیدی سے خدمت لینے کا بھی حق ہے اس لئے وہ اس کو روٹی کپڑا جو کچھ دے گا اس پر گراں نہ ہوگا۔ وہ سمجھے گا کہ میں تنخواہ دے کر نوکر رکھتا جب بھی خرچ ہوتا۔ اب اس سے خدمت لوں گا اور اس کے معاوضے میں روٹی کپڑا دوں گا۔ پھر چونکہ غلام کو چلنے پھرنے سیر وتفریح کرنے کی آزادی ہوتی ہے۔ قید خانہ میں بند نہیں ہوتا۔ اس لئے اس کو اپنے آقا پر وہ غیظ نہیں ہوتا جو جیل خانہ کے قیدی کو ہوتا ہے۔ اس حالت میں اگر آقا نے اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا تو اس کا احسان غلام کے دل میں گھر کر لیتا ہے اور وہ اس کے گھر کو اپنا گھر اس کے گھر والوں کو اپنا عزیز سمجھنے لگتا ہے۔ یہ سب باتیں ہی نہیں بلکہ واقعات ہیں پھر اس صورت میں غلام علمی وتمدنی ترقی بھی کر سکتا ہے کیونکہ جب آقا و غلام میں اتحاد ہو جاتا ہے تو آقا خود چاہتا ہے کہ میرا غلام معزز وشائستہ ہو۔ وہ اس کو تعلیم بھی دلاتا ہے صنعت وحرفت بھی سکھلاتا ہے۔

چنانچہ اسلام میں صدہا علماء وزہاد عباد ایسے ہوئے ہیں جو اصل میں موالی تھے۔ غلاموں کے طبقہ نے تمام علوم میں ترقی حاصل کی بلکہ غلاموں کو بعض دفعہ بادشاہت بھی نصیب ہوئی ہے۔ سلطان محمود کو مخالفین بہت بدنام کرتے ہیں کہ انہوں نے تلوار سے اسلام پھیلایا مگر تاریخ میں ان کا ایک واقعہ لکھا ہے اس سے ان کی رحمدلی اور شفقت کا اندازہ ہو جائے گا اور یہ کہ غلاموں کے ساتھ ان کا کیا برتاؤ تھا ایک بار سلطان محمود نے ہندوستان پر حملہ کیا اور بہت سے ہندو جنگ میں قید ہوئے جن کو وہ اپنے ساتھ غزنی لے گئے۔ ان میں ایک غلام بہت ہونہار ہوشیار تھا اس کو آزاد

کر کے سلطان نے ہر قسم کے علوم وفنون کی تعلیم دی جب وہ تعلیم سے فارغ ہوا تو اس کو حکومت کے عہدے دیئے گئے حتیٰ کہ رفتہ رفتہ اس کو ایک بڑے ملک کا صوبہ بنا دیا۔ صوبہ کی حیثیت اس وقت وہ تھی جو آج کل کسی بڑے والئی ریاست کی ہوتی ہے۔

جس وقت سلطان نے اس کو تخت پر بٹھلایا اور تاج سر پر رکھا تو وہ غلام رونے لگا۔ سلطان نے فرمایا کہ یہ وقت خوشی کا ہے یا غم کا۔ اس نے عرض کیا جہاں پناہ! اس وقت مجھے اپنے بچپن کا ایک واقعہ یاد آ کر پھر اپنی یہ قدر ومنزلت دیکھ کر رونا آ گیا۔ حضور جس وقت میں ہندوستان میں بچہ سا تھا تو آپ کے حملات کی خبریں سن سن کر ہندو کانپتے تھے اور ان کی عورتیں اپنے بچوں کو آپ کے نام لے کر ایسا ڈرایا کرتی تھیں۔ جیسا ہوا سے ڈرایا کرتی ہیں۔ میری ماں بھی مجھے اسی طرح آپ کے نام سے ڈرایا کرتی تھی۔ تو میں سمجھتا تھا کہ نہ معلوم محمود کیسا جابر مظالم ہوگا حتیٰ کہ آپ نے خود ہمارے ملک پر حملہ کیا اور اس فوج سے آپ کا مقابلہ ہوا جس میں یہ غلام موجود تھا۔ اس وقت تک میں آپ کے نام سے ڈرتا تھا۔ پھر میں آپ کے ہاتھوں قید ہوا تو میری جان ہی نکل گئی کہ بس اب خیر نہیں مگر حضور نے دشمنوں کی روایات کے خلاف میرے ساتھ ایسا برتاؤ فرمایا کہ آج میرے سر پر تاج سلطنت رکھا جا رہا ہے تو اس وقت مجھے یہ خیال کر کے رونا آ گیا کہ کاش آج میری ماں ہوتی تو میں اس سے کہتا کہ دیکھو یہ وہی محمود ہے جس کو تو ہوا بتلایا کرتی تھی۔

صاحبو! ایسے واقعات اسلام میں بکثرت ہیں اور یہ اسی مسئلہ غلامی کا نتیجہ ہے اگر یہ لوگ جیل خانہ میں قید کر دیئے جاتے تو نہ ان کو مسلمانوں سے انس ہوتا نہ مسلمانوں کو ان سے تعلق ہوتا۔ غلام بن کر یہ لوگ مسلمانوں میں ملے جلے رہے۔ علمی ترقی حاصل کرتے رہے۔ آخر کار اپنی حیثیت کے موافق درجات ومناسب پر فائز ہوتے رہے۔ کوئی محدث بنا کوئی فقیہہ کوئی قاری بنا کوئی مفسر کوئی نحوی بنا کوئی ادیب کوئی قاضی ہوا کوئی حاکم۔

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غلاموں کی یہاں تک رعایت فرمائی ہے کہ آپ کا حکم ہے کہ جو خود کھاؤ وہی غلاموں کو کھلاؤ۔ جو خود پہنو وہی پہناؤ اور جب وہ کھانا پکا کر لائے تو اس کو اپنے ساتھ بٹھا کر کھلاؤ۔ عین وصال کے وقت کے آپ کی یہ حالت تھی **الصلوۃ وما ملکت ایمانکم** (سنن ابن ماجہ: ۱۶۲۵) یعنی نماز کا خیال رکھو اور ان غلاموں کا بھی جو تمہارے ہاتھوں کے نیچے ہیں اس سے زیادہ اور کیا رعایت ہو سکتی ہے؟ اور بحمد اللہ حضرات صحابہ وتابعین اور اکثر سلاطین اسلام نے غلاموں کے ساتھ یہی برتاؤ کیا اگر کسی ایک نے دو نے اس کے خلاف عمل درآمد کیا تو وہ اپنے فعل کا خود ذمہ دار ہے اسلام پر اس سے اعتراض نہیں ہو سکتا۔

جرأت اعتراض:

دراصل بات یہ ہے کہ آج کل مخالفوں کو اعتراض کرنے کی جرأت زیادہ تر ہمارے افعال کو دیکھ کر ہو رہی ہے وہ ہمارے افعال کو دیکھ کر محض تحکم سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ یہ اسلامی تعلیم کا اثر ہوگا حالانکہ ہمارے اندر آج کل جو کچھ خرابی اعمال آ رہی ہے وہ کفار کے اختلاط کا یا ان کے اتباع کا نتیجہ ہے کہ بہت مسلمانوں نے کفار کے طرز عمل اختیار کر لئے ہیں اگر ہم اپنی حالت کی اصلاح کر لیں اور اسلام کی تعلیم کے موافق اپنا طرز عمل بنالیں تو کسی کو اسلام پر اعتراض کی جرأت نہ ہو بلکہ کفار خود بخود اسلام کی طرف امنجذب ہونے لگیں۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ کا قصہ ایک یہودی کے ساتھ پیش آیا۔ یہودی کے پاس ایک زرہ تھی۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ یہ زرہ میری ہے یہودی نے کہا میری ہے، حضرت علیؓ اس وقت خلیفہ تھے۔ آپ نے اپنے ماتحت قاضی کے یہاں جن کا نام شریح ہے، دعویٰ دائر کیا۔ قاضی کی عدالت میں مقدمہ پیش ہوا۔ جس کی شان یہ ہے کہ سلطان وقت مدعی ہے اور رعایا کا ایک یہودی مدعی علیہ ہے۔ قاضی نے حضرت علیؓ سے کہا کہ آپ ثبوت پیش کیجئے۔ حضرت علیؓ نے گواہی میں اپنا ایک آزاد شدہ غلام قنبر پیش کیا اور دوسرا گواہ امام حسنؓ پیش کئے۔ قاضی نے فرمایا کہ قنبر کی گواہی تو معتبر ہے کیونکہ وہ آزاد شدہ غلام ہے مگر امام حسنؓ کی گواہی قبول نہیں ہے کیونکہ وہ آپ کے بیٹے ہیں اور باپ کی طرف داری میں بیٹے کی گواہی قبول نہیں ہو سکتی۔ اس مسئلہ میں حضرت علیؓ اور قاضی شریح کی رائے میں اختلاف تھا۔ حضرت علیؓ نے بیٹے کی گواہی کو جبکہ وہ دیندار ثقہ ہو جائز سمجھتے تھے اور حضرت شریح کسی حال میں جائز نہ سمجھتے تھے۔ اس لئے انہوں نے امام حسنؓ کی گواہی قبول نہیں کی اور یہودی کی ڈگری کر دی۔

حضرت علیؓ کو یہ فیصلہ ذرا بھی ناگوار نہ ہوا، خوش خوش عدالت سے باہر چلے آئے مگر یہودی کو اس فیصلہ پر ایسا تعجب ہوا کہ وہ بدوں اسلام قبول کئے نہ رہ سکا۔ وہ بار بار کہتا تھا کہ خلیفہ کا قاضی خلیفہ کو ہرادے اور رعایا کے یہودی کو اس کے مقابلہ میں جتادے۔

حقانیت اسلام:

عجیب بات ہے۔ آخر حقانیت اسلام نے اس کے دل پر اثر کیا فوراً مسلمان ہو گیا بھلا معترضین سے کوئی پوچھے کہ اس یہودی کو کس تلوار نے مسلمان کیا تھا؟ کچھ نہیں صرف صحابہ کا طرز عمل دیکھ کر اسلام کی طرف اسے کشش ہوئی۔ واللہ اگر ہم لوگ اپنی اصلاح کر لیں تو کفار کی خود بخود اصلاح

ہو جائے گی۔ حضرات صحابہ کی تو بڑی شان ہے ہم لوگ جو ان کے سامنے محض نقال ہیں بلکہ نقل بھی پوری نہیں ہوتی۔ ہم ریل کے سفر میں بارہا اس کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ ہندوؤں پر باری باتوں کا اور طرز عمل کا بڑا اثر ہوتا ہے اور وہ خود بھی چپکے چپکے اقرار کرتے ہیں کہ ان کی طرف دل کو کشش ہوتی ہے۔ یہ لوگ سچے معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ چند واقعات اس قسم کے اوپر مذکور ہو چکے ہیں۔

لوگ اسلام کو بدنام کرتے ہیں کہ وہ تلوار سے پھیلا ہے واللہ بالکل غلط ہے۔ اگر مسلمان تلوار کے زد سے لوگوں کو مسلمان کیا کرتے تو آج ہندوستان میں جہاں اسلامی سلطنت چھ سو برس تک رہی ہے ایک بھی ہندو باقی نہ رہتا۔ مولنٰا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا جواب اس اعتراض کے متعلق یہ ہے کہ اگر اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے تو یہ بتلاؤ کہ وہ شمشیر زن کہاں سے آئے تھے؟ کیونکہ تلوار خود تو نہیں چل سکتی تو جن لوگوں نے سب سے پہلے تلوار چلائی ہے یقیناً وہ تو تلوار سے مسلمان نہیں ہوئے تھے کیونکہ ان سے پہلے تلوار کا چلانے والا کوئی تھا ہی نہیں۔ تو ثابت ہو گیا کہ اسلام تلوار سے نہیں پھیلا۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ جہاد مدینہ میں آ کر شروع ہوا اور اہل مدینہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے ہی زیادہ تر مسلمان ہو چکے تھے۔ آخر ان کو کس تلوار نے مسلمان کیا تھا اور مکہ میں جو کئی سو آدمی مسلمان ہوئے اور کفار کے ہاتھ سے اذیتیں برداشت کرتے رہے وہ کس تلوار سے مسلمان ہوئے تھے۔

پھر ہجرت مدینہ سے پہلے بعض صحابہ نے حبشہ کی طرف ہجرت کی ہے اور وہاں کفار قریش کے ساتھ مسلمانوں کا مناظرہ ہوا اور نجاشی شاہ حبشہ نے حضرت جعفرؓ بن ابی طالب کی زبان سے قرآن سن کر بے تحاشا رونا شروع کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور قرآن کی حقانیت کی گواہی دی اور اسلام قبول کیا۔ اس پر کس کی تلوار چلی تھی۔ اسی طرح صدہا واقعات تاریخ میں موجود ہیں جن سے ثابت ہے کہ اسلام محض اپنی حقانیت سے پھیلا ہے۔ خصوصاً عرب کی قوم جو جنگ جوئی میں شہرۂ آفاق ہے وہ کبھی اور کسی طرح تلوار کے خوف سے اسلام قبول نہ کر سکتی تھی۔ ان کے نزدیک لڑنا مرنا معمولی بات تھی مگر دب کر دین کا بدلنا سخت عیب تھا اور وہ ہرگز تلوار کے خوف سے اسلام نہیں لا سکتے تھے (۱۲ جامع)

سبب مشروعیت جہاد:

اس پر شاید یہ سوال ہو کہ پھر جہاد کس لئے مشروع ہوا؟ تو خوب سمجھ لو کہ جہاد حفاظت اسلام کے لئے مشروع ہوا ہے نہ کہ اشاعت اسلام کیلئے۔ اور ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ لوگ اس

فرق کے نہ سمجھنے کی وجہ سے غلطی میں پڑے ہوئے ہیں۔ جہاد کی مثال آپریشن جیسی ہے کیونکہ مادے دو قسم کے ہوتے ہیں ایک متعدی ایک غیر متعدی۔ جو مادہ غیر متعدی ہوتا ہے اس کو تو محلات اورام کے ذریعہ سے دبا دیا جاتا ہے۔ کوئی مرہم لگا دیا۔ مالش کر دی جس سے وہ دب گیا اور متعدی مادہ کے لئے اپریشن کیا جاتا ہے۔ اس کو چیر کر نکال دیا جاتا ہے۔ اسی طرح دشمنان اسلام دو طرح کے ہیں بعض تو وہ جن سے صلح کر لینی مناسب ہوتی ہے۔ وہ صلح کر کے مسلمانوں کو ستانا چھوڑ دیتے ہیں۔ ان سے تو صلح و مصالحت کر لی جاتی ہے۔ بعض ایسے موذی و مفسد ہوتے ہیں کہ صلح پر آمادہ نہیں ہوتے۔ یہ مادہ متعدیہ ہے۔ ان کے واسطے آپریشن کی ضرورت ہے اسی کا نام جہاد ہے۔ پس جہاد سے لوگوں کو مسلمان بنانا مقصود نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کی حفاظت مقصود ہے۔

لوگ عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کو بدنام کرتے ہیں کہ انہوں نے ہندوؤں کو زبردستی مسلمان کیا ہے، یہ بالکل غلط ہے۔ عالمگیر پابند شرع تھے۔ بارہ ہزار تین احادیث کے حافظ تھے۔ قرآن لکھ لکھ کر ہدیہ کر کے گذارا کرتے تھے اپنے خرچ میں خزانہ کا ایک پیسہ نہ لاتے تھے۔ ان کے سامنے **لا اکراہ فی الدین** (دین میں جبر نہیں) کا حکم موجود تھا وہ اس کے خلاف (اور ان کے متعلق ان تاریخوں کا بیان ہم پر حجت نہیں ہو سکتا جو بعض متعصب انگریزوں نے لکھی ہیں کیونکہ ہم تو مسلمانوں میں بھی ہر مؤرخ کو معتبر نہیں سمجھتے جب تک کہ وہ شرعی قواعد کے موافق ثقہ نہ ہو پھر مخالفین کی تاریخوں کو ہم کیسے حجت تسلیم کر سکتے ہیں۔ ایسی تاریخوں کا رد بعض مستقل رسالوں میں شائع بھی) کیونکر کر سکتے تھے یہ تو پہلے واقعات تھے ان سے قطع نظر کر کے میں پوچھتا ہوں کہ اچھا اس وقت جو لوگ ہندوستان میں اسلام لاتے ہیں وہ کیوں مسلمان ہوتے ہیں۔ ان پر کون سی تلوار کا زور ہے؟ یقیناً اس وقت کسی طرح بھی ان پر زور نہیں ہے بلکہ ہر طرح آزادی ہے۔ نہ ہم ان کو کسی طرح کی طمع دلاتے ہیں۔ مسلمانوں کے پاس اتنا مال ہی نہیں جو وہ طمع دلا کر کسی کو مسلمان کریں بلکہ حالت یہ ہے کہ آج کل کوئی نو مسلم اسلام لایا تو کل کو اس سے بھی دینی کاموں میں چندہ مانگتے ہیں اور اگر کوئی شخص اسلام لاتے وقت ہم سے روپیہ کی درخواست کرے تو ہم صاف کہہ دیتے ہیں کہ تم اپنی نجات کے واسطے اسلام لاتے ہو تو لاؤ ورنہ ہم کو لالچ کے ساتھ مسلمان کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ جو دولت ہم تم کو دے رہے ہیں اس کے مقابلہ میں تو اگر تم خود ہی کو نذرانہ دو تو بجا ہے۔ لیکن باوجود اس آزادی اور استغناء کے پھر بھی بہت لوگ اسلام لاتے ہیں اور لا رہے ہیں اور اسلام لاتے ہی ان کی ایسی حالت ہوتی ہے کہ گویا بچھڑا ہوا محبوب ان کو مل گیا۔

ایک ہندو اسلام لانے کے بعد خدا کی محبت اور اس کی یاد میں اس قدر روتا تھا جس کا بیان نہیں اور کہتا تھا کہ مجھ کو تو اب معلوم ہوا کہ خدا کسے کہتے ہیں۔

اختتام:

غرض اس کی عجیب حالت تھی یہ ہیں محاسن اسلام جن کو میں نے مختصراً بیان کر دیا ہے۔ یہ موٹی موٹی باتیں ہیں۔ ان کو تبلیغ کے وقت بیان کرو اور اگر کوئی فلسفی زیادہ الجھے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس بات کی ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے یا حکم دیا ہے اور آپ خدا کے رسول ہیں اور آپ کی رسالت وصدق دلائل سے ثابت ہے۔ اگر تم کو حضور کی رسالت میں شبہ ہے تو ہم اس کو دلائل سے ثابت کر سکتے ہیں۔ جب آپ کی رسالت ثابت ہو جائے گی تو آپ کے سارے احکام کو تسلیم کرنا لازم ہوگا اور منجملہ ان کے ایک یہ حکم ہے کہ حضور فرماتے ہیں کہ میرے دین سے سب ادیان منسوخ ہوگئے ہیں اب اسلام کے بغیر نجات نہیں ہو سکتی۔ بس فلسفیوں کو اس سے زیادہ کچھ نہ کہا جائے ہاں اگر کوئی منصف ہو تو اس کے سامنے یہ محاسن بھی بیان کر دیئے جائیں۔ ایک بات آثار محاسن اسلام میں سے یہ ہے کہ ہر مذہب کا پورا اثر اس کے خواص متبعین میں ہوا کرتا ہے پس خواص اہل اسلام اہل اللہ اور علماء متقین کا موازنہ دوسرے مذاہب کے خواص سے کر لیا جائے اور ان کے پاس ایک دو ہفتہ رہ کر ان کی حالت کو دیکھا جائے۔ دعوے سے کہا جاتا ہے کہ انشاء اللہ خواص اہل اسلام تمام دنیا کے مذاہب کے خواص سے افضل ہوں گے۔ عبادت خداوندی، محبت الٰہی، ذکر و فکر خشیت و رغبت آخرت کا جو اثر ان میں نمایاں ہوگا۔ کسی مذہب کے خواص میں ان کا پتہ بھی نہ ملے گا۔ اس وقت ظلمت و نور میں کھلا ہوا فرق نظر آئے گا۔ لو یہ میں نے ایسی آسان صورت بتلا دی جس سے ہر شخص حق و باطل میں امتیاز کر سکتا ہے۔ یہ ہیں محاسن اسلام ان کی تبلیغ کرو اور اس وعظ کا نام بھی مضامین کی مناسبت سے محاسن اسلام ہی رکھتا ہوں۔ اب ختم کرتا ہوں دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو فہم سلیم عطا فرمائے اور مسلمانوں کو تبلیغ اسلام کی توفیق دے اور جو مسلمان فتنہ ارتداد میں گمراہ ہوئے ہیں ان کو دوبارہ اسلام کی طرف ہدایت کر دے اور جن پر خطرہ ہو خدا ان کو اس بلاء سے محفوظ رکھے۔ **آمین وصلی اللہ علی سیدنا ومولنا محمد وعلی آلہ واصحابہ اجمعین وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔**

احسان الاسلام

یہ وعظ حضرت حکیم الامت تھانوی صاحبؒ نے جامع مسجد کانپور میں ۱۰ محرم الحرام ۱۳۳۴ھ بروز جمعہ کھڑے ہو کر بیان فرمایا جو دو گھنٹے پچاس منٹ تک جاری رہا۔ سامعین کی تعداد ایک ہزار تھی۔ مولوی احمد عبدالحکیم صاحب مرحوم نے قلم بند فرمایا۔

خدا کی قسم جس پہلو سے لو، نہایت راحت بخش اور مصالح کی رعایت کرنیوالا مذہب ہے۔ میرے پاس الفاظ نہیں کہ میں اس کی تعریف کرسکوں۔

قلم بشکن ، سیاہی ریز و کاغذ سوز و دم درکش
حسن ایں قصہ عشق ست در دفتر نمی گنجد ،

(از حکیم الامت حضرت تھانویؒ صاحب)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونومن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور انفسنا ومن سيئاتِ اعمالنا من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادی له ونشهد ان لا اله الا الله وحده لاشریک له ونشهد ان سيدنا ومولانا محمدا عبده ورسوله صلی الله تعالیٰ علیه وعلیٰ اٰلِهٖ واصحابهٖ وبارک وسلم

اما بعد فاعوذ بالله من الشیطٰن الرَّجیم بسم الله الرحمن الرحیم۔

بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَه، لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَه، اَجْرُه، عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ.

ہاں جو کوئی شخص بھی اپنا رخ اللہ تعالیٰ کی طرف جھکا دے اور وہ مخلص بھی ہو تو ایسے شخص کو اس کا عوض ملتا ہے۔ پروردگار کے پاس پہنچ کر اور نہ ایسے لوگوں پر کوئی اندیشہ ہے اور نہ ایسے لوگ مغموم ہونے والے ہیں۔

تمہید:

یہ ایک آیت ہے کہ جس کے اول میں رد ہے۔ بعض مدعین کے ایک غلط دعوے کا اور بعد میں دلیل رد کے مقام پر ایک قاعدہ کلیہ کا ذکر کیا گیا ہے کہ اس میں حق تعالیٰ نے ایک نہایت ضروری مضمون ذکر فرمایا ہے جو جامع ہے۔ تمام مشرب و مسلک حق کا کہ جس کے بہت سے فروع (شاخیں، شعبے) ہیں اور وہ ایسا ہے جس کے اہمال (مطلب چھوڑنا) سے ہم لوگوں کی تمام حالتیں تباہ و برباد ہو رہی ہیں جس کے اسباب مختلف عنوانوں سے بیان کئے جاتے ہیں مگر حقیقت میں اس تباہی و بربادی کا اصلی سبب اس قاعدہ کلیہ کا چھوڑ دینا ہے اس آیت میں اسی کا ذکر ہے ہر چند کہ رد اور قاعدہ کلیہ دونوں میں یہاں زیادہ فائدہ رد ہے مگر وہ قاعدہ کلیہ جو کہ رد کے لئے بھی کافی ہے اور نیز ہماری حالتوں کی اصلاح بھی اس سے وابستہ ہے چونکہ وہ متضمن (ضمن میں لینے والا) دو فائدہ کو ہے اس لئے اس وقت بیان میں وہ ہی زیادہ مقصود ہے اور وہ قاعدہ کلیہ کہ جس پر مدار ہے

ہماری فلاح کا اور جس سے غافل رہنے کی وجہ سے ہماری خرابی اور تباہی بڑھتی جاتی ہے اور نہایت ضروری ہے وہ تعبیر میں تو بہت چھوٹی سی بات ہے مگر حقیقت میں بہت بڑی بات ہے اور اس امر ضروری کا نام جس کا تکفل (ذمہ دار) اس قاعدہ نے کیا ہے حق تعالیٰ کے ساتھ تعلق رکھنا ہے۔

اب ان لفظوں کی حقیقت پر جب تک زیادہ غور نہ کیا جاوے یہ سمجھ میں نہ آوے گا کہ ہم نے اس قاعدہ کو چھوڑ رکھا ہے اس واسطے کہ ہر شخص یہی جانتا ہے کہ ہمارا خدا سے تعلق ہے یہ تو ٹھیک ہے کہ ہمارا خدا سے تعلق ہے مگر یہ امر غور طلب ہے کہ آیا آپ کو خدا سے تعلق ہے یا خدا کو آپ سے تعلق ہے پس یہ ہے سمجھ لینے کی بات، سو اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ خدا کو تو ہم سے تعلق ہے اور ہمیں خدا سے تعلق نہیں ہے اور اس نے باوجودیکہ اس کے ذمہ واجب نہیں لازم نہیں مگر اتنے حقوق ادا کیے ہیں کہ ہم ان کا شمار و اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ یہ محض تعلق اور رحمت ہے۔ ورنہ ہمارا کیا حق اور کیا لزوم؟

مسلک اہلسنت:

اہلسنت نے اس مسئلہ کی حقیقت کو خوب سمجھ لیا ہے کہ ہمارا کوئی حق خدا پر واجب نہیں جو کچھ وہ عطا فرمائے محض رحمت اور خالص عنایت ہے۔ معتزلہ نے اس مسئلہ میں اہل سنت کا خلاف کیا ہے خدا جانے کیا سمجھے کہ ہمارا حق خدا پر واجب ہے۔ وجوب کا کوئی سبب کوئی علت ہونا چاہیے یہ بلا علت واجب کیسے ہوگیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ معتزلہ نے کچھ نہیں سمجھا اگر کوئی سبب یا علت ہو تو وہ بھی انہیں کی ہے پھر بھی ہم مستحق نہیں ہو سکتے وہ کہتے ہیں عبادت سے خدا پر جنت دینا واجب ہے اور وجوب عقلی کے قائل ہیں مگر انہوں نے یہ نہ دیکھا کہ یہ سبب جو تراشا گیا ہے قطع نظر اس کے کہ یہ سبب بھی انہیں کا عطا کیا ہوا ہے اگر اس میں کچھ ظاہری سبب ہے تو اس کا یہ اثر موقوف ہے اس کے مقبول ہونے پر سو مقبول ہونا تو درکنار غنیمت ہے کہ ان اعمال پر مواخذہ نہ ہو۔ لطیف المزاج شخص اندازہ کرلے کہ ایک بدسلیقہ خدمت گار ہے۔ پنکھا جھلتے وقت کبھی مار دیتا ہے کبھی کسی کاغذ کو پریشان کر دیتا ہے غرض ایک اودھم مچا رہا ہے اور آقا حلم و کرم سے معاف کر دیتا ہے تو کیا اس خدمت گار کا اپنی اس بیہودہ کارگذاری کو قابل انعام سمجھنا صحیح ہوگا۔

خواجہ پندارد کہ دارد حاصلے   حاصل خواجہ بجز پندار نیست

(خواجہ سمجھتا ہے کہ اسکو کچھ حاصل ہے اس کو بجز پندار کے کچھ حاصل نہیں) وہ یہ سمجھتا ہے کہ میں نے بڑی خدمت کی۔ ارے کمبخت کیا خدمت کی؟ یہ آقا کا احسان ہے کہ وہ کرم کرتا ہے اور بڑی عنایت ہے کہ جرمانہ نہیں کرتا، اسی طرح ہماری عبادت ہے کہ ہم اس کا پورا پورا حق کیا ادا کرتے کہ

محال ہے مگر جتنا سنوار کر ہم کر سکتے ہیں وہ بھی تو نہیں کرتے۔

حضور قلب کی حقیقت:

کیوں صاحبو! کیا اپنی نماز کی حالت آپ درست نہیں کر سکتے؟ کیا آپ قادر نہیں خشوع وحضو، قلب پر؟! اگر کوئی کہے کہ ہم تو قادر نہیں تو ہم کہیں گے تم حضور قلب کی حقیقت ہی نہیں جانتے۔ حضور قلب کی حقیقت یہ ہے کہ نماز پڑھتے وقت برابر یہ خیال رہے کہ میں نماز پڑھ رہا ہوں کیا صاحبو! یہ آپ سے نہیں ہو سکتا باقی خیالات اور وساوس کا بند کرنا حضور قلب نہیں ہے بلکہ یہ سمجھنا ہی غلطی ہے کیونکہ یہ تو بالکل ظاہر ہے کہ خیالات کو روکنا اختیار سے باہر ہے اگر حضور قلب کی یہ حقیقت ہوتی اس سے ایک عقیدہ کی خرابی ہوگی کہ یہ تو ہمارے اختیار سے باہر اور پھر ہم اس کے مکلف تو گویا ہم کو ایسی چیز کی تکلیف دی گئی کہ ہماری قدرت سے باہر ہے اور یہ سراسر خلاف ہے۔ **لا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا** (اللہ تعالیٰ کسی جان کو اسکی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے) کے کہ کسی ایسی بات کا خدا نے حکم نہیں کیا جو قدرت سے خارج ہو، سو اگر حضور کے قلب کے ایسے معنے ہیں جو قدرت سے خارج ہے تو اس کا مامور بہ ہونا اس آیت کے معارض ہوگا پس حضور قلب کی حقیقت اتنی ہے کہ اس قدر متوجہ رہو کہ میں کیا کر رہا ہوں، پھر اگر اس خیال کے ساتھ اور خیال بھی آویں تو آنے دو آپ کا کام یہ ہے کہ کشتی کی سیدھ باندھ لیجئے باقی موجوں کا روکنا کشتی بان کا کام نہیں بلکہ اگر وہ اس کی کوشش بھی کرے تو کشتی کا ساحل پر پہنچنا تو درکنار سلامتی بھی دشوار ہے اس طرح خیالات و وساوس امواج ہیں یہ قیامت تک بند نہیں ہو سکتے۔ آتے ہیں آنے دیجئے امواج کشتی کی رفتار کو روکتی ہیں مگر کھڑا نہیں کر سکتیں۔ اسی طرح خیالات و وساوس آتے ہیں آنے دیجئے یہ حضور قلب کے منافی نہیں۔ بس آپ کا کام اتنا ہی ہے کہ آپ برابر یہ خیال رکھئے کہ نماز پڑھ رہا ہوں اب **سبحان ربی العظیم** (میرا پروردگار ہر عیب سے پاک عظمت والا ہے) کہہ رہا ہوں۔ اب **سبحان ربی الاعلیٰ** (میرا پروردگار ہر عیب سے پاک بلند مرتبہ والا ہے) کہہ رہا ہوں غرض جو فعل کیجئے اپنے قصد اور اپنے ارادہ سے کیجئے اس طرح نہیں کہ گھڑی میں ایک دفعہ کوک دے دی اب وہ برابر چل رہی ہے، ہماری کوک تکبیر تحریمہ ہے ادھر تکبیر تحریمہ کہی اور بس بے فکر ہو گئے اب تمام حساب و کتاب اور تمام معاملات نماز ہی میں طے ہو رہے ہیں ان حرکات کی عادت اور مشق ہو گئی ہے اس لئے جب رکوع کا وقت آتا ہے خود بخود رکوع ہو جاتا ہے۔ جب سجدہ کا وقت آتا ہے تو خود بخود سجدہ ہو جاتا ہے اس میں ہمارے قصد کو دخل ہی نہیں ہوتا۔

حضور قلب کی ایک نہایت آسان مثال ہے وہ یہ ہے کہ کسی حافظ صاحب کو کوئی صورت کچی ہو اور تراویح میں سنانا ہو تو وہ کیا کریں گے یہ کریں گے کہ دن بھر دیکھنے کے بعد رات کو جس وقت وہ سورت آئے گی برابر سوچتا رہے گا کہ ان ان مقام پر قال فرعون آیا ہے اور ان ان مقام پر قال موسیٰ آیا ہے غرض برابر دھیان اپنے پڑھنے کی طرف رہے گا اور خیالات بھی آتے رہیں گے یہاں تک کہ اول سے آخر تک وہ صورت سنا دے گا۔ تو جیسی توجہ حافظ صاحب کو اس کچی صورت سنانے کے وقت ہوتی ہے پس یہی حضور قلب ہے۔ اگر حضور قلب قدرت سے خارج ہے تو حافظ صاحب کو کیونکر ہوا؟ اس سے معلوم ہوا کہ قدرت سے خارج نہیں۔ اور یہ سخت غلطی ہے کہ قدرت سے خارج سمجھ لیا ہے اور عوام کیا بہت سے اہل علم بھی ایسا ہی سمجھ رہے ہیں۔ ان حضرات کو ساری وجہ غلطی کی یہ ہے کہ ہمارے درس میں کوئی کتاب ایسی نہیں جس میں یہ حقائق مذکور ہوں۔ بس حکایتیں دیکھ لیں سن لیں کہ نماز میں تیر لگا اور خبر نہ ہوئی اور اسی کو حضور قلب سمجھ گئے حالانکہ یہ ایک طرح کی حالت ہے وہبی اور حضور قلب وہی ہے جو میں نے بیان کیا۔

حضور قلب اختیاری ہے:

اس تقریر سے حضور قلب کی حقیقت اچھی طرح سمجھ میں آ گئی ہوگی۔ خصوص اس مثال سے تو کوئی شبہ باقی نہ رہا ہوگا جو بات دفتر سے حل نہ ہوتی وہ اس مثال سے واضح ہوگئی۔ جب حقیقت اس کی یہ ہے تو اختیاری ہے چنانچہ قرآن میں جہاں بھولنے کا شبہ ہو ہر شخص سوچ سوچ کر پڑھتا ہے چنانچہ حافظ جی رات کو غوطہ کھا کھا کے سورہ ختم کرتے ہیں تو ان کو حضور قلب کیسے حاصل ہوتا ہے، معلوم ہوتا ہے اختیار میں ہے جب تو حاصل ہو جاتا ہے اب بتایئے کہ آپ نماز میں کتنا حضور قلب کرتے ہیں پورا تو کیا جتنا کر سکتے ہیں اتنا بھی نہیں کرتے اور اگر پورا پورا کر بھی لیا تو بھی خدا پر کوئی حق ہمارا نہیں ہوا۔ اس واسطے کہ یہ کیفیت جو میسر ہوئی کدھر سے میسر ہوئی یہ بھی تو انہیں کا عطیہ ہے۔

نیا ورم از خانہ چیزے نخست
تو دادی ہمہ چیز ومن چیز تست

(میں اپنے گھر سے کوئی چیز نہیں لایا یہ سب آپ کا عطیہ ہے میری کیا حقیقت ہے) تو جب نماز بھی خدا کی پھر اس سے ہمارا حق جنت میں کدھر سے ہوگیا۔ اس کی تو ایسی مثال ہے کہ کسی نے کسی کو ایک برتن دے دیا اب وہ شخص یہ سمجھے کہ برتن دینے والا قرضدار ہوگیا کیونکہ اس نے برتن دیا ہے تو کھانا بھی اس کے ذمہ قرض ہوگیا اور اس کی ایسی مثال ہے کہ کوئی کہے کہ کرتے کا بھی میں ہی مستحق ہوں کہ آپ کا دیا ہوا پاجامہ پہنے ہوں۔ بہر حال یہ سب انہیں کا ہے پھر ہمارا کیا استحقاق

جو نماز ہم پڑھتے ہیں وہ بھی خدا ہی نے ہمیں دی ہے تو بس کیا اس سے خدا ہمارا قرضدار ہو گیا۔ خدا تعالیٰ نے اہل سنت کو اس غلطی سے محفوظ رکھا ہے اس واسطے کہ جن اسباب میں استحقاق کی صلاحیت ہے وہ سب بھی تو انہیں کے ہیں کوئی شخص اپنے غلام کو سرمایہ دیتا ہے کہ یہ لے کر تجارت کرو اس میں جو نفع ہو آدھا ہمارا آدھا تمہارا اور سرمایہ سب ہمارا یہ محض لیاقت و سلیقہ سکھلانے کے لئے ایسا کرتا ہے کہ کسی طرح غلام کو اس لالچ میں تجارت آ جاوے ورنہ سارا نفع و سرمایہ آقا ہی کا ہے۔ اسی طرح ہم نے جو نماز روزہ کیا اس کی توفیق ہمیں انہیں نے دی، نفع بھی ان کا سرمایہ بھی ان کا مگر ہمارے خوش کرنے کو کہہ دیا کہ تمہارا ہے۔

حق تعالیٰ کی رعایتیں:

بہر حال خدا پر کسی کا حق نہیں مگر اس پر بھی کیا رعایتیں کی ہیں کہ آپ اہل حقوق کی بھی اتنی رعایت نہیں کر سکتے غرض ان کے ذمہ تو کوئی حق نہ تھا اور وہ دے رہے ہیں۔ اور آپ پر ان کے بے شمار حقوق ہیں اور پھر بھی آپ ان کی عظمت کے موافق تو کیا اتنا بھی نہیں کرتے جتنا اپنے مجازی آقا کا کرتے ہیں۔ خدا کی طرف سے جو تنخواہ ہم کو ملتی ہے وہ اس قدر ہے کہ اندازہ نہیں ہو سکتا اور وہ تنخواہ کیا ہے ایک مثال سے سمجھئے۔ ایک شخص کے آنکھ نہیں ڈاکٹر کہتا ہے کہ کسی کی آنکھ نکال کر لگا دی جائے گی کسی غریب فاقہ زدہ سے کہا کہ پانچ سو روپیہ لے لو ایک آنکھ بیچ ڈالو وہ کہتا ہے آنکھ بھلا اتنی کم قیمت میں بیچ ڈالوں بھلا کم از کم ایک لاکھ تو ایک کی قیمت ہو اگر ضرورت ہے تو ایک لاکھ میں اس کی آنکھ لی جائے گی اسی طرح تمام اعضائے بدن کی قیمت جوڑ لو تو کروڑوں روپیہ ہر وقت ہمارے پاس ہے تو یہ دولت تو ظاہری ہمارے پاس ہے۔

اور اگر دولت باطنی کو دیکھا جائے تو اس کی قیمت کی تو انتہا ہی نہیں ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ کسی نئے شہر میں گذر ہوا دن میں دیکھا کہ شہر پناہ کا پھاٹک بند ہے لوگوں سے دریافت کیا کیوں بند ہے معلوم ہوا کہ بادشاہ کا شکاری باز اڑ گیا ہے تو بادشاہ نے شہر پناہ کے پھاٹک بند کرا دیئے ہیں تاکہ وہ باز شہر سے باہر نہ نکل جاوے۔ انہوں نے اپنے دل میں کہا کہ بھلا وہ پھاٹک سے کیوں جانے لگا اوپر سے اڑ کر جا سکتا ہے بادشاہ بڑا ہی احمق ہے۔ حق تعالیٰ سے ناز میں عرض کیا کہ ایسے احمق کو تو سلطنت دے دی اور ہم ایسے عاقل جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں یہ مقام ادلال و ناز کا ہوتا ہے اہل حال کو زیبا ہے اگر کوئی دوسرا حرص کرنے لگے تو دیکھو کبھی جوتیاں نہ لگ جائیں۔

جواب میں ارشاد ہوا کہ تمہاری عقل و تمیز اور فقر اس کو اور اس کی حماقت و سلطنت تم کو دے

دوں تم راضی ہو پھر تو معذرت کرنے لگے کہ میں قیامت تک بھی اس کو گوارا نہ کروں گا۔

قیمت خود ہر دو عالم گفتۂ　　نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

تو اپنی قیمت دونوں جہان بیان کی ہے نرخ بڑھا کہ ابھی تک ارزانی ہے یہ انسان کی قیمت ہے پھر کہتا ہے میں مفلس ہوں۔ افسوس تم نے اپنی قدر و قیمت خو نہیں سمجھی ادھر سے تو اس قدر عطا ہے کہ جس کا حد و حساب نہیں ان تنخواہوں کے بعد اگر اوسط لگایئے تو ادنیٰ درجہ ایک لاکھ ماہوار تو ضرور ہوتا ہے تو جب حق تعالیٰ ایک لاکھ ماہوار دیتے ہیں اور دوسرا پچاس روپے ماہوار دیتا ہے تو جو نسبت تنخواہوں میں ہے وہی نسبت حقوق کے ادا کرنے میں ہونا چاہیے اب آپ ہی دیکھ لیجئے کہ آپ آقا کے مقابلہ میں خدا تعالیٰ کے حقوق کتنے ادا کرتے ہیں آقا کے برابر تو کیا اس سے دسواں بیسواں حصہ بھی تو ادا نہیں کرتے اور حقوق جانے دیجئے ذرا سا فرض یہ نماز ہے ایک منٹ میں ایک رکعت بخوبی ہو جاتی ہے شب و روز کے فرض و واجب کی بیس رکعتیں ہوتی ہیں اور سنن کی بارہ رکعتیں ہیں سب ملا کر بتیس ہوتی ہیں جن میں بتیس منٹ صرف ہوتے ہیں وضو کرنے میں جو وقت صرف ہوتا ہے وہ قابل شمار نہیں حضرت منہ ہاتھ دھونا اس میں اللہ میاں پر کیا احسان؟ وہ تو بے نمازی بھی دھوتے ہیں۔

اگر کوئی کہے کہ ہم یوں منہ ہاتھ نہ دھوتے محض وضوء کی وجہ سے دھو لیتے ہیں تو ایسے منحوس سے ہمارا خطاب نہیں ہم نے ایسے بھی دیکھے کہ ہفتوں منہ ہاتھ نہیں دھوتے کسی روز حاکم آ گیا تو منہ ہاتھ دھو لیا تو ایسے منحوسوں سے خطاب کون کرے بہرحال وضوء میں تو اپنی بشاشت ہے صفائی اور تبرید اعضاء کے خیال سے یوں بھی منہ ہاتھ پاؤں دھوتے ہیں تو وضوء میں تو کوئی کلفت ہی نہیں جو اس کو شمار کیا جاوے ہاں اگر مصیبت ہے تو نماز میں خود حق تعالیٰ بھی فرماتے ہیں۔ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخَاشِعِيْنَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔ (اور بے شک نماز دشوار ضرور ہے مگر جن کے قلوب میں خشوع ہے ان پر کچھ دشوار نہیں وہ خاشعین وہ لوگ ہیں، جو خیال رکھتے ہیں اس کا کہ بیشک ملنے والے ہیں اپنے رب سے اور بے شک وہ اپنے رب کی طرف جانے والے ہیں۔) یعنی نماز گراں ہے کہ ہنسو نہیں بولو نہیں یہ نہیں کہ کدھر چاہو منہ کر کے کھڑے ہو گئے ایک ہی طرف منہ کئے کھڑے رہو ان کی وجہ سے کلفت ہے تو بہرحال شب و روز میں بتیس منٹ یعنی چوبیس گھنٹہ میں تقریباً آدھ گھنٹہ کیا بہت ہے اور اگر کوئی بڑا ہی خاشع خاضع ہوا تو خیر بہت سے بہت ایک گھنٹہ صرف ہوگا۔ ہاں اگر امامت کریں

گے تو بے شک بغیر سورۂ بقر کے نماز ہی نہ ہوگی ورنہ اپنی نماز تو اِنَّآ اَعْطَيْنٰا اور قُلْ هُوَ اللهُ ہی سے ہمیشہ ہوا کرتی ہے اگر کہیں یہ حکم ہوتا کہ بغیر سورۂ بقر کے نماز ہی نہیں ہوگی شاید یہ لوگ تو نماز ہی نہ پڑھتے مگر ایسا حکم تو ہوا نہیں بلکہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا تو یہاں تک مذہب ہے کہ ایک آیت سے فرض اور ایک آیت طویل یا تین آیت قصیر اور سورۂ فاتحہ سے واجب ادا ہو جاتا ہے، مثلاً سورۂ فاتحہ کے بعد مُدْهَآمَّتٰنِ (وہ دونوں باغ گہرے سبز ہوں گے) پڑھ لیا فرض نماز ہو گئی ممکن ہے کہ کوئی صاحب ہمت ایسا ہی کرنے لگیں، کہ بس مُدْهَآمَّتٰنِ پڑھ لیا نماز تو ہو ہی جاوے گی ایک منٹ میں آٹھ رکعتیں پڑھ ڈالیں تو حضرت فرض تو ادا ہو جاوے گا لیکن واجب تو رہ جاوے گا اسی طرح تعدیل بھی واجب ہے اور آئمہ تو فرض کہتے ہیں یہ امام صاحب ہی کا مذہب ہے اور امام صاحبؒ نے اس قدر سہولت اپنے لئے نہیں کی یہ ساری سہولت ہمارے آپ کے لئے کی تھی وہ خود تو اس قدر نماز پڑھتے تھے کہ مدتوں عشاء کے وضوء سے فجر کی نماز پڑھی ہے تو یہ سہولت ہمارے واسطے ہے تا کہ کوئی بے نمازی نمازی بننا چاہے تو اسے تنگی نہ ہو تو یہی ہماری نماز جو آدھ گھنٹہ میں سب فرض سنتیں ہو جاتی ہیں اور جو ہم میں خاشع خاضع ہیں ان کو ایک گھنٹہ کافی ہے خیال تو کیجئے اتنی بڑی تنخواہ اور کارگذاری کتنی مختصر کہ چوبیں گھنٹہ میں آدھ گھنٹہ اور ساڑھے تیئس گھنٹہ میں عام اجازت ہے بجز گناہ کے جو چاہے کیجئے اور اس پر بھی بعضے وہ ہیں جو کچھ نہیں کرتے اور بعضے ان سے بڑھ کر ہیں کہ خود بھی نہیں کرتے اور اوروں کو بھی نہیں کرنے دیتے۔

اس پر ایک حکایت یاد آ گئی بلوہ کے زمانہ کا قصہ ہے کہ جہاں لاشیں پڑی تھیں ایک شخص زخمی تھا زخم اتنا کاری تھا کہ اٹھ کر جا نہیں سکتا تھا۔ اتفاقاً کسی ضرورت سے ایک بنئے کا ادھر گذر ہوا اس شخص نے آہٹ پا کر ضعیف آواز سے پکارا بنیا اس آواز سے ڈرا کہ مردہ کہاں بولنے لگا اس نے کہا ڈرو نہیں میں زخمی ہو گیا ہوں چل نہیں سکتا ہوں تم ذرا ادھر آؤ بنئے نے کہا ہم نہیں آتے اس نے پھر کہا بھائی ذرا ادھر تو آؤ میری کمر میں ایک ہمیانی بندھی ہوئی ہے ایک ہزار روپیہ ہے میں مر جاؤں گا یہ ضائع ہو جاوے گا تم اسے کھول لے جاؤ تمہارے ہی کام آوے گا اب تو لالہ کے منہ میں پانی بھر آیا اس کی طرف بڑھے ڈرتے ڈرتے جب قریب پہنچے تو اس نے ٹانگ پر ایک تلوار رسید کی اور کہا کہ میاں روپیہ کہاں یہاں رات بھر اکیلے جی گھبراتا ہے۔ میں نے خیال کیا کہ کسی آدمی کو پاس رکھنا چاہیے ویسے تو کون رہتا، اس ترکیب سے تم کو پاس رکھوں گا بنیا گر پڑا اور بڑا ناخوش ہوا اور غصہ میں کہنے لگا کہ سسرا نہ آپ چلے نہ اوروں کو چلنے دے تو آج کل بھی یہی حالت ہے کہ دین پر نہ آپ چلیں نہ اور کو چلنے دیں۔

دین اور معاش:

اگر کوئی بندہ خدا تمام مصلحت پر خاک ڈال کر اس شعر کے مضمون کا حامل ہو بھی گیا۔

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار بگذارند وہمہ طرۂ یارے گیرند

(یعنی بڑی مصلحت یہی ہے کہ سب کو چھوڑ کر بس ایک ہی کو سب دوست لے لیں)

اور خدا کی راہ پر لگ گیا تو وہ ان کے زعم میں پاگل ہو گیا وہ ان کے نزدیک معاش سے محروم ہو گیا حالانکہ دیندار لوگ باوجود کم ہنری کے بھی کھانے پہننے میں ان ہنرمند دنیاداروں سے اچھے پڑ رہتے ہیں۔ ہمارے یہاں ایک بزرگ تھے انہوں نے ایک عجیب لطیفہ کہا تھا کہ علم دنیا تو جب تک خاص مقدار پر نہ ہو کام نہیں آتا مثلاً بی اے ایف اے ہو تو نوکری ملے یا اس سے گھٹیا ہو تو انٹرنس ہو اور مڈل کا بالکل ذلیل درجہ ہے پھر اس مقدار تک پہنچنا موہوم خصوصاً آج کل کی عمریں تھوڑی ہوتی ہیں پھر یہ بھی احتمال ہے خدا جانے برابر پاس ہوتے رہیں گے یا فیل ہوں گے مگر یہ اپنے فعل سے باز نہیں آتے خواہ نیک فعل ہو یا بدفعل سب اسی میں مبتلا ہیں اور نوکری کو بزبان حال کہہ رہے ہیں۔ تا تو بمن می رسی من بخدا می رسم (جب تک تو میرے پاس پہنچتی ہے میں خدا کے پاس پہنچتا ہوں) یہ تو علم معاش کی حالت ہے اور علم دین وہ چیز ہے کہ اس کی کوئی مقدار بھی بیکار نہیں آخرت میں بھی اور دنیا میں بھی چنانچہ اس کے حاصل کرنے والے کے لئے کھانا کپڑا سب ہی کچھ مہیا ہو جاتا ہے علم دین اگرچہ معاش کے لئے ہے ہی نہیں لیکن اگر کسی کو اس سے معاش ہی حاصل کرنا ہو تو اس میں جو بالکل ادنیٰ درجہ کی مقدار ہے کہ اذان یاد کرلے جو کہ پانچ منٹ میں یاد ہوتی ہے تو اس میں بھی تو روٹیوں کی کمی نہیں گو کانپور میں نہیں ملیں گی مگر کسی گاؤں میں چلا جاوے وہاں کسی مسجد میں اذان کہنا اور جھاڑو دینا شروع کردے دو چار دن میں روٹیاں ضرور ہی مقرر ہو جاویں گی اور علم معاش میں اول تو ادنیٰ درجہ کے لئے بھی کئی برس چاہئیں اور پھر بھی نوکری کا ملنا موہوم ہے۔

علاوہ اس کے ایک تفاوت اور ہے وہ یہ کہ ظاہر ہے کہ ہر مسلمان مخاطب ہے ایمان بالتقدیر کا تو اب میں پوچھتا ہوں کہ آیا تقدیر کے مسئلہ پر ایمان ہے یا نہیں اگر نہیں ہے تو تجدید (نئے سرے سے کام کرنا) اسلام کی ضرورت ہے کہ ایسا شخص خارج از اسلام ہے اور اگر ہے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ بی اے ایم اے پاس کرنے پر بھی قسمت سے زیادہ نہیں ملے گا پھر کس خرافات میں مبتلا ہوئے ہو۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ بے شک تقدیر پر ایمان ہے مگر تقدیر کے ساتھ تدبیر بھی تو شرط ہے تو ہم کہیں گے کہ ہاں شرط ہونا مسلم مگر علت تو نہیں ہے۔ باقی شرط اور علت میں کیا فرق ہے سو فرق یہ

ہے کہ علت پر تو معلول (علت کیا گیا جس کا کوئی سبب نہ ہو) کا مرتب ہونا واجب ہے اور شرط پر مشروط (شرط کیا گیا) کا مرتب ہونا واجب نہیں ہاں مشروط کے لئے شرط کا ہونا واجب ہے تو اگر تدبیر علت ہوتی تو ہم ہر تدبیر کرنے والے کو ضرور کامیاب پاتے ہم ایک شخص کو دیکھتے ہیں اپنی معمولی لیاقت سے بہت کچھ کما رہا ہے اور ایک دوسرا شخص ہے کہ اس کی دوتی لیاقت ہے مگر کماتا اس سے آدھا بھی نہیں اس سے صاف معلوم ہوا کہ علت نہیں ورنہ معلول کا اس سے انفکاک نہ ہوتا۔

اب میں ترقی کرکے کہتا ہوں کہ شرط بھی نہیں اگر شرط ہے تو مطلق تدبیر ہے نہ کہ خاص بی اے اور ایم اے بننا بس اتنا ضروری ہے کہ کوئی بہانہ ہو البتہ اس کا ہم انکار نہیں کرتے کہ کسی بہانہ میں کم ملے گا کسی میں زیادہ، لیکن یہ کمی بیشی ذرائع میں ہے باقی مقصود ممکن ہے کہ کم ذرائع والا مقصود میں زیادہ کامیاب ہو اور زیادہ ذرائع والا مقصود میں کم رہے۔ ایک نواب صاحب کی حکایت ہے کہ صرف دو تولہ گوشت کا قلیا بجائے غذا کے کپڑے میں پوٹلی بنا کر چوسا کرتے تھے انہوں نے ایک بار ایک لکڑہارے کو دیکھا کہ دوپہر کے وقت سایہ میں پہنچ کر بوجھ پھینکا ایک روٹ کپڑے میں سے کھولا اور ایک گٹھی پیاز کے ساتھ کھالی کر وہیں لیٹ کر خراٹے لینے لگا نواب صاحب کہتے تھے کہ میں راضی ہوں کہ میری نوابی اسے اور اس کی صحت مجھے دے دی جائے۔

تو دیکھئے کثیر الذرائع شخص ان ذرائع کو مقصود سے بدلنے پر رضامند ہو رہا ہے اور اگر یہ باتیں سمجھ میں نہیں آتیں تو خیر خود ہی مبتلا رہو مگر دوسروں کی کیوں راہ مارتے ہو یہی غنیمت سمجھو کہ ہم تمہیں عربی پڑھنے کو نہیں کہتے آپ کو عربی خوانوں کی ہمدردی کا بڑا جوش ہے کہ یہ بھی انگریزی پڑھیں اور تعجب ہے کہ کیوں انگریزی نہیں پڑھتے اور اس کا سبب کم ہمتی قرار دیتے ہیں میں کہتا ہوں آج کل عربی پڑھنا بڑی عالی ہمتی کی بات ہے کیوں کہ عربی کی آج کل سخت ناقدری ہے اور بظاہر کوئی دنیوی غرض بھی اس سے پوری نہیں ہو سکتی پھر بھی جو لوگ یہ کام کرتے ہیں وہ اعلیٰ درجہ کے عالی ہمت اور ولی ہیں کہ رضا اور قرب حق کے لئے وہ اپنی دنیا چھوڑے ہوئے اور ہر قسم کے طعن و تشنیع سننے کے لئے آمادہ ہیں تو ان کی قدر کرنا چاہیے نہ کہ تحقیر۔

ضرورت علماء:

علاوہ اس کے میں ان حضرات مصلحین سے حیثیت اسلام سے پوچھتا ہوں کہ آیا علماء کا قوم کے لئے ہونا ضروری ہے یا نہیں، اگر نہیں ہے تو اس کا قائل ہونا پڑے گا پھر اسلام کی بھی ضرورت نہیں کیونکہ بدوں علماء کے اسلام قائم نہیں رہ سکتا کیونکہ کوئی پیشہ بدوں اس کے ماہرین کے چل

نہیں سکتا یہ اور بات ہے کہ تھوڑی بہت معلوم دینی سب کو ہو جائیں اور اس سے وہ محدود وقت تک کچھ ضرورت رفع کر لیا کریں مگر اس سے اس مقدار ضرورت کا بھی بقا نہیں ہو سکتا بقا کسی شئے کا ہمیشہ اس کے ماہرین سے ہوتا ہے تو ماہرین علماء کی ضرورت ٹھہری۔

پھر یہ ماہرین کیسے پیدا ہوں؟ سو تجربہ سے اس کی صرف یہی صورت ہے کہ ساری قوم پر واجب ہے کہ چندہ سے کچھ سرمایہ جمع کر کے علماء کی خدمت کر کے آئندہ نسل کو علوم دینیہ پڑھائیں اور برابر یہی سلسلہ جاری رکھیں سو عقلاً تو یہ بات واجب تھی کہ ساری قوم اس کی کفیل ہوتی مگر ایک طالب علم بیچارہ نے اپنا دین آپ پر سے معاف کیا اور اپنے ہی اوپر مصیبت جھیل کے تحصیل علوم دینیہ میں مشغول ہوا تو چاہیے تو یہ تھا کہ آپ اس کی قدر کرتے بجائے اس کے اور رہزنی کرتے ہیں کہ عربی پڑھو گے تو کھاؤ گے کیا؟ کیا مسجد کے مینڈھے بنو گے ہاں صاحب دنیا کا کتا بننے سے اچھا ہے۔

ریاست رامپور میں ایک نے دوسرے کے بچہ کو انگریزی پڑھانے کی رائے دی اس نے کہا کہ قرآن شریف ختم ہو جاوے تو پڑھاؤں گا اور معلوم ہوا کہ دو سال میں نصف ہو چکا ہے نصف باقی ہے تو وہ صاحب کیا فرماتے ہیں کہ دو سال تو ضائع گئے اور دو سال کیوں ضائع کرتے ہو؟ یہ حالت رہ گئی ہے مسلمانوں کی یہ کیا اسلام ہے انا للہ چاہیے تو یہ تھا کہ اگر کوئی تحصیل علوم دینیہ کی طرف توجہ نہ کرتا تو تمام قوم کا فرض تھا کہ خوشامد کر کے کچھ لوگ اس کے لئے تیار کرتے افسوس اب تو کیفیت یہ ہے کہ خود تو کیا تیار کرتے دوسروں کو تیار ہونے سے روکتے ہیں یہ سب علامات اس کی ہیں کہ آپ کو خدا سے تعلق نہیں رہا۔

خدا کو بندہ سے تعلق:

ہاں خدا کو البتہ تم سے تعلق ہے اپنے دلوں کو ٹٹول لو تمہیں خود معلوم ہو جاوے گا کہ خدا سے تعلق نہیں رہا۔ خدا کو آپ سے تعلق ہونے کی دلیل ایک تو ان کے انعامات ہی ہیں۔

دوسرے ایک جگہ ارشاد بھی ہے وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (میں اس کی طرف شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہوں) اور خدا کا قرب یہی قرب علمی و قرب رحمت ہے اور اَنْتُمْ اَقْرَبُ اِلَيْنَا (تم ہماری طرف زیدہ قریب ہو) نہیں فرمایا۔ اگر کوئی کہے کہ قرب و بعد تو امور نسبہ متکررہ مشترکہ میں سے ہیں یہ کیوں کر ہو سکتا ہے کہ انہیں ہم سے قرب ہو اور ہمیں ان سے بعد ہو۔

جواب یہ ہے کہ قرب حسی بالمعنے اللغوی بے شک ایسا ہی ہے اور یہاں تو قرب بمعنے توجہ کے ہے سو خدا کا قرب الی العبد من حیث التوجہ قرب عبد الی اللہ من حیث

خدا کا قرب بندہ کی طرف باعتبار توجہ کے بندہ کا قرب اللہ تعالیٰ کی طرف باعتبار توجہ کے التوجہ کو مستلزم نہیں بس وہ اشکال مرتفع ہو گیا خلاصہ یہ ہوا کہ وہ تو ہم سے قریب ہیں یعنی متوجہ ہیں اور ہم ان سے بعید ہیں یعنی ہمیں ان کی طرف توجہ نہیں۔ بالکل قلب موضوع ہے جو ان کو حق پہنچتا تھا ہم نے کر رکھا ہے جو ہمیں زیبا بلکہ ضروری اور فرض تھا وہ انہوں نے کر رکھا ہے اور اگر ہم میں سے کسی کو توجہ بھی ہے تب بھی اگر بے تعلقی نہیں تو کم تعلقی تو ضرور ہے پس مسلمانوں کی ساری خرابیوں کا حاصل یہ ہے اگر یہ دور ہو جاوے تو ہماری تمام حالتیں درست ہو جاویں اس واسطے کہ خدا تعالیٰ کی عادت مسلمانوں کے لئے یہ جاری ہے کہ ان کی دنیا ان کے دین کے ساتھ وابستہ ہے۔

روح دنیا:

شاید کسی کو شبہ ہو کہ دیندار مسلمانوں کے پاس دنیا کم دیکھتے ہیں اور غیر دیندار مسلمانوں کے پاس زیادہ تو سمجھ لو کہ دنیا مال و دولت کا نام نہیں روح دنیا کچھ اور ہی ہے اور وہی دنیا سے مقصود ہے۔ پس دنیا درحقیقت وہ ہے اور وہ راحت قلب ہے چنانچہ اگر ایک شخص کے پاس ایک لاکھ روپیہ بھی ہو اور جائیداد بھی ہو ہر طرح کا سامان عشرت بھی مہیا ہو اور اس کے ساتھ ہی اسے یہ بھی معلوم ہو کہ آج کے چوتھے روز مجھے پھانسی دے دی جائے گی اب فرمایئے کہ کیا اسے اس دولت سے خوشی ہو گی؟ کیا اسے اس سامان عشرت سے لطف میسر ہو گا؟ کیا اسے لذیذ کھانوں میں حظ آئے گا؟ کیا اسے عالیشان کوٹھی میں راحت ملے گی؟ کیا خاک راحت ملے گی کیا خاک لطف وحظ آئے گا اس وقت دنیا اس کی آنکھوں میں اندھیر ہو گی یہ سب کیوں محض اس لئے کہ اس کی قلب کو راحت میسر نہیں اس سے معلوم ہوا کہ اصل اور روح دنیا کی راحت ہے محض مال و دولت سے کچھ نہیں ہوتا اور میں بقسم کہتا ہوں کہ حقیقی راحت اہل اللہ کو میسر ہے اگر آپ کو یقین نہ آئے تو ان کے پاس رہ کر دیکھ لیجئے جس پر آپ کو رحم آ رہا ہے کہ ہائے اس کے کپڑے پھٹے ہوئے ہیں جوتا ٹوٹا ہوا ہے اگر یہ شخص دیندار ہے۔ تو واللہ یہ شخص راحت میں ہے اور نافرمان امیر اس کے مقابلہ میں مصیبت میں ہے اور واقعی خدا کے نافرمانوں کو کسی وقت چین نہیں ہے۔

معرفت ومحبت:

اور اس میں ایک راز ہے وہ یہ کہ حوادث انسان کے اختیار میں نہیں ہوتے ایک مقدمہ یہ ہوا دوسرا مقدمہ یہ کہ زیادہ حوادث طبیعت کے خلاف ہوتے ہیں پس جب ناگوار خلاف طبیعت امور پیش آتے رہیں گے تو چین کیوں کر میسر ہو گا روپیہ بہت ہے مگر کیا کریں کہ کہیں نیند نہ آنے کی

شکایت ہے کہیں معدہ کمزور ہے عمدہ غذا نہیں کھا سکتے۔ کبھی زکام ہے کبھی پیچش ہے کبھی بخار ہے حالت غور کر کے دیکھئے تو آرام سے بیٹھنا میسر نہیں ہوتا بیٹھے ہیں خبر آئی کہ بھانجا بیمار ہے یا بیٹے کو بخار ہے غرض زیادہ حوادث ایسے ہی ہوتے رہتے ہیں جو پریشان کرنے والے ہیں، تیسرا مقدمہ یہ کہ یہ نہیں ہوسکتا کہ واقعات رک جائیں یا خلاف طبع نہ رہیں اگر اس کی تدبیر کی کوئی صورت ہے تو صرف یہ ہے کہ مزاج کو ایسا کر لے کہ کوئی واقعہ خلاف مزاج نہ رہے اور مزاج ایسا کس طرح ہوسکتا ہے۔ سو وہ ٹوٹے پھوٹے بوریوں میں اور تنگ وتاریک حجروں میں ہوسکتا ہے اور وہ کیا چیز ہے جو ان حجروں میں بیٹھنے سے ملتی ہے وہ محبت ومعرفت ہے۔

اس کو ایک مثال سے سمجھئے اگر کوئی شخص کسی کو پیچھے سے ایک دھول مارے تو کتنا غصہ آوے گا۔ اتفاق سے یہی شخص کسی عورت پر فریفتہ ہوگیا۔ اس نے بھی ایسا ہی کیا جب تک اس کو دیکھا نہ تھا تغیر ہوا تھا مگر دیکھا تو محبوبہ۔ بس اس دھول پر نثار ہو جاوے گا کہ ایسی کہاں میری قسمت اور بزبان حال کہے گا۔

ناخوش تو خوش بود برجان من — دل فدائے یار دل رنجان من

(تیری یعنی محبوب کی جانب سے جو امر پیش آئے گو وہ طبیعت کو ناگوار ہی کیوں نہ ہو مگر وہ میری جان پر خوش اور پسندیدہ ہے میں اپنے یار پر جو میری جان کو رنج دینے والا ہے اپنے دل کو قربان کرتا ہوں) بھلا اس کے ہاتھ سے تو بڑی بات ہے محبوب کے معائنہ میں جو تکلیف پیش آتی ہے وہ تک ناگوار نہیں ہوتی ایک شخص کو کسی کے عشق میں اس کے ورثہ نے سو کوڑے مارے ننانوے میں تو ہنستا رہا اور اخیر کے ایک کوڑے میں رو دیا لوگوں نے پوچھا کہ کیا بات ہے اس نے کہا کہ ننانوے میں تو میرا محبوب بھی شریک تماشہ تھا اور اخیر کے چابک میں وہ چلا گیا تھا۔

بجرم عشق توام میکشند غوغائے است — تو نیز برسر بام آ کہ خوش تماشائے است

(تیرے عشق کے جرم میں تکلیف اٹھا رہے ہیں اور شور مچا رہے ہیں تو بھی کوٹھے پر آ بہت اچھا تماشا ہے۔) یہ درخواست کہ تو نیز برسر بام آ۔ بس اسی واسطے ہے کہ خالی محبوب کے دیکھنے سے بھی تکلیف کی ناگواری جاتی رہتی ہے اس کی تائید قرآن مجید سے بھی ہوتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کیلئے حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا کہ آپ قضا وقدر کے حکم پر صبر کیجئے کیونکہ آپ ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں۔ ہم آپ کو دیکھ رہے ہیں۔

ہمینم بس کہ داند ماہرویم — کہ من نیز از خریداران اویم

(مجھ کو یہی کافی ہے کہ میرا محبوب جان لے کہ میں بھی اس کے خریداروں میں ہوں) بس عشق اور معرفت درد کو کھو دیتا ہے، محبت و معرفت عجیب چیز ہے جو واقعہ محبوب کی طرف سے پیش آئے وہ ناگوار ہی نہیں ہوتا ۔ عمر از محبت تلخہا شیریں شود (محبت سے تلخیاں بھی گوارا ہیں) غرض مزاج کو ایسا بنانے والی چیز محبت و معرفت ہے اس کا خاصہ ہے کہ قلب کے اندر نور پیدا ہو جاتا ہے کہ جس سے بجز محبوب کوئی چیز نظر نہیں آتی اور یہ دو چیزیں ہیں ایک محبت ایک معرفت دونوں کی حقیقت الگ الگ ہے معرفت سے تو یہ بات پیدا ہو جاتی ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے ادھر سے ہوتا ہے اور محبت اسے خوشگوار بنا دیتی ہے معرفت کے باب میں شیخ فرماتے ہیں گلستان میں۔

از خداداد خلاف دشمن و دوست   کہ دل ہر دو در تصرف اوست

(دوست کی مہربانی اور دشمن کی دشمنی کو خدا کی طرف سے سمجھو کہ دونوں کے دل پر اسی کا تصرف ہے)

دریں نوعے از شرک پوشیدہ ہست   کہ زیدم بیاز رد و عمردم نجیست

(اس میں بھی ایک قسم کا شرک ہے کہ زید نے مجھ کو آزردہ کیا اور عمرو نے زخمی کیا) یعنی زید و عمرو کی طرف منسوب کرنا بھی ایک قسم کا شرک ہے جب حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہوا پوچھا گیا ہمارے دربار میں کیا لائے اس سوال سے بہت شرم آئی کہ کیا عمل بتادوں کہ کیا لایا ہوں اپنے نزدیک بے غبار جواب سمجھ کے عرض کیا کہ توحید لایا ہوں کیوں کہ یہ تو ادنیٰ شرط اسلام ہے اس کے عرض کرنے میں کوئی دعویٰ نہیں ارشاد ہوا کہ اَمَا تَذْكُرُ لَيْلَةَ اللَّبَنِ وہ رات بھی یاد ہے جب کہا تھا کہ دودھ سے درد ہو گیا کیا منہ لیکر دعوے توحید کا کرتے ہو دودھ کو فاعل ٹھہرا چکے ہو، کانپ اٹھے عرض کیا یا الٰہی سوائے اعتراف خطا و قصور کے اور کچھ نہیں لایا بس اس جرح میں رہ گئے یہی توحید ہے جو معرفت کے کامل ہونے سے کامل ہو جاتی ہے پھر تو یہ حالت ہو جاتی ہے۔

موحد چہ برپائے ریزی زرش   چہ فولاد ہندی نہی برسرش
امید و ہراسش نباشد زکس   ہمیں ست بنیاد توحید و بس

(موحد اور عارف کے قدموں پر خواہ زر بکھیر دو یا اس کے سر پر تلوار رکھو امید و خوف اس کو بجز خدا کے کسی سے نہیں ہوتا توحید کی بنیاد بس اسی پر ہے)

وجہ یہ کہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ لوگ کر رہے ہیں کوئی اور ہی ان سے کرا رہا ہے۔ میں نے ایک صندوق دیکھا ایک دیہاتی بڑھئی بنا کر لایا تھا اس کے ڈھکنے کے اوپر لکڑی کی پتلیاں تھیں صندوق کے اندر اس کی مشین تھی ایک تار ہر پتلی میں لگا ہوا تھا جب کوک دی

جاتی تھی تو سب پتلیاں حرکت کرنے لگتی، تھیں کوئی موسل سے کوٹتی تھی کوئی چھاج سے پھٹکتی تھی کوئی عورت چکی چلاتی تھی کوئی چرخہ کاتتی تھی ایک آرا چلا رہا تھا غرض جتنی پتلیاں اتنی حرکتیں اور ایک کنجی سے ساری حرکتیں ہوتی تھیں اسی طرح دنیا میں جو کچھ کرتے ہیں ان کی حرکت خود بخود نہیں ہے کسی اور نے وہ حرکت دے رکھی ہے جب عارف کی نظر تیز ہو جاتی ہے تو اسی تحریک کے مشاہدہ کے سبب زید وعمرو پر نظر نہیں پڑتی۔

اثرِ معرفت ومحبت:

یہی وجہ ہے کہ بجائے اس کے کہ کسی پر غیظ آوے وہ حق تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ دوسرا تصرف فرمادے۔ حضرت سلطان ابراہیم بن ادھم رحمتہ اللہ علیہ تارک سلطنت میں ایک مرتبہ جہاز میں سوار ہوئے جہاز پر کسی امیر کے یہاں روزانہ نقلیں ہوا کرتی تھیں۔ نقالوں نے ایک روز درخواست کی کہ اگر کوئی غریب آدمی میسر ہو جاوے تو اس سے دھول دھپا کریں اور نقل کا لطف بڑھے تمام جہاز میں کسی اور پر تو دست اندازی کی جرأت نہ ہوئی مگر حضرت ابراہیم بن ادھمؒ کو غریب سمجھ کر اس کام کے لئے منتخب کر کے لے گئے۔

این چنیں شیخ گدائے کو بکو　　　عشق آمد لاابالی فاتقوا

(ایسا فقیر صفت شیخ عشق میں بڑا لاابالی ہے پس ڈرتے ہی رہو۔) غرض انہیں مجلس میں لے گئے ان پر یہ مشاہدہ غالب ہے کہ یہ لوگ خود نہیں کھینچ رہے ہیں ان سے کوئی اور ہی کھنچوا رہا ہے ہم انہیں کے ہیں وہ جس حالت میں رکھیں راضی ہیں۔

زندہ کنی عطائے تو وربکشی فدائے تو　　　دل شدہ مبتلائے تو ہرچہ کنی رضائے تو

(زندہ کریں آپ کی عطا ہے قتل کریں آپ پر فدا ہوں دل آپ پر مبتلا ہو گیا ہے جو تصرف کریں آپ سے راضی ہوں)

اب کوئی دھول لگا رہا ہے کوئی ٹانگ پکڑ کر گھسیٹ رہا ہے یہ اس طرح خاموش کہ گویا حس ہی نہیں جب دیر ہو گئی تو عادۃ اللہ ہے کہ

حلم حق با تو مواسا کند　　　چونکہ از حد بگذری رسوا کند

(اللہ تعالیٰ کی بردباری تمہارے ساتھ مواسات یعنی رعایت کرتی ہے جب تمہاری گستاخیاں حد سے بڑھ جاتی ہیں تو رسوا کرتے ہیں۔) ایک دفعہ غیرت باری کو جوش آیا ارشاد ہوا اے ابراہیم ان کی گستاخی حد سے بڑھ گئی کہو تو سب کو غرق کر دوں یہ عرض کرتے ہیں کہ اے اللہ غرق کرنے کی جگہ

ان کو آنکھیں ہی نہ دے دیجئے اور اس خرافات سے نکال ہی نہ لیجئے سبحان اللہ یہ ہے اتباع سنت۔ جس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دندان مبارک شہید ہوا ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم جناب باری میں عرض کرتے ہیں اَللّٰهُمَّ اهْدِ قَوْمِیْ فَاِنَّهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ (الدر المنثور ۲:۲۹۸) اے اللہ میری قوم کو ہدیت کر دے کہ یہ جانتے نہیں۔ ملا دو پیازہ نے ایک ال نامہ لکھا ہے اس میں لکھا ہے کہ الرسول خیر خواہ دشمناں (رسول دشمنوں کا بھی خیر خواہ ہے) تو واقعی حضور صلی اللہ علیہ وسلم خیر خواہ دشمناں ہی ہیں بہر حال حضرت ابراہیم بن ادھمؒ نے ان کا غریق ہونا گوارا نہ کیا تو یہ کیا بات ہے کیوں نہیں غیظ ہوتا یہ اثر معرفت کا ہے اسی پر شیخ شیرازی فرماتے ہیں۔

چہ خوش گفت بہلول فرخندہ خوئے   چو بگذشت برعارف جنگجو ئے
گرایں مدعی دوست بشناختے   بہ پیکار دشمن نہ پرداختے

(بہلول مبارک خصلت نے کیا اچھی بات کہی جبکہ وہ لڑنے والے عارف پر گذرے اگر اس مدعی کو اللہ تعالیٰ کی معرفت ہوتی تو دشمن کے ساتھ لڑائی میں مشغول نہ ہوتا)

یعنی اگر اس کو دوست کی معرفت ہوتی تو دشمن سے لڑنے کی فرصت ہی نہ ہوتی اب معلوم ہوتا ہے کہ فرصت ہے یہ لڑائی اسے ہی زیبا ہے جسے دوست کا مشغلہ نہ ہو ورنہ۔

دیدہ از دیدنش نگشتے سیر   ہمچناں کز فرات مستسقی

(آنکھ اس محبوب) کے دیکھنے سے سیر نہیں ہوتی جیسے جلندھر کا مریض نہر فرات کے پانی سے سیر نہیں ہوتا) کیا یہ تھوڑا کام ہے اسے فرصت کہاں مل سکتی ہے غرض یہ اثر تو معرفت کا ہے کہ یہ حادث واحد حقیقی کے تصرف سے ظاہر ہوا ہے اور زید و عمر و واسطہ محضہ ہیں۔

اور محبت سے یہ ہوتا ہے کہ اس واقعہ کی ناگواری اڑ جاتی ہے سو دونوں کی ضرورت ہے کیونکہ نری معرفت ہو اور محبت نہ ہو تو سب سے زیادہ دریائے ہلاکت میں ایسا عارف ہی ڈوبے گا مثلاً کوئی مر گیا تو عارف صاحب جانتے ہیں کہ خدا نے مارا طاعون نے نہیں مارا پس اگر محبت نہ ہونے کے سبب یہ واقعہ ناگوار ہو تو یہ عارف بجائے طاعون کے خدا کی شکایت کرے گا تو نری معرفت ہلاکت ہے یہ خدا کی رحمت ہے کہ اہل اللہ کی صحبت میں دونوں باتیں میسر ہو جاتی ہیں تو صحبت کے بعد جبکہ معرفت و محبت دونوں دولتیں عطا ہو گئیں تو اب جو واقعہ پیش آئے گا معرفت کے سبب خلق سے ناگواری نہ ہو گی اور محبت کے سبب خالق سے ناگواری نہ ہو گی چاہے کتنا ہی عظیم حادثہ ہو مگر یہ خوش ہیں کہ

ہر چہ از دوست می رسد نیکوست

(جو کچھ دوست کی طرف سے پیش آئے وہ خیر ہی ہے) حقیقی آسائش اسے کہتے ہیں مصیبت سے اور لوگ گھبراتے ہیں اور یہ ہنستا ہے خوش ہوتا ہے۔

عارفین کے نزدیک حقیقت موت:

اجی اور تو اور موت جو کہ تمام مصیبتوں کا میزان کل ہے اور جس سے سب لوگ گھبراتے ہیں حتیٰ کہ بعض سلاطین نے اپنے قلعہ میں خضر دروازہ ایک ایسے دروازہ کا نام رکھا تھا جس میں سے خاندان شاہی کے جنازوں کو نکالا جاتا تھا تو موت کا نام لینے سے گھبراتے تھے کسی لڑکی نے ایک بڑھیا کو کہا کہ مرتی بھی نہیں تو اس بڑھیا نے اپنی ایک ساتھن سے جا کر بطور شکایت کہا کہ سنا بھی کہ فلاں مجھ کو یوں کہتی تھی کہ اے بڑھیا تو یوں ہو جا پھر وہ بڑھیا کیا کہتی ہے اے اللہ میاں سنیو مت۔ کمبخت احمق اگر اللہ میاں یہ تیری سنیں گے تو وہ اس کی بھی سنیں گے ورنہ یہ کہاں سے سنیں گے تو موت سے بڑھیاں بھی گھبراتی ہیں غالباً مولانا جامیؒ نے لکھا ہے کہ ایک بڑھیا کی لڑکی جس کا نام مہتی تھا بہت بیمار تھی جب اس کی حالت زیادہ غیر ہوئی تو بڑھیا نے رو رو کے دعا کی کہ اے اللہ اسے اچھا کر دے اور اس کے بدلے مجھے موت دے دے۔ ایک دن شام کے وقت اس کی گائے کسی امیر کے باورچی خانہ میں جا گھسی اور ایک پتیلہ میں منہ ڈال دیا پھر نکال نہ سکی اسی ہیئت سے وہ اپنے گھر آ گئی بڑھیا نے اس ہیئت سے کبھی اس کو دیکھا نہ تھا سمجھی کہ میری دعا قبول ہو گئی اب یہ عزرائیل آ گئے بس گھبرا کے لڑکی کی طرف اشارہ کر کے کہتی ہے اے موت یہ ہے اسے لے جاؤ۔

گفت اے موت من نہ مہتی ام پیرزال غریب محنتی ام

(کہا اے موت میں مہتی نہیں ہوں میں ایک غریب محنتی بڑھیا ہوں)

غرض لڑکی کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگی دیکھ یہ ہے میں نہیں ہوں۔ موت کا نام آتے ہی بس بیٹی کی محبت فنا ہو گئی، یہیں کانپور میں ایک عجیب و غریب واقعہ ہوا۔ ایک لڑکے کو سرسام ہو گیا تدبیریں کی گئیں کچھ افاقہ نہ ہوا لوگ یہ سمجھے کہ مر گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد ہوش آ گیا ماں سمجھی کہ یہ بھوت ہو گیا تو اب اس کے لئے تعویذ گنڈے کراتی پھرتی ہے کہ کسی طرح مر جاوے اگر کسی موقع پر مردہ اہل مجلس کو مخاطب کر کے السلام علیکم کہہ دے تو ب ڈر کے مارے بھاگ جاویں تو یہ موت جو کہ لوگوں کے نزدیک اتنی بڑی مصیبت ہے کہ ر اس الکل ہے تمام مصائب کی مگر اس کی حقیقت ان عارفین محبین کے نزدیک کیا ہے یہ ہے کہ اس کے شوق و تمنا میں عارف شیرازی فرماتے ہیں۔

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بردم   راحت جاں طلبم وز پے جاناں بردم
نذر کردم کہ گر ایں غم بسر آید روزے   تا در میکدہ شاداں و غزلخواں بردم

(وہ دن مبارک ہے جس روز میں اس دنیائے فانی سے کوچ کروں راحت جان طلب کروں اور محبوب کے لئے جاؤں میں نے نذر کی ہے کہ جس دن یہ غم تمام ہو جائے یعنی موت کا وقت آئے تو محبوب کے دربار تک خوش وخرم اور غزل پڑھتا ہوا جاؤں)

فقط خرم ہی نہیں منت بھی مانتے ہیں کیا ٹھکانہ ہے ان کے نزدیک یہ موت کی حقیقت ہے کہ تمنا کرتے ہیں شاید کوئی کہے کہ یہ فرصت کی باتیں ہیں مرتے وقت یہ حالت رہے تو جانیں، اس وقت تو نانی یاد آتی ہوگی تو لیجئے ایک بزرگ عین حالت نزع میں مسرور ہو کر فرماتے تھے۔

وقت آں آمد کہ من عریاں شوم   جسم بگذارم سرا سر جاں شوم

(اب وہ وقت آرہا ہے کہ میں عریاں ہوں جسم کو چھوڑ کر سراسر جان بنوں)

خوش ہو رہے ہیں کہ الحمد للہ اس جیل خانہ سے چھوٹنے کا وقت آگیا بلکہ ان کی مسرت کی تو یہ کیفیت ہے کہ بعض بعض سے بطور خرق عادت خود بعد موت بھی مسرت کے آثار ظاہر ہوتے ہیں یا قرائن سے مسرت بعد الموت کا پتہ لگتا ہے چنانچہ ایک بزرگ نے وصیت کی تھی کہ میرے جنازہ کے ساتھ ساتھ یہ شعر پڑھتے چلیں۔

مفلسانیم آمدہ در کوئے تو   شیأ للہ از جمال روئے تو
دست بکشا جانب زنبیل ما   آفریں بر دست و بر بازوئے تو

(آپ کے دربار میں ہم مفلس ہو کر آئے ہیں اپنے جمال کے صدقہ میں کچھ عنایت کیجئے ہماری زنبیل کی طرف ہاتھ بڑھائیے آپ کے دست وبازو پر آفرین ہے۔) آخر کیا بات ہے اور میں نے ایک کتاب میں دیکھا کہ جب سلطان نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کا جنازہ لے کر چلے تو ان کے ایک عاشق زار کی زبان سے شدت غم میں بے ساختہ نکلا

سرو سیمینا بصحرا می روی   سخت بے مہری کہ بے ما میروی
اے تماشا گاہ عالم روئے تو   تو کجا بہر تماشا میروی

(اے محبوب آپ جنگل میں جارہے ہیں سخت بے مہری کہ بغیر ہمارے جارہے ہیں اے محبوب آپ کا رخ انور جہان کا تماشا گاہ ہے آپ تماشا کے لئے کہاں جارہے ہیں) تو لکھا ہے کہ کفن میں سے آپ کا ہاتھ اونچا ہوا جیسے وجد میں ہوتا ہے۔ لوگوں نے انہیں پڑھنے سے روکا۔ تو مرنے

کے بعد بھی یہ حالت ہوتی ہے اس کی وجہ کیا ہے صرف یہ ہے کہ مرنے کے وقت کو زمان وصال سمجھتے ہیں اس لئے اس کی تمنا کرتے ہیں جیسے جامی فرماتے ہیں۔

چہ خوش وقتے وخرم روز گارے　　　کہ یارے برخورد از وصل یارے

(کیا اچھا وقت اور کیا اچھا زمانہ ہے کہ اس میں کوئی محب اپنے محبوب کے وصال سے متمتع ہو۔) ایک بزرگ طاعون کو خطاب فرماتے ہیں۔ خُذْ بِیْ اِلَیْکَ (مجھ کو پکڑ لے) اس موقع پر مجھے عراقی کا شعر یاد آتا ہے۔

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت　　　سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(دشمن کا ایسا نصیب نہ ہو کہ تیری تلوار سے ہلاک ہو دوستوں کا سر سلامت رہے کہ تو خنجر آزمائی کرے۔)

پس موت کے سامنے ان کی یہ حالت ہے معرفت ومحبت یہ چیز ہے۔

کمال نظر معرفت:

خلاصہ یہ ہے کہ جس کو حق تعالیٰ سے تعلق ہے اس کو دنیا میں کوئی پریشانی نہیں ہوتی اور آخرت میں وعدہ صادقہ ہے جنت کا اور اگر جنت بھی چند روز گناہوں کے سبب نہ ملے تب بھی آخرت کی تکلیف مومن کے لئے دنیا کی راحت سے افضل ہے کیونکہ اس تکلیف کے انقطاع کی ہر وقت یقینی امیدوار یہاں کی راحت کے زوال کا ہر وقت یقینی خوف۔ اوران مضامین کا اکثر حصہ حال سے سمجھ میں آسکتا ہے نرے قال سے نہیں یوں تو طوطا بھی نبی جی بھیجو سیکھ لیتا ہے مگر جب بلی آکر دبائے تو ٹاں ٹاں ٹاں۔ اور حال میسر ہوتا ہے اہل حال کی صحبت میں پس اس کا بھی اہتمام کرو لوگ کہتے ہیں اب اس شان کے بزرگ نہیں رہے تو کس کی صحبت اختیار کریں سو یہ خیال بالکل غلط ہے ایسے بندگان خدا اب بھی موجود ہیں لیکن ایک دن میں نظر نہیں آسکتے اگر کسی کی آنکھ آج بنی ہو تو نظر ضعیف ہوگی۔ تھوڑی دور کی چیزیں دکھائی دیں گی۔ چار دن کے بعد اور آگے نظر آئے گا۔ تو نظر تو ہے مگر اول دن اس لئے نظر نہیں آتا کہ ضعیف ہے۔ ہاں سرمہ ہو تو نظر آوے وہ سرمہ بھی انہیں کی صحبت میں ہے کہ جس سے نظر آجاوے گا مگر مشکل تو یہ ہے کہ لوگ دیکھتے ہیں رسوم کو اور محققین کے یہاں رنگے کپڑے ہوں گے نہ ایسی موٹی تسبیح ہوگی کہ ہتھیار کا کام دے جیسا ایک شاہ صاحب کہتے تھے کہ تسبیح ایسی تو ہو کہ لاٹھی کا کام دے غرض ان کے یہاں نہ کوئی گنبد دار مزار ہے نہ رسوم ہیں کہ نیاز ہو رہی ہے عرس ہو رہا ہے یہ کچھ بھی نہیں بس ایک چیز ہے۔

یکے دان دیکے خوان دیکے بیں (ایک کو جان ایک پڑھ اور ایک ہی کو دیکھ) ان کا یہ مذہب ہے۔

خلیل آسا در ملک یقیں زن　　　نوائے لا احب الآفلیں زن

(ابراہیم علیہ السلام کی طرح یقین حاصل کر کے لا احب الآفلین (میں غروب ہو جانے والوں سے محبت نہیں رکھتا۔) کی صدا لگاؤ) ان کے یہاں اور تو کوئی کیا چیز ہوتی وہ خود بھی نہیں رہے

بحال تہی دست باید گرستن　　　کہ تا نقد دل ہم بہ چنگے ندارد

(تنگدستی کی حالت میں رونا چاہیے کہ نقد دل چنگل میں نہیں رکھتا ہے۔)

اور وہ اپنی ہستی کیسے نہ مٹاتے جبکہ ان پر محو کرنے والی تجلی ہو رہی ہے جس کی خاصیت ہی یہ ہے۔

چو سلطان عزت علم بر کشد　　　جہاں سر بجیب عدم در کشد

(جب محبوب حقیقی کی تجلی قلب پر وارد ہوتی ہے سب چیزیں فنا ہو جاتی ہیں)

اگر آفتاب ست یک ذرہ نیست　　　وگر ہفت دریاست یک قطرہ نیست

(اگر آفتاب ہے ایک ذرہ نہیں اور سات دریا ہیں۔ تو ایک قطرہ نہیں ہے۔)

تو اگر صحیح شناخت ہو تو اللہ کے بندے ایسے ایسے نظر آویں گے کہ ان کی صحبت میں تمہاری نگاہ تیز ہو جاوے گی ان کی صحبت اختیار کرو تو کھلی آنکھوں نظر آ جاوے گا کہ معرفت و محبت کیا چیز ہے اور یہ کہ حقیقی آسائش اہل معرفت و محبت ہی کو حاصل ہے انہیں کی شان میں ہے۔

مبیں حقیر گدایان عشق را کایں قوم　　　شہان بے کمر و خسروان بے کلہ اند

(گدایان عشق کو حقیر نہ سمجھو کیونکہ یہ لوگ شاہان بے تخت و تاج ہیں۔)

اور یہ امر واقعی ہے نری شاعری نہیں ہے یہ ان کی حالت ہے مشاہدہ کر لو ان کے اقوال و افعال میں واقعات کے وقت غور کرو کہ ان کی کیا کیفیت ہے ہر وقت ان کا مذہب یہ ہے۔

سوئے نومیدی مرو کا مید ہاست　　　سوئے تاریکی مرد خورشید ہا است

(نا امیدی کی راہ نہ جاؤ بہت سی امیدیں ہیں تاریکی کی طرف نہ چلو، بہت سے آفتاب ہیں یعنی اللہ تعالیٰ سے نا امید نہ ہو امیدیں رکھو۔)

دنیا دار کا ایک ذرا سا بچہ بیمار ہو جاتا ہے تو تیماردار بدحواس ہو جاتے ہیں وہاں سب کے سب اگر فنا ہو جائیں تو بھی کچھ پرواہ نہیں۔

ایک غزوہ میں ایک بی بی کے شوہر اور بچے باپ سب کام آ گئے، کسی نے کہا کہ تمہارا باپ بھائی بچے سب مارے گئے تو وہ کہتی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) بھی سلامت ہیں کہا ہاں کہنے

گی جب آپ سلامت ہیں تو مجھے کسی کے کام آنے کی کچھ پرواہ نہیں۔

فَاِنَّ اَبِیْ وَوَالِدَہٗ وَعِرْضِیْ لِعِرْضِ مُحَمَّدٍ مِنْکُمْ وِقَاءُ

(یعنی میرے ماں باپ کی عزت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آبرو کے لئے تم سے وقایہ یعنی ڈھال ہے)

مولانا فرماتے ہیں۔

روزہا گر رفت گو رو باک نیست تو بماں اے آنکہ جز تو پاک نیست

(ایام تلف ہونے پر حسرت نہ کرنا چاہیے اگر گئے بلا سے عشق جو اصلی دولت ہے اور سب خرابیوں سے۔ پاک وصاف اس کا رہنا کافی ہے۔) جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد صحابہ کرام کو کس قدر قلق ہوا کہ ہم میں سے اگر کسی کو اس درجہ کا قلق ہو تو دیوانہ ہو جائے مگر خدا کے زندہ رہنے کے مضمون سے تسلی ہو گئی۔ جب آپ کی وفات ہوئی ہے تو حضرت عمرؓ کمال حزن میں فرما رہے تھے کہ اگر کوئی کہے گا کہ وفات ہو گئی تو قتل کر دوں گا۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے یہ آیت پڑھ کر سنائی وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْخَلَتْ مِنْ قَبْلِہِ الرُّسُلُ اَفَاِنْ مَّاتَ اَوْقُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰی اَعْقَابِکُمْ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم رسول ہی تو ہیں اور آپ سے پہلے بہت سے رسول گذر گئے پس اگر مر جائیں یا قتل ہو جائیں تو تم ایڑیوں کے بل پلٹ جاؤ گے؟) تو حضرت عمرؓ کی تسلی ہو گئی اور فرمایا کہ میں اس قدر اس آیت کو بھولا ہوا تھا کہ معلوم ہوتا ہے کہ آج ہی نازل ہوئی ہے اور حضرت صدیق اکبرؓ نے فرمایا کہ آج محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی مگر خدا زندہ ہے۔

مجھے صحابہؓ کی اس حالت پر ایک حکایت یاد آئی میرے ایک دوست ہیں ہم وطن بھی ہیں بہت ہی خوف زدہ ہو کر اپنی حالت بیان کرنے لگے کہ مجھے جتنی حق تعالیٰ سے محبت ہے اتنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں میں نے کہا کچھ پریشانی کی بات نہیں کہ تمہاری یہ حالت خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہ ہے۔ تم بالکل متبع سنت ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اتنی محبت نہ تھی جتنی خدا سے تھی۔ شگفتہ ہو کر دعائیں دینے لگے۔ صحابہ کی بھی یہی کیفیت تھی تو حضرت اتنے بڑے واقعہ پر صحابہ کا صبر کرنا محض اس وجہ سے تھا کہ حی لا یموت تو ہے اسی سے انہیں غم مہلک نہیں ہوا رنج قاتل نہیں ہوا۔

خدا تعالیٰ نے اسباب مصیبت کا ایک معالجہ یہ بھی کیا ہے یعنی جب کوئی حادثہ پیش آتے تو صبر و سکون کا علاج بتلاتے ہیں اِذَآ اَصَابَتْھُمْ مُّصِیْبَۃٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ (اور جب ان کو مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں ہم اللہ ہی کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں) دو

تعلیمیں فرمائی ہیں ایک خواص کے لئے اور ایک عوام کے لئے اِنَّا لِلّٰهِ ہم خدا کے ہیں یہ خواص کے لئے ہے کہ جب اپنے کو خدا کا سمجھیں گے تو اس کے ہر تصرف کو خوشی سے گوارا کریں گے وَاِنَّآ اِلَیْهِ رٰاجِعُوْنَ اور ہم اسی کی طرف لوٹیں گے یہ دوسروں کے لئے ہے اس طرح سے کہ جب سب وہاں جا رہے ہیں تو سب جمع ہو کر مل جاویں گے وہ شخص مفقود بھی مل جاوے گا جیسا کہ اگر کسی کا کوئی عزیز حیدر آباد میں وزیر اعظم ہو جاوے تو تم آیا یہ چاہو گے کہ وہ ہمارے پاس چلا آئے یا یہ چاہو گے کہ ہم بھی وہاں پہنچ جائیں بس یوں سمجھو کہ جو مرا وہ حیدر آباد پہنچا۔

ہمارے حضرتؒ کے پاس ایک بڈھا آیا کہ حضرت دعا فرما دیجئے کہ بیوی بہت بیمار ہے جاں بلب ہے تندرست ہو جاوے۔ فرمایا کہ بھائی مرتی ہے، مرنے دو خدا کا شکر کرو کہ ایک مسلمان جیل خانہ سے چھوٹتا ہے۔ جہاں وہ جاتی ہے تم بھی پہنچ جاؤ گے میں نے کہا لو! بڑے میاں آئے تھے بیوی کو بچانے اپنے مرنے کی بھی بشارت لے چلے۔ لو اور آؤ دعا کرانے۔ پھر کہنے لگا حضرتؒ اگر وہ مرجائے گی تو میری روٹی کون پکائے گا فرمایا ہاجی وہ ماں کے پیٹ سے روٹی ہی پکاتی تو آئی تھی۔ اللہ اکبر ہر امر میں حقیقت پر نظر تھی غرض جب نظر معرفت کی کامل ہو جائے گی پھر پریشان ہو اس کی بلا بہر حال یہ آثار تھے تعلق کے اور بے تعلقی کے کہ بے تعلقی سے دونوں جہان کی مصیبتیں وابستہ ہیں افسوس ہے کہ اس کے بعد بھی ہم کو فکر نہ ہو۔

غلط دعویٰ پر رد:

اور اگر فکر ہے تو سنو حق تعالیٰ اسی کا طریق بتلاتے ہیں۔ بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ. (ہاں جو کوئی اپنا رخ اللہ کی طرف جھکائے اور وہ مخلص بھی ہو تو ایسے شخص کو اس کا عوض ملتا ہے پروردگار کے پاس پہنچ کر اور نہ ایسے لوگوں پر کوئی اندیشہ ہے اور نہ ایسے لوگ مغموم ہونے والے ہیں) بلیٰ میں رد ہے اہل باطل کے ایک غلط دعویٰ کا کہ جس کے متعلق رد سے پہلے ارشاد ہے تِلْکَ اَمَانِیُّهُمْ یہ ان کی آرزوئیں ہیں کہ بجز ان کے اور لوگ جنت میں نہیں جاویں گے آگے ارشاد ہوا۔ بَلٰی یعنی کیوں نہیں جاویں گے پھر اس کی دلیل قاعدہ کلیہ کے ضمن میں بیان فرماتے ہیں مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ الخ جو شخص سپرد کر دے اپنی وجہ یعنی ذات کو خداوند تعالیٰ کیلئے اس حال میں کہ وہ محسن ہو ان کا۔ اجر اللہ کے پاس ہے نہ ان پر خوف ہو گا نہ وہ غمگین ہوں گے یہ ترجمہ ہوا۔

یہاں پر حق تعالیٰ نے اس عمل منجی کو اسلام سے تعبیر فرمایا اس کی تفصیل سمجھنے کے بعد معلوم ہو گا

کہ وہ کیا چیز ہے سو ہمارے روشن خیال حضرات کے نزدیک اس کی حقیقت ایسی چیز ہے کہ نہ اس میں کچھ مامورات ہیں نہ منہیات ان کی کیفیت یہ ہے کہ ان کو کسی منہی عنہ سے منع کرو تو کہتے ہیں کیا اس سے ایمان جاتا رہا مولویوں نے خواہ مخواہ تنگی کردی ہے اجی اسلام بہت وسیع چیز ہے۔ وہاں ایسے ایسے افعال کا کیا اثر بس لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ (اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں) کے قائل ہوگئے اور اسلام کامل ہوگیا، نہ کسی فعل سے اس میں نقصان آتا ہے نہ کسی عقیدہ سے اس میں خلل آتا ہے اس کے لئے ایک حدیث یاد کر رکھی ہے مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ فَقَدْ دَخَلَ الجنة (جس نے لا الٰہ الا اللہ کہہ لیا یقیناً وہ جنت میں داخل ہوگا) سبحان اللہ اچھا ست نکالا کہ لا الٰہ الا اللہ کہہ لیا بس کافی ہے اب اور اعمال کی کیا ضرورت۔ بے شک حدیث صحیح ہے مگر جو مطلب آپ سمجھے وہ اس کا مطلب ہی نہیں اس کا مطلب ایک دیہاتی مثال میں سمجھئے۔ ایک شخص ایک عورت سے نکاح کرلے قاضی پوچھے تم نے قبول کی وہ کہے قبول کی لیجئے نکاح ہوگیا، یہ میاں یوں سمجھے کہ عورت ہاتھ آئی خوب چین کریں گے یہ خبر نہ تھی کہ تھوڑے دنوں میں لدنا پڑے گا جس کی حقیقت حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے کسی کے پوچھنے پر خوب فرمایا ہے سُرُوْرُ شَهْرٍ ایک مہینہ کی خوشی پھر پوچھا ثُمَّ مَاذَا یعنی پھر کیا ہوتا ہے فرمایا لُزُوْمُ مَهْرٍ یعنی مہر لازم آجاتا ہے، پوچھا ثُمَّ مَاذا (پھر کیا) فرمایا غُمُوْمُ دَهْرٍ یعنی تمام زمانہ کے رنج وغم۔ پھر پوچھا ثُمَّ مَاذَا (پھر کب) فرمایا كُسُوْرُ ظَهْرٍ یعنی کمر ٹوٹ جاتی ہے غرض میاں ایک ماہ نوشہ رہے خوب عزت رہی دعوتیں ہوا کیں اس کے بعد ماں باپ نے الگ کردیا اب گھر کرنے بیٹھے اب وہ غموم دھر میں مبتلا ہوئے الگ ہوتے وقت ماں باپ نے ایک ماہ کا غلہ وغیرہ دے دیا تھا مہینہ بھر تک وہ کھاتے رہے جب ختم ہوگیا اب بیوی نے کہنا شروع کیا کہ غلہ لاؤ، گھی لاؤ کپڑا بناؤ وغیرہ وغیرہ یہ لاؤ وہ لاؤ تو آپ کہتے ہیں بی تو پاگل ہوگئی ہے کیسی لکڑی، کیسا غلہ، کیسا گھی، میں نے ان چیزوں کی کہاں ذمہ داری کی ہے اس نے کہا آخر تم نے ایجاب قاضی پر کہا نہ تھا کہ میں نے قبول کی وہ کہتے ہیں کہ پھر میں نے یہ تو نہ کہا تھا کہ میں نے غلہ وغیرہ بھی قبول کیا میں نے تو فقط تجھے قبول کیا تھا نہ میں نے آٹا قبول کیا نہ لکڑی قبول کی، غرض جھگڑا اس قدر بڑھا کہ محلہ کے عقلاء فیصلہ کرنے کے لئے جمع کئے گئے ان میں آپ بھی ہوں اب آپ بتائیے کہ کیا فیصلہ کریں گے کیا یہ فیصلہ نہ کریں گے کہ روٹی کپڑا سب اس سے دلائیں گے اور کہیں گے کہ ارے احمق بیوی کا قبول کرنا اس کی تمام ضروریات کا قبول کرلینا ہے اس کے لئے کسی مستقل معاہدہ کی ضرورت نہیں۔

بس لا الہ الا اللہ کے بھی یہی معنی ہیں اب ذرا سنبھل کر کہیے گا بس اسی مختصر کلمہ نے تمام باتوں کو لے لیا ہے لہٰذا جب وضع خلاف شرع ہوگی تو ایک جز لا الہ الا اللہ کا چھوٹا تو مولوی اہل محلہ کے مثل ہیں اور یہ اسی نادان کے مثل ہے جو کہتا ہے کہ میں نے تو لا الہ الا اللہ کہا تھا یہ کہاں کا جھگڑا نکالا کہ وضع خلاف شرع نہ رکھو داڑھی مت منڈواؤ یا مت کٹاؤ مونچھیں مت بڑھاؤ نماز پڑھو روزہ رکھو۔

اب تمہارے ہی اجلاس میں فیصلہ کراتا ہوں کہ کیا مثال مذکورہ کی طرح اس شخص کا فقط لا الہ الا اللہ کو کافی سمجھنا صحیح ہے ذرا بھی عقل سلیم ہوگی تو کون کہے گا کہ صحیح ہے یہ تو اسلام کا ست نکالا کہ لا الہ الا اللہ کہہ لو بس کافی ہے۔ بس یہ اسلام کی حقیقت بتادی اسی سے کہتے ہیں کہ اسلام بہت وسیع ہے۔

یہ تو امت جدیدہ کا مذاق تھا اب قدیم مذاق والوں کو لیجئے ان میں جو بڑے دیندار کہلاتے ہیں انہوں نے یہ کہا کہ نماز روزہ کرلو حور و قصور کا اعتقاد کرلو بس اسلام اس میں منحصر ہوگیا آگے رہے معاملات۔ جذبات۔ اخلاق۔ تہذیب۔ معاشرت۔ تمدن اس کو سمجھا کہ اسلام میں تو ہے نہیں پھر یا تو ان کو مطروح کردیا اور اگر کسی نے ان کا اہتمام کرنا چاہا تھا تو بس غیر قوموں سے لینا شروع کردیا افسوس ہمارے گھر کیا نہ تھا جو دوسروں سے دریوزہ گری کی گئی ہماری آپ کی بس یہ مثال ہے۔

یک سبد پرناں ترا بر فرق سر تو ہمی جوئی لب ناں در بدر۔

ایک ٹوکرا روٹیوں کا سر پر ہے مگر بھیک مانگتے پھرتے ہیں اتنی اتنی روٹیاں ہیں کہ اوروں کو بھی دے سکتے ہو آج جو متمدن قومیں ہیں ان کا اعتراف ہے کہ ہم نے سب اسلام سے سیکھا ہے مگر مسلمان ایسے بے خبر ہیں کہ اپنا گھر چھوڑ کر پرائے در پر جاتے ہیں اسی مثال مذکور کا تتمہ ہے۔

تابزانوئی میان جوئے آب وزعطش وز جوع گشتستی خراب

گھٹنے تک پانی ہے مگر اس سے غافل ہیں اور پیاس کے مارے غل مچا رکھا ہے، بس یہ حالت ہے اسلام کی حقیقت سمجھنے والوں کی سو اس آیت میں حق تعالیٰ نے اسلام کی حقیقت بیان فرمائی ہے کہ اسلام کیا چیز ہے اپنے کو خدا کے سپرد کردینا جس کا حاصل وہی تعلق مع اللہ نکلا ہے جو تمہید میں بیان کیا گیا ہے ہاں ایک غلطی اور ان نئے محققین کی حقیقت اسلام کے متعلق یاد آئی۔ ایک صاحب کہنے لگے کہ مسلمان ہونے کے لئے صرف توحید کافی ہے اعتقاد

رسالت کی ضرورت نہیں۔ یہ زہر آلود عقیدہ ایک قریب کے ضلع سے نکلا ہے میں نے کہا اگر توحید کا عقیدہ کافی بھی تسلیم کر لیا جاوے تب بھی وہ عقیدہ توحید کا بدون اعتقاد رسالت متحقق نہیں ہوتا وجہ یہ کہ توحید کی حقیقت خدا کو ذات وصفات میں کامل سمجھنا ہے۔ اور منجملہ صفات باری تعالیٰ صدق بھی ہے اگر کوئی (معاذ اللہ عنہا) خدا کو جھوٹا سمجھے تو وہ بوجہ انکار صفت کمال صدق کے توحید کا منکر ہے ایک مقدمہ تو یہ ہوا اور دوسرا مقدمہ یہ کہ خدا نے ہمیں خبر دی ہے کہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) تو جس نے دل سے اس کا یقین نہ کیا اس نے خدا کو جھوٹا جانا تو وہ توحید کا بھی منکر ہوا۔ جواب کے واسطے دس برس کی مہلت ہے اس کے بعد ان صاحب کی حالت اچھی ہوگی الحمدللہ بات یہ ہے کہ اونٹ جب تک پہاڑ تلے سے نہ نکلے اپنے کو بہت بڑا سمجھتا ہے تو اصل میں انہیں کوئی ان کے مذاق کا جواب دینے والا نہیں ملا تھا اس لئے ان کے دماغ میں یہ سمائی تھی کہ میں بڑا ہوں گو ایسے بڑے جیسے کے آٹھ آٹھ بکتے ہوں بس اتنا فرق ہے کہ وہ تر بڑے ہیں یہ خشک بڑے ہیں بلکہ ایک شخص کا قول ہے کہ آج کل کے بڑے بڑیاں ہیں بڑے نہیں، خیر یہ تو لطیفے تھے۔

دنیوی بڑائی کی خرابی:

اصل میں بڑائی میں بڑی خرابی ہے مگر افسوس آج کل کے محقق اس کی تعلیم دیتے ہیں خود داری جس کا نام ہے یہ بھی وہی بڑائی ہے افسوس یہ اسی شاخ کو تازہ کر رہے ہیں جس کی جڑ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کاٹی ہے، جانتے ہو خود داری کا بانی کون ہے شیطان ہے جس نے آٹھ لاکھ برس تک عبادت کر کے جب اس کو ارشاد ہوا اُسْجُدُوْا لِاٰدَمَ آدم کو سجدہ کرو تو یہ قصہ ہوا کہ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ اَبٰی وَاسْتَکْبَرَ (بجز ابلیس کے سب نے سجدہ کیا اس نے انکار کیا اور اپنے آپ کو بڑا سمجھا) سب نے تو سجدہ کر لیا اور یہ کہتا ہے میں نہیں کرتا اس واسطے کہ مجھے عنصر اعلیٰ یعنی آگ سے بنایا ہے اور آدم کو عنصر ادنیٰ یعنی خاک سے بنایا ہے۔ غرض یہ اصول خود داری اسی نے ایجاد کئے ہیں جو اس کے وارثوں کو میراث میں پہنچتے ہیں اور انبیاء علیہم السلام کے وارثوں میں یہ بات کہاں سے آتی ان کی یہ میراث ہے مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰہِ رَفَعَهُ اللّٰہُ (مشکوۃ المصابیح: ۵۱۱۹) (جو شخص اللہ کے لئے تواضع کرے تو اللہ تعالیٰ اس کا مرتبہ بلند کرتے ہیں) اپنے کو بلند نہیں سمجھتے اور واقعی اگر کوئی بڑائی کرنے بھی لگے تو ہماری بڑائی ہی کیا۔

زخاک آفریدت خداوند پاک   پس اے بندہ افتادگی کن چو خاک
ترابا چنیں تندی وسرکشی   نہ پندارم از خاکی یا آتشیؔ

(اللہ تعالیٰ نے تجھ کو خاک سے پیدا کیا ہے پس اے بندہ خاکساری اختیار کر تجھ کو ایسی تندی وسرکشی کے ساتھ میں نہیں سمجھتا کہ تو خاکی ہے یا آتشی)

دنیا میں تین چیزیں ایسی ہیں جن پر آدمی بڑائی کرسکتا ہے ایک مال۔ دوسرے جمال تیسرے کمال۔ بس یہ تین چیزیں ہیں بڑائی کی۔ سو مال پر تو کیا بڑائی کسی چور کو ذرا ہمت ہو جاوے ایک دن میں ساری بڑائی چھکڑوں پر لاد کر لے کر چل دیئے۔ اب رہا جمال، خدا بھلا کرے بخار کا کہ دو ہفتہ میں چڑیل بھوت کی شکل بنا دیتا ہے پھر اپنی صورت سے آپ ہی شرم آنے لگتی ہے۔ رہا کمال تو تمام کمالات کا مدار ایک دماغ پر ہے دماغ پر کوئی آفت آجاوے لیجئے وہ بھی گیا، یہ حشر ہے بڑائی کا، یہ بڑائی عقل کے بھی خلاف ہے یہ تو دنیا کی بڑائی تھی۔

دین کی بڑائی کی خرابی:

بعض کو دین کی بڑائی کا زعم ہو جاتا ہے تو یہ حالت ہوتی ہے کہ قرآن وحدیث کا ترجمہ دیکھا اور اجتہاد شروع کر دیا ترجمہ سے بدوں حقیقت شناسی کے اجتہاد کرنا ایسا ہی ہے، جیسا کسی شخص نے گلستاں کا لفظی ترجمہ دیکھ کر اجتہاد کیا تھا اس میں یہ شعر دیکھا تھا کہ

دوست آں باشد کہ گیرد دوست دست   در پریشاں حال ودر ماندگی

(دوست وہ ہے جو پریشانی اور بدحالی میں دوست کی مدد کرے۔) ان کو ایک جگہ ان کے دوست پٹتے ہوئے مل گئے مگر وہ بھی کچھ کچھ ہاتھ پاؤں چلا رہے تھے آپ نے اس دوست کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے بس خوب پٹے اس نے بعد میں پوچھا یہ کیا حرکت تھی؟ تو آپ فرماتے ہیں ع دوست آں باشد کہ گیرد دوست دوست،، دست کا ترجمہ دیکھ لیا غنیمت ہے ورنہ دوست کے پاخانہ کا دست اٹھ کرلاتا ایسے ہی اجتہاد سے ان لوگوں نے دین کی گت بنائی ہے۔

ایک دوسرے مجتہد صاحب نے فخرا بیان کیا کہ جس روز پرچے آئے تھے امتحان کے ہم نے تو نماز میں قصر کیا تھا کہ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ اِنْ خِفْتُمْ تم پر گناہ نہیں اگر تم نماز میں قصر کرو جب کہ تمہیں خوف ہو ہم کو جواب کے صحیح نہ لکھے جانے کا بڑا خوف تھا اس لئے ہم نے قصر کیا۔ ایک دوست وہاں موجود تھے انہوں نے پوچھا کہ کیوں صاحب جو معاہدہ مشروط ہو دو شرطوں کے ساتھ وہ کیا ایک شرط کے تحقق سے مکمل ہو جاتا ہے انہوں نے کہا نہیں

انہوں نے کہا کہ آپ نے قرآن کی آیت پوری نہیں پڑھی لَیْسَ عَلَیْکُمْ سے پہلے اِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ بھی ہے کہ جب تم زمین میں سفر کرو۔ خیر خوف تھا مگر آپ نے سفر کون سا کیا تھا۔ بس ہو چکا اجتہاد آپ نے نماز کھوئی اس کی قضا کیجئے تھے بھلے مانس اقرار غلطی کا کیا تو یہ حالت ہے مجتہدوں کی۔ ایک صاحب نے کہہ دیا کہ سود حرام ہی نہیں اور لَا تَاْکُلُوْا الرِّبٰوا میں یہ لفظ ربٰوا بکسر را نہیں ہے بلکہ ربا بضم را ہے جس کے معنی لوٹ مار کرنے اور اچک لینے کے ہیں پس جو مال لوٹ کر لیا جائے گا وہ حرام ہوگا ان مجتہد صاحب کو بھی خبر نہیں کہ کہاں ربا جو ربودن فارسی سے مشتق ہے اور کہاں عربی قرآن اگر ایسے ہی مجتہدین ہوں گے تو پھر دین کا خدا حافظ ہے۔

گر بہ میر و سگ وزیر و موش را دیواں کنند   ایں چنیں ارکان دولت ملک را ویراں کنند

(یعنی اگر نااہلوں کے ہاتھ میں حکومت آجائے تو ملک ویران ہو جاتے) اگر ان کے قبضہ میں اسلام ہوتا تو خدا جانے یہ کیا گت بناتے مگر وہاں تو ارشاد ہے اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحَافِظُوْنَ ۔ (ہم نے ہی قرآن کو نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں) خدا تعالیٰ نے خود حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے اور واقعی عجیب طرح حفاظت فرمائی ہے کہ ایسے بے سرو سامانی کی حالت میں علماء تیار ہوتے ہیں کہ آج کوئی چیز علم دین کی طرف رغبت دلانے والی نہیں ہے یہ ادھر ہی کی حفاظت ہے کہ باوجود اس ناقدری کے پھر بھی اللہ کے نیک بندے اس طرف متوجہ ہوتے ہیں پس جب وہ خود محافظ ہیں تو پھر بھلا کون دین کو مٹا سکتا ہے۔

چراغے کہ ایزد برفروزد   ہر آنکس تف زند ریشش بسوزد

(جس چراغ کو حق تعالیٰ روشن کریں جو شخص اس پر پھونک مارے اس کی ڈاڑھی جل جائے) اگر کوئی کہے کہ ہمارے پاس ریش ہی نہیں تو ہم اس کیلئے کہیں گے۔

ہر آنکس تف زند رویش بسوزد (جو اس پر پھونک مارے اس کا چہرہ جھلس جائے) یہ خرابیاں ہیں اپنے کو دین میں بڑا سمجھنے کی۔ اور کسی اخبار میں چھپا تھا کہ زمانہ مقتضی ہے کہ مذہب سب روئے زمین کے لوگوں کا ایک ہو۔ یہ مختلف فرقے آریہ، عیسائی، شیعہ، سنی کچھ نہ رہیں پھر وہ کونسا مذہب ہو سو اگر مذاہب موجودہ میں سے کوئی مذہب تجویز کیا جائے تب تو ترجیح بلا مرجح لازم آتی ہے اس لئے نہ تو سب مسلمان ہو سکتے ہیں، نہ ہندو، نہ عیسائی کیونکہ اس میں تو پھر وہی اختلاف ہوگا پس اس کی یہ صورت ہو سکتی ہے کہ تھوڑا تھوڑا رعایت تمام مذاہب کی رکھو اس طرح سے کہ اصل مذہب تو توحید کو قرار دو اور باقی سب مذاہب کے اجزاء کو فروع قرار دے کر ہر ایک کو اس کی حالت پر رہنے دو اور کسی

سے تعرض نہ کرو اگر ایسا ہو جائے تو اچھا ہے بس پھر سب مل جل کر رہو یہ رائیں ہیں۔

میں کہتا ہوں گورنمنٹ کے قوانین میں کیوں دست اندازی نہیں کرتے۔ بس یہ اللہ میاں ہی کا قانون ہے تختہ مشق بنانے کے لئے اور یہ تو ان کی حالت ہے جو بددین ہیں اور جو دیندار ہیں ان میں بعضوں کو یہ خبط ہو گیا کہ دو چار کتابوں کے ترجمے دیکھ لئے مجتہد ہو گئے تصوف کے رسالے دیکھ لئے اور شیخ کامل بن گئے۔ طب احسانی دیکھ لی مطب کرنے لگے، طبیب حاذق بن گئے۔ اب شیخ کی کلیات بھی لغویات اور واہیات ہو گئیں مسہل کا ایک نسخہ یاد کر لیا چاہے جس خلط کا غلبہ ہو وہی ایک نسخہ دے دیا مریض چاہے مرے چاہے جئے۔ جیسے ایک سیاح کا قصہ سنا ہے کہ اس نے ایک میم کو دوا دی تھی۔ پولیس کمشنر بمبئی کی میم تھی آدھے سر کے درد کی شکایت تھی کس طرح اچھا نہ ہوتا تھا ان سیاح صاحب نے انعام کے لالچ میں اسے اپنے پاس سے بوٹی دی خدا کی شان کہ وہ اچھی ہو گئی اب یہ گئے انعام مانگنے اس نے پوچھا کہ یہ کیا بوٹی تھی جو تم نے دے دی تھی اس کی کیا خاصیت ہے اور کیا مزاج ہے اور اس کا کیا کیا نفع ہے اور اگر نقصان کرے تو کیا تدارک ہے انہوں نے کہا کہ یہ تو مجھے معلوم نہیں اس نے کہا ایسی نامعلوم چیز سے تم نے ہمارا علاج کیوں کیا۔ اگر ہم مر جاتے یا ہمارا مرض بڑھ جاتا تو کیا ہوتا اس کا چالان کرا دیا مقدمہ چلا اور وہ جیل خانہ گیا۔ بس ایسے مجتہدوں کو بھی اگر ایسی سزا ملا کرے تو آنکھیں کھل جائیں۔ مولویوں کے قال یقال سے یہ باز نہیں رہ سکتے اگر مولوی کہیں بھی تو گالیاں کھائیں غرض اس بڑائی کی بدولت ان اجتہادات کی نوبت پہنچی اور ان اجتہادات کی بدولت ان لوگوں نے اسلام کی حقیقت سمجھنے میں غلطی کی بعض جو مدعی اجتہاد بھی نہیں انہوں نے اسلام کے احکام وضوابط اور ان کا اغراض ورسوم کے ساتھ مزاحم ہونا دیکھ کر اس کی حقیقت کا عجیب خلاصہ نکالا چنانچہ ایک شخص مجھ سے کہتے تھے کہ اسلام کی تعلیم کا یہ خلاصہ ہے کہ نہ خوشی میں ہنسو نہ رنج میں روؤ تو یہ معنی اسلام کے سمجھے اور ان کو اسلام بڑا سخت اور خونخوار نظر آنے گا۔

حقیقت اسلام:

غرض افسوس اسلام کو ان میں سے کسی نے بھی نہ سمجھا سو سمجھ لو کہ اسلام تعلق مع اللہ کا نام ہے اور مَنْ اَسْلَمَ (جس نے سپرد کیا) سے یہی مقصود ہے بس اس حقیقت پر اگر مفصل نظر کرو تو اب معلوم ہو گا کہ اسلام کیسی حسین چیز ہے اسلام وہ چیز ہے کہ

زفرق تابقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجاست

(سر سے پیر تک جس جگہ نظر کرتا ہوں کرشمہ دامن دل کو کھینچتا ہے کہ یہی جگہ محبوبیت کی ہے۔) خدا کی قسم جس پہلو سے لو نہایت راحت بخش اور مصالح کی رعایت کرنے والا مذہب ہے میرے پاس الفاظ نہیں کہ میں اس کی تعریف کرسکوں۔

قلم بشکن سیاہی ریز و کاغذ سوز و دم درکش   حسن ایں قصہ عشق است در دفتر نمی گنجد

(قلم توڑ سیاہی کو پھینک کاغذ کو جلا اور خاموش رہ اے حسن یہ عشق کا قصہ ہے دفتر میں نہیں سما سکتا) کسی محقق کے پاس چند روز رہ لو اس وقت آنکھیں کھلیں کہ اسلام کیا چیز ہے! اسلام وہ مذہب ہے جس نے ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں تک کی تعیم دی ہے کہ جب تین آدمی کسی مجلس میں بیٹھے ہوں تو دو آدمی آپس میں سرگوشی نہ کریں کہ تیسرے کی دلشکنی ہوگی وہ سمجھے گا کہ بس مجھ سے مخفی رکھتا ہے ہاں جب چار ہو جائیں تو کچھ حرج نہیں کہ وہ دونوں بھی سرگوشی کرسکتے ہیں اور ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ شاید دوسرے سے مخفی رکھتا ہو اور لیجئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک صحابی حاضر ہوئے آواز دی آپ نے پوچھا مَنْ کون ہے انہوں نے کہا اَنَا میں ہوں آپ نے فرمایا اَنَا اَنَا میں میں یہ بھی کوئی جواب ہوا۔ کتنی معقول بات فرمائی پہلی آواز سے آپ نے نہیں پہچانا۔ اس لئے پوچھا کہ کون ہے اس کے جواب میں میں ہوں کہنا غلطی ہے اس واسطے کہ اس سے مزید پتہ نہ معلوم ہوا جو آواز پہلے معلوئی ہوئی تھی وہی اب بھی معلوم ہوئی اگر آواز سے پہچانتے تو پہلے ہی پہچان لیتے اور یہاں تک تعلیم فرمائی کہ قانون بتلا دیا جب کسی کے گھر جاؤ تو پہلے دروازہ پر اجازت لے لو کہ السلام علیکم فلاں حاضر ہوا اگر جواب نہ آوے پھر اجازت مانگو پھر کہو تیسری بار اجازت مانگو تین دفعہ کے بعد بھی اگر کوئی نہ آوے نہ جواب دے تو لوٹ جاؤ شکایت مت کرو برا مت مانو کتنی اچھی تعلیم فرمائی ہے باب اخلاق کا خلاصہ یہ ہے۔

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد   کسے را با کسے کارے نباشد

(وہ جگہ بہشت ہے جہاں کوئی تکلیف نہ ہو کسی کو کسی سے تنگی ہو۔)

مصرعہ ثانی کا یہ مطلب نہیں کہ ایک کو دوسرے سے ہمدردی نہ ہو بلکہ مقصود یہ ہے کہ ایک کو دوسرے سے ایذا نہ ہو۔ اسباب ایذا کو نہایت اہتمام سے رفع کیا گیا ہے اس کا نہایت اہتمام کیا ہے کہ کسی کو کسی سے تنگی نہ ہو اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل کرکے بھی دکھلا دیا حالانکہ آپ پر کسی کو جان تصدق کرنے میں بھی دریغ نہ تھا مگر پھر بھی آپ نے معاملات میں خدام کو کس قدر آزاد رکھا تھا کہ حضرت بریرہؓ پہلے ایک باندی تھیں حالت رق میں ان کا نکاح کردیا گیا تھا اس کے بعد یہ آزاد کی

گئیں تو قانون شرعی یہ ہے کہ جو کوئی باندی آزاد ہو جائے تو اسے اپنے شوہر کے ساتھ رہنے نہ، رہنے میں اختیار ہوتا ہے تو بریرہؓ نے آزاد ہوتے ہی ان شوہر کے ساتھ رہنے سے انکار کر دیا ان کے شوہر انہیں بہت چاہتے تھے انہیں ان کی جدائی ناگوار ہوئی بیچارے روتے پھرتے تھے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی حالت جب خراب دیکھی حضرت بریرہؓ سے فرمایا کہ تم مغیث کے ساتھ نکاح کر لو تو اچھا ہے تو حضرت بریرہؓ سوال کرتی ہیں کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ حکم ہے یا سفارش؟ آپؐ نے فرمایا کہ سفارش ہے تو بریرہؓ کہتی ہیں میں نہیں قبول کرتی آپ خاموش ہو رہے ناخوش نہیں ہوئے۔

ذرا بڑے لوگ غور سے دیکھیں کہ سفارش کا کیا درجہ ہے آج کسی پیر صاحب کسی مولوی صاحب سے بریرہؓ کی یہی گفتگو کر کے دیکھ لیجئے کتنا ناخوش ہوں گے افسوس کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی بڑھ گئے کہاں کی مولویت کہاں کی پیری؟

آزادی کے غلط معنی:

اب تو ہر امر میں اپنا اثر ڈال کر دوسرے کو مجبور کرنا چاہتے ہیں ہم نے ریل میں ایک مدعی آزادی کو دیکھا کہ گھسی ہوئی دونی قلی کو دی اس نے کہا کہ بدل دیجئے انکار کر دیا اس نے کہا کہ یہ نہیں چلے گی کہا کہ چلا دینا اس نے کہا کیوں کر چلا دوں کہا جس طرح ہم نے چلا دی ہے۔ ارے تم تو ظالم تھے اس واسطے تم نے چلالی وہ غریب تمہاری طرح کیسے چلا سکتا ہے، وہ بیچارہ روتا ہوا چلا گیا۔ یہ کیا تعلیم ہے کیا تہذیب ہے تم معاشرت میں جن کی حرص کرتے ہو وہ تو ایسا نہیں کرتے کہ خواہ مخواہ کسی غریب پر اس طرح کا ظلم کریں۔ کیا یہی معنی ہیں آزادی کے کہ ہم پر تو کسی کا بوجھ نہ پڑے اصل آزادی وہی ہے جو اسلام نے تعلیم فرمائی ہے جس کا خلاصہ ہے۔

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد

بہشت وہ جگہ جہاں کسی قسم کی تکلیف نہیں۔

ان واقعات سے بڑھ کر ایک اور قصہ مسلم شریف میں ہے کہ ایک صحابی نے شوربا پکایا تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی آپ نے فرمایا کہ بھئی عائشہؓ بھی چلیں گی انہوں نے کہا نہیں فقط آپ۔ آپؐ نے فرمایا کہ پھر میں بھی نہیں چلتا انہوں نے کہا نہ سہی وہ چلے گئے دوبارہ پھر آئے پھر یہی گفتگو ہوئی پھر چلے گئے۔ تیسری مرتبہ میں انہوں نے حضرت عائشہؓ کی بھی دعوت منظور کی، سبحان اللہ کیا آزادی ہے کیسا بے تکلف کہہ دیا کہ نہ سہی اور جب وہ اس قدر آزاد تھے تو بعد میں جو

انہوں نے حضرت عائشہؓ کی دعوت بھی کردی تھی تو وہ اس وقت ان کی رائے بدل گئی تھی جبر کی کوئی بات نہ تھی اللہ اکبر۔ یہ ہے آزادی کوئی ایسا کر کے تو دکھلا دے۔ ہمارے استاد زادہ ہیں حکیم معین الدین صاحب ان کے یہاں مولانا گنگوہیؒ تشریف لائے اس روز ان کے گھر میں سناٹا تھا عرض کیا میرے یہاں تو آج کچھ ہے نہیں اگر آپ فرمائیں تو کسی اور کو دعوت کی ترغیب دوں۔ مولانا نے فرمایا کہ میں تمہارا مہمان ہوں۔ تمہارے گھر فاقہ ہے تو میں بھی فاقہ کروں گا یہ ہیں متبع سنت وہ تھوڑا ہی کہ دو چار اختلافی مسئلوں میں شور کردیا بس متبع سنت ہوگئے مولانا کی برکت سے شام کے وقت ایک شخص آیا حکیم صاحب کو کچھ روپے نذر دے گیا اب کیا تھا مولانا نے فرمایا بکھیڑا نہ کرنا حکیم صاحب نے عرض کیا واہ فاقہ کے بعد بھی بکھیڑا نہ ہو۔ تکلف کو کھانا تیار کرایا۔ حضرت! کیا یے آزار زندگی ہے گاڑھے کے کپڑے ہیں اس میں بھی راضی ہیں دوشالہ ہے تو اس میں بھی خوش ہیں اور اصلی آزادی تو اہل اللہ میں ہے مگر دنیاداروں میں بھی پورانی وضع میں بہ نسبت نئی وضع کے پھر کسی قدر آزادی ہے جو جی چاہے پہن لیجئے آج کل اگر کوٹ پہنیں تو لنگی فیشن کے خلاف، لنگی باندھیں تو کوٹ فیشن کے بالکل خلاف بخلاف پورانی وضع کے کہ

لنگے زیر و لنگے بالا (ایک تہ بند اوپر اور ایک نیچے) سب کھپتا ہے پس آزادی تو یہ ہے اور وہ تو جکڑ بندی ہے خدا جانے اس کا نام آزادی کس نے رکھ ہے جب فیشن ہے تو آزادی کہاں وہ تو اچھی خاصی قید ہے۔

خود بینی و خود رائی:

غرض اسلام کی حقیقت اور اس کی تعلیمات کو دیکھئے تو پھر اس کا حسن و جمال معلوم ہوا اور جو لوگ اس سے کورے ہیں انہوں نے حقیقت ہی نہیں سمجھی سو اسلام کے معنی ہیں اپنے کو خدا کے سپرد کر دینا اور جب سپردگی ٹھیری تو ایک ذرہ برابر جز میں بھی اگر خود رائی ہوگی تو سپردگی کہاں رہے گی۔ اب بالکل سمجھ میں آجائے گا کہ پاجامہ ٹخنوں سے نیچے پہننا اسلام کے خلاف کیوں ہے اور ڈاڑھی کٹانا یا منڈانا اسلام کے خلاف کیوں ہے نہ پاجامہ کرتا ٹوپی کی خاص اوضاع اسلام کے خلاف کیوں ہے۔

اور اس سپردگی کی ایک مثال ہے کہ کوئی مقدمہ ایک وکیل کے سپرد کر دیتے ہیں یا جج کے سپرد کر دیتے ہیں اس عارضی سپردگی کا یہ اثر ہے کہ پھر اس میں کوئی رائے نہیں دیتا۔ جو وہ کہے ماننا ہے جو وہ کرے کرتا ہے اسی طرح خدا کے سپرد کرنے کے بعد بھی رائے زنی نہ کرنا چاہیے یہ ہے تفویض الی اللہ اسی کو عارف شیرازی کہتے ہیں۔

فکر خود و رائے خود در عالم رندی نیست   کفرست دریں مذہب خود بینی و خود رائی

(عالم عاشقی میں اپنی فکر اور اپنی رائے بالکل بے کار ہے اس طریق میں خود بینی اور خود رائی کفر ہے)

اس زمانہ میں دونوں مرض مرض عام ہیں عام طور سے اسلامی مسائل میں رائے دیتے ہیں کہ ہمارے خیال میں یوں ہونا چاہیے ارے تم ہو کیا چیز؟ تمہاری ایسی ہی مثال ہے کہ ایک کاغذ کامل ہے اس میں سیکڑوں آدمی نوکر ہیں اس میں حوض بھی ہوتے ہیں اور حوض میں پانی بھی ہوتا ہے جدید تحقیقات سے یہ ثابت ہوا ہے کہ پانی کے ایک قطرہ میں لاکھوں کیڑے ہوتے ہیں جو خوردبین سے نظر آتے ہیں ان کیڑوں میں سے ایک کیڑا آپ سے یہ کہے کہ میری رائے میں آپ اس کلرک کے بجائے فلاں کلرک کو رکھ لیجئے آپ بہت ہنسیں گے کہ وہ کیڑا جو کہ پانی کے ایک قطرہ سے بھی لاکھوں حصہ چھوٹا ہے ہمیں رائے دیتا ہے اسے کیا خبر کہ کیا ہونا چاہیے جو اس کیڑے کی رائے آپ کے کاغذ کے کارخانہ میں وقعت رکھتی ہے۔ واللہ خدا کے کارخانہ میں آپ کی رائے کا بھی وہی درجہ ہے بلکہ اس سے بھی بدرجہا زیادہ ذلیل و خوار ہے واللہ بغاوت عظیمہ ہے کہ ہمارے خیال میں۔ ہمارا خیال ہی کیا چیز ہے شرم نہیں آتی کہ خدا کو رائے دیتے ہو۔ حالانکہ تم خدا کے مقابلہ میں اتنے بھی نہیں جتنا تمہارے مقابلہ میں وہ کیڑا ہے، کیونکہ کمالات باری غیر متناہی ہیں اور تم متناہی اور وہ کیڑا بھی مثل تمہارے متناہی۔ تو رائے ہماری کیا ہے؟

لطائف آیت:

حاصل یہ کہ سپرد کردینے کے بعد پھر رائے نہیں دی جایا کرتی۔ جس طرح مقدمہ وکیل کے سپرد کردینے کے بعد کوئی رائے نہیں دیتا اسی کو فرماتے ہیں اَسْلَمَ وَجْهَهٗ (جس نے اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کردیا) باقی ذات کو وَجْهَه سے کیوں تعبیر کیا۔

سو وجہ کہتے ہیں منہ کو عموماً مفسرین نے تو یہ لکھا ہے کہ یہاں تَسْمِیَةُ الْکُلِّ بِاسْمِ الْجُزْ ہے یعنی جز بول کر کل مراد لیا ہے۔

اور وجہ تخصیص یہ کہ وجہ تمام اعضاء میں اشرف تھا جب اشرف کو سپرد کردیا تو کل کو سپرد کردیا مگر ایک اس سے زیادہ بات لطیف ہے وہ یہ کہ پہچان چہرہ سے ہوتی ہے تو گویا تشخص میں زیادہ دخل چہرہ کو ہے پس وجہ سے تعبیر کرنا ذوات مشخصہ کو نہایت برمحل ہے یہ تو پرانے طالب علموں کے کام کی بات تھی۔

ایک بات تو تعلیم یافتہ لوگوں کے کام کی بھی سمجھ میں آئی کہ آج کل جو رائے دی جاتی ہے اس

کی قوت دماغ کے اندر ہے اور وجہ کو دماغ سے خاص تلبس ہے گویا دونوں متلازم ہیں۔ پس وجہ کو سپرد کرنا گویا دماغ کو سپرد کرنا ہے اور دماغ کے سپرد کرنے کے بعد جب دماغ ہی آپ کا نہ رہا تو رائے اور خیال آپ کا کہاں سے آیا تو یہ تعبیر مشیر ہے خود رائے کے قطع کردینے کی طرف۔

اگر کوئی کہے کہ کیا دماغ سے کام نہ لیں اسلام کے احکام تو سب دماغ ہی کے متعلق ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ اگر مقدمہ کسی بیرسٹر کے سپرد کردو تو اگر وہ گواہوں کی شناخت کے واسطے کہے تو کیا اس کو یہ جواب دوگے کہ ہم نے تو آپ کے سپرد کردیا جس چیز کو سپرد کردیا ہے اس میں اپنی رائے کا دخل مت دو باقی جتنے میں وہ خود دخل دینے کو کہے اس میں دخل دو پس اسی طرح یہاں بھی دماغ سے اتنا کام لو جتنا حکم ہے۔

اور یہ توجیہیں تو جب ہیں کہ وجہ کو ظاہری وجہ پر رکھا جائے اور اگر وجہ کو وجہ باطن پر محمول کیا جائے تو یہاں پر وجہ کے معنی قلب کے ہوں گے جیسے اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَنِیْ (میں اپنے قلب کو اس ذات کی طرف متوجہ کرتا ہوں جس نے مجھے پیدا کیا ہے) میں کہا گیا ہے کہ یہاں وجہ سے مراد چہرہ نہیں ہے کیوں کہ اس کو خدا کی طرف کرنے کے کیا معنی بلکہ یہاں مراد قلب ہے کہ میں نے پھیر دیا رخ قلب اپنا خدا کی طرف جس نے مجھے پیدا کیا تو یہ اَسْلَمَ وَجْھَہٗ کا بطن اور باطن تھا خلاصہ مجموعہ توجیہین کا یہ ہوا کہ اپنی ہر چیز کو خدا کے سپرد کردیا۔ اب سمجھئے کہ کبھی سپرد کرنا غرض کی وجہ سے ہوتا ہے اور کبھی خوف سے اور کبھی محبت سے محققین کا مذہب یہ ہے کہ اگر کسی نے غرض کی وجہ سے سپرد کیا کہ کام خوب نکلیں گے تو یہ شرک خفی ہے کہ کام بنانے کے لئے اطاعت کرتا ہے خدا کے لئے نہیں کرتا پس یہ تسلیم اس لئے کرو کہ اس کا حق ہے اس لئے وَھُوَ مُحْسِنٌ بھی فرمایا کہ سپرد کرنے میں اخلاص ہو اپنی کوئی غرض وابستہ نہ ہو۔ چنانچہ اسلام جب ہی مقبول ہے کہ اس میں ریاء نہ ہو کیونکہ یہ خلاف اخلاص ہے اس تفسیر کے بعد معلوم ہو گیا ہوگا کہ اسلام مطلوب کی یہی حقیقت ہے کہ خالصاً اللہ کے ہو جاؤ۔ آگے احسان کے متعلق بھی بہت مضمون تھا مگر اب وقت نہیں رہا انشاء اللہ پھر کسی موقعہ پر مستقلاً بیان کردیا جائے گا۔

اس کے بعد اب وعدہ ہے کہ فَلَہٗٓ اَجْرُہٗ عِنْدَ رَبِّہٖ اس کے لئے اس کا اجر ہے اس کے پروردگار کے نزدیک فَلَہٗ اَجْرُہٗ پر کفایت نہیں کی بلکہ عِنْدَ رَبِّہٖ بھی بڑھایا اس میں بڑا راز ہے ایک تو کسی مزدور سے کہے کہ کام کرو ہم تمہیں کھانا کھلائیں گے اور ایک یہ کہ اپنے پاس بٹھا کر کھانا کھلائیں گے اور وہ مزدور عاشق بھی ہو تو کس قدر شوق سے کام کرے گا اور کھانے سے کس قدر مسرور ہوگا عِنْدَ رَبِّہٖ اس لئے بڑھایا ہے۔

ہر کجا یوسف رخے باشد چوماہ   جنت ست آں گرچہ باشد قعر چاہ
ہر کجا دبر بود خرم نشیں،   فوق گردوں است نے قعر زمیں،

(جہاں محبوب ہو وہ جگہ جنت ہے اگرچہ کنواں ہی کیوں نہ ہو جس جگہ محبوب ہو خوش وخرم بیٹھ وہ جگہ مرتبہ میں آسمان سے بلند تر ہے نہ پست زمین)

سبحان اللہ کیا قرآن کی بلاغت ہے بس یہ شعر صادق آتا ہے

بہار عالم حسنش دل وجاں تازہ میدارد   برنگ اصحاب صورت رابوار باب معنی را

(اس کی عالم حسن کی بہار ظاہر پرستوں کے دل وجان کو رنگ سے اور حقیقت پرستوں کے دل وجان کو بو سے تازہ رکھتی ہے) یعنی دو مذاق کے لوگ ہیں ایک تو روٹ کھولے، جیسے ہم ہیں ان کو فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ، سے خوش کر دیا کہ گھبراؤ نہیں روٹیاں مل جائیں گے۔ ایک وہ ہیں جو دیدار کے مشتاق ہیں ان کے واسطے عِنْدَ رَبِّهٖ فرمایا کہ دعوت ہوگی اور ہمارے پاس ہوگی اور یہ سب انعام ہوا انعام کا کمال یہ ہے کہ منفعت عطا ہو اور مضرت سے بچایا جاوے منفعت کا مذکور تو ہو چکا آگے مضرت سے بچانے کا وعدہ ہے کہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ ان پر کوئی خوف نہیں، کوئی قید نہیں لگائی کہ کہاں خوف نہیں گو بعض جگہ سے آخرت کی قید معلوم ہوتی ہے کہ آخرت میں کوئی خوف نہیں لیکن یہاں کا اطلاق اگر بحالہ رکھا جاوے تو دنیا وآخرت دونوں کو عام رہے گا رہا یہ کہ دوسری آیات میں يَخَافُوْنَ سے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کو خوف ہے سو محققین نے جواب دیا ہے کہ لَا خوف علیہم فرمایا لا خوف بھم یا لھم نہیں فرمایا یعنی ان پر خوف کی چیز واقع نہ ہوگی گو خود وہ خوف کیا کریں اس کے بعد ارشاد ہے وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ اور نہ وہ غمگین ہوں گے خوف آئندہ کا اندیشہ ہے اور حزن واقعہ ماضیہ کے متعلق ہوتا ہے۔

تو حاصل یہ ہوا کہ نہ تو مستقبل میں کسی مضرت کا احتمال ہے نہ کسی ماضی کی فوت سے ان پر حزن ہے کہ ہائے یہ نہ ہوا، ہائے وہ نہ ہوا نہ دنیا میں نہ آخرت میں۔ خلاصہ یہ کہ ہر قسم کی مضرتوں سے محفوظ ہوں گے یہ اسلام پر انعام ہوا۔

اے صاحبو! اس تقریر سے اسلام کی حقیقت یا بلفظ دیگر متعلق مع اللہ کے برکات ظاہر ہو گئے پھر کوئی وجہ نہیں کہ آپ اسے نہ اختیار کریں یہ بہت بڑی ذلت ہے یا تو مجھے کوئی دولت اس کے مقابلہ میں ایسی بتا دیجئے جو اس سے بڑھ کر ہوتا کہ میں بھی آئندہ اسی کی ترغیب دیا کروں اور اگر ایسی کوئی دولت نہیں تو آپ بھی اس کے حاصل کرنے کی کوشش کیجئے ورنہ حجت تمام ہو چکی اب آپ کے پاس قیامت میں کوئی جواب نہیں ہے اب حق تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ ہمیں توفیق عمل کی عطا فرمائے۔ آمین فقط

الدوام علی الاسلام والاعتصام بالانعام

یہ وعظ ۶ رشوال المکرم ۱۳۴۵ھ بروز شنبہ بوقت صبح مسجد خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں ۳ گھنٹے ۴۵ منٹ تک ہوا۔

شرکائے وعظ کی تعداد تقریباً پچاس تھی۔

مولٰنا ظفر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے قلمبند فرمایا۔

اس وقت آپ کو ایسی چیز بتلانا چاہتا ہوں جو پریشانی کو لذیذ کر دے کیونکہ میں کہہ چکا کہ پریشانی تو جنت سے ورے ختم نہیں ہو سکتی۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ پریشانی کو لذیذ کر دیا جائے۔ اور یہ بھی ایک طرح پریشانی کا خاتمہ ہی ہے۔

تو میں ایسی بات بیان کرنا چاہتا ہوں جو تمام اعمال میں کام آئے اور غفلت سے روکتی رہے اور پریشانی کے وقت ہمت بندھائے اور وہ نئی بات نہیں بلکہ وہ وہی ہے جس کا نام قرآن میں کہیں تقویٰ ہے کہیں اعتصام بحبل اللہ ہے اور اسی کا نام ذکر نعمت بھی ہے۔

عباراتنا شتیٰ وحسنک واحدٌ وکل الی ذالک الجمال یشیرُ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونومن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیأت اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لآ الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولٰنا محمد اعبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ الٰہ واصحابہ وبارک وسلم

امابعد فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم. بسم اللہ الرحمن الرحیم.
یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ. وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْکُرُوْا نِعْمَتَ اللہِ عَلَیْکُمْ اِذْ کُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِہٖٓ اِخْوَانًا وَکُنْتُمْ عَلٰی شَفَا حُفْرَۃٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَکُمْ مِّنْھَا کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللہُ لَکُمْ اٰیٰتِہٖ لَعَلَّکُمْ تَھْتَدُوْنَ.

اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو جیسے ڈرنے کا حق ہے اور بجز اسلام کے اور کسی حالت پر جان مت دینا اور مضبوطی سے پکڑے رہو اللہ تعالیٰ کے سلسلہ کو اس طور پر کہ باہم متفق بھی رہو اور باہم نا اتفاقی مت کرو اور تم پر جو اللہ کا انعام ہے اس کو یاد کرو جب کہ تم دشمن تھے پس اللہ تعالیٰ نے تمہارے قلوب میں الفت ڈالدی سو تم خدا تعالیٰ کے انعام سے آپس میں بھائی بھائی ہوگئے اور تم دوزخ کے گڑھے کے کنارہ پر تھے سو اس سے خدا تعالیٰ نے تمہاری جان بچائی اسی طرح اللہ تعالیٰ تم لوگوں کو اپنے احکام بیان کر کے بتلاتے رہتے ہیں تا کہ تم لوگ راہ پر رہو۔

دستور العمل:

یہ آیتیں ہر چند کہ ایک خاص قصہ میں نازل ہوئی ہیں مگر مقصود اسی قصہ کے ساتھ مخصوص نہیں۔ بلکہ حق تعالیٰ نے ان میں ہم کو ایک دستور العمل بتلایا ہے تا کہ پھر ویسے قصے رونما نہ ہوں

اور دیگر آفات سے بھی محفوظ رہیں۔

قصہ یہ ہے کہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے پہلے آپ کے دو خاندانوں میں جن کا نام اوس وخزرج ہے، سخت عداوت تھی۔ جب مدینہ والے مسلمان ہو گئے تو یہ عداوت اتحاد سے اور وہ بغض ونفرت دوستی اور محبت سے مبدل ہو گئی اور جب سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ طیبہ میں رونق افروز ہوئے، اس وقت تو یہ اتحاد اور بھی زیادہ مستحکم ہو گیا اور یہ اتحاد یہود کو بہت ناگوار گذرا، اور ایک یہودی نے جو اوس وخزرج دونوں قبیلوں کے آدمیوں کو ایک جلسہ میں باہم شیر وشکر دیکھا تو حسد سے جل مرا اور اس نے ایک شخص کو اس کام پر مقرر کیا کہ اوس وخزرج میں جو وقائع وحروب ہوئے ہیں اور ان کے متعلق ہر قبیلے کے شعراء نے اشعار کہے ہیں، وہ اشعار انصار کی مجلسوں میں پڑھ دے چنانچہ اس میں وہ کسی قدر کامیاب ہو گیا کہ اشعار کا پڑھنا تھا۔ فوراً ایک آگ سی بھڑک اٹھی اور آپس میں تو تو میں میں ہونے لگی یہاں تک کہ لڑائی کا موقعہ اور وقت بھی مقرر ہو گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو اطلاع ہوئی آپ ان کے پاس تشریف لائے اور فرمایا یہ کیا اندھیر ہے کہ میرے سامنے ہی کہ میں تمہارے اندر زندہ موجود ہوں، پھر مسلمان ہو جانے اور باہم متفق ومتحد ہو جانے کے بعد یہ واہیات حرکت؟ کیا تم اسلام کے بعد پھر اسی حالت کفر کی طرف عود کرنا چاہتے ہو؟

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے سب کو تنبہ ہوا اور سمجھے کہ یہ شیطانی حرکت تھی اور ایک دوسرے کے گلے لگ کر بہت روئے اور توبہ کی جس سے حاسدین کی کوشش اکارت گئی وَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ ان لوگوں نے ان کے ساتھ برائی کرنا چاہا تھا، سو ہم نے ان ہی لوگوں کو ناکام کر دیا۔ کیونکہ اب پہلے سے بھی زیادہ اتحاد ہو گیا اور صحابہ کو معلوم ہو گیا کہ نفسانیت کی بناء پر باہم قتال وجدال عملی کفر ہے۔ اس لئے ہمیشہ کے واسطے اس کا دروازہ بند ہو گیا۔ (اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ میں جنگ ہوئی۔ اس کا منشاء جاہلیت کی عداوت نہ تھی بلکہ اس کا منشا محض دین تھا کہ ایک فریق دوسرے کو دین کے خلاف عمل کرنے والا سمجھتا تھا۔ اس لئے ہر ایک اپنے زعم میں دوسرے کو دین پر لانے کے لئے جنگ کر رہا تھا۔ گو ان میں ایک فریق واقع میں غلطی پر تھا مگر اپنے اجتہاد میں ہر ایک حق پر تھا اور خطاء اجتہادی معصیت نہیں بلکہ اس پر بھی اجر کا وعدہ ہے۔ ۱۲ جامع)

جس سے دشمنوں کی تدابیر الٹی ہو گئیں، اور صحابہ میں پہلے سے بھی زیادہ محبت والفت قائم ہو گئی۔ مضلین کو بھی بعض دفعہ دھوکہ ہو جاتا ہے کہ وہ ایک کام کرتے ہیں اہل حق کو ضرر پہنچانے کے لئے اور اس کا انجام خیر ہوتا ہے، بلکہ بعض دفعہ شیطان کو بھی جو رئیس المضلین ہے، دھوکہ ہو جاتا

ہے کہ وہ بندہ سے ایک معصیت کرانا چاہتا ہے تا کہ خدائے تعالیٰ سے اس کو بعد ہو جائے، مگر اس کو پہلے سے بھی زیادہ قرب بڑھ جاتا ہے۔ بعض دفعہ تو اس طرح کہ وہ گناہ کا ارادہ کر کے پھر خدا کے خوف سے رک جاتا ہے اور بعض دفعہ گناہ کا ارتکاب بھی ہو جاتا ہے مگر اس کے بعد ندامت اس درجہ غالب ہوتی ہے کہ بندہ روتے روتے ہلاکت کے قریب ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کو یہ عجز و نیاز پسند ہے وہ اس کو پہلے سے بھی زیادہ مقرب بنا لیتے ہیں پھر یہ شخص آئندہ کو اس گناہ کے دروازے بالکل بند کر دیتا ہے، جن کی وجہ سے شیطان کے دھوکہ میں آیا تھا۔ غرض شیاطین الانس والجن دونوں کو بعض دفعہ دھوکہ ہو جاتا ہے جیسا کہ اس یہودی کو ہوا۔ جس نے اوس وخزرج میں نفاق وشقاق ڈالنا چاہا تھا۔ اگر اسے یہ معلوم ہو جاتا کہ میری سعی کا یہ انجام ہوگا، تو وہ کبھی ایسا نہ کرتا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی کوشش کو صرف اسی واقعہ میں ناکام نہیں کیا بلکہ آئندہ کا بھی انتظام فرما دیا اور جدال وقتال کے دروازے بالکل بند کر دیئے۔

کفر عملی:

چنانچہ اس سے پہلے جو آیات ہیں ان میں اول تو اہل کتاب پر ملامت ہے۔ جنہوں نے یہ کارروائی کی تھی اور یہ ملامت بڑی بلاغت سے کی گئی ہے کہ اس فعل پر ملامت کرنے سے پہلے ان کو کفر پر ملامت کی گئی۔ جس کا حاصل یہ ہوا کہ چاہیے تو یہ تھا کہ تم خود بھی مسلمان ہو جاتے، نہ یہ کہ الٹا دوسروں کے گمراہ کرنے کی فکر میں لگ رہے ہو۔ پھر مسلمانوں کو خطاب اور فہمائش ہے کہ اہل کتاب کو تمہارا اتحاد و اتفاق، جو ذریعہ ہے دین و دنیا کی ترقی کا، سخت ناگوار ہے وہ تم کو آپس میں لڑانا چاہتے ہیں۔ اور اگر تم ان کا کہنا مانو گے تو وہ تم کو ایمان کے بعد کافر بنا دیں گے اور دشمنوں کے فریب میں آ کر اپنا نقصان کرنا اور ان کا دل خوش کرنا سخت جہالت وحماقت ہے۔ اس کے بعد ارشاد ہے **وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِىَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ؕ** اور بھلا تم کیسے کفر کر سکتے ہو حالانکہ اسباب مانعہ عن الکفر (کفر سے روکنے والے اسباب پورے طور پر جمع ہیں کہ تم کو اللہ تعالیٰ کے احکام پڑھ کر سنائے جاتے ہیں اور پھر تم میں اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی موجود ہیں اور یہ دونوں قوی ذرائع ہیں ایمان پر قائم رہنے کی۔ پس تم کو چاہیے کہ کتاب اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے موافق ایمان پر اور ایمان کی باتوں پر قائم رہو) اور یاد رکھو کہ) جو شخص اللہ تعالیٰ کو مضبوط پکڑتا ہے۔ (یعنی اس کی اطاعت کرتا اور اس کے مخالف کی اطاعت نہیں کرتا ہے۔) تو ایسا

شخص ضرور راہ راست کی طرف ہدایت کیا جاتا ہے۔

اس آیت میں کفر سے مراد معنی عام ہیں، جو کفر اعتقادی و عملی دونوں کو شامل ہے اور قتال وجدال کفر عملی ہے۔ کیونکہ فعل قریب کفر ہے۔ اس سے نا اتفاقی پیدا ہوتی ہے جو گناہ بھی ہے اور قوت وترقی کی زائل کرنے والی بھی۔ پھر ان بکھیڑوں میں پڑ کر دین حق سے بعد ہو جاتا ہے۔ نا اتفاقی میں ہر شخص دوسرے کو زک دینے کے لئے ہر ممکن سے ممکن تدبیر کو کام میں لاتا ہے۔ خواہ جائز ہو یا ناجائز۔ انسانیت سے قریب ہو یا بعید۔

اسی واسطے حدیث میں فساد ذات البین کو حالقہ فرمایا ہے کہ یہ مونڈنے والی چیز ہے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تفسیر بھی خود ہی فرمائی لَا اَقُوْلُ تَحْلِقُ الشَّعْرَ بَلْ تَحْلِقُ الدِّیْنَ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ بالوں کو مونڈتی ہے بلکہ دین کو مونڈتی ہے اور ظاہر ہے کہ جب مسلمان کو دین سے بعد ہوگا تو کفر سے قریب ہوگا۔ (اور قاعدہ عقلیہ ہے اَلْقَرِیْبُ مِنَ الشَّیْئِ یَاخُذُ حُکْمَہٗ' کہ جو جس سے قریب ہو اسی کا حکم لے لیتا ہے اسی وجہ سے فقہاء نے اَقْرَبُ اِلَی الْقُعُوْدِ (بیٹھنے کی طرف قریب تر) کو قاعدہ اور اَقْرَبُ اِلَی الْقِیَامِ (کھڑے ہونے کے قریب) کو قائم اور غالب الغش (کھوٹ غالب) کو مغشوش اور غالب الفضہ (چاندی غالب) کو فضہ (چاندی) فرمایا ہے۔ اس قاعدہ سے عمل قَرِیْبٌ مِنَ الْکُفْرِ (قریب کفر کے) کو کفر کہنا اور اس کے مرتکب کو عملاً کافر کہنا صحیح ہے ۱۲)

صاحبو! قرآن محاورات میں نازل ہوا ہے اور محاورات میں اس کی نظیر موجود ہے کہ جو شخص جس قوم کے افعل کرتا ہے۔ اس پر اسی قوم کا اطلاق کرتے ہیں جیسے کمینہ حرکت کرنے والے کو کہتے ہیں کہ تو تو چمار ہے۔ یعنی چماروں کی سی حرکت کرتا ہے۔ اس سے ہر شخص یہی سمجھتا ہے کہ تحقیر کے لئے یہ عنوان اختیار کیا گیا ہے یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ شخص اگر شیخ و سید تھا تو شیخ و سید نہیں رہا بلکہ مراد صرف یہ ہے کہ عملاً چمار ہو گیا گو واقع میں سید ہے۔ اسی طرح یہاں یہ مراد ہے کہ قتال وجدال کرنے والا عملاً کافر ہے گو واقع میں مومن ہے۔ پس جیسا کہ چمار کی دو قسمیں ہیں۔ ایک حقیقی چمار جس کی ذات بھی چمار ہو ایک عملی چمار جو چماروں جیسے کام کرے۔ اسی طرح کافر کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک حقیقی کافر جو اعتقاداً کفر کے مرتکب ہیں۔ دوسرے عملی کافر جو کافروں جیسے کام کرتے ہیں۔

ضرورت علم کلام:

اور یہ تقسیم محاورات کے بالکل موافق ہے۔ کوئی دقیق بات نہیں۔ مگر خوارج و معتزلہ کی عقل ماری گئی کہ انہوں نے اس محاورہ کو نہیں سمجھا اور محاورہ کے موافق مستعمل لفظ میں تدقیق کرنے لگے۔ کفر کو حقیقی معنی پر محمول کر کے یہ حکم لگا دیا کہ گناہ کبیرہ کا ارتکاب کفر ہے۔ اور مرتکب کبیرہ سچ مچ کافر یا

خارج عن الایمان ہے۔ جب ان لوگوں نے قرآن کے معانی کو بدلنا شروع کیا تو اہل حق کو جواب دینے کی ضرورت ہوئی اور انہوں نے ہیئت ایمان کی تحقیق کی۔ صحابہ کو اس کی ضرورت نہ تھی کیونکہ وہ سب کے سب محاورات کے جاننے والے اور کلام الٰہی کو سب سے زیادہ سمجھنے والے تھے۔ ان میں باہم ایسے اختلافات کم ہوتے تھے۔ اس لئے ان کو ایسے مسائل میں گفتگو کی ضرورت نہ تھی اور جس قدر ضرورت تھی اس کے موافق انہوں نے بھی گفتگو کی مگر اس وقت علم کلام کی تدوین کی ضرورت نہ ہوئی تھی۔ اور ایک علم کلام ہی کیا۔ صحابہ کے زمانہ میں تو فقہ کی بھی تدوین نہ تھی کیونکہ ان میں اتباع کا مذاق غالب تھا۔ تدقیق عمل کا مذاق نہ تھا تو ان کو اس سے بحث نہ تھی کہ فرض کون ہے اور واجب کون۔ بس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو وضوء کرتے ہوئے دیکھا تھا اور اسباغ وضوء کے فضائل سنے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر وضو کرنے لگے۔ آپ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تھا بس اسی طرح پڑھنے لگے جیسے آپ پڑھتے تھے۔ ان کو اس کھود کرید کی حاجت نہ تھی کہ نماز میں کیا تو فرض ہے اور کیا واجب اور کون مستحب؟ کیونکہ جس کو نسخہ پینا ہے وہ نسخہ کی تحقیق نہیں کیا کرتا کہ اس کا جزو اعظم کیا ہے۔ مزاج کیسا ہے۔ مگر جب کسی کو پورا نسخہ پینا منظور نہ ہو اور وہ تحقیق کے درپے ہو جائے۔ تو طبیب شفیق جزو اعظم وغیرہ کی تحقیق بھی بیان کردیگا اور اس کو مدون بھی کردے گا تاکہ کوئی پورا نسخہ نہ استعمال کرے تو بالکل محروم بھی نہ رہے۔ وہ جزو اعظم ہی استعمال کرے کہ وہ بھی حصول مقصود کیلئے کسی درجہ میں تو کافی ہے گو اثر دیر میں ہوگا اور پورے نسخہ کے برابر نہ ہوگا۔ تو اگر مسمان حضرات صحابہ ہی کے طرز پر رہتے اور عبادات کو ناقص نہ کرتے تو فقہاء کو تدوین فقہ اور تحقیق فرائض و واجبات و شرائط و ارکان کی ضرورت نہ ہوتی۔ اسی طرح اگر سب مسلمان مذاہب اصلیہ پر رہتے اور تدقیق شروع نہ کرتے تو متکلمین کو بھی تَكْفُرُوْنَ (تم کفر کرتے ہو) کی تحقیق کی ضرورت نہ ہوتی کہ یہاں کفر عملی مراد ہے نہ کفر حقیقی۔ نہ ان کو اِسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ کی تاویل بیان کرنا پڑتی۔ متکلمین کو بھی اس کی ضرورت جب ہی ہوئی جب کہ اہل بدعت نے تلبیس شروع کردی۔

اور یقینی ہے کہ اگر علوم قرآن اپنی سندیت اصلیہ پر رہتے تو اس سے نفع زیادہ ہوتا اور فضول ابحاث میں عوام کا اور علماء کا وقت صرف نہ ہوتا۔ بلکہ تمام عماء ضروری علوم کی تدوین و تحقیق میں مصروف ہوتے مگر اس کو کیا کیا جائے کہ صحابہ کے بعد مسمانوں کی طبائع میں اتباع کا مادہ کم ہوگیا۔ عقول میں سلامتی کم ہوگئی اور تحقیق و تدقیق کے درپے ہونے لگے۔ اہل بدعت وہوا نے تلبیس و تحریف شروع کردی تو اب علماء میں تقسیم خدمات ہونے لگی۔ کسی نے بلاغت کو لے لیا۔

کسی نے نحو وصرف کو کسی نے علم کلام کو، کسی نے حدیث کو کسی نے فقہ کو کسی نے تفسیر کو اور ایک جماعت نے علوم عقلیہ کی خدمت اختیار کی اور اب علوم عقلیہ کی بھی ضرورت ہے۔

کیونکہ آج کل عقوں میں سلامتی نہیں رہی وہ بدوں علوم عقلیہ کی مدد کے دقیق عوم کو نہیں سمجھ سکتے۔ اگر عقول میں سلامتی ہو تو پھر عقول میزانیہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ چنانچہ حضرات صحابہ ومجتہدین کو اس کی ضرورت نہ تھی مگر باوجود اس کے ان کے تمام دلائل قوانین عقلیہ پر منطبق ہیں۔ لیکن اب بدوں علوم عقلیہ کے فہم اس لئے مشکل ہو گیا کہ جو اشکالات شریعت پر کئے جاتے ہیں خود ان میں علوم عقلیہ فلسفیہ کی بہت آمیزش ہے۔ خصوصاً معتزلہ کے اشکالات میں اور گو علوم عقلیہ کے ذریعہ سے معتزلہ کے اشکالات رفع کر دیئے گئے مگر یہ ضرور ہے کہ متاخرین کے کلام میں علوم قرآن بہت کم ہیں اور سلف کے کلام میں عوم قرآن زیادہ ہیں۔ اور سعف کی باتیں دل کو لگتی ہیں کیونکہ سند کا خاصہ ہے کہ دل کو کشش کرتی ہے۔ سادگی سے جو بات بیان کی جاوے، وہ دل میں پیوستہ ہو جاتی ہے۔ متاخرین کے کلام میں یہ رنگ نہیں ان کی باتیں اس قدر دل کو نہیں لگتیں مگر وہ کیا کریں وہ اس رنگ کے اختیار کرنے پر مجبور تھے کیونکہ معترضین نے اسی رنگ سے اعتراضات پیش کئے تھے۔

تدقیقات سے احتراز:

اور یہ بھی خدا کی رحمت ہے کہ ہم سے پہلے یہ شبہات پیدا ہو چکے اور متقدمین متکلمین نے ان کے جواب میں قیامت تک کا انتظام کر دیا کہ علم کلام کی بنیاد ڈال کر قیامت تک کے شبہات کا ازالہ کر دیا۔ اگر ہم جیسے کم ہمتوں کے سامنے معتزلہ کے شبہات پیش ہوتے تو ہم سے یہ کام دشوار تھا۔ غرض اس میں تو شک نہیں کہ متکلمین نے جو کچھ تحقیق وتدقیق کی وہ ایک ضروری کام تھا جس پر مخالفین اہل بدعت وہویٰ کی تلبیس نے ان کو مجبور کیا (گو اس مجبوری کے بعد بعض ابحاث انہوں نے ایسی بھی چھیڑ دیں جن کے چھیڑنے پر وہ مجبور نہ تھے اور ایسی ابحاث کی شمار بہت قلیل ہے ١٢) لیکن متکلمین کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ مسلمانوں کو قرآن پر ایسی تحقیق وتدقیق کے ساتھ ایمان لانا چاہیے۔ بلکہ مطلب صرف یہ ہے کہ اگر کوئی مخالف اسلام پر اعتراض کرے اور اس کی فہم میں سلامتی نہ ہو اور سزاجت کے ساتھ وہ قائل نہ ہو سکے تو اس کے مقابلہ میں اس سے کام لیا جائے اور خود اپنے اعتقاد رکھنے کے واسطے سزاجت ہی کا رنگ اختیار کرنا چاہیے۔ خصوصاً عوام کو تو یہی لازم ہے کہ قرآن پر سند کے ساتھ ایمان لائیں۔ کیونکہ تدقیقات سے شبہات دفع نہیں ہوتے بلکہ اس سے شبہات اور بڑھتے ہیں جن سے بعض دفعہ نجات مشکل ہو جاتی ہے اور اخیر میں جب کبھی نجات ہوئی

ہے مزاجت ہی سے ہوئی ہے کہ اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم سچے ہیں ان کا حکم سر آنکھوں پر ہے خواہ سمجھ میں آئے یا نہ آئے (میں کہتا ہوں کہ متکلمین کا تدقیقات سے یہ مطلب نہ تھا کہ تم اپنے شبہات ان کے ذریعے سے زائل کرو بلکہ صرف یہ مقصود تھا کہ اگر مخالف ان تدقیقات کے پیرایہ میں اعتراض کرے تو تم اس کو اسی کے طرز سے خاموش کرسکو ۱۲ جامع) اور سادہ تعلیم کے بعد بہ نسبت فسفیات کے تصوف کی تحصیل سے بھی شبہات سے نجات جلد ہو جاتی ہے۔ مگر اسی شرط کے ساتھ کہ تصوف بھی سند بے اصلیہ پر ہو جس میں علوم فلسفہ کا رنگ نہ ہو یعنی علوم کشفیہ کی تحقیق نہ ہو۔ جو واقع میں تو علوم فلسفیہ نہیں۔ لیکن ان کی تعبیر فلسفہ کے رنگ میں ہوتی ہے اس لئے وہ علوم فلسفہ معلوم ہوتے ہیں۔ گو اصل مفہوم کے اعتبار سے تو فلسفہ علم حکمت کو کہتے ہیں جو تمام علوم کشفیہ کو شامل ہے۔ مگر میں علوم فلسفیہ بمعنے علوم دقیقہ زائدہ سے منع کرتا ہوں کہ محاورہ میں انہیں کو عوم فلسفیہ کہتے ہیں۔ غرض تصوف سے بھی اسی وقت شبہات کا مادہ منقطع ہوگا جب کہ کشفیات سے الگ رہے اور ان کی تحقیق میں نہ پڑے۔ ورنہ شبہات سے نجات دشوار ہے۔

چنانچہ خود اہل کشف کا ارشاد ہے **اَنْتُم تَخَافُوْنَ الْمَعَاصِیَ وَنَحْنُ نَخَافُ الْکُفْرَ** کہ علمائے ظاہر کو تو معاصی ہی میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے مگر ہم کو کفر کا اندیشہ لگا رہتا ہے کیونکہ علوم کشفیہ کی فہم میں جب غلطی ہوتی ہے تو وہ کفر سے ادھر نہیں رہتی۔ اس لئے ان کے درپے ہونا بہت مضر ہے اس کے ساتھ ہی مشائخ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ علوم کشفیہ کی تحقیق و تدقیق تو نہ کرے لیکن اجمالاً ان کی تصدیق کر دے تاکہ صاحب کشف کے گمراہ سمجھنے کا عقیدہ پیدا نہ ہو کیونکہ یہ عقیدہ سخت مضر ہوگا۔ وہ مقبولان الٰہی ہیں۔ جن کی شان میں یہ ارشاد وارد ہے۔ **مَنْ اٰذٰی لِیْ وَلِیاً فَقَدْ اٰذَنْتُہ' بِالْحَرْبِ** (السنن الکبریٰ للبیہقی ۳۴۶-۳) (جو میرے ولی کو ایذا دے اس کو میری طرف سے اعلان جنگ ہے) اور تصدیق اجمالی کے معنی یہ ہیں کہ یوں سمجھے کہ یہ قول متحمل حق و صواب ہے ممکن ہے صحیح ہو۔ احتمال و امکان کی قید اس لئے میں نے بڑھا دی تاکہ الہام کے قطعی ہونے کا اعتقاد نہ ہو۔ گو بعض صوفیہ کے کلام میں یہ بھی وارد ہے کہ اہل کشف صحیح تلبیس ابلیس سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ میں بھی بہت دنوں اس کے اندر چکر میں رہا کہ اس قول کا مطب کیا ہے کیونکہ ہمارا عقیدہ تو ظنیت الہام کا ہے اور اس کو تلبیس ابلیس سے محفوظ اور بالکل صحیح فرماتے ہیں جس سے متبادر یہ ہے کہ ان کے نزدیک الہام قطعی ہے۔ میں عرصہ دراز تک اس اشکال کی وجہ سے پریشان رہا اور جو بات اس پریشانی کے متعلق مجھے معوم ہوئی ہے وہ عرض کرتا ہوں۔

علوم کشفیہ کا مطالعہ:

اور میں محقق ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا بلکہ محض شفقت کی بناء پر کہتا ہوں کہ میرا عمر بھر کا تجربہ ہے کہ علوم کشفیہ کا مطالعہ مضر ہے ان کا مطالعہ کبھی نہ کرے نہ ان کی تحقیق کے درپے ہو۔ ہاں اجمالاً ۲۰ شف کی بزرگی کا معتقد رہے اور اجمالاً ان کی تصدیق بھی کرے۔ مگر تفصیل کی فکر میں نہ پڑے۔ ت مجدد صاحب رحمتہ اللہ علیہ تو بڑے رتبہ کے ہیں وہ تو بے دھڑک فرماتے ہیں۔ کہ شیخ اکبر از صفہ ۔ن الہی نظری آید مگر علوم او نامقبول اند (شیخ اکبر مقبولان الٰہی میں سے معلوم ہوتے ہیں مگر ان ۔ لوم نامقبول ہیں) مگر مشکل ہماری ہے کہ ہم شیخ کی باتوں کو نامقبول کیسے کہیں ہمارا تو یہ رتبہ ں۔ سو الحمدللہ کچھ دن ہوئے ہیں کہ اس اشکال کا جواب سمجھ میں آ گیا۔ مگر ایک مسئلہ سمجھ میں جانے کے بھروسہ دوسرے مسائل کا مطالعہ یہ سمجھ کر نہ کرنا چاہیے کہ ہم کو تو دامن چھڑانا آتا ہے ونکہ بعض دفعہ ایسا خار لگتا ہے کہ پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے وہ دامن کو بھی پھاڑ کے رکھ دیتا ہے درخود نہیں نکلتا۔ دیکھو اگر ایک شخص کو نگاہ نیچی کر لینے کی مشق ہے تو اس کو یہ تو مناسب نہیں کہ اس کے بھروسہ خود قصد کر کے بازار میں ایسی جگہ کو نکلا کرے جہاں بازاری عورتوں کا مجمع رہتا ہے۔

صاحبو! بہتر تو یہی ہے کہ بازار ہی میں نہ جایئے تاکہ کوئی عورت نظر ہی نہ پڑے ورنہ کبھی تو ایسی نظر پڑے گی کہ یہ ساری مشق رکھی رہ جائے گی۔ تم ہزار نگاہ نیچی کرنا چاہو گے وہ پھر اوپر کو آنکھ اٹھا دے گی اور نگاہ نیچی کر بھی لی تو ایک بار کی نظر سے بعض دفعہ دل پر ایسا تیر لگتا ہے کہ عمر بھر دل سے نہیں نکلتا۔ پھر یوں کہو گے۔

درون سینہ من زخم بے نشان زدۂ　　　بحیرتم چہ عجب تیر بے کمان زدہ

(تو نے میرے سینہ میں بے نشان زخم مارا ہے۔ حیرت ہے کہ کیا عجیب تیر بل کمان کے مارا ہے۔)

اس لئے اہل تجربہ کا قول ہے راہ راست رو اگرچہ دور است (سیدھے راستہ پر چلو اگرچہ دور ہو۔)

اس قول پر اہل اقیدس کو شبہ ہوا ہے کہ خط مستقیم تو بوجہ **اقصر الخطوط الواصلہ بین النقطیین** (دو نقطوں کے درمیان جو خطوط ہیں ان سب سے چھوٹے خط کو خط مستقیم کہتے ہیں) ہونے کے اقرب الطرق (راستوں میں قریب تر) ہوگا۔ وہ دور کیونکر ہو سکتا ہے؟ اسی خرابی کا نتیجہ ہے کہ محاورات کو تدقیقات پر محمول کرنے لگے۔ محاورہ میں راہ راست کہتے ہیں راہ بے خطر کو۔ مطلب یہ ہے کہ جس راستہ میں خطرہ نہ ہو۔ اس کو اختیار کرو اگرچہ دور ہی کیوں نہ ہو۔ اب کچھ شبہ نہیں پس علوم کشفیہ کا مطالعہ ہرگز نہ کرنا چاہیے کیونکہ وہ خطرہ سے خالی نہیں۔ بلکہ صرف علوم معاملہ

کا مطالعہ کرے کہ وہ بے خطر ہیں۔ اور میں نے وہ قول کشف صحیح کے مامون عن التلبیس ہونے کا قصداً نہیں دیکھا تھا بلکہ نظر سے گذر گیا اور آفت آ گئی اور کہیں حاشیہ یا شرح میں اس کا حل بھی نہ تھا لیکن خدا کا شکر ہے کہ باوجود کسی شخص کی عدم اعانت کے اشکال حل ہو گیا۔

وہ حل یہ ہے کہ ہم نے مانا کہ صاحب کشف صحیح تلبیس سے مامون ہو جاتا ہے لیکن باوجود امن عن التلبیس کے حجت شرعیہ اس کو لازم نہیں۔ کیونکہ ایسی نظائر موجود ہیں جہاں باوجود امن عن التلبیس کے شرعاً ایک شئے حجت نہیں۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے ابصار بالنظر گو اکثر اوقات مامون عن التلبیس ہے۔ جس کی نگاہ درست ہو اس کا ابصار عموماً غلطی نہیں کرتا۔ مگر پھر بھی وہ شرعاً حجت نہیں۔ نہ اس کے مقتضاء پر اعتقاد واجب ہے نہ اس کے خلاف کا احتمال گناہ ہے۔ مثلاً ہم کو چاند سورج سے چھوٹا نظر آتا ہے مگر اس پر اعتقاد لازم نہیں۔ ممکن ہے کہ واقع میں بڑا ہو اور ہم کو چھوٹا نظر آتا ہو۔ ہاں وہ مواقع مستثنیٰ ہیں جن میں شریعت نے ابصار کو حجت مانا ہے۔ جیسے رویت ہلال وغیرہ اس نظیر کا ذہن میں آنا تھا کہ بادل سا پھٹا اور اشکال کی ظلمت رفع ہو کر دل میں نور چمکا اور حق تعالیٰ کا بار بار شکر ادا کیا ورنہ دل پر پہاڑ سا رکھا تھا اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ اگر پہاڑ پر یہ ثقل ہوتا تو پھٹ جاتا۔ بس خطرات میں قصداً پڑ کر پھر نکلنا یہ عقلمندی نہیں، بلکہ سلامتی اسی میں ہے کہ خطرات کے پاس نہ جاؤ۔

ہرگز بگندمی گوں لاتقربوا کہ زہرست حال پدریا وازام الکتاب دارم

(گندمی رنگ کے ہرگز قریب مت جاؤ کہ زہر ہے ام الکتاب حال پدر کی یاد رکھتا ہوں)

وہ تو شیخ اکبر تھے۔ مگر کہیں تم ان کے علوم کشفیہ کو دیکھ کر شیخ اکفر نہ ہو جاؤ جیسے عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ اکبر شاہ کے متعلق کہا کرتے۔ ''جد ما اکفر بود''۔ (ہمارا دادا اکفر تھا) وہاں تو خود اکبر کو اکفر کہہ رہے ہیں۔ یہاں اکبر تو اکبر ہی رہیں گے۔ ہاں ان کے کلام کو دیکھنے والا اکفر ہو جائے گا۔

اکبر کے درباری کچھ ایسے بے دین واقع ہوئے تھے کہ ہمیشہ اس غریب کو نئے نئے طریقے سے کافر بنانے کی کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ سب نے مل کر اس کو نبی بنایا اور ایک شخص ابوبکر بنا اور ایک عمر بنا۔ ملا دو پیازے بھی اس مجلس میں موجود تھے۔ جب ان کی باری آئی اور ان سے پوچھا گیا کہ ملا جی آپ کیا بننا چاہتے ہیں؟ تو بولے میں اس جماعت کا ابوجہل ہوں۔ میں تم سب کی تکذیب کرتا ہوں کہ تمہارا نبی بھی جھوٹا اور اس کے ساتھی بھی جھوٹے۔ کیونکہ نبی کے واسطے اس کی بھی ضرورت ہے کہ کوئی اس کا مکذب بھی تو ہو وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا۔ (اسی طرح

ہم نے ہر نبی کے دشمن بہت سے شیاطین پیدا کیے تھے کچھ آدمی اور کچھ جن، جن میں سے بعضے دوسرے بعض کو چکنی چپڑی باتوں کا وسوسہ ڈالتے رہتے تھے تاکہ ان کو دھوکہ میں ڈال دیں۔)

ملاجی کی اس بات پر دربار میں قہقہہ پڑ گیا۔ وہ نبوت درہم برہم ہوگئی اور یہ حکایات افواہی ہیں۔ ابوالفضل میں اکبر نے ایک مکتوب میں ان سب خرافات سے اپنا تبریہ بھی کیا ہے جو اس کی طرف منسوب کی جاتی ہیں۔ پس خلاصہ جواب کا یہ ہوا کہ ہم نے مانا کہ صاحب کشف صحیح کو تلبیس نہیں ہوتی مگر پھر بھی کشف شرعاً حجت نہیں۔ نہ خود صاحب کشف پر۔ نہ دوسروں پر۔ جیسے میں نے ابھی کہا کہ چاند کو ہم آفتاب سے چھوٹا دیکھتے ہیں مگر شرعاً یہ ابصار حجت نہیں۔ نہ اس پر اعتقاد رکھنا واجب، نہ اس کے خلاف کا اعتقاد حرام۔ بہرحال میں اپنے دوستوں کو مشورہ دیتا ہوں کہ وہ شیخ اکبر کی تصانیف کا ہرگز مطالعہ نہ کریں۔ نہ معلوم کس چکر میں پڑ جائیں۔ تمہارے لئے شیخ اکبر سے شیخ اصغر ہی اچھا۔ یہ بات میں تجربہ کے بعد کہہ رہا ہوں اور مشہور تعلیم ہے سَلِ الْمُجَرِّبَ وَلَا تَسْئَلِ الْحَكِيْمَ (تجربہ کار سے دریافت کرو حکیم سے مت پوچھو۔)

علوم کشفیہ اور تصوف:

یاد رکھو کہ علوم کشفیہ کو تصوف سے کچھ تعلق نہیں مگر چونکہ بعض صوفیہ اہل کشف تھے اور انہوں نے اپنی کشفیات کو تقریراً (تحریراً ظاہر کیا جس سے ناقص الفہم گمراہ ہونے لگے۔ اس لئے محققین صوفیہ نے ان کی حقیقت ظاہر کر کے اشکالات کو رفع کرنا چاہا۔ اس لئے علوم کشفیہ تصوف سمجھے جانے لگے۔ اگر یہ حضرات اہل کشف اپنے علوم کو ظاہر نہ کرتے تو محققین کو ان سے بحث کرنے کی ضرورت نہ ہوتی بلکہ وہ اصل مقصود ہی کی تحقیق میں رہتے۔ یعنی علوم معاملہ کی تفصیل میں کیونکہ قرب حق کا مدار معاملہ پر ہے نہ کہ علوم کشفیہ پر خوب سمجھ لو۔ اب یہاں سے سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ متکلمین پر جو بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ انہوں۔ نے علوم قرآن کو چھوڑ کر خواہ مخواہ تدقیق سے کام لیا۔ یہ ان کی کوتاہ نظری ہے۔ کیونکہ متکلمین نے ضرورت سے مجبور ہو کر ایسا کیا ہے جب کہ لوگ خود تدقیق کرنے لگے اور شبہات میں پڑ گئے تھے۔ اگر لوگ شبہات میں نہ پڑتے تو ان کو ضرورت نہ تھی۔ پس تم بھی شبہات میں نہ پڑو اور سنداجت اصلیہ پر رہو تو واقعی اس سے بہتر کوئی راستہ نہیں۔

علماء کی احتیاط:

امام ابوالحسن اشعریؒ کی حکایت ایک ثقہ سے سنی ہے کہ ایک عالم ان سے ملنے گئے مگر چونکہ

صورت سے نا آشنا تھے اس لئے خود آپ ہی سے پوچھا کہ شیخ ابوالحسن اشعری کون سے ہیں؟ فرمایا تو میرے ساتھ دربار شاہی میں چلو، وہاں بتلاؤں گا۔ چنانچہ دونوں دربار شاہی میں پہنچے۔ وہاں ہر قسم کے علماء مجتمع تھے محدثین بھی، فقہاء بھی، فلاسفہ بھی، متکلمین بھی، معتزلہ بھی اور اہل سنت بھی، امام ابوالحسن اشعریؒ کے پہنچنے کے بعد ایک شخص نے ذات وصفات کے کسی مسئلہ میں گفتگو شروع کی۔ اس کے بعد دوسرے علماء نے اس کے متعلق اپنی اپنی تحقیقات بیان کیں۔ معتزلہ نے اہل سنت کے مسلک پر اعتراضات کئے۔ اہل سنت نے ان کو جواب دیئے۔ یہ سب کچھ ہوتا رہا مگر امام ابوالحسن خاموش بیٹھے رہے۔ جب سب علماء اپنی اپنی کہہ چکے تو اخیر میں شیخ نے کھڑے ہو کر معتزلہ وفلاسفہ کو خطاب کر کے ان کی سب باتوں کا جواب دیا اور ان مسائل کی ایسی تحقیق کی کہ جس پر فلاسفہ کو بولنے کا موقع نہ رہا۔ اس سے فارغ ہو کر بیٹھے تو اپنے رفیق سے کہا کہ ابوالحسن میں ہی ہوں۔ یہ بزرگ بہت خوش ہوئے اور کہا واقعی جیسا سنا تھا۔ اس سے بڑھ کر آپ کو پایا۔ پھر ان بزرگ نے اپنی کتاب میں امام کی بہت تعریف لکھی اور اخیر میں یہ لکھا ہے کہ جب امام ابوالحسنؒ سب کو جواب دے چکے تو میں نے عرض کیا کہ حضرت آپ نے اول ہی ان مسائل کی تحقیق کیوں نہ بیان کر دی جو اخیر میں بیان فرمائی ہے تا کہ مخالفین کو اعتراض کا موقع ہی نہ ملتا۔ امام نے جو اس سوال کا جواب دیا وہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ فرمایا کہ ان مسائل میں خود تکلم کرنا بدعت ہے کیونکہ ان میں تکلم کرنا خلاف سنت ہے۔ تو میں نے ابتداء ان میں تکلم کو جائز نہ سمجھا مگر جب اہل بدعت نے مذہب حق پر اعتراض کیا۔ تو اب جواب کی غرض سے تکلم کی ضرورت ہوئی۔ اس لئے میں ابتداء میں خاموش رہا اور اخیر میں مجبور ہو کر بولا جب کہ حق پر اعتراضات ہونے لگے کہ اب سکوت کی گنجائش نہ رہی اب ایسے محتاط علماء کہاں ہیں۔ اب تو ہر شخص ذرا سے سوال پر اپنی تحقیقات بیان کرنے لگتا ہے۔

چنانچہ آج کل لوگوں کو یہ سبق مل گیا ہے کہ جو ملتا ہے سلطان ابن سعود کے متعلق سوال کرتا ہے کہ ان کے بارے میں آپ کا کیا اعتقاد ہے؟ اب لگے مولوی صاحب اپنی تحقیق بیان کرنے۔ جس میں خواہ مخواہ فضول وقت ضائع ہوتا ہے۔ صاحبو! صاف یوں ہی کیوں نہ کہہ دو کہ ہم کو کچھ خبر نہیں۔ اور یہ کہہ کر اپنے کام میں لگو اور واقعی ہندوستان کے رہنے والوں کو کیا خبر۔ ہمارے پاس بجز اخباروں کے تحقیق کا ذریعہ ہی کیا ہے اور اخباروں کی دیانت کا جو حال ہے سب کو معلوم ہے۔

رہا حجاج کے بیان سے استدلال کرنا سو اس کی یہ حقیقت ہے کہ ہر شخص اپنے مذاق کے موافق حالت بیان کرتا ہے۔ بعض لوگ اول اول ابن سعود کی تعریف کرتے ہوئے آئے تھے کیونکہ اس

قت تک ابن سعود کا طرز عمل بظاہر ان کے مذاق کے موافق تھا اور ان کو یہ امید تھی کہ وہ شخصی سلطنت قائم نہ کریں گے بلکہ جمہوری قائم کریں گے۔ پھر دوبارہ جو یہ رنگ دیکھ کر آئے کہ سلطان نے اپنی ملکیت کا اعلان کر دیا اور شخصی سلطنت قائم کر دی تو وہی تعریف کرنے والے جو سلطان کو امام وقت اور فرشتہ خصلت کہتے تھے، اب اس کو شیطان سے بدتر کہنے لگے۔ اس حالت میں کسی کے بیان پر کیا خاک اعتماد کیا جائے۔ پس اسلم یہی ہے کہ سکوت کیا جائے اور کہہ دیا جائے کہ ہم کو تحقیق نہیں مگر اس جواب سے شرماتے ہیں کیونکہ اس میں جہل کا اقرار ہے۔ حالانکہ صاحب علم ہونے کے لئے ہر بات کا جاننا ضروری نہیں تو کسی ایک بات کے نہ جاننے سے آپ کا جاہل ہونا کیونکر لازم آیا۔

معمولات اور مجہولات:

بزرجمہر کا قصہ ہے جو نوشیرواں کا وزیر اعظم تھا کہ اس سے ایک بڑھیا نے کسی بات کے متعلق سوال کیا بزرجمہر نے کہا کہ مجھے اس کی تحقیق نہیں۔ بڑھیا نے حیرت سے کہا کہ تم کو وزیر ہو کر اس بات کی خبر نہیں ہے۔ پھر تم اتنی بڑی تنخواہ کس بات کی پاتے ہو؟ بزرجمہر نے کہا کہ اتنی تنخواہ تو میں اپنی معلومات کے عوض میں پاتا ہوں۔ اگر مجہولات کی تنخواہ پاتا تو خزائن ہفت اقلیم بھی کافی نہ ہوتے۔

دوسرے آپ کو معلوم ہے لا آوری (میں نہیں جانتا) کہنا جہل کی دلیل نہیں بلکہ علم کی دلیل ہے چنانچہ ایک بار مولنا محمد اسمٰعیل صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ نے وعظ فرمایا کسی نے کہا سبحان اللہ کیا علوم ہیں۔ مولنا نے فرمایا میں تو کچھ بھی نہیں جانتا۔ اس شخص نے کہا یہ حضرت کی تواضع ہے۔ فرمایا یہ تواضع نہیں بلکہ تکبر کا قول ہے کیونکہ لا اعلم (میں نہیں جانتا) بڑا عالم ہی کہہ سکتا ہے جس پر علم کی وسعت منکشف ہو چکی ہو ورنہ جس پر وسعت علم منکشف نہیں ہوئی وہ ہر بات میں علم کا دعویٰ کرتا ہے۔

تیسرے لا اعلم کہہ دینا بڑی راحت کی بات ہے اور اعلم (میں جانتا ہوں) کہنا مصیبت کو اپنے سر لینا ہے۔ اس لئے ایک عاقل کی رائے ہے کہ حتی الامکان جواب نفی میں دیا کرو کیونکہ نفی میں جواب دینا اہون ہے اور اثبات میں جواب دینا اشد ہے مثلاً اگر تم سے کسی نے سوال کیا کہ آپ نے کلکتہ دیکھا ہے۔ اس کے جواب میں اگر یہ کہہ دیا کہ ہاں دیکھا تو بس سوالات شروع ہو جائیں گے کہ بتلاؤ وہاں کیا کیا عجائبات ہیں۔ چڑیا گھر کتنا بڑا ہے اور قلعہ کیسا ہے وغیرہ وغیرہ اگر یہ کہہ دیا کہ میں نے کلکتہ دیکھا نہیں۔ تو اس پر کوئی سوال نہیں ہو سکتا۔ پس راحت اسی میں ہے کہ جب کوئی فضول سوال کرے تو اس کے جواب میں یا تو اپنے جاہل ہونے کا اقرار کرے یا سائل کو جاہل بنا دے۔ اگر لڑائی کا اندیشہ نہ ہو۔ اور یہ کہہ دے کہ اس

سوال کا جواب سمجھنے کے لئے تمہارا فہم کافی نہیں۔

جیسے علی گڑھ میں میرے پاس ایک صاحب آئے جو کالج میں عربی یا انگریزی کے پروفیسر تھے اور وہاں دونوں زبانوں میں یکتا مشہور تھے۔ انہوں نے ایک حدیث کا متن پڑھا جس کا مفہوم یہ ہے کہ جہاں زنا کی کثرت ہوتی ہے۔ وہاں طاعون پھیلتا ہے۔ اور یہ کہا کہ یہ سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے کہا کہ حدیث کا مدلول سمجھ میں نہیں آیا یا جنابت اور عقوبت میں ارتباط سمجھ میں نہیں آیا؟ کہا ارتباط سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے کہا۔ ارتباط نہ سمجھنے سے ضرر کیا ہوا؟ کہنے لگے کہ ضرر تو کچھ نہیں ہوا لیکن معلوم ہونے میں نفع تھا۔ میں نے کہا وہ نفع کیا تھا؟ کہنے لگے اطمینان ہو جاتا۔ میں نے کہا کہ خود اطمینان کے مطلوب ہونے کی کیا دلیل ہے؟ کہنے لگے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول وَلٰکِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ (لیکن اس لئے تاکہ میرا قلب مطمئن ہو جائے) میں نے کہا اور اس کی کیا دلیل کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اطمینان مفید تھا تو آپ کو بھی ہوگا؟ کیونکہ ممکن ہے ایک شئے کسی کو مفید ہو اور کسی کو مفید نہ ہو جیسا کہ ادویہ میں مشاہدہ ہے کہ ایک دوا ایک شخص کو موافق ہوتی ہے دوسرے کو موافق نہیں ہوتی۔ اس پر وہ خاموش ہو گئے۔ بعد میں میں نے کہا کہ آپ یہ نہ سمجھے گا کہ مولویوں کو احکام کی حکمتیں معلوم نہیں الحمد للہ ہمارے پاس اسرار و حکم کا خزانہ موجود ہے مگر۔

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز
ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

مصلحت نہیں ہے کہ راز فاش ہو جائے ورنہ عارفین کی مجلس میں کوئی ایسی خبر نہیں کہ معلوم نہ ہو)

اور گو یہ ظاہر میں تکبر تھا مگر صوفیہ کا ارشاد ہے اَلتَّکَبُّرُ مَعَ الْمُتَکَبِّرِیْنَ عِبَادَۃٌ (متکبرین سے تکبر کرنا عبادت ہے) یہ بات میں نے اس لئے کہہ دی تاکہ وہ نہ سمجھیں کہ علماء کورے ہیں ان کو کچھ معلوم نہیں کیونکہ آج کل نو تعلیم یافتہ جماعت کو اپنی عقل و فہم پر بہت ناز ہے ان کے چلے جانے کے بعد میں نے دوستوں کے سامنے اس حدیث کے متعلق ایک تحقیق بیان کی جو میرے ذہن میں تھی۔ جس سے زنا و طاعون کے درمیان ارتباط ظاہر ہوتا ہے۔ احباب کہنے لگے کہ تم نے یہ تحقیق ان پروفیسر صاحب کے سامنے بیان نہ کر دی، وہ بہت خوش ہوتے۔ میں نے کہا تم نہیں جانتے یہ لوگ حکم کو بناء احکام قرار دیتے ہیں۔ ان کو حکمت بتلانا ان کے مرض کو بڑھانا ہے۔ ان کے لئے اسی جواب کی ضرورت ہے کہ حکمت کا جاننا کیا ضرور ہے؟

اور آپ لوگ حکمت کو بنا احکام نہیں سمجھتے

دوسرے یہ کہ وہ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصہ سے اطمینان کے مطلوب ہونے پر استدلال کرتے ہیں تو اول تو یہ استدلال اس لئے صحیح نہیں کہ وہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حق تعالیٰ سے طلب اطمینان کا اظہار کیا تھا مخلوق سے انہوں نے اطمینان نہیں چاہا تھا پھر تم مخلوق سے اطمینان کے طالب کیوں ہو۔ دوسرے وہاں حق تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اطمینان مشاہدہ سے کر دیا تھا کہ مردہ کو زندہ کر کے دکھلا دیا تھا جس میں شبہ کی گنجائش نہ تھی اور میں اگر ان پروفیسر صاحب کا اطمینان کرتا تو مقدمات ظنیہ سے کرتا جو ممکن ہے کسی وقت ٹوٹ جاتے یا کم از کم ان کے نزدیک مخدوش ہو جاتے تو پھر ان کا اطمینان بھی رخصت ہو جاتا اور اطمینان زائل ہونے کے بعد وہ حدیث کی بھی تصدیق نہ کرتے۔ کیونکہ ان کے ذہن میں حدیث کی صحت ان ہی مقدمات پر مبنی تھی۔ اس لئے ان کے سامنے یہ تقریر مناسب نہ تھی۔ جواب میں میں سائل کے مزاج کا اتباع نہیں کرتا بلکہ اس کے مرض کا علاج کرتا ہوں تا کہ اس کو اپنی غلطی پر تنبہ ہو۔

میرے پاس ایک صاحب جو ایک اردو کے اسکول میں مدرس تھے آئے کہ مجھے تقدیر کا مسئلہ سمجھا دو۔ میں نے کہا کہ آپ کی عوض سمجھے گا کون؟ کہنے لگے میں سمجھوں گا میں نے کہا تم نہیں سمجھ سکتے اور میں ایسے شخص سے خطاب نہیں کر سکتا جس کو میں جانتا ہوں کہ اس مسئلہ کو نہیں سمجھ سکتا۔ تم کسی طالب علم کو لے آؤ میں اس کے سامنے تقریر کر دوں گا تم بھی سن لینا۔ اس سے تم کو یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ تم نہیں سمجھ سکتے اور یہ معلوم ہو جائے گا کہ مولویوں کے پاس تمہارے سوالوں کے جوابات ہیں۔

میں اوپر عرض کر چکا ہوں کہ یہ صاحب اسکول کے معلم تھے۔ جن کی لیاقت کا یہ حال ہے کہ ایک صاحب نے اعتراض کو اعتراز لکھا تھا۔ کسی نے ٹوکا تو کہا جی ہاں غلطی ہو گئی ظاء سے لکھنا چاہیے تھا۔ انگریزی میں تو بی اے، ایم اے ہو جاتے ہیں اور علوم عربیہ سے اتنی اجنبیت کہ اعتراض کا املاء بھی صحیح نہیں۔ میں تو کہا کرتا ہوں کہ انگریزی خواں ترقی معکوس کرتے ہیں مرد سے بی بنتے ہیں یعنی عورت جو بی اے کا جزو اول ہے پھر میم بن جاتے ہیں کہ ایم اے اور میمیں قریب قریب ہیں اور اس پر دعویٰ یہ ہے کہ ہم ہر بات کو سمجھتے ہیں اور ہمارے علماء ایسے خوش اخلاق ہیں کہ ان لوگوں کے ہر سوال پر جواب کی تقریر کرنے لگتے ہیں اور احکام شرعیہ کی حکمتیں بیان کرنے لگتے ہیں۔ یہ خوش اخلاقی نہیں بچہ کے ہاتھ میں سانپ دینا ہے۔ تم کو تو سانپ کا پکڑنا جائز ہے کیونکہ

تمہارے پاس منتر اور تریاق موجود ہے۔ بچہ کو سانپ دینا اسے ہلاک کرنا ہے۔ اسی طرح علوم غامضہ کی تقریر جاہلوں کے سامنے کرنا ان کو ہلاک کرنا ہے۔ کیونکہ اس سے جو ان کو شبہات پیدا ہوں گے ان کا علاج ان کے پاس نہیں۔ بس ان کو تو صاف جواب دو کہ قرآن وحدیث میں یہی آیا ہے تم کو ماننا پڑے گا اور جو اس جواب کو نہ مانے اس کو منہ نہ لگاؤ۔

آنکس کہ بقرآن وخبر زد نہ رہی　　آنست جوابش کہ جوابش نہ دہی

(جس شخص سے قرآن وحدیث سے تو نہ چھوٹے۔ اس کا جواب یہی ہے کہ اس کو جواب نہ دو)

بحث اور تسلی:

اور میں بقسم کہتا ہوں کہ اطمینان اور تسلی اسی سے ہوتی ہے کہ میں اللہ ورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو بلا دلیل مانتا ہوں۔ اسرار اور حکم کے درپے ہونے سے پوری تسلی نہیں ہوتی۔ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ جو بہت بڑے معقولی اور فلسفی ہیں۔ متکلم بھی بڑے درجے کے ہیں۔ اخیر عمر میں اپنی عمر بھر کا تجربہ بیان کرتے ہیں۔

نِهَایَۃُ اَقْدَامِ الْعُقُوْلِ عِقَالٌ　　وَغَایَۃُ سَعْیِ الْعَالَمِیْنَ ضَلَال
وَلَمْ نَسْتَفِدْ مِنْ بَحْثِنَا طُوْلَ عُمْرِنَا　　سِوَیٰ اَنْ جَمَعْنَا فِیْهِ قِیْلَ یُقَال

(دنیا والوں کی کوشش کا خلاصہ ضلال ثابت ہوا بجز بک بک اور قیل قال کے کچھ حاصل نہ ہوا عمر یوں ہی ضائع کی)

کہ ہم کو عمر بھر کی بحث سے سوائے قیل وقال کے کچھ حاصل نہیں ہوا۔ ان ہی امام رازی کا قصہ سنا گیا ہے کہ یہ شیخ نجم الدین کبریٰ رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہونے گئے تھے۔ شیخ نے بیعت کیا۔ اور ذکر وشغل تعلیم کر کے ایک حجرہ میں رہنے کا امر کیا یہ ذکر وشغل میں مصروف ہو گئے تو چند روز کے بعد یہ محسوس ہوا کہ دل میں سے کوئی چیز نکل کر بھاگی جا رہی ہے شیخ سے عرض کیا فرمایا یہ آپ کا منطق وفلسفہ ہے جو قلب سے نکل رہا ہے۔ انہوں نے کہا حضرت میں نے تو اس کو بڑی محنت سے حاصل کیا تھا اس کا قلب سے محو ہونا تو مجھے گوارا نہیں۔ فرمایا اس کے عوض تم کو حق تعالیٰ دوسرے علوم عطا فرمائیں گے جو حقیقی علوم ہیں اور یہ تو کتابی علم ہے وہ وہبی علم ہوگا۔

بینی اندر خود علوم انبیاء　　بے کتاب وبے معید واوستا

(بے کتاب وبے مددگار واستاد کے اپنے اندر انبیاء جیسے علوم پاؤ گے)

مگر امام رازی کو گوارا نہ ہوا۔ شیخ نے کہا پھر تمہیں اختیار ہے چنانچہ یہ ذکر وشغل چھوڑ کر درس

وتدریس میں مشغول ہوگئے۔ اتفاق سے شیخ کی زندگی ہی میں امام کی وفات کا وقت آگیا اور نزع کی حالت میں شیطان ان کے پاس آیا اور کہا تم دنیا سے جا رہے ہو توحید بھی سالم لے چلے ہو کہا ہاں الحمد للہ میری توحید سالم ہے۔ شیطان نے کہا ذرا مجھے تو بتلاؤ تمہارے پاس توحید کی کیا دلیل ہے۔ امام رازی نے کتاب التوحید میں توحید کے سو دلائل لکھے تھے وہ بیان کرنا شروع کئے اور شیطان کم بخت نے ایک ایک دلیل کو توڑنا شروع کیا یہاں تک کہ ان کے تمام دلائل کو توڑ دیا۔ اب تو امام رازی کا رنگ فق ہوگیا۔ شیطان نے کہا کہ یہ تو آپ کی توحید کا حال تھا جو رکن اعظم اسلام ہے جس میں آپ جہل مرکب کے اندر مبتلا تھے۔ اس پر دوسرے مسائل کو بھی قیاس کرلو۔ یہ واقعہ شیخ نجم الدین کبریٰ کو منکشف ہوگیا۔ اس وقت شیخ وضوء کر رہے تھے۔ امام رازی کی پریشانی دیکھ کر شیخ گھبرا گئے اور فرمایا کہ اس وقت ایک بہت بڑے عالم کا ایمان خطرہ میں ہے۔ ایک خادم جو حضرت کو وضوء کرا رہا تھا بولا کہ حضرت پھر آپ دستگیری فرمایئے شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے اسی جگہ سے ایک چلو پانی امام رازی کی طرف پھینکا۔ حالانکہ وہ بہت دور دراز فاصلہ پر تھے مگر شیخ کی کرامت تھی کہ حق تعالیٰ نے وہ چلو بھر پانی امام رازی کے منہ پر پہنچا دیا جس سے ان کے حواس بجا ہوئے۔ پھر شیخ نے کہا کہ شیطان سے یہ کیوں نہیں کہہ دیتے کہ ”نا معقول میں بلا دلیل خدا کو واحد اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سچا رسول صلی اللہ علیہ وسلم مانتا ہوں“ بطور کرامت ہی کے یہ آواز بھی ان کے کان میں پہنچی۔ جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جمعہ کا خطبہ پڑھتے ہوئے منکشف ہوا کہ لشکر اسلام دشمن کے نرغہ میں ہے اور دشمن غالب ہوا چاہتا ہے، تو آپ نے خطبہ ہی میں جوش سے فرمایا یاساریۃُ الْجبل یاساریۃُ الْجَبل کہ اے ساریہ (یہ سردار لشکر کا نام ہے) پہاڑ کی پناہ اور حق تعالیٰ نے یہ آواز مدینہ سے لشکر اسلام میں پہنچا دی جو اس وقت شام یا عراق میں تھا اور حضرت ساریہؓ نے حضرت عمرؓ کی آواز سن کر پہاڑی مورچہ پر قبضہ کرلیا جس کے بعد دشمن کی فوج کے حوصلے پست ہوگئے اور لشکر اسلام کو فتح ہوئی۔ ایسے ہی یہاں ہوا اور امام رازی نے شیطان کو بھی جواب دیا کہ ”او نا معقول میں بلا دلیل کے خدا کو واحد اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سچا رسول صلی اللہ علیہ وسلم مانتا ہوں“ یہ جواب دینا تھا کہ شیطان دم دبا کر بھاگا اور حضرت شیخ نے خادم کو بشارت دی کہ الحمد للہ امام رازی شیطان کے جال سے نکل گئے۔

دست پیر از غائباں کوتاہ نیست دست او جز قبضۂ اللہ نیست

(پیر کا ہاتھ (توجہ) غائبوں سے کوتاہ نہیں ہے۔ اس کا سوائے اللہ کے دوسرے کے قبضہ میں نہیں ہے۔)

اس میں علم غیب کا دعویٰ نہیں ہے کہ پیروں کو (معاذ اللہ) مریدوں کا حال ہمیشہ معلوم ہوجاتا ہے بلکہ بات یہ ہے کہ یہ حضرات مقبولان الٰہی ہیں تو جو ان سے وابستہ ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو محروم

نہیں رکھنا چاہتے۔ جس کے طرق مختلف ہوتے ہیں اور ان میں سے ایک طریق یہ بھی ہے کہ بعض اوقات اللہ تعالیٰ ان مشائخ کو کشف کے ذریعے سے اطلاع دے دیتے ہیں اور ان کو حکم دیتے ہیں کہ اس شخص کی امداد کرو اور کبھی شیخ کو اطلاع بھی نہیں ہوتی۔ کوئی لطیفہ غیبی شیخ کی صورت میں آ کر مدد کر جاتا ہے۔ بس اصل یہ ہے کہ اگر ابتلاء اللہ کی طرف سے وارد ہے تو لطفاً انہی کی طرف سے درمان بھی ہے۔

دردازیارست ودرماں نیز ہم   دل فدائے اوشد وجان نیز ہم

(بیماری دوست کی طرف سے اور علاج بھی۔ اس پر میرا دل فدا ہے اور جان بھی)

بیماری بھی وہی دیتے ہیں نسخہ بھی وہی پلاتے ہیں یہ ہر وقت کا مشاہدہ ہے کہ اس طریق میں جال بھی ہیں اور ان کے کاٹنے کی قینچیاں بھی ہیں۔ اسی کو مولٰنا نہایت جوش سے فرماتے ہیں۔

صد ہزاراں دام ودانہ است اے خدا   ماچو مرغان حریص وبے نوا
دمبدم پابستہ دام تو ایم   گرہمہ شہباز وسیمرغے شویم
می رہانی ہر دمے مارا وباز   سوئے دامے می رویم اے بے نیاز

(اے خدا سینکڑوں جال اور دانہ ہیں ہم پرندوں کی طرح حریص وبے نوا ہیں ہر دم آپکے جال کے پابستہ ہیں اگرچہ شہباز اور سیمرغ کیوں نہ ہوں ایک جال سے آپ ہم کو رہائی دیتے اور ہم دوسرے جال میں پھنس جاتے ہیں)

ایک جال سے نکلتے ہیں دوسرے میں پھنستے ہیں پھر حق تعالیٰ نے اس کے کاٹنے کو بھی قینچی تیار کر رکھی ہے۔ بس یہی قصہ ہے کہ ہر وقت کا مرنا اور ہر وقت کا جینا ہے۔

کشتگان خنجر تسلیم را   ہر زمان از غیب جان دیگر است

(خنجر تسلیم کے کشتوں کو ہر زمانہ میں ایک اور جان عطا ہوتی ہے)

چنانچہ امام رازیؒ کو اللہ تعالیٰ نے ایک بیماری دی کہ شیطان نے ان کو پریشان کر دیا تو اس کے ساتھ دوا بھی نازل کی کہ شیخ کو کشف ہوگیا۔ شیخ نے خادم کو اس حال پر مطلع کیا اس نے امام کی سفارش کی کہ دستگیری فرمایئے شیخ کو جوش ہوا کیونکہ وہ ماذون من اللہ تھے اور انہوں نے باطناً بھی توجہ کی جس سے امام رازی کے قلب سے وساوس وخطرات رفع ہوگئے اور ظاہری اعانت بھی کی کہ وہ جواب تعلیم کیا جس نے شیطان کے جال کو تار تار کر کے توڑ دیا۔ اسی لئے تو حدیث میں ہے فَقِيهٌ واحِدٌ اَشَدُّ عَلَى الشَّيْطَانِ مِنْ اَلْفِ عَابِدٍ (سنن الترمذی ۲۶۸۱) ایک فقیہ

ہزار عابدوں سے زیادہ شیطان پر بھاری ہے۔ یہاں فقیہہ سے مراد عارف ہے جو مکائد شیطان سے واقف ہو، جزئیات فقہ کا حافظ مراد نہیں۔ کیونکہ جزئیات فقہ تو امام رازیؒ کو شیخ نجم الدین کبریٰؒ سے زیادہ یاد تھے۔ مگر دیکھ لیجئے کہ شیطان کے جال کو کس نے توڑا۔

اسی لئے میں کہتا ہوں کہ اسرار اور حکم اور ابحاث سے تسلی حاصل نہیں ہو سکتی، اور نہ ان سے شیطان بھاگتا ہے۔ تسلی اسی سے ہوتی ہے کہ خدا کا حکم یوں ہی ہے بس ہم بے دلیل کے مانتے ہیں اسرار و حکم کے یا علوم کشفیہ کے درپے نہ ہو یہ خطرات سے خالی نہیں۔ بس طریق تصوف سے اتنا حصہ لے لو کہ اخلاص واحسان حاصل کر لو جس کو نسبت کہتے ہیں۔ بس اس سے زیادہ اور کچھ نہ لو۔ صوفیہ کی تحقیقات اور کشفیات کا مطالعہ یہ سانپ ہیں ان سے دور رہو۔

نکتہ ہچوں تیغ پولا دست تیز　　چوں نداری تو سپر واپس گریز
پیش ایں الماس بے اسپر میا　　کز بریدن تیغ را نبود حیا

(تصوف کی باریکیاں فولادی تلوار سے بھی زیادہ تیز ہیں جب تمہارے پاس ڈھال نہیں ہے واپس آؤ۔ اس تلوار کے سامنے بغیر ڈھال نہ آؤ۔ اس لئے تلوار کو کاٹنے سے حیا نہیں آتی)

اور یہ جو میں نے کہا ہے کہ علل اور ابحاث سے تسلی نہیں ہوتی بلکہ اطمینان اسی سے ہوتا ہے کہ اللہ ورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم ہے۔ اس کی تائید اس قصہ سے تو ہوتی ہی ہے جو ابھی بیان کیا گیا ہے۔ حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وسوسہ کا علاج یہ بتلایا ہے کہ وسوسہ کے وقت امَنْتُ باللهِ وَرَسُوْلِه (میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان دیا) کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دلائل معلوم نہ تھے یقیناً معلوم تھے مگر دلائل میں غور کرنے کی تعلیم اسی لئے نہیں فرمائی کہ یہ سلسلہ غیر متناہی ہے۔ اس سلسلہ میں شبہات پر شبہات نکلتے چلے آئیں گے۔

جواب جاہلاں:

اس لئے وہ بوٹی بتلائی جو ہزار جواہرات سے بھی انفع ہے مگر افسوس اس کی قدر نہیں کی جاتی کیونکہ بوٹی بہ نسبت جواہر کے ارزاں اور سہل الحصول ہے اور قاعدہ ہے۔

ہرکہ او ارزاں خرد ارزاں دہد　　گوہرے طفلے بقرص ناں دہد

(جو شخص کسی چیز کو ارزاں لیتا ہے، ارزاں دے بھی دیتا ہے۔ چنانچہ نادان قیمتی موتی کو روٹی کے عوض دے دیتا ہے۔

لوگ لمبے لمبے جوابوں کی قدر کرتے ہیں۔ مختصر اور سہل جواب کی قدر نہیں کرتے آج کل ہی میں شاملی سے ایک پان فروش کا خط آیا تھا جس میں اسی قسم کا سوال تھا۔ میں نے اس کا مختصر جواب دیا تو وہ لکھتے ہیں کہ خشک جواب سے تسلی نہیں ہوتی۔ چونکہ وہ پان فروش ہے اور پان پانی کا نر؟ تو اس نے پانوں کی طرح جواب کے لئے بھی تری لازمی سمجھی۔

مگر یہ ایسا قیاس ہے جیسا شیخ سعدیؒ کی باندی نے قیاس کیا تھا کہ ایک شخص شیخ سے ملنے آیا۔ باندی دروازہ پر نام پوچھنے گئی اور کچھ دیر تک اس سے باتیں کر کے واپس آئی تو شیخ نے پوچھا کون تھا؟ کہا غبد اللہ (غین معجمہ سے) شیخ نے فرمایا غبد اللہ کیا ہے؟ کہا اس کی عین یعنی آنکھ میں نقطہ یعنی پھولا ہے اس لئے میں نے کہا بجائے عبد اللہ کے غبد اللہ کہا پوچھا وہ کیا کہتا تھا؟ کہا کچھ نہیں ایک معمولی بات تھی۔ میں نے خود ہی جواب دیا وہ یہ پوچھتا تھا کہ استنجا میں پاکی کب ہوتی ہے۔ کتنا دھویا جائے؟ میں نے کہا اتنا دھویا جائے کہ کھال چوں چوں بولنے لگے۔ جیسے برتن کو رگڑتے ہیں تو وہ چوں چوں کرتا ہے اس نے موضع استنجاء کو برتن پر قیاس کیا، ایسے ہی اس پان فروش نے جواب سوال کو پانوں پر قیاس کیا کہ جواب بھی تر ہونا چاہیے۔ حالانکہ یہ قیاس غلط ہے۔ جواب کے لئے تری کی ضرورت نہیں۔ بعض دفعہ خشکی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ بلکہ بعض دفعہ ضرب یضرب یعنی سختی کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور ضرب یضرب میں ایسی برکت ہے کہ اس سے بہت جلد تمام شبہات حل ہو جاتے ہیں۔ ہمارے مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

اَلْوَعْظُ يَنْفَعُ لَوْبِالْعِلْمِ وَالْحِكَمِ وَالسَّيْفُ اَبْلَغُ وَعَاظٍ عَلَى الْقُمَمِ

(نصیحت اگر علم وحکمت کے ساتھ ہو تو نفع پہنچاتی ہے اور تلوار سروں پر پڑنی نصیحت گروں میں سب سے بلیغ نصیحت گر ہے۔)

اور کئی مرتبہ فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانچ کتابیں نازل فرمائی ہیں، چار تو مشہور ہیں تورات وزبور وانجیل وقرآن اور ایک پانچویں کتاب بھی آسمان ہی سے نازل ہوئی ہے چنانچہ ارشاد ہے وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ (اور ہم نے لوہے کو پیدا کیا جس میں شدید ہیبت ہے) جب چاروں کتابوں سے کسی کی اصلاح نہ ہو تو اس کے لئے پانچویں کتاب کی ضرورت ہے وہ حدید ہے یعنی نعلدار جوتا۔

ایک شخص وساوس میں مبتلا تھے اور میں ان کا علاج کرتا تھا ایک دن وہ کہنے لگے کہ اب تو یہ وسوسہ ہوتا ہے کہ عیسائی ہو جاؤں میں نے اس کے جواب میں زور سے ایک دھول رسید کیا اور کہا

ن ۔ ق جا دور ہوا بھی عیسائی ہو جا! اسلام کو ایسے ناپاکوں کی ضرورت نہیں! اس ڈھول کی ایسی برکت ہوئی کہ دس برس سے زیادہ زمانہ ہوا آج تک ان کو ایک دو شبہات بھی تو نہ ہوئے۔

اسی طرح ایک ذاکر کی عادت تھی کہ وہ ذکر میں اٹھ اٹھ کر بھاگتے تھے میں نے اس کا یہ علاج کیا کہ اپنے پاس بٹھلا کر ان سے ذکر کرایا اور جب بھاگنے لگے زور سے ہاتھ پکڑ کر بٹھلا دیا اور دو دھپ رسید کئے۔ پھر عمر بھر ان کو یہ جوش نہ آیا۔ خیر یہ طرز عمل تو سب کے ساتھ نہیں ہو سکتا کیونکہ ہماری حکومت نہیں لیکن یہ تو ہو سکتا ہے کہ جاہلوں کو منہ نہ لگایا جائے اور ان کے لایعنی سوالات کا خشک جواب دیا جائے اس سے بھی ان کا دماغ درست ہو جاتا ہے۔

چنانچہ ایک بار میں سہارنپور گیا تو وہاں ایک صاحب بہشتی زیور بغل میں دبائے ہوئے لائے اور ایک مسئلہ دکھا کر مجھ سے کہنے لگے کہ یہ مسئلہ دیکھ لیجئے میں نے کہا کہ میری تو ساری کتاب بار بار کی دیکھی ہوئی ہے۔ مجھے آپ کیا دکھلاتے ہیں؟ کہنے لگے یہ مسئلہ سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے کہا کہ اس کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا یا اس کی دلیل سمجھ میں نہیں آئی؟ اگر مطلب سمجھ میں نہیں آیا تو میں اس سے زیادہ آسان عبارت میں بیان کرنے پر قادر نہیں میرے نزدیک بہشتی زیور نہایت آسان اردو میں ہے۔ کہنے لگے کہ مطلب تو سمجھ لیا دلیل سمجھ میں نہیں آئی میں نے کہا کہ کیا اس مسئلہ کے سوا بہشتی زیور کے تمام مسائل کی دلیلیں آپ نے سمجھ لی ہیں؟ یا اور بھی کچھ ایسے مسائل ہیں جن کی دلیلیں معلوم نہیں ہوئیں؟ اور اگر سب کی دلیلیں معلوم ہو چکی ہیں تو مجھے سوال کی اجازت دیجئے کہ میں کسی مسئلہ کی دلیل آپ سے دریافت کروں؟ کہنے لگے کہ نہیں اور بھی بہت سے مسائل ایسے ہیں جن کی دلیل مجھے معلوم نہیں۔ میں نے کہا پھر اس کو بھی اسی فہرست میں داخل کر لیجئے اسی کی دلیل جاننے کی کیا ضرورت ہے۔ بس اب ان کی منطق ختم ہو گئی اور کتاب بغل میں دبا کر رخصت ہو گئے بعد میں معلوم ہوا کہ اس شخص نے تین روز سے حضرات علمائے سہارنپور کو تنگ کر رکھا تھا اور وہ حضرات خوش اخلاقی سے ان کو دلیل سمجھا رہے تھے لیکن میں نے چار منٹ میں اس کو لاجواب کر کے اٹھا دیا۔

ان کے جانے کے بعد ایک صاحب جنٹلمین تشریف لائے اور تہذیب و خیر خواہی کے لہجے میں فرمانے لگے کہ بعض جہلاء اس مسئلہ پر طعن کرتے ہیں جس سے ہمارا دل دکھتا ہے کہ ہمارے سامنے ہمارے بزرگوں کو برا بھلا کہا جاوے اس لئے مناسب ہے کہ بہشتی زیور کے اس مسئلہ کے متعلق جو مخالفین کا اعتراض ہے اس کے جواب کے لئے ایک جلسہ منعقد کر کے حق کو واضح کر دیا

جائے۔ میں نے کہا کہ آپ کی خیر خواہی میں شک نہیں مگر یہ بتلایئے دنیا میں ایک جماعت یعنی دہریہ خدا تعالیٰ کو اور ایک جماعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور ایک جماعت صحابہ کو اور آئمہ مجتہدین کو برا بھلا کہتی ہے اور یقیناً اس سے بھی آپ کا دل مجروح ہوتا ہے آپ نے اس کا کیا انتظام کیا ہے؟ ہر کام ترتیب سے اچھا ہوتا ہے آپ پہلے ان جماعتوں کا انتظام کر دیجئے اخیر میں ایسے جماعت کا میں انتظام کر دوں گا جو بہشتی زیور پر طعن کرتے ہیں بس اس کا کچھ جواب نہ تھا میں کہتا ہوں کہ جاہلوں کا جواب لاعلمی جوابوں سے نہیں ہو سکتا بس ان کے لئے تو پانچویں کتاب ہو یا یہ کہ ان کو جواب مت دو دھمکا دو خشک جواب دے دو جیسا میں نے سہارنپور میں دیا تھا۔

ہاں اگر کوئی استفادہ کی غرض سے سوال کرے اور اس میں استفادہ کی قابلیت بھی ہو تو اس کے لئے ہم ہر وقت علمی جواب دینے کو تیار ہیں اور اگر استفادہ مطلوب نہ ہو یا اس میں اس تحقیق کی استعداد نہ ہو تو اس کو علمی جواب ہرگز نہ دو کیونکہ اس سے اس کی اصلاح نہ ہوگی بلکہ اور زیادہ ہلاک ہوگا اور شبہات کا سلسلہ بڑھتا چلا جائے گا دیکھو اگر ایک پودا سا آدمی آ نے اور یہ کہے کہ میرے سر پر یہ دو من کا بورا اٹھوا دو بتلایئے ہم کیونکر دو من کا بورا اس کو اٹھوا دیں یقیناً اس کا تو گوہ نکل جائیگا۔

جیسے ایک شخص کا قصہ ہے کہ وہ رات کو بستر پر پیشاب کر لیا کرتا تھا بیوی نے ملامت کی کمبخت یہ کیا حرکت ہے کہ تو بڑی عمر کا آدمی ہو کر رات کو بستر پر موتتا ہے کہنے لگا کیا بتلاؤں رات کو ہر روز شیطان خواب میں آتا ہے کہ چلو سیر کو چلیں میں ساتھ ہو لیتا ہوں راستہ میں پیشاب کی ضرورت ہوتی ہے اس وقت میں اپنے نزدیک قدمچہ پر بیٹھ کر پیشاب کرتا ہوں اور وہ بستر پر نکل جاتا ہے۔ بیوی بھی اس کی بے وقوف تھی کہنے لگی کہ جب شیطان جو جنات کا بادشاہ ہے تمہارا ایسا دوست ہے تو اس سے یوں کہنا کہ ہم غریب آدمی ہیں کہیں سے بہت سا روپیہ ہم کو دلا دے۔ مرد نے کہا آج کی رات آیا تو ضرور کہوں گا چنانچہ رات کو خواب میں شیطان آیا اور اس نے بیوی کی فرمائش اس سے ظاہر کی۔ شیطان نے کہا یہ کون سی بڑی بات ہے دونوں چلے اور خزانہ میں لے جا کر شیطان نے اس کے اوپر روپیہ لادنا شروع کیا اتنا لادا کہ میاں کا گوہ نکل گیا۔ صبح کو آنکھ کھلی تو خزانہ تو غائب، البتہ بستر پر پیشاب کے ساتھ گوہ کا ڈھیر موجود تھا۔

بیوی نے کہا کیا واہیات ہے؟ اس نے سارا قصہ کہا وہ کہنے لگی کہ میں ایسے خزانہ سے باز آئی تم پیشاب ہی کر لیا کرو تو اچھا ہے جو! تحمل سے زیادہ کسی پر بوجھ لادنے کا انجام یہی ہے کہ اس کو حاصل تو کچھ نہ ہوگا ہاں ہلاکت میں پڑ جائے گا۔ اس لئے ہمارے حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو مناظرہ

سے بہت نفرت تھی۔ فرمایا کرتے تھے کہ جب کوئی تم سے کسی مسئلہ میں الجھے تو تم بحث کبھی نہ کرو بلکہ سب رطب ویابس اس کے سامنے رکھ کر خود الگ ہو جاؤ اور کہہ دو کہ تم اس میں حق و باطل کو خود ہی انتخاب کر لو جیسے ایک شخص نے حجام سے کہا تھا کہ میری ڈاڑھی میں سے سفید سفید بال چن کر الگ کر دو۔ حجام نے استرہ سے ساری ڈاڑھی جدا کر کے اس کے سامنے رکھ دی کہ مجھ کو اتنی فرصت نہیں آپ خود سفید و سیاہ کو الگ کر لیجئے۔

مولنا رومیؒ نے مثنوی میں حکایت لکھی ہے کہ ایک شخص بانسری بجا رہا تھا کہ دفعۃً ریح صادر ہوئی تو اس نے بانسری منہ سے ہٹا کر دبر میں لگا دی اور کہا کہ بی اگر تو مجھ سے اچھا بجانا جانتی ہے تو تو ہی بجالے۔ حکایت تو فحش ہے مگر مولنا نے اس سے نتیجہ بہت عمدہ نکالا ہے۔

فرماتے ہیں کہ جب تم کوئی مضمون بیان کر رہے ہو اور کوئی مدعی نااہل بک بک کرنے لگے تو تم چپ ہو جاؤ اور اس سے کہہ دو کہ اچھا بھائی تو ہی بول لے ہم خاموش ہوتے ہیں مولنا نے اس جگہ مدعی کو دبر سے تشبیہ دی ہے واقعی بلیغ تشبیہ ہے کیونکہ مدعی بھی اپنی خرافات سے عالم کو متعفن کرتا ہے مگر آج کل طلبہ میں یہ مرض ہو گیا ہے کہ وہ ہر شخص کے جواب دینے کو تیار ہو جاتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو کچھ کام نہیں اس لئے ذرا ذرا سی بات میں بحث کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ ایک دفعہ میں ریل میں سوار تھا اپنے احباب میں تصویر کے مسئلہ پر گفتگو ہو رہی تھی وہاں ایک پادری بھی بیٹھا ہوا تھا وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ہمارے پاس آیا اور کہا میں بھی پوچھ سکتا ہوں (یہ آج کل محاورہ ہو گیا ہے کہ وقوع سے صیغہ امکان میں سوال کرتے ہیں) میں نے کہا آیئے جناب پوچھئے (میں کفار کو جنابت سے جناب کہا کرتا ہوں کیونکہ وہ غسل جنابت نہیں کرتے) کہنے لگا کہ اسلام میں تصویر کیوں حرام ہے؟ اگر یہ سوال کسی نئے مولوی سے کیا جاتا تو دو گھنٹہ تک اس سے بحث کرتے مگر میں اس روگ کو نہیں پالتا میں نے جواب دیا کہ مسئلہ فروع میں سے ہے اور فروع سے اصول مقدم ہیں آپ کو ابھی تک ہمارے اصول ہی مسلم نہیں اس لئے فروع کے سوال کا آپ کو حق نہیں کہنے لگا یہ تو سچ ہے کہ مجھے اس سوال کا حق نہیں مگر میں نے چاہا تھا کہ سفر میں علمی گفتگو سے مشغلہ ہو جاتا میں نے کہا کہ مذہبی مسائل کو مشغلہ بنانا آپ کو مبارک ہو۔ ہمارا مذہب ایسا نہیں کہ ہم اس کو مشغلہ بنائیں۔ بس اب وہ خاموش تھا اور اپنے اس جواب پر سخت شرمندہ تھا۔

اسی طرح ایک بار ایک ہندو آریہ نے ریل میں مجھ سے پوچھا کہ اگر کوئی مسلمان ایک نیک کام کرے اور وہی کام کافر بھی کرے تو دونوں کا اجر برابر ہو گا یا کم زیادہ۔ میں نے کہا افسوس ہے

آپ مجھ سے ایسا سوال کر رہے ہیں جس کا جواب خود آپ کے ذہن میں موجود ہے کہنے لگا یہ کیوں کر؟ میں نے کہا اس لئے کہ اس جواب کے مقدمات سب آپ کے ذہن میں ہیں کہنے لگا یہ کیونکر معلوم ہوا؟ میں نے کہا ابھی آپ اقرار کئے لیتے ہیں۔ سنیئے کیا آپ نہیں جانتے کہ ہر مذہب والا اپنے مذہب کو حق اور دوسرے مذاہب کو باطل سمجھتا ہے ایک مقدمہ تو یہ ہے دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ مذہب حق والا مثل مطیع سلطنت کے اور مذہب باطل والا مثل باغی سلطنت کے ہے۔ اور تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ بغاوت ایسا جرم ہے جو انسان کے تمام کمالات کو بیکار اور لاشئے کر دیتا ہے چنانچہ اگر کسی جامع الکمالات باغی کو پھانسی ہونے لگے کوئی عاقل یہ شبہ نہیں کرتا کہ اس کے کمالات کو مانع سزا نہیں سمجھا گیا اور یہ سب مقدمات بدیہی ہیں جو آپ کو پہلے سے معلوم ہیں اب ان سب کو ملا کر دیکھئے آپ کے سوال کا جواب خود نکل آئے گا اور ان مقدمات کو جان کر مجھ سے سوال کرنے کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہے کہ میرے منہ سے اپنی نسبت کافر کا لفظ سننا چاہتے ہیں تو وہ آریہ اس تقریر پر فریفتہ ہو کر کہنے لگا کہ واقعی میری نیت یہی تھی کہ آپ مجھے کافر کہیں کیونکہ ایسے منہ سے کافر کا لفظ سننا بھی موجب لذت ہے۔ میں نے کہا یہ آپ کی لیاقت ہے لیکن میری اسلامی تہذیب مجھے اس سے منع کرتی ہے کہ میں بلا ضرورت کسی کا دل دکھاؤں۔ ریل میں سفر کرتے ہوئے اکثر ایسا اتفاق ہوا ہے کہ ہم لوگ آپس میں مسائل شرعیہ کی تحقیق میں گفتگو کرتے تو کفار ان کو غور سے سنتے اور ان پر اثر ہوتا تھا کیونکہ حق میں ایک خاص کشش ہے جو باطل میں کبھی نہیں ہوتی۔

چنانچہ ایک دفعہ ہم لوگ باتیں کر رہے تھے تو چند ہندو آپس میں کہنے لگے کہ ان کی باتوں کی طرف دل کھنچتا ہے دوسرے نے کہا یہ سچے ہونے کی علامت ہے۔ ایک دفعہ ہم باتیں کر رہے تھے جب اسٹیشن آ گیا اور اترنے لگے تو ایک ہندو نے حاضرین سے کہا کہ کیا نور برس رہا تھا اب سارا نور یہ اپنے ساتھ لے چلے۔ تو صاحبو! آپ بحث و مباحثہ نہ کریں۔ آپس میں مسلمانوں ہی سے اسلام کی تعلیم پر گفتگو کرتے رہیں اسی کا کفار پر اثر ہوگا بحث کا اثر نہیں ہوتا کیونکہ اس میں مخالف ضد پر آ جاتا ہے اور سچے طالب تحقیق آج کل کہاں ہیں؟ یہ سب گفتگو اس پر چلی تھی کہ اس جگہ حق تعالیٰ نے قتال و شقاق کو تکفرون سے تعبیر فرمایا ہے اور میں نے کہا تھا کہ یہ استعمال محاورات کے موافق ہے حقیقت پر محمول نہیں۔ خوارج و معتزلہ کی جہالت ہے کہ انہوں نے محاورات کو تدقیق پر محمول کرنا شروع کر دیا اس لئے متکلمین کو علم کلام مدون کرنے کی ضرورت ہوئی اس پر یہ تقریر طویل ہو گئی اور یہاں سے یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ آج کل جو (یہ تفسیر اس لئے کی گئی کہ بعض جاہلوں نے ایک جلسہ میں لفظ ہم کی تفسیر ہندو

مسلمان سے کی ہے اس طرح سے کہ ہ سے مراد ہندو اور م سے مراد مسلمان ۱۲ جامع۔) جو ہم لوگوں میں یعنی مسلمانوں میں نااتفاقی ہے دیکھ لیا جائے کہ یہ کیسی سخت حالت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو کفر سے تعبیر فرمایا ہے چنانچہ حضرات صحابہ اس کو سن کر چونکے اور اپنی غلطی پر متنبہ ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے آئندہ کے لئے ان کو دستور العمل بتلایا کہ خیر جو ہو چکا ہو چکا گذشتہ تو گذشتہ ہوا آئندہ کا بندوبست کرو تا کہ پھر اس معصیت کا خطرہ نہ رہے۔ چنانچہ اول تقویٰ اور اسلام پر مداومت کا امر ہے پھر اعتصام بحبل اللہ کا امر ہے پھر ارشاد ہے وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا اور تم پر جو اللہ کا انعام ہے اس کو یاد کرو جب کہ تم دشمن تھے پس اللہ تعالیٰ نے تمہارے قلوب میں الفت ڈال دی سو تم خدا کے انعام سے آپس میں بھائی بھائی ہو گئے۔) جس میں نعمت اتفاق کے یاد کرنے کا حکم ہے کہ اس نعمت کو اور اس کی برکات کو یاد کرو اور موازنہ کرو کہ تمہاری پہلے کیا حالت تھی اور اس کا نتیجہ کیسا وخیم تھا اور اتفاق کے بعد کیا حالت ہو گئی اور اس کا انجام نعیم مقیم ہے۔

تسہیل و تکمیل عمل:

شاید بعض لوگوں کو اس وقت یہ خیال ہوا ہوگا کہ میں آج اتفاق و اتحاد کا مضمون بیان کروں گا کیونکہ بظاہر یہاں یہی مضمون مذکور ہے لیکن مجھے دوسری بات بیان کرنا ہے جو اتفاق و اتحاد کی بھی جڑ ہے اور وہ ایسی بات ہے جو راستہ طے کرنے والوں کو پیش آتی ہے اور ان کی ضرورت کی ہے کیونکہ مسلمانوں میں دو قسم کے آدمی ہیں ایک تو وہ جنہوں نے دین کا کام شروع ہی نہیں کیا دوسرے وہ جو کام شروع کر چکے ہیں اور راستہ میں ہیں۔ پہلی جماعت کا علاج تو یہ ہے کہ ان کو کام میں لگا دیا جائے اور جو لوگ راستہ طے کر رہے ہیں ان کے لئے ایصال کی ضرورت ہے تو یہ مضمون ایصال کی قبیل سے ہے اراءۃ طریق کی قبیل سے نہیں اور گو مضمون نیا نہیں لیکن عنوان نیا ہے چنانچہ معلوم ہو جائے گا کہ اس آیت کا مطلب اس عنوان سے بہت کم لوگوں نے سمجھا ہوگا۔ اب میں مقصود کو شروع کرتا ہوں اور ان شاء اللہ تعالیٰ مختصر ہی بیان کروں گا کیونکہ اول تو وہ بات ہی مختصر ہے دوسرے اس وقت کچھ طبیعت بھی مضمحل ہے جن بزرگوں کی وجہ سے یہ بیان ہو رہا ہے ان کی درخواست تو کل گذشتہ کے متعلق تھی مگر کل طبیعت زیادہ مضمحل تھی کیونکہ کل رات ایک طوطے نے بے وقت ٹرٹر لگائی جس سے نیند اچاٹ ہو گئی پھر دیر تک نیند نہ آئی جب کچھ نیند آئی تو اس نے پھر بولنا شروع کیا آخر اس کو عالم بالا میں پہنچایا (یعنی بالا خانہ) تب کچھ نیند آئی مگر بھری نہیں آج بھی طبیعت پر قدرے اضمحلال کا اثر ہے مگر کل جیسا نہیں اس لئے مختصر ہی بیان کروں گا۔ حضرات صحابہ

نے بھی بعض دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مختصر بات کا سوال کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو رد نہیں فرمایا بلکہ درخواست کو قبول کر کے مختصر بات بتلا دی چنانچہ ایک صحابی نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احکام شرعیہ بہت زیادہ ہو گئے ہیں۔ مجھے ایک مختصر بات بتلا دیجئے جس کو میں دستور العمل بنالوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قُلْ اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ ثُمَّ اسْتَقِمْ (ایمان لایا میں اللہ پر اور اس پر استقامت کر)

صحابیؓ کے اس سوال سے یہ مراد نہ تھی کہ فرائض میں اختصار ہو جائے یا ایسی بات بتلا دی جائے جس سے سب مسائل مستنبط ہو جائیں کیونکہ اس جواب سے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا ہے سب مسائل کیسے مستنبط ہوں گے؟ بھلا سجدۂ سہو کا وجوب اس سے کیونکر مستنبط اور اگر کھینچ تان کر کے نکالا بھی گیا تو وہ استنباط نہ ہوگا بلکہ چپکا ہوگا جیسے آج کل ایک فرقہ قرآنیہ نکلا ہے جو حدیث کو نہیں مانتا پہلے ایک فرقہ غیر مقلدین نکلا تھا جس نے فقہ کو اڑا دیا تھا اب یہ فرقہ نکلا ہے جس نے حدیث کو بھی اڑا دیا۔ اندیشہ ہے کوئی کم بخت ایسا نہ نکلے جو قرآن ہی کو اڑا دے (معلوم ہوا ہے کہ پٹیالہ میں ایک مدعی نبوت نکلا ہے وہ قرآن کی بھی نفی کرتا ہے۔ قاتله الله من لعين مارد ۱۲)

آج کل یہ حالت ہے کہ ایک فتنہ دبنے نہیں پاتا کہ دوسرا کھڑا ہو جاتا ہے۔

اِذَا سُدَّمِنْهَا مَنْجَرٌ جَاشَ مَنْجَرٌ

(ایک فتنہ دباؤ تو دوسرا فتنہ کھڑا ہو جاتا ہے)

سو اس فرقہ کے بانی سے کسی نے پوچھا کہ تم حدیث کی تو نفی کرتے ہو اور سارے مسائل قرآن ہی سے مستنبط کرتے ہو تو بتلاؤ کہ عدد رکعات نماز کی دلیل قران میں کہاں ہے تو وہ کہتا ہے کہ اس کا جواب کل دوں گا بھلا یہ حماقت تو دیکھئے کہ استدلال تو کل ہوگا اور عمل پہلے ہی سے شروع کر دیا اگر یہ عمل قرآن پر مبنی تھا تو اس میں سوچ کیوں ہوئی اور قرآن پر مبنی نہ تھا تو کس پر مبنی تھا۔ اگر حدیث وفقہ پر مبنی تھا تو اس نے عمل سے ثابت کر دیا کہ قرآن کے سوا بھی کوئی چیز حجت ہے غرض اگلے دن آپ تشریف لائے اور دعویٰ کیا کہ میں قرآن سے رکعت صلوٰۃ کا ثبوت دوں گا سنیئے حق تعالیٰ فرماتے ہیں اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا اُولِیْٓ اَجْنِحَۃٍ مَّثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ (تمام تر حمد اللہ کو لائق ہے جو آسمان اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے جو فرشتوں کو پیغام رساں بنانے والا ہے جن کے دو دو اور تین تین اور چار چار پر و بازو ہیں) کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو پیام رساں بنایا ہے جن میں کسی کے دو بازو ہیں کسی کے تین کسی کے

چار بس ایسی ہی نمازوں کی رکعات کا عدد مختلف ہے بھلا کوئی پوچھے کہ یہاں تو فرشتوں کی بازوؤں کا ذکر ہے اس کو رکعت صلوۃ سے کیا تعلق؟ اور اگر محض عدد کا ذکر ہی استنباط کے لئے کافی ہے تو پھر ایک رکعت کی بھی نماز ہونا چاہیے کیونکہ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ میں ایک کا ذکر ہے یہ تو وہی مثل ہوئی کہ کسی طالب علم سے کسی نے کہا تھا کہ دو اور دو کے ہوتے ہیں وہ جواب دیتا ہے کہ چار روٹیاں تو جیسے دو اور دو کی دلالت روٹیوں پر ہے ایسے ہی مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ کی دلالت رکعات پر ہوگی اس کو اثبات بالقرآن نہیں کہہ سکتے اثبات تو وہ ہے جو خود مفید مطلوب ہو بدوں ضم ضمیمہ کے۔ اگر حدیث سے پانچ وقت کی نمازیں اور ان کی رکعتیں کی شمار معلوم نہ ہوتی تو کوئی شخص مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ سے رکعات نماز سمجھ سکتا تھا ہرگز نہیں تو اگر اس طرح اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ ثُمَّ اسْتَقِمْ (اللہ پر ایمان لا اور اس پر مستقیم رہ) سے سب مسائل مستنبط کیے جائیں تو اس کا تو کچھ علاج نہیں ورنہ خود یہ کلام استنباط مسائل کے لئے ہرگز کافی نہیں اور نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ مطلب ہے کہ اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ ثُمَّ اسْتَقِمْ (ایمان لائے اللہ پر پھر اس پر مستقیم رہو) سارے مسائل کے استنباط کو کافی ہے اب یہ سوال ہوگا کہ پھر صحابی کے سوال اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب کا کیا مطلب ہے تو اس کو حضرات صوفیہ نے سمجھا۔ وہ فرماتے ہیں کہ صحابی نے ایسا دستور العمل پوچھنا چاہا تھا جو تمام اعمال میں کام آوے اور سب کو سمیٹ دے جیسا کہ صوفیہ مریدین کو مراقبہ رویت وغیرہ بتلایا کرتے ہیں جو تمام اخلاق رذیلہ غضب و حرص و کبر وغیرہ میں کام آتا ہے اور تنہا سب کے علاج کو کافی ہو جاتا ہے اور اگر ہر مرض کا جدا جدا علاج کیا جائے تو بڑی مدت چاہیے اب انہوں نے ایسی بات بتلائی جس کے رسوخ سے ایک دم سارے امراض اور معاصی کی جڑ اکھڑ جائے گی کیونکہ جو شخص ہر وقت اس بات کو پیش نظر رکھے گا کہ حق تعالیٰ مجھ کو دیکھ رہے ہیں وہ نہ تکبر کر سکے گا نہ غصہ بے جا نہ گناہ صغیرہ کر سکے گا نہ کبیرہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابی نے ایسی ہی بات دریافت کرنا چاہی تھی جس کے جواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا قُلْ اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ ثُمَّ اسْتَقِمْ کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کا استحضار رکھو اور اس کے بعد ہر عمل میں استقامت کا لحاظ کرو کہ نہ تسویف ہو۔ ظاہر ہے کہ جو شخص ہر وقت اس کا استحضار رکھے گا کہ میں خدا پر ایمان لا چکا ہوں تو وہ تمام احکام کو خوشی سے بجا لائے گا اور کسی حکم میں چون و چرا نہ کرے گا یہ تو تسہیل عمل کا طریق تھا اس کے بعد تکمیل عمل کا طریقہ بتلا دیا کہ استقامت کا لحاظ رکھو یہاں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بلاغت کا اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے دو جملوں میں تمام طریق کو سمیٹ دیا جس میں تسہیل عمل بھی ہے اور تکمیل بھی

ہے۔ تو اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مختصر بات کا دریافت کرنا اور بتلانا بھی سنت ہے اسی لئے مجھے طریق میں اس کا بہت خیال رہتا ہے کہ ایسی مختصر بات بتلائی جائے جو سب باتوں پر حاوی ہو۔

چنانچہ ایک دفعہ میں نے اخلاق رذیلہ کا علاج دو لفظوں میں تجویز کیا تھا ”تامل وتحمل“ کو جو کام کرے سوچ کے کرے کہ شرعاً جائز ہے یا نہیں اور جلدی نہ کرے بلکہ تحمل سے کام کیا کرے۔ مجھے اختصار کے ساتھ قافیہ کا بھی خبط ہے۔ اس سے یاد میں سہولت ہوتی ہے۔ اس لئے ایک دوست کا فیصلہ ہے کہ یہ نثر میں شاعر ہے۔ ابھی کچھ دن ہوئے میں نے ایک زمین لی ہے جب اس کے لینے کا ارادہ ہوا تو میں نے اس کے متعلق یہ دعا تجویز کی تھی۔ اَللّٰهُمَّ حَصِّلْ اَللّٰهُمَّ كَمِّلْ اَللّٰهُمَّ عَجِّلْ اَللّٰهُمَّ سَهِّلْ (اے اللہ حاصل کرادے اے اللہ پورا کرادے اے اللہ جلدی کرادے اے اللہ آسان کرادے) جس میں چاروں جملے مقفٰی ہیں اسی طرح طریق میں طالبین کے لئے ایک بار یہ دستور العمل تجویز کیا اطلاع واتباع۔ کہ اپنے احوال واعمال سے شیخ کو مطلع کرتے رہیں اور اس کی تجویز پر عمل کریں۔ ایک دفعہ یہ تجویز کیا تھا کہ انقیاد واعتماد۔ اس وقت پہلی مقفی عبارت ذہن سے نکل گئی تھی تو جب ایک قافیہ دار عبارت بھول جاتا ہوں دوسری قافیہ دار عبادت تجویز کر لیتا ہوں۔ ممکن ہے کسی وقت یہ بھی ذہن سے نکل جائے تو تیسری قافیہ دار تجویز کرلوں گا۔ یہ تو جنم روگ ہے۔ جیسا ایک آزاد مزاج بزرگ نے حفظ قرآن کو جنم روگ بمعنی دائم الرعایت فرمایا تھا کیونکہ حفظ قرآن کے لئے بھی ہر وقت کی فکر کی ضرورت ہے۔ جہاں ذرا غافل ہوا اور ذہن سے نکلا چنانچہ جو لوگ ہمیشہ نہیں پڑھتے۔ ان کو اس سے اجنبیت ہو جاتی ہے۔ جیسے مولوی احمد حسن صاحب کانپوری فرماتے تھے کہ رمضان میں جو میں قرآن تراویح کے اندر پڑھتا ہوں تو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ قرآن پڑھ رہا ہوں یا تورات وانجیل۔ کیونکہ ان کو سال کے اندر کثرت تدریس کے سبب تلاوت کی نوبت کم آتی تھی مگر بعض لوگوں کا حافظہ اچھا ہوتا ہے وہ باوجود عدم مشغولی کے اور بے فکری کے بھی نہیں بھولتے۔ حالی شاعر کا واقعہ میں نے پانی پت میں مولوی عبدالسلام صاحب انصاری مرحوم سے سنا ہے کہ ان کو قرآن حفظ تھا مگر حفظ کے بعد ابتدائے جوانی میں کبھی محراب سنائی ہوگی پھر شاعری اور لیڈری کے قصہ میں پڑ گئے تو برسوں محراب نہیں سنائی نہ تلاوت کا شغل رہا۔ مگر حافظہ ایسا اچھا تھا کہ بڑھاپے میں بھی قرآن خوب یاد تھا۔ چنانچہ ایک دفعہ ان کے بڑھاپے میں پانی پت کے چند لڑکوں نے شبینہ کرنا چاہا اور یہ شوخی سوجھی کہ حالی سے اس شبینہ کی شراکت کی درخواست کرو۔ چنانچہ سب مل کر ان کے پاس گئے کہ حضور آج ہم سب نے شبینہ کا قصد کیا ہے آپ ہماری سرپرستی فرمائیں اور ایک منزل آپ بھی سنائیں۔ حالی نے کہا کہ بھائی

میں نے تو بہت زمانہ سے قرآن نہیں سنایا جو کچھ یاد تھا سب بھول بھال گیا۔ مجھے معاف کرو! مگر لڑکوں نے نہ مانا اور اصرار کیا مجبور ہو کر درخواست منظور کی اور کہا کہ اتنا تو بتا دو کہ میرے ذمہ کونسی منزل ہوگی چنانچہ سب سے زیادہ مشکل منزل جس میں متشابہات زیادہ ہیں ان کے لئے تجویز کی گئی اور نوجوان حافظ اپنے دل میں خوش ہو رہے تھے کہ آج بڈھے کو خوب رسوائی ہوگی یقیناً خوب غوطے کھا دیں گے۔ مگر جب رات ہوئی اور حالی کے پڑھنے کی باری آئی تو ظالم نے ایسا اچھا سنایا کہ ایک جگہ بھی تو نہ اٹکا اس وقت سب کو معلوم ہوا کہ ان کو قرآن واقعی یاد ہے۔ بھولے نہیں سو ایسے لوگ بہت کم ہیں جن کو باوجود عدم مزاولت کے بھی ایسا یاد رہے ورنہ عام حالت یہی ہے کہ قرآن بدون دائمی مزاولت کے یاد نہیں رہتا۔ اسی قیاس پر ایک اور تفریع کرتا ہوں کہ اسی طرح اس طریق میں بھی قلت کی نگہداشت عمر بھر کا روگ ہے کسی وقت غفلت کی اجازت نہیں۔

یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نباشی
شاید کہ نگاہے کند آگاہ نباشی

(ایک پلک مارنے کی مقدار بھی محبوب حقیقی سے غافل مت ہو شاید کہ تم پر لطف کی نگاہ کریں اور تم آگاہ نہ ہو) اور

اندریں رہ می تراش و می خراش تارے آخر دے فارغ مباش
تادرم آخر دے آخر بود کہ عنایت باتو صاحب سربود

(تم کو چاہیے کہ طریق وصول الی اللہ میں ہمیشہ ادھیڑ بن میں لگے رہو اور آخری وقت تک ایک لحظہ بھی فارغ مت ہو کیونکہ آخری وقت تک کوئی گھڑی ایسی تو ضرور ہوگی جس میں عنایت ربانی تمہاری ہمراز اور رفیق بن جائے گی؟

لذت پریشانی:

اور ایک اور لطف صنع ہے کہ اگر کسی وقت سالک غافل ہونا بھی چاہے تو حضرت حق غافل نہیں ہونے دیتے۔ ایک سپاہی ایسا مسلط کر دیا ہے جو کان پکڑ کر کھڑا کر دیتا ہے بے فکر نہیں ہونے دیتا اور اس سپاہی کا حلیہ میں بیان نہیں کر سکتا کہیں سننے والے بے چین نہ ہو جائیں جو لوگ آرام میں ہیں ان کو کیوں بے چین کیا تو وہ سپاہی آ کر کہتا ہے کہ ایک دن پچاس ہزار سال کے برابر آنے والا ہے اس سے غافل ہو کر کہاں جا رہا ہے۔ بس جہاں غفلت ہوئی اور یہ دن پیش نظر ہو جاتا ہے اس لئے سالک غافل نہیں رہ سکتا کبھی تجلی جلال منکشف ہوتی ہے وہ دل کو تھرا دیتی ہے لوگ سمجھتے ہیں

کہ اہل اللہ بڑی چین میں ہیں ان کو کچھ فکر نہیں بے شک دنیا کی تو ان کو فکر نہیں مگر دنیا کی فکر نہ ہونے کا منشا بے فکری نہیں بلکہ ایسی عظیم الشان فکر ہے جس نے عصائے موسوی کی طرح سب فکروں کو نگل لیا ہے واللہ جو فکر ان کو ہے اگر آپ کو ہو جائے تو رات کا سونا بھول جائیں۔

اے ترا خارے بپا نشکستہ کے دانی کہ چیست
حال شیرانے کہ شمشیر بلا بر سر خورند

(تمہارے پاؤں میں کانٹا بھی نہیں لگا ہے تم ان لوگوں کی حالت کو کیا سمجھ سکتے ہو جن کے سروں پر بلا اور مصیبت کی تلواریں چل رہی ہیں۔)

سعدی علیہ الرحمۃ نے اس کو بہت وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔

خوشا وقت شوریدگان غمش   اگر ریش بینند وگر مرہمش
گدایان از بادشاہی نفور   بامیدش اندر گدائی صبور
دمادم شراب الم در کشند   وگر تلخ بینند دم در کشند

(اس کے غم کے پریشان لوگوں کا کیا اچھا وقت ہے اگر زخم دیکھتے ہیں اور اگر اس پر مرہم رکھتے ہیں۔ ایسے فقیر بادشاہی سے نفرت کرنے والے اس کی امید پر فقیری میں قناعت کرنے والے ہر دم رنج کی شراب پیتے ہیں اور جب اس میں رنج کی کڑواہٹ دیکھتے ہیں خاموش رہتے ہیں)

غرض سالک کے لئے نئے نئے سبق ہمیشہ تازہ ہوتے رہتے ہیں جو کسی وقت اس کو غفلت نہیں ہونے دیتے اور وہ سب تقویٰ ہی کی افراد سے ہیں جس کا **یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۔** (اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو ڈرنے کا حق سوائے اسلام کے اور کسی حالت پر جان مت دو) میں امر ہے اس وقت اسی مضمون کو دوسرے عنوان سے بیان کرنا چاہتا ہوں کیونکہ تقویٰ کا عنوان بہت وسیع ہے اور ضرورت اس کی ہے کہ مختصر بات بتلائی جائے جس سے تمام اعمال سہل ہو جائیں اور تمام مقامات طریق حل ہو جائیں میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ اس مضمون کے بعد آپ کو پریشانی ہی نہیں ہوگی بلکہ یہ کہتا ہوں کہ اگر پریشانی ہوگی تو لذیذ ہوگی کہ آپ اس پریشانی کے بدلے ہفت اقلیم کا لینا بھی منظور نہ کریں گے۔ باقی پریشانی کے رفع ہونے سے تو امید ہی قطع کر دیجئے کیونکہ آپ تو پریشانی ہی کے لئے پیدا ہوئے ہیں یہ تو جنت ہی میں پہنچ کر ختم ہوگی خدا تعالیٰ وہاں سرخرو کر کے ہم کو پہنچا دیں (آمین ثم آمین)

اور بعض کوتاہ نظر عاشقوں نے تو جنت میں بھی پریشانی کو ختم نہیں ، نا۔ چنانچہ ایک عاشق کا قول ہے إِنَّ فِيْ الجَنَان لجنة ليس فيها حُوْرٌ وَلاَ قَصُوْرٌ وَلٰكِنْ فِيْهَا اَرِنِيْ (جنتوں میں ایک جنت ایسی ہے جس میں نہ حوریں ہیں نہ محلات اور ارنی ارنی سے) مجھ کو اپنا دیدار رکھا مجھ کو اپنا دیدار رکھ)

یہ قول(قلت ويحتمل ان يكون الكشف صحيحا ولكنه اى صاحب الكشف اخطاء في قوله ان اهل هذه الجنة لا راحة لهم وانهم فى كرب واضطراب بل ليكن ان يكون لهم فى ارنى ارنى راحة ليس بغيرهم فى الحور والقصور ولا يكون منشاء قولهم ارنى ارنى كربهم واضطرابهم ولا قلقهم هل مشاء والاولال على الله وطلب روية اظهاراً للمحبة و هذا فانهم لاادب لهم فى غيره جل وعلا الله سبحانه اعلم) واقع میں صحیح نہیں اور کشف حجت نہیں مگر اس صاحب کشف نے جو دلیل بیان کی ہے اس دلیل سے مجھے بھی بہت دنوں شبہ رہا وہ یہ کہ حسن وجمال حق حقیقۃً بے نہایت ہے اور عاشق کا عشق وطلب بمعنے لاتقف عندحد بے نہایت پھر چین کیونکر ہو وہاں تو یہ حال ہے۔

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی راسخن پایاں بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہم چناں باقی

(نہ اس کے حسن کی انتہا ہے نہ سعدی کے کلام کی کوئی انتہا ہے جیسے جلندھر والا پیاسا مرجاتا ہے اور دریا باقی رہ جاتا ہے۔ اسی طرح محبوب کا بیان باقی رہ گیا۔)

اور یہ کیفیت ہے

داماں نگہ تنگ وگل حسن تو بسیار گلچیں بہار تو زداماں گلہ دارد

(داماں نگاہ تنگ ہے اور تیرے بے حس کے پھول بے حد ہیں گل چین تنگی دامن کا گلہ رکھتا ہے۔)

اور ایک عاشق کہتا ہے۔

(جتنی زیادہ تیرے چہرہ پر نظر ڈالتا اتنا تیرے چہرے پر حسن زیادہ معلوم ہوتا ہے)

یہ ہے ان کی دلیل اس دلیل سے میں بہت روز تک چکر میں رہا اسی واسطے کہتا ہوں کہ بس نماز روزہ میں لگے رہو اور ان کشفیات واسرار کے پیچھے نہ پڑو یہ بلائے بے درماں ہے پھر بحمد للہ اس کا جواب سمجھ میں آ گیا وہ یہ کہ یہاں تو خشوق لاتقف حد۔ اس لئے ہے کہ ہمارے اندر وصال حق کی جتنی استعدار پیدا کی گئی ہے یہاں کے مشاہدہ سے اس استعدد کا تقاضا پورا نہیں ہوتا۔ یہاں ہم کو حق تعالیٰ کا ناتمام وصال حاصل ہوتا ہے کہ بعض افراد میں استعداد اس سے زیادہ ہے وہ تقاضا کرتے ہیں کہ

ہمارا حق بھی ادا ہو اور جنت میں تمام افراد کی استعداد کا تقاضا بھی پورا کر دیا جائے گا پھر چین ہو جائے گا اور اس سے حسن حق کا محدود ہونا لازم نہیں آتا بلکہ استعداد طالب کا متناہی ہونا لازم آیا مگر اس عاشق نے استعداد طالب کو بھی غیر متناہی بمعنی لاتقف عند حد سمجھا اس لئے اشکال پیش آیا۔

اور منشاء اس دھوکہ کا یہ ہوا کہ دنیا میں عاشق کا شوق لاتقف عند حد ہی ہے اس سے وہ یہ سمجھا کہ عشق فی نفسہ لاتقف عند حد ہے حالانکہ ایسا نہیں بلکہ فی نفسہ محدود و متناہی ہے اور دنیا میں اس لئے لاتقف عند حد ہے کہ یہاں اس کی استعداد کے تمام افراد کا تقاضا پورا نہیں کیا گیا اور جنت میں ہر فرد کی استعداد کا تقاضا پورا ہو جائے گا جس سے سکون کامل ہو جائے گا اور یہ میں کسی طبعی قاعدہ پر مبنی کر کے نہیں کہتا بلکہ نص کی بناء پر کہتا ہوں حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ **وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرُ نِ الَّذِیْ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ لَا يَمَسُّنَا فِيْهَا نَصَبٌ وَّلَا يَمَسُّنَا فِيْهَا لُغُوْبٌ** (اور کہیں گے کہ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے ہم سے غم دور کیا یقیناً ہمارا پروردگار بڑا بخشنے والا بڑا مہربان ہے۔ جس نے ہم کو اپنے فضل سے ہمیشہ رہنے کے مقام پر اتارا جہاں نہ ہم کو کوئی کلفت پہنچے گی اور نہ ہم کو خستگی پہنچے گی۔

قلم بشکن سیاہی ریز و کاغذ سوز و دم درکش
حسن ایں قصہ عشق ست در دفتر نمی گنجد

(قلم توڑ روشنائی بکھیر کاغذ جلا خاموش رہ حسن یہ عشق کا قصہ ہے جو دفتر میں نہیں سما سکتا)

اور ایک شاعر کہتا ہے

نگردد قطع ہرگز جادہ عشق از دویدنہا
کہ می بالد بخود ایں راہ چوں تاک از بریدنہا

(عشق کا راستہ دوڑنے سے ہرگز قطع نہیں ہوتا جس طرح انگور کو جتنا زیادہ قطع کرو اور بڑھتا ہے یہی حال اس راستہ کا ہے)

اور مولانا فرماتے ہیں۔

اے برادر بے نہایت درگہیست
ہرچہ بروئے می رسی بروئے مایست

(اے برادر بے نہایت درگاہ ہے جس درجہ پر پہنچو اس پر مت ٹھہرو بلکہ آگے کو ترقی کرو)

اور گو عاشق کا عشق بالفعل متناہی ہے مگر چونکہ اس کا منشا حسن و جمال حق ہے اور وہ بے غایت ہے تو اس کا عشق بھی لاتقف عند حد ضرور ہوگا پھر چین کیونکر آئے عاشقان مجازی کو تو وصال محبوب سے اس لئے چین آ جاتا ہے کہ ان کے محبوب کا حسن متناہی ہے وصال کے بعد جی بھر کر اس

سے متمتع ہو گئے اور سکون ہو گیا اور جس کے محبوب کا حسن بے غایت ہو اس سے تو جتنا متمتع ہوگا اور زیادہ درجہ حسن کا ظاہر ہوگا جیسے ایک شاعر کہتا ہے۔

نَظَرًا زِدْتَهُ مَا إِذَا حُسْنًا وَجْهُهُ يَزِيدُكَ

پروردگار بڑا بخشنے والا بڑا قدر دان ہے جس نے ہم کو اپنے فضل سے ہمیشہ رہنے کے مقام میں لا اتارا جہاں ہم کو کوئی کلفت نہیں اور نہ کوئی ہم کو خستگی پہنچے گی)

اگر جنت میں بھی پریشانی رہی تو پھر عشق کو لے کر کیا کریں گے اس صاحب کشف کی نظر سے یہ مقدمہ نکل گیا کہ دنیا میں عشق اس لئے لاتقف عند حد ہے کہ یہاں استعداد عاشق کے جملہ افراد کا تقاضا پورا نہیں کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے ہم جیسے ناکاروں کو اس مقدمہ پر اطلاع کر دی اور یہ بھی ان بزرگوں کی برکت ہے جیسے کبھی کمزور باپ کے قوی لڑکا پیدا ہوتا ہے لیکن وہ قوی ہو کر بھی ہے بیٹا ہی اور وہ کمزور اس کا باپ ہے بہرحال جنت میں تو چین ہوگا مگر دنیا میں چین نہیں بعض لوگ یہاں طالب راحت میں یہ ان کی غلطی ہے بھلا عشق اور چین۔

عاشقی چیست بگو بندہ جاناں بودن دل بدست دگرے دادن و حیراں بودن
سوئے زلفش نظرے کردن و رویش دیدن گاہ کافر شدن و گاہ مسلماں بودن

(عاشقی کیا ہے محبوب کا بندہ بن جانا دل دوسرے (محبوب) کے قبضہ میں دے دینا اور حیران رہنا محبوب کی زلف کی طرف نظر کرنا اور اس کے چہرہ انور کو دیکھنا کبھی فانی ہونا اور کبھی باقی ہونا ہے)

کافر شدن سے پریشان نہ ہونا یہ ان صوفیوں کی اصطلاح ہے ان کے یہاں فانی کو کافر اور صاحب بقا کو مسلمان کہتے ہیں اور ایسی وحشت ناک اصطلاحیں انہوں نے گالیاں کھانے کو مقرر کی ہیں مگر اعتراض کا کسی کو حق نہیں کیونکہ قرآن میں بھی تو ہے۔ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ (سو جو شخص شیطان سے بد اعتقاد ہو)

اور ابراہیم علیہ السلام کا مقولہ ہے کہ انہوں نے اپنی قوم سے کہا تھا كَفَرْنَا بِكُمْ (ہم تمہارے منکر ہیں) بس اتنا فرق ہے کہ قرآن میں صلہ بھی مذکور ہے اس لئے وحشت نہیں ہوتی اور صوفیہ کو صلہ رحمی نہیں آتی ان کی بات سے لوگ متوحش ہوتے ہیں مگر حقیقت واضح ہو جانے کے بعد الفاظ سے متوحش نہ ہونا چاہیے اسی اصطلاح کے موافق حضرت خسرو فرماتے ہیں۔

کافر عشقم مسلمانی مرا در کار نیست
ہر رگ من تار گشتہ حاجت زنار نیست

(میں عشق میں فانی ہوں بقا مجھے درکار نہیں ہے میری رگ تار ہوگئی ہے اتار کی ضرورت نہیں)

مگر تم ان اشعار کو نقل کے طور پر بھی نہ پڑھنا کیونکہ وہ تو مغلوب تھے۔ اس لئے معذور تھے اور تم ان کو پڑھ کر مسلوب ہی ہو جاؤ گے اور اگر کوئی نجدی آ گیا تو مصلوب بھی ہو جاؤ گے اور جو عاشق ہو گا وہ تو خود ہی بک بک لگائے گا۔ وہ میرا اور تمہارا کسی کا کہنا نہ مانے گا لیکن وہ نقل کے طور پر نہ پڑھے گا بلکہ مغلوب ہو کر پڑھے گا۔ سو وہ بھی امیر خسروں کی طرح معذور ہے۔ غرض تم آرام کے طالب نہ بنو جیسا بعض سالکین دفع خطرات کے طالب ہیں کہ ایسی حالت ہو جائے کہ وساوس وخطرات پاس ہی نہ آئیں یہ بھی راحت کے طالب ہیں۔ میں اس وقت آپ کو ایسی چیز بتلانا چاہتا ہوں جو پریشانی کو لذیذ کر دے کیونکہ میں کہہ چکا کہ پریشانی تو جنت سے درے ختم نہیں ہو سکتی ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ پریشانی کو لذیذ کر دیا جائے اور یہ بھی ایک طرح پریشانی کا خاتمہ ہی ہے۔ تو میں ایسی بات بیان کرنا چاہتا ہوں جو تمام اعمال میں کام آئے۔ اور غفلت سے روکتی رہے اور پریشانی کے وقت ہمت بندھائے اور وہ نئی بات نہیں بلکہ وہ وہی ہے جس کا نام قرآن میں کہیں تقویٰ ہے کہیں اعتصام بحبل اللہ ہے اور اسی کا نام ذکر نعمت بھی ہے۔

عِبَارَاتُنَا شَتّٰی وَحُسْنُکَ وَاحِدٌ   وَکُلٌّ اِلٰی ذَاکَ الْجَمَالِ یُشِیْرُ

(عنوانات مختلف ہیں معنون ایک ہی جمال محبوب ہے ہر ایک عنوان اسی جمال کی طرف اشارہ کرتا ہے)

یہ سب عنوانات ایک ہی معنون کے ہیں جاننے والا ہر لباس میں اس کو پہچان لیتا ہے۔

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش   من انداز قدت را می شناسم

(خواہ کسی رنگ کا لباس پہن لو قد کے انداز ے میں پہچان لیتا ہوں)

تفویض پر مداومت:

صاحبو! اس وقت میں جس چیز کا پتہ دینا چاہتا ہوں وہ اسلام ہے جو ظاہر ہے کہ ان سب عنوانات میں موجود ہے مگر میں اس وقت اسلام کو دوسرے عنوان سے بیان کروں گا کہ اس عنوان سے بہت کم لوگوں نے اس کو دیکھا ہے اسی لئے اسلام کے لفظ سے ادھر ذہن نہیں جاتا اور وجہ اس کی یہ ہے کہ اسلام کا لفظ زبانوں پر اس درجہ شائع ہو گیا ہے کہ اب اس سے اس کا مصداق تو متبادر ہوتا ہے مگر مفہوم کی طرف کسی کو التفات نہیں ہوتا اگر لوگ اسلام کے لغوی معنی پر بھی نظر کر لیا کرتے تو اس حقیقت سے قریب ہو جاتے ہیں جس کو میں اس وقت بیان کروں گا۔ تو سنئے اسلام کے معنی

لغت میں سپرد کرنے کے ہیں جس کو تسلیم بھی کہتے ہیں میں اسی کو اس وقت بیان کرنا چاہتا ہوں جس کو صوفیہ نے تفویض سے تعبیر کیا ہے۔ یہی اسلام کی حقیقت ہے مگر اب لفظ اسلام سے اس کی طرف ذہن ہی نہیں جاتا قرآن میں کہیں اسلام کا ذکر مجملاً ہے کہیں مفصل ہے اور مفصل بمعنے تفویض ہی ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں **بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ.** الآیۃ (جو شخص بھی اپنا رخ اللہ تعالیٰ کی طرف جھکا دے اور وہ مخلص بھی ہو) دوسری جگہ ہے **وَمَنْ اَحْسَنُ دِیْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا** (اور ایسے شخص سے اچھا زیادہ کس کا دین ہوگا جو کہ اپنا رخ اللہ تعالیٰ کی طرف جھکا دے اور وہ شخص مخلص بھی ہو اور ملت ابراہیم کا اتباع کرے جس میں کجی کا نام نہیں)

اور ایک جگہ ہے **وَمَنْ یُّسْلِمْ وَجْهَهٗ اِلَی اللّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَکَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰی** (اور جو شخص اپنا رخ اللہ کی طرف جھکا دے اور وہ مخلص بھی ہو تو اس نے بڑا مضبوط حلقہ تھام لیا) یہاں اسلام وجہ کے ساتھ اتباع ملت ابراہیم کا بھی ذکر ہے اور اس کو دوسری جگہ اس طرح بیان فرمایا ہے۔ **وَمَنْ یَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهِیْمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ وَلَقَدِ اصْطَفَیْنٰهُ فِی الدُّنْیَا وَاِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ.** (اور ملت ابراہیمی سے وہی روگردانی کرے گا جو اپنی ذات سے احمق ہو اور ہم نے ان کو دنیا میں منتخب کیا اور وہ آخرت میں بڑے لوگوں میں شمار کئے جاتے ہیں جبکہ ان کے پروردگار نے ان سے فرمایا کہ تم اطاعت اختیار کرو انہوں نے عرض کیا کہ میں نے اطاعت اختیار کی رب العالمین کی) جس سے معلوم ہوا کہ ملت ابراہیم بھی اسلام وجہ رب العالمین ہے کہ اپنے کو خدا کے سپرد کر دے جس کو ایک مقام پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے **اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا** (میں یکسو ہو کر اپنا رخ اس کی طرف کرتا ہوں جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں) سے بیان فرمایا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ قرآن میں اسلام کی تفسیر اسلام وجہ ہے جس کے پورے معنے نماز روزہ کے نہیں ہیں بلکہ اسلام وجہ بمعنے تفویض ہے یعنی اپنی ذات کو خدا کے سپرد کر دینا اور اپنے کو ہر تصرف الہی کیلئے آمادہ کر دینا کہ وہ جو چاہیں کریں جو چاہیں حکم دیں سب منظور ہے نماز روزہ، بھی اس تفویض کا ایک فرد ہے لیکن عین نہیں اگر قرآن میں اسلام کا استعمال اطلاق ہی کے ساتھ ہوتا اور اس کے ساتھ وجہ اللہ یا وجہ الی اللہ مذکور نہ ہوتا تو یہ بھی احتمال تھا کہ اسلام بمعنی

اطاعت ہے مگر ان قیود کے ساتھ اطاعت کے معنے نہیں بنتے بلکہ تفویض ہی کے معنے مستقیم ہوتے ہیں اور قاعدہ ہے کہ آیات میں بعض بعض کی مفسر ہوتی ہیں تو اب جہاں اسلام بلا قید مذکور ہے، وہاں بھی مقید ہی مراد ہے۔ جیسے احادیث میں علم کے فضائل بلا قید مذکور ہیں حالانکہ علم مصدر ہے جس کے لئے قید کی ضرورت ہے خواہ بصورت مفعول ہو یا مضاف الیہ اس لئے لفظ کے اطلاق سے یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ فضائل مطلق علم کے ہیں بلکہ یقینی بات ہے کہ علم سے علم دین مراد ہے ایسے ہی نصوص میں اسلام سے اسلام وجہ مراد ہے یعنی تفویض یہی وہ چیز ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کمالات وفضائل ہیں جابجا حق تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے۔

پس ان آیات میں اصل مقصود لَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ (بجز اسلام کے اور کسی حالت میں جان مت دو) ہے اور اِتَّقُوا اللّٰهَ (اللہ سے ڈرو) وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ (اللہ کے انعام کو یاد کرو) وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ (اللہ تعالیٰ کے سلسلہ کو مضبوط پکڑو) یہ سب اسی کے لقب ہیں۔ اسی لئے میں نے اس بیان کا نام ''الدوام علی الاسلام والاعتصام بالانعام'' تجویز کیا ہے جس میں اصل مقصود کے ساتھ اس کے دوسرے عنوانات پر بھی دلالت ہے جیسے مولانا محمد اسحاق صاحب بردوانی کا سجع میں نے کہا تھا ثاقب از لطف محمد اسحاق جس کا ترجمہ تو یہ ہے کہ اسحاق علیہ السلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لطف سے روشن ہوئے ہیں مگر اس میں لطیفہ یہ بھی ہے کہ اس مصرع میں مولوی محمد اسحٰق صاحب اور ان کے والد کا اور دادا کا نام بھی آ گیا ہے کیونکہ ان کے والد کا نام لطف اللہ یا لطف الہدیٰ تھا اور دادا کا محمد ثاقب ایسے ہی اس وعظ کے نام میں اسلام بھی ہے اور اعتصام بھی ہے اور نعمت پر بھی دلالت ہے جس سے وہ تمام عنوانات جمع ہو گئے جو اس آیت میں اختیار کئے گئے ہیں بہر حال اس جگہ اول تو اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ (تو اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے) فرمایا ہے جس میں تفویض کی کسی قدر تفصیل ہے پھر وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ (اور تم اسلام کے سوا کسی حالت میں جان مت دو) میں مجملاً تفویض کا ذکر ہے اس کے بعد پھر تفصیل ہے وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ (اللہ کے سلسلہ کو مضبوط پکڑو اور اللہ کے انعام کو یاد کرو) میں کیونکہ مقصود کی علامت یہی ہے کہ اس کا ذکر شروع میں بھی ہو۔ درمیان میں بھی ہو تو یہاں اول ترکیب ہے پھر جمع ہے۔ پھر تحلیل ہے جس کا لطف اہل علم کو خاص طور سے حاصل ہوگا۔ اب میں مقصود کو عرض کرتا ہوں۔

حق تعالیٰ فرماتے ہیں يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُم

مُسْلِمُوْنَ. اے ایمان والو اللہ تعالیٰ سے ڈرو جیسا اس سے ڈرنے کا حق ہے اور تم بجز اسلام کے کسی حالت پر جان نہ دینا۔

یہاں ایک اشکال ہوتا ہے کہ اِتَّقُوْ اللہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ (اللہ تعالیٰ سے ڈرو جیسے اس سے ڈرنے کا حق ہے) تو مشکل ہے۔ خدا کی شان کے لائق تقویٰ کس سے ہوسکتا ہے؟ تو آیت میں تکلیف مالایطاق ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حَقَّ تُقَاتِہٖ سے مراد غایۃ مَاتَقْدِرُوْنَ عَلَیْہِ (جس قدر تم اس پر قادر ہو) ہے کہ جتنا تم کرسکتے ہو اتنا تقویٰ کرو۔ چنانچہ دوسری جگہ ارشاد ہے اور یہ بھی حق تعالیٰ کی رحمت ہے کہ دوسری جگہ اس مضمون کے دوسرے سہل عنوان سے بیان فرمایا کیونکہ ہم سے اپنی اطاعت کے موافق بھی تو نہیں ہوتا تو فرماتے ہیں فَاتَّقُوْا اللہَ مَااسْتَطَعْتُمْ (اللہ تعالیٰ سے ڈرو جتنی تم استطاعت رکھتے ہو) جس میں بجائے قدرت کے استطاعت کا لفظ وارد ہے اور استطاعت کہتے ہیں قدرۃ میسرہ کو نہ قدرت ممکنہ کو۔ بعض صحابہ نے دوسری آیت کو پہلے کے لئے ناسخ فرمایا ہے اس سے بعض طلبہ خوش ہوئے ہوں گے کہ اتقوا اللہ حق تقاتہ (اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے) منسوخ ہوگیا۔ چلو چھٹی ہوئی۔ ارے منسوخ تو وہ ہو جس میں نسخ کی قابلیت بھی ہو۔ بھلا ایمان بھی کہیں منسوخ ہوا ہے؟ اور اِتَّقُوا اللہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ (اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے) میں اسی شان کا امر ہے جیسے اٰمِنُوْا بِاللہِ (ایمان لاؤ اللہ پر) میں ہے کیونکہ حق تعالیٰ کی عظمت کا مقتضی یہی ہے کہ تقویٰ حق تقاتہ کیا جائے اور مقتضائے عظمت بدل نہیں سکتا بلکہ بات یہ ہے کہ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے عرف میں لفظ نسخ بیان تبدیل ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ وہ بیان تفسیر کو بھی نسخ کہتے ہیں۔ پس قواعد شرعیہ سے اِتَّقُوْا اللہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ کا مطلب ہی یہ تھا کہ اپنی استطاعت کے موافق تقویٰ اختیار کرو یہ تو طالب علمانہ اشکال کا جواب تھا۔ مگر افسوس یہ ہے کہ طلبہ تو صرف تفسیر میں پڑ گئے اشکالات اور شبہات حل کرنے کے درپے ہوگئے۔ اصل مقصود پر نظر ہی نہیں کہ یہاں امر کس چیز کا ہے اور ہم کو کیا کرنا چاہیے۔

صاحبو! ضرورت اس کی ہے کہ تمام مضامین کو سمیٹ کر مقصود کا پتہ لگایا جائے جیسے ایک کابلی طالب علم نے جس نے ابتدا ہی سے شرح جامی شروع کی اور جب لوگوں نے کہا کہ یہ طریقہ ٹھیک نہیں پہلے میزان ومنشعب اور ہدایۃ النحو وکافیہ پڑھو پھر شرح جامی پڑھنا کہا کہ شرح جامی ان سب کتابوں کی ماں ہے اور وہ سب اس کے بچے ہیں اور ہم نے اپنی والدہ کو دیکھا تھا

کہ جب وہ مرغی کے بچوں کو کھڈ لے میں بند کرنا چاہتیں تو بچے بہت پریشان کرتے کوئی ادھر بھاگتا کوئی ادھر آخر وہ مرغی کو پکڑ لیتیں تو سب بچے ساتھ ساتھ ہو لیتے۔ اسی طرح ہم نے شرح جامی کو پکڑ لیا ہے یہ آ جائیگی تو سب کتابیں آ جائیں گی۔ تو مضامین منتشرہ کے سمیٹنے کا بھی یہی طریقہ ہے کہ اصل مقصود کا پتہ لگاؤ تو غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان آیات میں اصل مقصود ایک ہی ہے باقی سب اس کے عنوانات ہیں اب اگر تقویٰ کو اصل مقصود کہا جائے تو یہ بھی صحیح ہے کیونکہ مقصود کا یہ بھی ایک عنوان ہے مگر اس کا مصداق یہ تو بہت وسیع ہے جس کی تفصیل پر ہم کو قدرت نہیں اور ضرورت سمیٹنے کی ہے جس کے لئے مختصر حقیقت چاہیے سو وہ حقیقت اسلام ہے یعنی یہاں حق تعالیٰ کا مقصود یہ ہے کہ اسلام یعنی تفویض پر مداوت رکھو کسی وقت اس کو ہاتھ سے نہ دو یہ ہے وہ چیز جس کو میں نے کہا تھا کہ وہ پریشانی کو بھی لذیذ کر دیتی ہے مگر وہ لذت مٹھائی اور حلوے جیسی نہیں بلکہ مرچوں بھرے کباب جیسی جس کی لذت وہی جانتے ہیں جو مرچ کھانے کے عادی ہیں چنانچہ عارفین کو بھی ہر طرح کی مشقت و مصائب و آلام پیش آتے ہیں مگر ان کو اس میں بھی لذت آتی ہے اور وہ یوں کہتے ہیں۔

ناخوش تو خوش بود بر جان من　　　دل فدائے یار دل رنجانے من

(محبوب کی جانب سے جو امر پیش آئے گو وہ اپنی طبیعت کے خلاف اور
ناخوش ہی کیوں نہ ہو مگر وہ میری جان پر خوش اور پسندیدہ ہے۔ میں اپنے
یار پر جو میری جان کو رنج دینے والا ہے اپنے دل کو قربان کرتا ہوں)

پس یہ مت سمجھنا کہ تفویض کے بعد پریشانیاں یا پریشان کن واقعات پیش نہ آئیں گے ہاں یہ ضرور ہے کہ پہلے وہ ناگوار تھے اب خوشگوار ہو جائیں گے جیسے مرچ کھانے والے کو مرچوں بھرا کباب خوشگوار و لذیذ ہوتا ہے کہ روتا بھی جاتا ہے اور کھاتا بھی جاتا ہے یہاں ایک اشکال طالب علمی اور ہے اس کو بھی حل کر دوں۔ وہ یہ کہ اصولی قاعدہ ہے کہ امر و نہی کا تعلق امور اختیاریہ سے ہوتا ہے اور یہاں موت پر نہی وارد ہے جو غیر اختیاری ہے جواب یہ ہے کہ یہ کلام محاورہ کے موافق ہے۔ محاورہ میں بھی کہا جاتا ہے کہ بے وفا بن کر جان مت دینا اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ عمر بھر وفادار رہنا اور اسی پر جان نکل جائے پس یہاں بھی گو ظاہر میں موت پر نہی وارد ہے مگر موت سے منع کرنا مراد نہیں بلکہ بے وفائی سے منع کرنا مقصود ہے۔ اسی طرح آیت میں دوام اسلام کا امر مقصود ہے جس کو محاورہ کے موافق اس عنوان سے بیان کیا گیا ہے

تقدیر یہ ہے **ذَاوِمُوْا عَلَى الْاِسْلَامِ حَتّٰى لَا تَمُوْتُوْا اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ** (دوام کرو اسلام پر اور تم اسلام کے سوا اور کسی حالت میں جان نہ دینا)

اب یہاں سے ایک خام صوفی کی غلطی ظاہر ہوگئی جس نے اس آیت سے موت نفس کو ثابت کیا ہے جو صوفیہ کی اصطلاح ہے اور استدلال میں یہی کہا ہے کہ یہاں موت پر نہی وارد ہے جس سے معلوم ہوا کہ یہاں وہ موت مراد نہیں جو غیر اختیاری ہے بلکہ اختیاری موت مراد ہے تو اس سے **مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا** (مر جاؤ تم مرنے سے پہلے) کا مسئلہ ثابت ہوا تو سمجھ لو کہ یہ استدلال صحیح نہیں کیونکہ یہاں موت پر نہی وارد ہی نہیں جیسا ابھی بیان کیا گیا ہے بلکہ وہ مسئلہ ایک حدیث سے ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی سے فرمایا تھا **یَا عَبْدَ اللّٰہِ اِذَا اَصْبَحْتَ فَلَا تُحَدِّثْ نَفْسَکَ بِالْمَسَاءِ وَاِذَا اَمْسَیْتَ فَلَا تُحَدِّثْ نَفْسَکَ بِالصَّبَاحِ عُدَّ نَفْسَکَ مِنْ اَصْحٰبِ الْقُبُوْرِ.** (اتحاف السادۃ المتقین ۲۵۱.۱۰) (اے عبداللہ رضی اللہ عنہ جب صبح ہو جائے تو شام کا انتظار نہ کر اور جب شام ہو جائے تو صبح کا انتظار نہ کر اور اپنے آپ کو قبر والوں سے (یعنی مردہ) سمجھو) بہر حال یہاں مراد **ذَاوِمُوْا عَلَى الْاِسْلَامِ** (اسلام پر مداوت کرو) ہے مگر اس کو **لَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ** (اسلام کے علاوہ اور کسی حالت میں جان مت دو) کے عنوان سے اس لئے ظاہر کیا گیا کہ **ذَاوِمُوْا عَلَى الْاِسْلَامِ** (اسلام پر مداومت کرو) کو سن کر عشاق پر مصیبت آ جاتی کہ حکم تو دوام علی التفویض کا ہے اور ہم سے اس میں کوتاہی ہوتی ہے تو اس عنوان میں ان کی تسلی کر دی گئی کہ اگر موت کے وقت بھی تفویض کامل ہو جائے تو کافی ہے۔ عوام تو اس کو سن کر بے فکر ہو گئے ہوں گے کہ بس مرتے ہوئے تفویض کلی حاصل کر لیں گے۔ ارے اس کے ساتھ یہ مقدمہ بھی تو ملاؤ کہ مرتے وقت تفویض کلی عادۃً اسی کو حاصل ہوتی ہے جو زندگی بھر اسی میں مشغول رہا ہو۔ ورنہ موت کا وقت تو سخت نازک ہے۔ وہ تحصیل نسبت و طے مقامات و تکمیل تفویض کا وقت تھوڑا ہی ہے کہ اسی وقت کام شروع کرو اور اسی وقت حاصل بھی کر لو اور یوں خلاف عادت حق تعالیٰ جو چاہیں کر دیں جیسے عیسیٰ علیہ السلام و آدم علیہ السلام و حوا علیہا السلام کو بدون ماں باپ کے بنا دیا' ورنہ عادت یہی ہے کہ بدون مرد و عورت کے مباشرت کے بچہ پیدا نہیں ہوتا اسی طرح عادۃً مرتے ہوئے انہی کو مقامات حاصل ہوتے ہیں جو زندگی بھر انہی کی فکر میں لگے رہے تھے۔

عوام کی بے فکری:

پس عوام کی بے فکری بے معنی ہے اور یہ شیطان نے ان کا راہ مار رکھا ہے کہ عمر بھر یہی پٹی پڑھاتا رہتا ہے کہ ابھی زندگی بہت ہے۔ ذرا دنیا کے لطف اٹھالو پھر خدا تعالیٰ کی طرف توجہ کریں گے۔ غرض تفویض وہ چیز ہے کہ ہر کام میں اس کی ضرورت ہے خواہ دنیا کا ہو یا دین کا اہل باطن تو اس سے ابتداہی میں کام لیتے ہیں اور اہل دنیا بعد میں اس سے کام لیتے ہیں۔ مثلاً کسی پر مقدمہ قائم ہو جائے اگر وہ صاحب باطن ہے تو اسی وقت سے معاملہ خدا کے سپرد کر دے گا اور جو نتیجہ ہو اس پر اول ہی سے راضی ہوگا اس کا یہ مطلب نہیں کہ تدبیر کو چھوڑ دے گا کیونکہ تدبیر تفویض کے منافی نہیں یہ بھی اسی کا حکم ہے جس کا حق وہ تفویض ہے پس یہ تدبیر بھی کرے گا مگر اپنی طرف سے کوئی نتیجہ تجویز نہ کرے گا بلکہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دے گا کہ جو ان کی رضا ہے میں اس پر راضی ہوں۔ دنیا دار بھی اخیر میں یہی کرتا ہے مگر وہ اول اول اپنی تدبیر پر نظر کرتا ہے اور اپنی طرف سے نتیجہ کی ایک شق متعین کر لیتا ہے کہ نتیجہ یوں ہونا چاہیے پھر جب ہار جاتا ہے تو کہتا ہے کہ تقدیر میں یوں ہی تھا میں خدا کی مرضی پر راضی ہوں۔

تفویض معتبر:

اسی طرح ایک فرع اس کی مثلاً مدرسہ ہے جس کے چلانے کے لئے تدبیر کی بے شک ضرورت ہے مگر صاحب تفویض تو ابتداء ہی سے تفویض کرتا ہے اور تدبیر جو کچھ کرتا ہے محض سنت واطاعت سمجھ کر کرتا ہے اس کی نیت یہ نہیں ہوتی کہ تدبیر ضرور کامیاب ہی ہو بلکہ وہ کامیابی اور ناکامی کو حق تعالیٰ کے سپرد کر کے کوشش کرتا ہے۔ اگر کامیابی ہوگئی تو اور ناکامی ہوئی تو وہ ہر حال میں خوش ہے اور جو شخص اس ارادہ سے تدبیر کرتا ہے کہ مجھے کامیابی ہی ہو اور جس طرح میں چاہتا ہوں۔ مدرسہ اسی طرح چلے اس کی پریشانیوں کی کوئی حد نہیں رہتی کیونکہ جہاں کوئی بات ناگوار طبع پیش آئے گی اس کو اپنی ناکامی کا رنج ہوگا تو بتلاؤ کہ تفویض سے زیادہ راحت کا آلہ دنیا میں کیا ہے۔ حضرت تلاش کرتے کرتے تھک جائے گا اس سے بڑھ کر راحت کا آلہ کوئی نہ ملے گا مگر راحت کی نیت سے تفویض کرنا دین نہیں بلکہ دنیا ہے حقیقی تفویض وہ ہے جس میں یہ بھی قصد نہ ہو کہ اس سے چین ملے گا بلکہ محض رضاء حق کا قصد ہو ورنہ وہ مثال ہوگی۔

جیسے ایک دیہاتی نے مولوی صاحب کی ترغیب سے نماز شروع کی مولوی صاحب کا جو پھر وہاں گذر ہوا نماز کی نسبت پوچھا کہنے لگا کہ نماز سے بڑا پھائیدہ (فائدہ) ہے جب ہی

مونڈھا پڑوں (یعنی سجدہ کروں) جبھی بادی (ریح) خوب نکڑے (نکلے) آپ کو ریح کا مرض تھا اور سجدہ میں گوز اڑایا کرتے تھے ظاہر ہے کہ یہ فائدہ کس درجہ کا ہے۔ یوں ہی تفویض بقصد راحت سے بھی گو راحت حاصل ہوگی مگر یہ نفع قابل اعتبار نہیں۔ تفویض معتبر وہی ہے جس سے صرف اللہ تعالیٰ کی رضا مقصود ہو اور کچھ مقصود نہ ہو۔ چنانچہ شیخ ابن عطاء اسکندری رحمۃ اللہ علیہ نے کسی کی حکایت لکھی ہے۔

کہ میں ایک بزرگ سے ملنے گیا تو وہ یہ دعا کر رہے تھے کہ اے اللہ میں لذت تفویض سے پناہ مانگتا ہوں۔ واقعی تفویض میں بڑی لذت ہے مگر اہل اللہ اس سے پناہ مانگتے ہیں کہ مبادا ہم لذت کی وجہ سے تفویض کر رہے ہوں لیکن یہ ان بزرگ کا حال تھا تم یہ بھی دعا نہ کرو کیونکہ لوگ بدوں لذت کے تفویض نہیں کر سکتے بس تم نہ لذت کا قصد کرو نہ اس کی نفی کی دعا کرو بلکہ یہ مذاق رکھو۔

ہرچہ از دوست می رسد نیکوست

(جو کچھ محبوب کی جانب سے پہنچے وہ بہتر ہے)

اب اگر لذت عطا ہو جائے تو یہ نعمت حق ہے اس سے گھبراتے کیوں ہو اس سے پناہ نہ مانگو نہ اس کے دفع کی دعا کرو اور لذت حاصل نہ ہو جب بھی راضی رہو اصحاب مقام یوں فرماتے ہیں کہ اگر وہ چپت ماریں چپت کھا لو اور پیار کریں تو پیار کرا لو اور اس کی لذت حاصل ہو تو اس کو نعمت سمجھو شاید کسی کو اس مقام پر حضرات ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کی ایک حکایت سے شبہ ہو کہ ایک دفعہ ان کی نماز تہجد ناغہ ہوگئی اس کا ان کو رنج ہوا اور اگلی صبح جاگنے کا زیادہ اہتمام کیا تو اس رات ایسی نیند آئی کہ صبح کی نماز بھی قضا ہوگئی اب تو وہ سخت پریشان ہوئے الہام ہوا کہ اے ابراہیم تم نے اپنی تدبیر کو دیکھ لیا اب تفویض کرو۔

(نَمْ اِذَا اَنَمْنَا وَقُمْ اِذَا اَقَمْنَا) (جب ہم سلائیں سو رہو جب اٹھائیں اٹھ جاؤ ١٢)

حضرت ابراہیم فرماتے ہیں فَوَّضْتُ فَاسْتَرَحْتُ کہ میں نے تفویض کردی اور راحت میں ہوگیا جس سے معوم ہوتا ہے کہ انہوں نے راحت کے لئے تفویض اختیار کی تھی جواب یہ ہے کہ اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا بلکہ اس میں تو صرف ترتب راحت کا ذکر ہے قصد استراحت پر کوئی لفظ دال نہیں مگر اس حکایت سے جاہل لوگ خوش ہوئے ہوں گے کہ بڑا مزہ آیا۔ اب سے ہم بھی نماز روزہ کے لئے اہتمام و تدبیر نہ کیا کریں گے بلکہ تفویض کردیں گے اس کا جواب یہ ہے کہ بہت اچھا پھر اللہ تعالیٰ تم کو سزا دیں گے اس وقت بھی تفویض کرنا۔

جیسے مثنوی میں ایک جبری کی حکایت مولانا نے لکھی ہے کہ وہ اختیار کا قائل نہ تھا۔ ایک دن وہ

کسی شخص کے باغ میں جا کر انگور توڑ توڑ کر کھانے لگا۔ مالک باغ نے جو دیکھا تو اس نے دھمکایا کہ یہ کیا کر رہا ہے، میرے انگور کیوں کھاتا ہے۔ کہا چپ رہو۔ زمین بھی خدا کی، درخت بھی خدا کا، انگور بھی خدا کے میں بھی خدا کا تو منع کرنے والا کون ہے۔ وہ باغ والا بھی ذہین تھا اس نے اپنے نوکر کو آواز دی کہ ایک خٹکا اور ایک رسا لاوہ لے آیا تو اس نے اس جبری کو رسے سے باندھ کر خوب مارا وہ چلانے لگا کہ اللہ کے واسطے چھوڑ دے کہا چپ رہو میں بھی خدا کا تو بھی خدا کا رسا بھی خدا کا خٹکا بھی خدا کا پھر کیوں چلاتا ہے۔ وہ کہنے لگا۔

گفت توبہ کردم از جبر اے عیار   اختیار است اختیار است اختیار
(اس نے کہا کہ میں نے جبر سے توبہ کی اور اختیار کا قائل ہوا)

معنی تفویض:

یاد رکھو تفویض کے معنی ترک تدبیر نہیں بلکہ تفویض کے معنی یہ ہیں کہ خدا کے سوا کسی پر نظر نہ رکھے، تدبیر کرے اور تدبیر کے نتیجہ کو خدا کے سپرد کر دے اور حضرت ابراہیم نے تدبیر فرض سے زیادہ تدبیر کی تھی اس لئے ان کو تنبیہ کی گئی کیونکہ خواص کو تدبیر فرض سے زیادہ کی اجازت نہیں ہوتی اور ہم کو تدبیر فرض سے زیادہ کی بھی اجازت ہے۔ کیونکہ ہم گنوار ہیں اور گنواروں کے لئے وہ قواعد نہیں ہوتی جو خواص کے لئے ہیں جیسے ایک حکیم کا قصہ ہے کہ اس نے ایک گنوار کو دیکھا کہ چنے کی چار پانچ روٹیاں کھا کر اوپر سے چھاچھ کا بنٹا پی رہا ہے۔ حکیم نے کہا کہ چھاچھ کو کھانے کے درمیان میں پینا چاہیے۔ اخیر میں پینا مضر ہے۔ گنوار نے اپنے بیٹے کو آواز دی کہ ارے فلانے ایک چار ٹکر (یعنی روٹی) اور لے آئے اسے چھاچھ کو بیچ میں کرلوں یو (یہ) حکیم کہہ رہا ہے۔ چنانچہ وہ چار تچک اور کھا گیا۔ حکیم صاحب نے یہ منظر دیکھ کر کہا چودھر جی! جی تمہارے واسطے کوئی قاعدہ قانون نہیں تم چاہے بیچ میں پیو یا اخیر میں اسی طرح ہمارے واسطے یہ قاعدہ نہیں کہ تدبیر فرض سے زیادہ تدبیر نہ کریں بلکہ ہم تو جب فرض سے زیادہ کرینگے جب فرض تک پہنچیں گے۔ غرض اس میں شک نہیں کہ تفویض سے دنیا کے کاموں میں بھی راحت ہے اور دین کے کاموں میں بھی۔ دنیا میں مقدمہ اور مدرسہ کی مثال تو گذر چکی۔ ایک اور مثال لو۔

مثلاً تم اپنے لڑکے کا رشتہ کر رہے ہو اور کامیابی نہیں ہوتی اس سے رنج ہوگا۔ کیونکہ تفویض نہیں تھی۔ تم نے اپنی طرف سے ایک شق تجویز کر لی تھی کہ یوں ہونا چاہیے اور اگر ابتداء ہی سے تجویز نہ کرتے بلکہ تفویض کرتے تو ہرگز ناکامی سے رنج نہ ہوتا یا کوئی عزیز مریض تھا تم اس کے

لئے تعویذ دیئے گئے اور نفع نہ ہوا تو اس وقت بھی رنج ہوگا کیونکہ تفویض نہ تھی بلکہ اس اعتقاد سے تعویذ دیا گیا تھا کہ بس اس کے باندھتے ہی آرام ہو جائے گا۔ اگر تفویض ہوتی تو اول ہی سے ہر شق پر راضی ہوتے اور وہ تعویذ تفویض ہو جاتا۔

آج کل مدرسہ دیوبند میں ایک شور برپا ہے۔ سخت شورش ہو رہی ہے (کہ وہ لوگ جن کو مولوی حبیب الرحمٰن صاحب نے باپ بن کر پالا پرورش کیا پڑھایا لکھایا اور تدابیر سے ان کو بڑا بنایا آج وہ انہی کے مقابلہ میں بڑائی جتلا رہے ہیں اور ان کے ہاتھ سے مدرسہ کا اہتمام لینا چاہ رہے ہیں اور مولوی حبیب الرحمٰن صاحب ایسے بے نفس ہیں کہ مدرسہ کے اہتمام سے استعفیٰ دینے کو آمادہ ہو گئے کہ جب میری خدمت لوگوں کو پسند نہیں تو میں ہی الگ ہو جاؤں لیکن اراکین مدرسہ نے ان کو اس خیال سے روک رکھا ہے ۱۲ جامع) اور اس شورش کے رفع کرنے میں مہتمم مدرسہ اراکین سب کوشاں ہیں مگر میں نے مہتمم صاحب کو لکھ دیا ہے کہ تم ابھی وقت سے ہر نتیجہ کے لئے آمادہ ہو جاؤ یہ تجویز ذہن میں نہ کرو کہ مدرسہ رہے یا تمہارے ہاتھ میں رہے بلکہ اگر مدرسہ ٹوٹ جائے یا بند ہو جائے تو تم ابھی سے اس پر راضی ہو جاؤ اور خدا پر نظر کر کے قوت کے ساتھ اپنے اصول پر قائم رہو اور یہ قوت بدوں تفویض کے پیدا نہیں ہو سکتی اس کا یہ مطلب نہیں کہ تدبیر نہ کرو کیونکہ تفویض ترک تدبیر کا نام نہیں چنانچہ میں کہہ چکا ہوں کہ تدبیر بھی اسی کا حکم ہے جس کے لئے تم تفویض کر رہے ہو دلیلہ الصَّرِیْحُ وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ (اس کی صریح دلیل یہ ہے واعدوا یعنی اور ان کافروں کے لئے جس قدر تم سے ہو سکے ہتھیار سے اور پلے ہوئے گھوڑوں سے سامان درست رکھو کہ اس کے ذریعہ سے تم رعب جمائے رکھو ان پر جو اللہ کے دشمن ہیں اور تمہارے دشمن ہیں) بس تفویض یہ ہے کہ تدبیر کرو مگر اس پر نظر نہ کرو اور اپنی تجویز سے کوئی شق نتیجہ کی متعین نہ کرو کہ یوں ہونا چاہیے۔

میرے اس لکھنے کا یہ اثر ہوا کہ مہتمم صاحب بڑے مضبوط ہو گئے اور لکھتے ہیں کہ تیری وجہ سے ہمیں بہت قوت ہو گئی۔

میرے ایک اور دوست ہیں ان کے ذمہ قرض بہت ہو گیا ہے۔ بنئے نالش کرنا چاہتے ہیں اس سے وہ بے چارے بڑے پریشان ہو رہے تھے مجھے بھی اپنی پریشانی لکھی۔ میں نے لکھا کہ پریشان کیوں ہوتے ہو آخر وہ نالش کر دیں گے تو کیا ہو جائے گا بہت سے بہت تم کو قید کرا دیں گے تو تم قید خانہ میں چلے جانا یا زمین و مکان نیلام ہو جائے گا تم زمین و مکان نیلام کرا دینا جس خدا نے اب تک

روزی دی ہے وہ پھر بھی روزی دے گا تم اپنی طرف سے اسی وقت ہر نتیجہ کے لئے تیار ہو جاؤ اور اس کے بعد مقدمہ میں تدبیر اس کی کرو کہ قرض کی قسطیں ہو جائیں۔ یہ خط پڑھ کر ان کو ایسا سکون واطمینان ہوا کہ اب لکھتے ہیں کہ یوں جی چاہتا ہے کہ سب قرض خواہوں سے کہہ دوں کہ سب مل کر نالش کر دو جو ہونا ہوگا ہو جائے گا میں نے لکھا کہ ایسا بھی نہ کرنا کہ یہ بھی خلاف تفویض ہے اپنی طرف سے تم نہ بلا تجویز کرو نہ راحت بلکہ جو وہ تجویز کردیں اس پر راضی رہو۔ حضرت یہ نسخہ اکسیر میں نے ایسا بتلا دیا جس سے نہ اہل دنیا کو استغناء ہے، نہ اہل دین کو، نہ علماء کو استغناء ہے نہ عرفاء کو بلکہ تمام عالم اس کا محتاج ہے اور اس کی زیادہ قدر ان سالکین کو ہوگی جو کسی بلائے باطنی میں پھنسے ہوئے ہوں کیونکہ بعض حالات سالکین کو ایسے پیش آتے ہیں کہ اگر پہاڑ پر رکھے جائیں تو پہاڑ پھٹ جائیں۔

آسماں بار امانت نتوانست کشید   قرعہ فال بہ نام من دیوانہ زدند

(آسمان بار امانت نہ اٹھا سکا قرعہ فال مجھ دیوانہ کے نام آیا)

یہ روح انسانی ہی کی طاقت ہے کہ وہ ایسے ثقیل وشدید امور کا تحمل کرتی ہے اسی کو حق تعالیٰ فرماتے ہیں **انا عرضنا الامانة علی السموٰت والارض والجبال فابین ان یحملنھا** (بیشک ہم نے یہ امانت آسمانوں، زمین اور پہاڑوں پر پیش کی تھی انہوں نے اس کی ذمہ داری سے انکار کر دیا) اور ایک آیت میں جو یہ فرمایا گیا ہے **لخلق السموٰت والارض اکبر من خلق الناس** (آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا انسان کے پیدا کرنے سے بڑھ کر ہے) تو یہ باعتبار مادہ انسانی کے ہے سو اس میں کیا شک ہے کہ مادہ انسان مادہ سمٰوٰت سے اضعف ہے لیکن روح انسانی **اَشَدُّ مِنَ الْجِبَالِ** (پہاڑوں سے زیادہ سخت) ہے روح انسان کی قوت سمٰوٰت وارض سب سے زیادہ ہے جس کا تجربہ سالکین کو ہوتا ہے جن پر یہ احوال شدائد گذرتے رہتے ہیں اور اس وقت تفویض کے سوا کوئی آلہ راحت کا نہیں بس سالکین تفویض کر کے دیکھیں ان شاء اللہ سب شدائد کا تحمل آسان ہو جائے گا ورنہ بھی آسان ہو تو تفویض کے سوا چارہ ہی کیا ہے۔ اسی کو حضرت حافظ فرماتے ہیں۔

باغباں گر چند روزے صحبت گل بایدش   بر جفائے خار ہجراں صبر بلبل بایدش

(باغبان کو اگر چند روز گل کی صحبت چاہیے تو خار ہجران کی زیادتی پر بلبل کا سا صبر درکار ہے)

اگر کبھی وصال کے بعد فراق ہو جائے تو صبر سے کام لو تفویض کرو۔ اگر تجلی جمال کے بعد تجلی قہر وجلال ہو تو اس وقت بھی تفویض سے ہی کام لو۔ حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار فرمایا کہ مجھے چین کیونکر ہو، اسرافیل صور منہ میں لئے ہوئے ہے اور کان جھکائے

حکم کا منتظر ہے کہ ذرا حکم ہو تو عالم کو درہم برہم کردوں۔ صحابہ اس کو سن کر لرز گئے گھبرا گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قُوْلُوْا حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ (ہم کو اللہ کافی ہے اور وہی اچھا کار ساز ہے) یعنی گھبراؤ نہیں بلکہ حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ کہو یعنی تفویض کرو اور خدا پر نظر رکھو۔ ارے جب سارے راستے ان کے ہی قبضے میں ہیں اور تم کہیں سے نکل کر بھاگ نہیں سکتے تو اب بجز تفویض کے چارہ ہی کیا ہے۔ مولٰنا فرماتے ہیں۔

اے حریفان راہ ہارا بست یار　　آہو لنگیم داؤ شیر شکار

(اے حریفوں یار نے تمام راستے بند کردیئے ہیں ہم لنگڑے ہرن کی
طرح اور شکار کے ہرن کی طرح ہے)

واللہ سارے راستے بند ہیں تم کہیں ان کے قبضہ سے باہر نہیں جاسکتے بس ہماری ایسی مثال ہے جیسے لنگڑا ہرن شیر کے پنجہ میں ہو اب بتلاؤ لنگڑا ہرن شیر کے پنجہ سے چھوٹنے کی کوشش کرے تو یہ اس کی حماقت ہے یا نہیں۔ بس اس کی خیر اسی میں ہے کہ اپنے کو شیر کے سامنے ڈال دے اور اس کے ہر تصرف پر راضی ہوجائے خواہ کھالے خواہ چھوڑ دے۔

غیر تسلیم ورضا کو چارہ　　درکف شیر نرخوں خوارۂ

(سوائے تعلیم ورضائے کوئی چارہ نہیں تم مثل خونخوار شیر نر کی مٹھی میں ہو)

ہائے اللہ ہائے اللہ اے اللہ اے اللہ (صَاحَ الشَّیْخُ وبکی وَوَلْوَلَ وَاضْطَرَبَ اِضْطِرَابًا شَدِیْدًا لَمْ نُشَاھِدْ بِہٖ قَطُّ (شیخ چلائے اور روئے اور سخت مضطرب ہوئے اس سے پہلے کبھی ایسا مشاہدہ نہیں ہوا) دیر تک خاموش رہنے کے بعد فرمایا کہ ۱۲ جامع) واللہ بجز تسیلم ورضا کے کچھ چارہ نہیں۔

غیر تسلیم ورضا کو چارۂ　　درکف شیر نرخوں خوارۂ

آہوئے لنگ کو یہی چاہیے کہ اپنے کو شیر کے آگے ڈال دے اور اپنا ضعف وعجز ظاہر کرے اب یہ ہوگا کہ شیر اس پر رحم کرکے خود اس کی پرورش کرے گا اور جنگل سے شکار لاکر اس کے آگے ڈال دے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو یہی علاج بتلایا ہے قُوْلُوْا حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ (کہو ہم کو اللہ کافی ہے اور وہی اچھا کارساز ہے) جس پر وعدہ ہے **ومن یتوکل علی اللہ فھو حسبہ ان اللہ بالغ امرہ قد جعل اللہ لکل شئی قدراً.** (اور جو شخص اللہ پر توکل کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کیلئے کافی ہے اللہ تعالیٰ اپنا کام پورا کرکے رہتا ہے اللہ تعالیٰ نے ہر شے کا ایک اندازہ مقرر کر رکھا ہے) اس شعر کے بعد حافظؒ فرماتے ہیں۔

اے دل اندر بند زلفش از پریشانی منال
مرغ زیرک چوں بدام افتد تحمل بایدش

(یعنی تمہاری مثال ایسی ہے جیسے مرغ جال میں پھنسا ہوا ہو اس کو تحمل ہی چاہیے کہ صبر وسکون کے ساتھ پابزنجیر ہو جاوے ورنہ جتنا پھڑ پھڑائے گا اور زیادہ پھنسے گا)

تڑپو گے جتنا جال کے اندر   جال گھسے گا کھال کے اندر

اس کے بعد فرماتے ہیں۔

رند عالم سوز را با مصلحت بینی چہ کار   کار ملک ست آنکہ تدبیر وتحمل بایدش

(اندر عالم سوز یعنی عاشق کو مصلحت بینی سے کیا تعلق اس کو تو محبوب حقیقی کا کام سمجھ کر تحمل وتدبیر چاہیے)

یعنی تدبیر کے درپے ہونا اور اسی فکر میں رہنا غلام کا کام نہیں یہ کام بادشاہوں کا ہے اور تم بادشاہ نہیں ہو بلکہ غلام ہو بادشاہ صرف ایک ہے اور سب اس کے غلام ہیں پس ان تدابیر پر نظر کرنا چھوڑ دو خدا پر نظر رکھو آگے علم وعمل پر بھروسہ کرنے کو منع فرماتے ہیں۔

تکیہ بر تقویٰ ودانش در طریقت کافریست   راہرو گر صد ہنر دارد توکل بایدش

(طریقت میں عقل وتقویٰ پر بھروسہ کرنا کفر ہے سالک اگر سو ہنر جانتا ہو پھر اس کو توکل یعنی اپنے کو اہل اللہ کے سپرد کرنا چاہیے۔)

یہاں بڑے بڑے متقی اور عارف سالک کو توکل ہی لازم ہے اس سے کام چلے گا ورنہ جہاں اس نے اپنی عقل یا تقویٰ پر اعتماد کیا اور تباہ ہوا۔ حضرت یہی ہے تفویض اور یہی حقیقت ہے اسلام کی اور اسی کا حکم ہے اس آیت میں لَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (سوائے اسلام کے اور کسی حالت میں جان دو) مگر ہم نے اسلام کا صرف لفظ یاد کر لیا ہے اس کی حقیقت پر کبھی نظر نہیں کی جن کو طریق کے احوال پیش آتے ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ جہاں تدبیر کے پیچھے پڑے اور اس پر نظر کی وہیں پریشانی اٹھائی اور جب تفویض کی فوراً ہلکے پھلکے ہو گئے اور ایسا معلوم ہوا کہ گویا کوئی یوں کہہ رہا ہے۔

من غم تو می خورم تو غم مخور   بر تو من مشفق ترم از صد پدید

(میں تیرا غم خوار ہوں تو غم مت کر میں تجھ پر سیکڑوں باپوں سے زیادہ شفیق ہوں)

تدبیر مشروع:

پس ہمیشہ کے لئے یہی دستور العمل بنا لو کہ شریعت نے جس تدبیر کی اجازت دی ہے خواہ

دین کے متعلق ہو یا دنیا کے وہ کر کے آگے نتیجہ کو خدا تعالیٰ کے سپرد کرو بس اسی سے نجات ہوگی اب میں تمام دنیا سے کہتا ہوں کہ کوئی اس سے بہتر نسخہ تو لائے ذرا ہم بھی تو دیکھیں ان شاء اللہ قیامت آجائے گی اور اس سے بہتر نسخہ کوئی نہ لا سکے گا اسی کو حق تعالیٰ اس جگہ بیان فرماتے ہیں وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (سوائے اسلام کے اور کسی حالت میں جان مت دو) اس کے بعد فرماتے ہیں وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا کہ اللہ کی رسی کو (یعنی قرآن واحکام قرآن کو جس میں حدیث وفقہ بھی سب شامل ہیں کیونکہ سب اسی ایک متن کی شروح ہیں) مضبوط پکڑ لو اور آپس میں افتراق نہ کرو (کیونکہ اس سے دین کو بھی سخت ضرر پہنچتا ہے جس کی بناء پر حدیث میں فساد ذات البین کو حالقہ فرمایا گیا ہے کما تقدم وَاذْکُرُوْا نِعْمَۃَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ اِذْ کُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِہٖٓ اِخْوَانًا اور اللہ کی اس نعمت کو اپنے اوپر یاد کرو کہ تم پہلے باہم دشمن تھے پھر اللہ تعالیٰ نے تمہارے قلوب میں الفت ڈال دی جس سے تم بھائی بھائی ہوگئے (یہ تو دنیوی نعمت ہے) وَکُنْتُمْ عَلٰی شَفَا حُفْرَۃٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَکُمْ مِّنْھَا اور تم جہنم کے گڑھے کے کنارہ پر کھڑے تھے کہ جہنم میں جانے کے لئے صرف مرنے کی دیر تھی کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو رسول اللہ صلی اللہ عیہ وسلم کے ذریعہ سے اس سے بچالیا (یہ دینی نعمت ہے) ان نعمتوں کو یاد کر کے ان کا شکر ادا کرو اور شکر وہی ہے کہ حَبْلُ اللّٰہِ کو مضبوط پکڑ لو یہ تو ترجمہ تھا اور مقصود ظاہر ہے کہ حبل اللہ اسلام ہے اور اسلام کی حقیقت تفویض ہے جو تمام حالات کو شامل ہے خواہ حالات آفاقیہ ہوں خواہ انفسیہ ہوں پھر انفسیہ میں خواہ احوال حسیہ ہوں جیسے مرض وصحت وقوت وضعف خواہ باطنیہ ہوں جیسے قبض وبسط ہیبت وانس ومحبت وشوق وامثالہا سب کو اپنے سر آنکھوں پر رکھے پس مقصود یہ ہوا کہ ہر حال میں تفویض پر مداومت رکھو چونکہ مجھے اس مضمون سے خود بہت نفع ہوا ہے اس لئے میں نے دوستوں کو بھی اس سے مطلع کرنا چاہا۔

بس اب میں ختم کرتا ہوں دعا کیجئے اللہ تعالیٰ ہم کو یہ دولت عظمیٰ نصیب فرمائیں اور فہم سلیم عطا فرمائیں آمین وصلی اللہ علی سیدنا خیر خلقہ محمد وعلی آلہ واصحابہ وازواجہ وذریتہ اجمعین واخر دعونا ان الحمد للہ رب العالمین۔

الاسلام الحقیقی

سے موسوم یہ وعظ

حکیم الامت مجدد الملۃ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے مظفر نگر میں بر سڑک متصل مکان شیخ ولایت علی صاحب سوداگر۔ ۴۵ منٹ تک کھڑے ہو کر بعد میں کرسی پر بیٹھ کر ۱۱ شوال المکرم ۱۳۴۰ھ بمطابق ۸ جون ۱۹۲۲ء شب جمعرات کو ارشاد فرمایا۔ جو دس بج کر ۱۲ منٹ سے رات ایک بجے تک جاری رہا۔ سامعین کی تعداد تقریباً ۵۰۰ (پانچ سو) تھی اور کچھ مستورات بھی تھیں۔ حکیم محمد مصطفٰے صاحب بجنوریؒ نے سے قلمبند فرمایا۔

مختصر یہ ہے کہ اسلام کامل یہ ہے کہ ہر حال میں آدمی حق تعالیٰ کا منقاد و مطیع رہے۔ اغراض سے قطع نظر کر کے اتباع اختیار کرے۔ نہ مال کی پرواہ کرے، نہ جاہ کی، نہ حکومت کی۔ نہ بڑے ہونے کی۔ بس اس کا یہ حاصل ہو جائے کہ

دلارا میکہ داری دل دروبند
دگر چشم از ہمہ عالم فروبند،
(از حضرت حکیم الامتؒ)

خطبہ

امابعد فاعوذ باللہ من الشیطن الرجیم. بسم اللہ الرحمن الرحیم.
قل ان صلوتی و نسکی ومحیای ومماتی للہ رب العلمین. لا
شریک لہ وبذالک امرت وانا اول المسلمین

ترجمہ: اے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آپ فرما دیجئے کہ بالیقین میری نماز اور میری ساری عبادت اور میرا جینا اور میرا مرنا یہ سب خالص اللہ تعالیٰ ہی کا ہے جو مالک ہے سارے جہان کا۔ اس کا کوئی شریک نہیں اور مجھ کو اسی کا حکم ہوا ہے اور میں سب ماننے والوں سے پہلا ہوں۔ (الانعام آیت نمبر ۱۶۲، ۱۶۳)

حکم اظہار مشرب:

اس آیت میں حق تعالیٰ نے اپنے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرمایا ہے کہ اپنا مشرب ظاہر کر دیجئے اسی واسطے امر کا صیغہ لایا گیا جس کے معنی یہ ہوئے کہ کہہ دیجئے اور سنا دیجئے لوگوں کو چنانچہ آپ نے اس حکم کی تعمیل کی اور حضور کو ایسا امر کرنے سے غرض یہ ہے کہ ہم لوگ بھی اس کا امثال کریں کیونکہ رسول کے بھیجنے سے غرض یہی ہوا کرتی ہے کہ اس کے اقوال اور افعال کی تقلید کی جائے یہ رحمت ہے حق تعالیٰ کی کہ ہمارے واسطے اوامر اور نواہی کی کتاب بھی بھیج دی اور رسول کو خود نمونہ بھی بنا دیا تاکہ احکام کی تعمیل میں کوئی دقت نہ رہے۔ کیوں کہ تعلیم کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ کسی کام کا طریقہ زبانی بتا دیا جاوے۔ اور ایک طریقہ یہ ہے کہ ہاتھ سے بھی کر کے دکھا دیا جاوے دوسری صورت تعلیم کی نہایت مکمل ہے اور پہلی صورت تعلیم کے لئے بسا اوقات کافی نہیں ہوتی مثلاً ایک باورچی اپنے شاگردوں کو کھانوں کے پکانے کی ترکیب زبانی بتلا دے۔ یا بصورت کتاب لکھ کر دے دے اور خوب اچھی طرح سمجھا کر پڑھا دے اور ذہن نشین بھی کر دے مگر ہاتھ سے پکا کر نہ دکھائے تو یہ تعلیم کافی نہ ہوگی اور ممکن نہیں کہ شاگردان زبانی بتلائی ہوئی اور پڑھائی ہوئی ترکیبوں سے کھانا پکا لیں۔ بخلاف اس کے کہ وہ باورچی کھانوں کی ترکیبیں زبانی بتلانے اور لکھوانے کے ساتھ پکا کر بھی دکھلا دے اور شاگردوں کے ہاتھ سے پکوا بھی دے تو یہ تعلیم نہایت مکمل ہوگی اور اس استاد کو بہت شفیق کہا جاوے گا۔ یہی حالت انبیاء علیہم السلام کی

ہے کہ وہ احکام الٰہی کو لیکر آتے ہیں اور ان کو زبانی بھی سمجھایا ہے اور اپنے ہاتھ سے ان کی تعمیل کر کے بھی دکھلا دی ہے غرض تعلیم کو بالکل مکمل کر دیا ہے اور ظاہر ہے کہ جو افعال ان حضرات نے کر کے دکھائے ہیں اس سے غرض یہی ہے کہ دوسرے بھی ان کی تقلید کریں اور ان کو احکام بجا لانے میں کوئی دقت پیش نہ آئے اسی قبیل سے یہ آیت ہے جس میں حکم ہے کہ اپنا مشرب ظاہر کر دیجئے غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اس کی قدر ہم نے کہاں تک کی۔

ہمارے دعویٰ اسلام کی حقیقت:

اس وقت وجہ اس آیت کے بیان کی یہ ہے کہ ہم لوگ اسلام کے مدعی ہیں اور بحمد اللہ اسلام سے متصف بھی ہیں۔ یہ نعمت ہے حق تعالیٰ کی اس سے انکار کیوں کیا جائے۔ مگر جس اسلام کا دعویٰ کیا جاتا ہے اس کی حقیقت بھی سمجھئے تاکہ معلوم ہو کہ دعویٰ صحیح ہے یا نہیں۔ اور کمال کے درجہ میں صحیح ہے یا کسی اور درجہ میں۔ میں اول ایک قاعدہ بیان کرتا ہوں جس کے بعد اس مضمون کا سمجھنا سہل ہو جائے گا وہ قاعدہ یہ ہے کہ جو شخص کسی صفت کے ساتھ متصف ہونے کا دعویٰ کرتا ہے تو تین حال سے خالی نہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ صفت اس میں بالکل نہ ہو اس صورت میں تو یہ دعویٰ کرنا بالکل جھوٹ ہے اور ایک صورت یہ ہے کہ وہ صفت اس میں ہو تو سہی لیکن کامل نہ ہو اس صورت میں وہ دعویٰ تو صحیح ہو گیا مگر صرف لغت کے اعتبار سے صحیح ہوگا عرفاً صحیح نہ ہوگا اور ایک صورت یہ ہے کہ وہ صفت اس میں علی وجہ الکمال موجود ہو تو اس صورت میں اس کا دعویٰ لغۃً اور عرفاً دونوں طرح صحیح ہوگا۔ مثلاً کوئی شخص مالدار ہونے کا دعویٰ کرے تو اس کی تین صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ دعویٰ خلاف واقع ہو یعنی مال اس کے پاس ذرا بھی نہ ہو اور خواہ مخواہ اپنے کو مالدار کہے یہ دعویٰ تو جھوٹا ہے اور ایک صورت یہ ہے کہ دعویٰ خلاف واقع اور جھوٹا تو نہیں ہے مگر یہ صفت اس میں علی وجہ الکمال نہیں ہے یعنی بہت مالدار نہیں ہے قدر قلیل اور برائے نام مال رکھتا ہے مثلاً دو چار پیسہ رکھتا ہے تو اس شخص کا یہ دعویٰ کہ میں مالدار ہوں لغۃً غلط نہیں کیونکہ مال کچھ نہ کچھ تو اس کے پاس موجود ہے لیکن عادت اور عرف یہ ہے کہ ایسے شخص کو بھی مالدار نہیں کہتے حتیٰ کہ اکثر ایسا شخص خود بھی یہ کہتے ہوئے شرماتا ہے کہ میں مالدار ہوں چنانچہ اگر کسی مجمع میں پکارا جائے کہ یہاں کون کون صاحب مالدار ہیں تو یہ شخص جس کے پاس دو چار پیسے ہوں ہرگز اپنا نام نہ لے گا حالانکہ یہ لغۃً مالدار ہے اور تیسرا درجہ یہ ہے کہ کسی کے پاس کثرت سے مال ہو۔ یہ شخص لغۃً وعادۃً ہر طرح مالدار ہے اور اگر وہ اپنے کو مالدار کہے تو اپنے دعویٰ میں سچا ہوگا۔

یہی حال ہر صفت کا ہے کہ اس میں تین درجے ہوتے ہیں ایک اس صفت کا بالکل معدوم

ہونا۔ اور ایک موجود ہونا مگر ناقص درجہ میں۔ اور ایک علی وجہ الکمال موجود ہونا۔ مثلاً عاقل ہونے کا دعویٰ کرنا اس میں ایک درجہ تو یہ ہے کہ کسی میں بالکل بھی عقل نہ ہو اور ایک یہ ہے کہ عقل تو ہو مگر کم۔ اور ایک یہ کہ کامل العقل ہو۔ ان تینوں درجوں میں سے عاقل اگر کہا جائے گا تو کامل العقل ہی کو کہا جائے گا اسی طرح دعویٰ شجاعت ہے کہ اس میں بھی تین درجے ہیں ایک تو یہ کہ کوئی ایسا کچے دل کا ہو کہ ذرا سی آہٹ سے بھی اس کا پیشاب خطا ہو جاتا ہو اس پر تو شجاع کا اطلاق کذب ہے اور ایک یہ کہ اس قدر بزدل تو نہ ہو کچھ دل کا مضبوط ہو۔ لیکن بہادر نہ ہو اس صورت میں شجاع کا اطلاق کذب تو نہیں ہے مگر عرف کے خلاف ہے اور عادۃً کوئی اس کو شجاع اور بہادر نہیں کہتا اور ایک درجہ یہ ہے کہ اعلیٰ درجہ کی شجاعت رکھتا ہو اور واقعی بہادر ہو اس شخص پر اطلاق شجاع کا بالکل صحیح ہے اور عقل اور عرف سب کے موافق ہے اس کی مثالیں بہت ہیں۔

حاصل یہ ہے کہ ہر صفت میں تین درجے ہوتے ہیں۔ عدم بالکلیہ اور وجود مع نقصان اور وجود مع کمال اور ان تینوں صورتوں میں اس صفت کا اطلاق بالکل صحیح معنوں میں اگر ہوتا ہے تو تیسرے درجے پر ہوتا ہے یعنی جبکہ وہ صفت علی وجہ الکمال پائی جائے۔ اب اصل مقصود پر آئیے کہ ہم دعویٰ کرتے ہیں اسلام کا تو حسب قاعدہ مذکورہ اس میں بھی تین درجے ہوں گے ایک یہ کہ دعویٰ اسلام کا ہو اور واقع میں اسلام بالکل نہ ہو یہ تو کذب ہے۔ الحمدللہ اس سے ہم بری ہیں یہ تو صفت کفار اور منافقین کی ہے منافقین بھی کفار ہی ہیں۔

منافقین اور اسلام:

منافقین سے میری مراد وہ نہیں ہیں جن کو آج کل کے محاورہ میں منافق کہا جاتا ہے آج کل کا محاورہ یہ ہے کہ جو زبان سے کچھ کہے اور دل میں کچھ ہو یعنی احباب اور اپنے ملنے والوں سے یہ برتاؤ رکھتا ہو کہ منہ پر تو نرم نرم باتیں کرے اور پیچھے برا بھلا کہتا اور گالیاں دیتا ہو اس کو منافق کہتے ہیں یہاں میری مراد یہ معنی نہیں بلکہ وہ معنی مراد ہیں جس پر شریعت کی اصطلاح میں منافق کا اطلاق ہوتا ہے وہ یہ کہ زبان سے دعویٰ کرے اسلام کا اور واقع میں اسلام نہ رکھتا ہو چونکہ اس کے دل میں اسلام نہیں ہوتا لہذا اسلام سے یہ بالکل خالی ہوتا ہے کیونکہ اسلام حقیقۃً قلب میں ہوتا ہے۔ اور اس کے قلب میں اسلام ہے نہیں تو اسلام کی صفت اس میں بالکل موجود نہیں صرف زبانی دعویٰ ہی دعویٰ ہے اور جب اس میں اسلام نہیں ہے تو کافر ہوا تو یہ اسی قسم میں داخل ہوا جو دعویٰ کرتا ہے ایک صفت کا اور وہ صفت اس میں بالکل موجود نہیں ہے تو دعویٰ اس کا کاذب ہے اس لئے فرمایا ہے وَاللّٰهُ يَشْهَدُ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَكَاذِبُونَ۔ (اور اللہ تعالیٰ گواہی دیتے ہیں کہ یہ منافقین جھوٹے ہیں)

اوران منافقین کا وجود باعتبار حکم شرعی کے اب نہیں ہے اس اعتبار کے ساتھ ان کا وجود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں تھا کیوں کہ قانون یہ تھا کہ یا تو دل سے کوئی ایمان لے آوے یا زبان سے مان لے اور یہ کہہ دے کہ میں مسلمان ہوں گو دل میں نہ ہو ورنہ قتل وقتال ہوگا تو اس وقت ایک جماعت ایسی تھی جس کے دل میں اسلام نہ تھا مگر قانون قتل وقتال کے ڈر سے زبان سے کہہ دیتے تھے کہ ہم بھی مسلمان ہیں تو وہ ظاہری احکام میں مسلمان سمجھے جاتے تھے نہ کہ حقیقت میں کیونکہ زبان کا اسلام کسی درجہ میں اسلام نہیں ہے کیونکہ اسلام تو دراصل قلب کا فعل ہے زبانی اسلام کو جو اسلام کہہ دیا جاتا ہے وہ صرف اس وجہ سے کہ زبان قلب کا عنوان ہے جب ایک شخص زبان سے کہہ رہا ہے کہ میں مسلمان ہوں اور اس کا کوئی مکذب نہیں تو اس کو کون کہہ دے کہ اس کے دل میں اسلام نہیں ہے اور گو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی سے بعض کا منافق ہونا معلوم ہو جاتا تھا مگر یہ حکم تھا کہ ان کے ساتھ بھی اہل اسلام ہی کا سا معاملہ کیا جاوے اس بناء پر اس وقت تین درجے مقرر تھے مومن و منافق و کافر اور اب کسی کو کسی کے قلب کا قطعی طور پر حال معلوم نہیں ہو سکتا اس لئے اب یہ درجہ نہ رہا کہ گو دل سے کسی کا کافر ہونا معلوم ہو جاوے مگر اس کے ساتھ معاملہ کافر جیسا نہ کیا جاوے کیونکہ وحی نہ ہونے کے سبب اب کسی کا دل سے کافر ہونا معلوم ہو ہی نہیں سکتا اس لئے اب تین درجے نہیں رہے صرف دو ہی درجے رہ گئے۔ مسلم یا کافر اور حضور کے زمانہ میں جو تین درجے تھے وہ بھی محض ظاہری احکام کے لحاظ سے تھے کہ ظاہر میں منافقین کے احکام مثل مسلمانوں کے تھے باقی حقیقت کے اعتبار سے تو ان منافقین کا کوئی تیسرا درجہ نہیں درجے درحقیقت دو ہی ہیں کفار اور مومنین۔ اور منافقین دراصل کفار ہی میں داخل ہیں اسی واسطے میں نے کہا تھا کہ منافقین بھی کفار ہی ہیں۔ یہ گروہ اب نہیں ہے صرف اسی زمانہ میں تھا اور ان کے واسطے یہ حکم تھا کہ ان کے ساتھ معاملہ اہل اسلام کا سا کرو نماز میں شریک ہوں تو ہونے دو مساجد میں آئیں تو آنے دو۔ غرض سب طرح ظاہری برتاؤ مسلمانوں کا سا رکھو لیکن حق تعالیٰ نے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو مطلع فرما دیا تھا مبہماً تو اس آیت سے وَمَاهم بمومنين یعنی یہ لوگ زبان سے کہتے ہیں کہ ہم بھی مومن ہیں مگر یہ مومن نہیں ہیں اس آیت میں تو ابہام کے ساتھ اطلاع دی گئی ہے اور تعیین کے ساتھ بھی اطلاع کر دی تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی ایک ایک کا نام بتلا دیا گیا تھا مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس راز کے اعلان عام کی اجازت نہیں دی تھی کیونکہ اس میں بعض مصلحتیں تھیں مثلاً یہ کہ اگر ان کے کفر کو تعیین کے ساتھ ظاہر کر دیا جاتا تو شاید کوئی ان کو قتل کر دیتا اور ان کے

ساتھ معاملہ کفار کا سا کیا جاتا اور قتل وقتال کیا جاتا تو خبریں دور دور بھی پہنچتی ہی ہیں تو سب جگہ یہ شہرت ہو جاتی کہ وہاں تو مسلمانوں کو بھی قتل کیا جاتا ہے تو پھر کوئی مسمان ہونے کیوں آتا۔ نیز حضورؐ کے اخلاق پر دھبہ آتا کہ اپنوں کو بھی قتل کرتے ہیں اس وجہ سے ان کے ساتھ معاملہ کفار کا سا نہیں کیا گیا یہی وجہ ہے کہ بعض وقت کسی منافق کے منہ سے کوئی بات ایسی نکل بھی گئی جس سے اس کا مافی الضمیر ظاہر ہو گیا اور حضرت عمر فاروقؓ نے حضورؐ سے اجازت مانگی کہ **دعنی اضرب عنقه** یعنی اجازت دیجئے کہ میں اس کی گردن مار دوں تو حضورؐ نے اس کی اجازت نہیں دی وہ مصلحت یہی ہے کہ اگر اجازت دی جاتی تو خبر یہی مشہور ہو جاتی کہ ایک مسمان کو مار دیا گیا اس وجہ سے منافقین کے ساتھ کفار کا سا برتاؤ نہیں کیا گیا اور حضورؐ کو بھی اطلاع عام کی اجازت نہ تھی یوں حضورؐ نے بعض خاص لوگوں کو مطلع فرما بھی دیا تھا۔ اور نام بنام بتلا دیا تھا۔ چنانچہ حضرت حذیفہؓ کو ان کے نام بتلائے تھے یہ صاحب سر یعنی حضور کے رازدار کہلاتے تھے۔ ان کو حضورؐ نے بتلا دیا تھا کہ فلاں فلاں شخص کا خاتمہ کفر پر ہونے والا ہے گو یہ زبان سے اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں، مگر دل میں ان کے اسلام نہیں ہے اور جس طرح حضورؐ نے عام طور سے اس کو ظاہر نہیں کیا تھا اسی طرح حضرت حذیفہؓ نے بھی اس کو راز میں رکھا اور کسی پر ظاہر نہیں کیا اور یوں فرمایا کرتے تھے کہ مجھے وہ باتیں معلوم ہیں کہ اگر میں زبان سے نکالوں **لقطع هٰذَا الْبُلْعُوْمُ** یعنی میرا گلا کاٹ دیا جائے مطلب یہ ہے کہ ایسوں کی حالت مجھے معلوم ہے جن کی نسبت کسی کو بھی برا خیال نہیں ہو سکتا۔ اگر میں زبان سے نکال بیٹھوں تو لوگ میرے ہی دشمن ہو جائیں اور میرا گلا کاٹ دیں۔

خشیت صحابہؓ:

صحابہ کو یہ بات معلوم ہو گئی تھی کہ ان کو یہ بات معلوم ہے اس وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی عادت تھی کہ جب کوئی جنازہ آتا تو یہ دیکھ لیتے کہ اسکے ساتھ حضرت حذیفہؓ بھی ہیں یا نہیں اگر حضرت حذیفہؓ نہ ہوتے تو حضرت عمرؓ بھی اس کی نماز میں شریک نہ ہوتے اس خیال سے کہ حضرت حذیفہؓ کا بدوں عذر شریک نہ ہونا خالی از علت نہیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص بھی شاید ان ہی میں سے ہے جن کا خاتمہ ایمان پر ہونے والا نہ تھا اور حضرت عمرؓ کی خشیت دیکھئے کہ باوجودیکہ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں اور ان کا تقویٰ طہارت علم سب کو معلوم ہے مگر خوف کی یہ حالت تھی کہ کبھی کبھی حضرت حذیفہؓ سے پوچھتے کہ سچ بتانا کہ میرا نام تو اس میں نہیں لیا گیا جن کی نسبت منافق ہونے کی

خبر دی گئی ہے۔ یہ حضرت عمرؓ کی خشیت تھی ورنہ یہ تھوڑا ہی تھا کہ حضرت عمرؓ کو حدیث کے سچے ہونے میں کچھ شک تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کلام میں دس آدمیوں کو نام بنام جنت کی بشارت دی تھی ان میں حضرت عمرؓ بھی تھے تو حدیث نبویؐ میں یہ بشارت سننے کے بعد ان کو اپنے ایمان پر کوئی شک تھوڑا ہی ہو سکتا ہے پھر اس سوال کی وجہ کیا تھی۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ جس کو حق تعالیٰ کی عظمت وقدرت منکشف ہو جاتی ہے وہ یہ تو بخوبی سمجھ جاتا ہے کہ وہاں وعدہ خلافی نہیں ہو سکتی۔ ایک ذرا سے با اختیار حاکم کے یہاں بھی ایسا نہیں ہو سکتا چہ جائیکہ احکم الحاکمین کے یہاں کہ جہاں کسی قسم کی روک ٹوک اور مجبوری ہے نہیں پھر وہاں وعدہ خلافی ہو تو کیوں ہو مگر عظمت وقدرت پر نظر ہونے سے یہ خیال ہو سکتا ہے کہ اگر وہ وعدہ پورا نہ کریں تو کسی کا کیا اجارہ ہے وعدہ کرنے سے قدرت سلب نہیں ہو گئی پس جیسا کہ وعدہ پورا کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں اسی طرح قدرت کو کام میں لانے سے بھی تو کوئی رکاوٹ نہیں ہے یہ خیال ان کی جان کو گھلا دیتا ہے۔ اور اس وقت جو آثار بھی خشیت کے ان پر ظاہر ہوں تو کچھ تعجب نہیں۔ حضرت عمرؓ جیسے کامل الایمان ہیں۔ سب جانتے ہیں کیا ان کو حدیث کی بشارت میں کچھ شک ہو سکتا ہے ہرگز نہیں مگر وہی بات ہے کہ جس وقت خشیت کا غلبہ ہوتا ہے اور قدرت پر نظر ہوتی ہے تو بشارت کا خیال بھی نہیں رہتا۔

اہل حال تو اس کو سمجھ گئے ہوں گے مگر اہل قال کی سمجھ میں نہ آیا ہو گا کیونکہ ابھی طالب علمانہ اشکال کچھ باقی ہیں اور قواعد علمیہ پر یہ مضمون منطبق نہیں ہوا۔ لیجئے میں ان کو بھی سمجھائے دیتا ہوں سمجھ لیجئے کہ یہ بات مسلم ہے کہ حق تعالیٰ کے وعدہ میں خلاف نہیں ہو سکتا، وعدے دو قسم کے ہیں مقید اور مطلق یعنی ایک تو وہ وعدہ ہوتا ہے جس میں بلا کسی قید کے کہہ دیا جاتا ہے کہ ہم یوں کریں گے تو اس وقت اس بات پر ایمان لانا واجب ہے کہ وہ کام ویسا ہی ہو گا اور مقید کے یہ معنی ہیں کہ مثلاً یوں کہہ دیا جائے کہ یہ شخص فلاں عمل کرے گا تو اس کو جنت میں لیجائیں گے۔ ظاہر ہے کہ اگر وہ قید پائی جائے گی یعنی وہ عمل کرے گا تو جنت اس کو ضرور ملے گی ورنہ نہیں۔

یہاں تک مضمون بالکل قواعد مشہورہ پر منطبق ہے۔ مگر یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ وعدہ مقیدہ کی بھی دو قسمیں ہیں ایک وہ جس میں قید ظاہر بھی کر دی گئی ہو اور ایک وہ جس میں قید ظاہر نہ کی گئی ہو بلکہ حق تعالیٰ نے اپنے علم میں رکھی ہو غرض بعض مقید بصورت اطلاق ہوتا ہے تو اب حضرت عمرؓ کے خوف کی وجہ یہ تھی کہ مجھ سے وعدہ کیا گیا ہے کہ تم جنت میں جاؤ گے لیکن ممکن ہے کہ یہ وعدہ کسی قید کے ساتھ مقید ہو اور اس قید کو ظاہر نہ کیا گیا ہو بلکہ حق تعالیٰ نے اپنے علم میں رکھی ہو اور ممکن ہے کہ

مجھ میں اس قید کا وجود نہ ہو تو اس صورت میں باوجود وعدے کے بھی خوف ہو سکتا ہے۔ لیجئے اب وہ مضمون قواعد علیہ پر بھی منطبق ہو گیا۔

باوجود وعدہ کے خوف:

حاصل یہ کہ باوجود وعدے کے بھی خوف ہو سکتا ہے۔ اور ہونا چاہیے۔ اسی واسطے یہ دعا سکھلائی گئی ہے **ربنا اٰتنا ما وعدتنا علیٰ رسلک ولا تخزنا یوم القیمۃ** جس کا ترجمہ ہے کہ اے اللہ جن باتوں کا آپ نے رسولوں کی زبانی ہم سے وعدہ کیا ہے وہ ہم کو دینا اور ہم کو قیامت کے دن رسوا نہ کرنا اس میں ظاہراً یہ اشکال ہے کہ جس چیز کا وعدہ کیا گیا اس میں خلاف تو ہو ہی نہیں سکتا پھر اس کے مانگنے کی کیا ضرورت ہے جس سے وہم ہوتا ہے کہ کیا وعدہ پورا ہونے پر ایمان نہیں۔ اور یہ دعا خود حق تعالیٰ نے تعلیم فرمائی ہے تو یہ کیا بات ہے۔

اس کی وجہ علماء نے یہی لکھی ہے کہ جس قید کے ساتھ وعدے کئے گئے ہیں ممکن ہے کہ وہ قید ہم میں باقی رہے یا نہ رہے اور ہم محل وعدہ رہیں یا نہ رہیں خدانخواستہ حالت ایسی متغیر ہو جاوے کہ ہم اس وعدہ کے مصداق ہی نہ رہیں۔ مثلاً وعدہ کیا گیا ہے کہ جو کوئی ایمان لائے گا اور عمل صالح کرے گا تو اس کو جنت ملے گی۔ اس میں وعدہ ہے جنت کا مگر مقید ہے بقاء ایمان اور عمل صالح کے ساتھ۔ فرض کر لیجئے ہم میں اس وقت ایمان بھی ہے اور عمل صالح بھی ہے اور اس وقت ہم اس وعدہ کے مصداق ہیں لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ خاتمہ کے وقت یہ حالت نہ رہے اور اس وعدہ کے مصداق نہ رہیں۔ اور جنت نہ مل سکے تو وعدہ بھی سچا رہا اور موعود ظاہری کے خلاف کا وقوع میں آنا بھی ممکن ہو گیا کیونکہ وہ حقیقۃً موعود ہی نہ تھا اس واسطے سوال کیا جاتا ہے۔ اب اس آیت پر وہ اشکال نہ رہا کہ جس چیز کا وعدہ ہے اس کا سوال کیوں کیا جاتا ہے حاصل جواب کا یہ ہوا کہ سوال اس بات کا کیا جاتا ہے کہ حق تعالیٰ ہمارے اندر ان قیود کو پیدا کر دیں اور باقی رکھیں جن کے ساتھ وہ وعدہ مقید ہے تو **اٰتنا ما وعدتنا** کا حاصل یہ ہوا کہ ہم کو ان لوگوں میں سے کر دیجئے جو اس وعدہ کے مصداق ہیں۔ غرض وعدہ سچا ہے لیکن کبھی واقع میں وہ وعدہ مقید ہوتا ہے اور یہ کچھ ضرور نہیں کہ وہ قید ہم کو بتلا بھی دی جائے یہ بات اس قدر خوف کی ہے کہ جس کے کان میں ایک دفعہ پڑ گئی ہو اس کو کبھی چین نہیں آ سکتا یہ تقریر اہل قال کے فہم کی رائق بھی ہو گئی باقی اہل حال کی تو وہی حالت ہے جو پہلے عرض کی گئی کہ اگر ان کو یہ بھی معلوم ہو چکا ہو کہ میں اس وعدے کا مصداق ہوں تب بھی

چین نہیں آتا کیونکہ یہ بات ہی ایسی ہولناک ہے کہ جس وقت اس کی طرف خیال چلا جاوے تو اور سب خیالات کو محو کر دیتی ہے تو اعتقاد وعدہ کا زائل نہیں ہوتا۔ لیکن اس کا استحضار نہیں رہتا۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ شیر خوفناک چیز ہے فرض کیجئے کہ وہ ایک بہت مضبوط لوہے کے کٹہرے میں بند ہو اور اس حالت میں ایک شخص اس کے سامنے کھڑا ہو اور وہ شیر کٹہرے کے اندر سے اس پر آنکھیں نکالے اور حملہ کرے تو اس شخص کی حالت کیا ہوگی کیا وہ اطمینان سے کھڑا رہے گا ہرگز نہیں، رنگ زرد پڑ جائے گا اور کانپنے لگے گا اور دل دھک دھک کرنے لگے گا حالانکہ ظاہر میں اس کی کوئی وجہ نہیں ہے کیونکہ معلوم ہے کہ شیر کٹہرے سے باہر نہیں آسکتا اور اس کو ذرا بھی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ پھر یہ حالت اس کی کیوں ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ شیر کے واسطے ہیبت لازم ہے جس وقت شیر کا سامنا ہوتا ہے۔ ہیبت سے دوسرے تمام خیالات اس وقت محو ہو جاتے ہیں اور یہ یاد نہیں رہتا کہ میرے اور شیر کے درمیان کٹہرا حائل ہے یہی حالت ہے حق تعالیٰ کی عظمت اور قہر کی کہ جس کے سامنے وہ ہوتا ہے اس سے دوسرے خیلات بالکل محو ہو جاتے ہیں یہ وجہ ہے حضرت عمرؓ کے ڈرنے کی۔ حالانکہ اطمینان تھا کہ میں عشرہ مبشرہ میں سے ہوں مگر قہر خداوندی ایسی ہولناک اور ہیبت ناک چیز ہے کہ جس وقت اس کا خیال آتا تھا تو اور تمام خیلات مٹ جاتے تھے۔ جس وقت حضرت عمرؓ پر اس کا انکشاف ہوتا تو ڈرتے اور حضرت حذیفہؓ سے پوچھتے تھے کہ میرا نام تو حضورؐ نے منافقین میں نہیں لیا وہ اطمینان دلاتے تو تسلی ہو جاتی پھر کبھی خشیت کا غلبہ ہوتا تو پھر اسی طرح پوچھتے پھر وہ اطمینان دلاتے تو تسلی ہو جاتی غرض یہی لوٹ پوٹ رہتی بحمد اللہ اس وقت اس کی وجہ اس طرح بیان کر دی گئی ہے کہ کوئی بھی علمی اشکال نہیں رہا باقی پورا انکشاف اور حل اشکالوں کا اس وقت ہو سکتا ہے جبکہ ہم بھی اپنے اندر خوف اور خشیت پیدا کر لیں۔ اہل حال کی حالت بدون حال پیدا کئے پوری طرح سمجھ میں آ نہیں سکتی۔

الحاصل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو منافقین کا علم تھا مگر ان کو رسوا نہ کیا گیا اور ان کے ساتھ ظاہری برتاؤ اہل اسلام سا ہی کیا گیا ان مصالح کی وجہ سے جن کو میں نے بیان کیا۔ بہر حال اس وقت ایک جماعت منافقین کی تھی اور ایک جماعت کفار کی اور دونوں میں یہ امر مشترک تھا کہ دونوں میں ایمان نہ تھا تو حقیقت میں یہ دونوں ایک ہی جماعت کے فرد تھے۔ یہ جماعت وہ ہے جن کا دعویٰ غلط ہے اور یہ اس کے مشابہ ہیں جو دعویٰ کرے مالدار ہونے کا اور مال اس کے پاس ذرا بھی نہ ہو یہ مدعین کی پہلی قسم ہے۔ سو اس وقت بحمد اللہ ایسا منافق نہیں ہے کوئی شاذ و نادر کہیں ہو تو ہو مگر کوئی جماعت منافقین

کی نہیں ہے کوئی ایک دو آدمی دباد بایا پڑا ہو کسی حکومت وغیرہ کے خوف سے یا کسی کے لحاظ سے تو اور بات ہے ورنہ درحقیقت آج کل کوئی عام دباؤ ایسا نہیں ہے جس کی وجہ سے کسی جماعت کو اس بات کی ضرورت ہو کہ ظاہر کچھ رکھا جاوے اور باطن کچھ آج کل جس کا جی چاہے کھلم کھلا کافر ہو سکتا ہے۔ اس لئے منافقین کا ذکر اس وقت فضول ہے بلکہ اس وقت صرف مسلمانوں کا ذکر ہے کہ یہ اپنے دعوے میں غلطی پر تو نہیں اور اس شخص کے مشابہ تو نہیں کہ جو مالدار ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور مال سے بالکل ہی خالی ہے سو خدا تعالیٰ کا احسان ہے کہ ہم میں ایسا کوئی نہیں اس سے تو حق تعالیٰ نے محفوظ رکھا ہے کہ ہم زبان سے مسلمان بنتے ہیں اور دل میں ایمان سے خالی ہوں۔

کسی کو کافر کہنا:

یہاں سے ایک بات یہ بھی نکلتی ہے کہ یہ جو بعض لوگ تشدد کرتے ہیں کہ مسلمان کو کافر اور منافق کہہ دیتے ہیں یہ بڑی غلطی اور جرات ہے۔ جب وہ زبان سے اسلام ظاہر کرتا ہے اور آج کل کوئی وجہ اس بات کی رہی نہیں کہ نفاق کا وتیرہ اختیار کیا جائے تو پھر کسی کو کافر اور منافق کہنے کے کیا معنی؟ کافر بڑا سخت لفظ ہے بڑی احتیاط چاہیے۔ کافر کسی کو اس وقت کہہ سکتے ہیں جب کہ وہ کوئی فعل ایسا کرتا ہو جو محتمل تاویل کو بھی نہ ہو۔ مثلاً کوئی شخص بت پرستی بلا اکراہ کھلم کھلا کرتا ہو تو اس وقت اس کو کافر کہہ سکتے ہیں۔ اور جب ایک شخص بت پرستی سے نفرت رکھتا ہے زبان سے کلمہ پڑھتا ہے تو اس کی تکذیب کرنا اور کافر کہنا کیا معنی؟ ظاہر بات ہے کہ کافر اصل میں تو اس کو کہتے ہیں جو دل سے منکر ہو حق تعالیٰ کا اور جو شخص زبان سے انکار کرتا ہے اس کو کافر اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ ہمارے نزدیک وہ دل سے منکر ہے کیونکہ اس کی زبان سے انکار سنا گیا اور زبان ترجمان دل ہے تو کفر کا حکم اس واسطے لگایا گیا ہے کہ زبان کے ذریعہ سے اس کا انکار قلبی معلوم ہو گیا۔ غرض کسی کو کفر لسانی کی وجہ سے کافر کہنا بھی دراصل کفر قلبی ہی کی وجہ سے ہے مگر چونکہ ہم کو انکار قلب کا علم ظاہر سے ہوتا ہے یعنی زبان سے اس واسطے زبان سے انکار کرنے والے کو کافر کہہ دیتے ہیں تو اس سے ثابت ہوا کہ ہم حکم اسی بات پر لگا سکتے ہیں جو ظاہر ہو اور زبان سے کہی جائے پس جب ایک شخص اسلام ظاہر کرتا ہے اس کو ہم کافر کیسے کہہ سکتے ہیں؟ اس کے تو یہ معنی ہوں گے کہ گو یہ اسلام ظاہر کرتا ہے مگر ہم کو کسی اور ذریعہ سے دل کا حال معلوم ہو گیا ہے کہ اس میں کفر ہے سو وہ کونسا ذریعہ ہے؟ ہمارے پاس وحی نہیں آتی جس سے دل کا حال معلوم ہو جائے اور نہ کسی صاحب جی نے ہم کو بتلایا جیسا کہ حضرت حذیفہؓ کو بتلا دیا تھا۔ پھر دل پر حکم کیسے لگایا جا سکتا ہے یہ سخت غلطی ہے۔

فتویٰ کفر میں احتیاط:

اور اس میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ ہم نے آج کل یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ اپنا جو ایک مسلک قرار دے لیا ہے بس وہی اسلام ہے اور وہی ایمان ہے جو اس کے خلاف ہو وہ کافر ہے یہ بہت سخت بات ہے۔ امام ابو حنیفہ کو دیکھئے۔ صاحب مذہب تھے، مجتہد تھے۔ ان کا یہ منصب تھا کہ ایک مسلک قرار دے لیتے ہم تو اس کے بھی اہل نہیں مگر ان کی احتیاط دیکھئے ان کے زمانہ میں یہ واقعہ پیش آیا کہ ایک شخص نے سوال کیا کہ آپ اس شخص کے حق میں کیا فرماتے ہیں جو یہ کہتا ہے کہ لا یدخل النار کافر یعنی کوئی کافر دوزخ میں نہیں جائے گا آپ نے شاگردوں سے پوچھا سب نے اس شخص پر کفر کا فتویٰ لگا دیا کیونکہ یہ لفظ صراحۃً خدا تعالیٰ کے قول کے خلاف ہے قرآن شریف میں صاف آیا ہے کہ کفار دوزخ میں جائیں گے اور یہ شخص کہتا ہے کہ کوئی کافر دوزخ میں نہ جائے گا تو اس نے تکذیب کی حق تعالیٰ کے قول کی اور اس کا کفر ہونا ظاہر ہے امام صاحبؒ نے فرمایا کہ ظاہر معنی تو یہی ہیں مگر اس میں کوئی تاویل بھی ہو سکتی ہے یا نہیں لوگوں نے کہا ایسے صریح لفظ میں کیا تاویل ہو سکتی ہے۔ فرمایا نہیں میرے نزدیک ایک تاویل ہو سکتی ہے اس کا یہ کہنا کہ دوزخ میں کوئی کافر نہیں جائے گا اس کے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ دوزخ میں جاتے وقت کوئی کافر نہ رہے گا کیونکہ قیامت میں کفار کو حق ظاہر ہو جائے گا اور یہ معلوم ہو جائے گا کہ ہم غلطی پر تھے۔ جب اپنی غلطی ظاہر ہو جائے گی تو اس وقت انبیاء کی بھی تصدیق کریں گے اور جنت کی بھی اور نار کی بھی تو وہ منکر نہ رہے تو اب یہ کہنا ٹھیک ہو گیا کہ دوزخ میں جو کوئی جائے گا وہ منکر اور کافر نہ ہو گا یعنی اس وقت تو اس شخص نے کیا جھوٹ کہا پھر کفر کا فتویٰ کیوں لگایا جاوے۔ یہ اور بات ہے کہ اس وقت کا ایمان نفع نہ دے گا کیونکہ قیامت دار الجزاء ہے دار العمل نہیں ہے دار العمل تو دنیا ہے دنیا کا کیا ہوا عمل کام دے سکتا ہے نہ کہ آخرت کا۔

علاوہ ازیں آخرت تو علم الیقین کا گھر ہے وہاں ہر شخص کو انکشاف حقائق ہو جائے گا اور ایمان وہ کار آمد ہے جو بالغیب ہو۔ حق تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو اسی لئے تو بھیجا ہے کہ بلا دیکھے ہوئے ان کی خبر پر اور ان کی کتاب پر یقین کر کے ایمان لایا جاوے۔ یہ ایمان مقبول ہے اور اگر تصدیق بالغیب مدار قبول ایمان نہ ہوتی تو حق تعالیٰ کو کیوں بھیجتے یہیں انکشاف حقائق فرما دیتے تاکہ سب ایمان لے آتے تو جو شخص آخرت میں ایمان لایا اس نے انبیاء کی اور قرآن کی تصدیق نہیں کی بلکہ دیکھ کر ایمان لایا یہ ایمان بالغیب نہیں ہوا لہٰذا مقبول نہیں تو گو اس شخص کا ایمان کار آمد تو

بے شک نہیں ہے لیکن ایمان تو ہے۔

حاصل یہ ہوا کہ وہ شخص گو شرعاً کافر ہے مگر لغۃً کافر نہیں پس یہ جملہ تو صادق ہوگیا کہ وہ نار میں داخل ہوتے وقت بمعنی لغوی کافر اور منکر نہ ہوگا سو لا یدخل النار کافر کہنے والے کو کیسے کافر کہتے ہو جبکہ اس کے قول میں یہ تاویل ہوسکتی ہے۔

دیکھئے امام صاحب نے کس قدر احتیاط کی حالانکہ ایسا صریح کلمہ کفر تھا مگر سلف نے اس بارہ میں بڑی احتیاط سے کام لیا ہے یہی حالت ہمارے اساتذہ اور مشائخ اور بزرگوں کی تھی کہ کسی کو کافر کہنے میں بڑی احتیاط کرتے تھے۔ میں نے ایک حکایت ایک کتاب میں دیکھی اور اس کو دیکھ کر مجھے بڑا غصہ آیا اور اس کا حکم فوراً یہی ذہن میں کہ یہ شخص کافر ہوگیا اور فوراً حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کے پاس گیا کہ دیکھئے حضرت اس شخص کے کفر میں کیا کلام ہے وہ حکایت یہ تھی کہ ایک شیخ نے اپنے ایک مرید سے پوچھا کہ تو خدا کو جانتا ہے اس نے کہا کہ جی میں کیا جانوں خدا کو میں تو آپ کو جانتا ہوں یہ کس قدر بیہودہ کلمہ ہے یہ شخص خدا کا انکار کرتا ہے اور خدا سے بھی زیادہ پیر کو سمجھتا ہے تو اس کے کفر میں کیا کلام ہے۔ مولانا ہنسے اور کہا کیا اس لفظ کے کوئی صحیح معنی نہیں ہوسکتے۔ میں نے کہا حضرت اس کے کیا معنی ہوسکتے ہیں جب ایک شخص خدا ہی کو جاننے کا منکر ہے تو اس کا ایمان کہاں؟ فرمانے لگے اچھا تم جانتے ہو خدا کو بس اب تو ہوش درست ہوئے۔

کہنے لگے بھائی خدا کو جاننا تو بڑا مشکل ہے وہ کون شخص ہے جو دعوی کرے کہ میں خدا کو جانتا ہوں یہی تو وہ مسئلہ ہے جس میں تمام فلاسفر گمراہ ہوئے اور یہی تو وہ مسئلہ ہے جس میں ہزاروں اب بھی گمراہ موجود ہیں۔ جو حق پر ہیں وہ بھی اس سے زیادہ نہیں کہہ سکتے کہ خدا تعالیٰ کو اجمالاً کچھ پہچانتے ہیں باقی جس کا نام علم اور جاننا اور پہچاننا ہے اس کی تو خیر صلا ہے۔ یہی بات تو وہ شخص بھی کہتا ہے کہ میں خدا کو کیا جانوں میں تو تم کو جانوں یعنی خدا کا راستہ بتلانے والے کو۔ تو وہ کیا بے جا کہتا ہے پھر بیچارے کو کافر کیوں بناتے ہو۔ دیکھئے مولانا نے ایک تاویل بعید کر کے اس کو بچا لیا۔

کافر بنانا یا بتانا:

اہل حق کا طریقہ یہی ہے کہ حتی الامکان جب تک کوئی بھی تاویل بن سکے کسی کو کافر نہ بتادیں۔ ہاں اگر وہ خود ہی تاویل کو بھی رد کرے تو مجبوری ہے کہ اب مدعی سست اور گواہ چست کا قصہ ہے باقی اپنی طرف سے کبھی کسی کو کافر نہیں بناتے اور جہاں کہیں بضرورت شرعی انہوں نے کسی کو کافر کہہ دیا ہے بعض جہلاء اس پر بھی طعن کرتے ہیں کہ لوگوں کو کافر بناتے ہیں۔ میں اس کے متعلق بطور لطیفہ کہا

کرتا ہوں کہ انہوں نے کافر بنایا نہیں بلکہ کافر بتایا ہے (دونوں میں ایک نقطہ کا فرق ہے۔) اس شخص نے واقعی ایسا ہی کام کیا ہے جس پر کفر عائد ہوتا ہے اور کوئی تاویل بھی نہیں بن سکتی تو وہ کافر تو خود بن گیا انہوں نے صرف بتا دیا ہے کہ اس پر کفر عائد ہوتا ہے اور اس بتانے میں بھی اتنی احتیاط کی ہے کہ بعید سے بعید تاویل بھی اٹھا نہیں رکھی جب کوئی تاویل بھی نہ بن سکی تب انہوں نے یہ لفظ منہ سے نکالا اور ان کی کوئی ذاتی غرض یا غیظ وغضب یا بات کی پچ اس میں شامل نہیں ہوتی بلکہ خوف خدا اور ترحم شامل ہوتا ہے کافر کے لفظ سے وہ کانپتے ہیں اور کسی کے لئے بھی اس کے استعمال کو حتی الامکان گوارا نہیں کرتے اور واقعی یہ لفظ ہے بھی ایسا ہی کیونکہ اس کے معنی ہیں ابدالآباد کیلئے رحمت خدا سے بالکل ناامید ومحروم ہو جانے والا سو یہ کتنی بڑی بات ہے کہ ارحم الراحمین کی رحمت سے کسی کو ایسا ناامید کر دیا جاوے ان کی نظر میں دنیا کوئی چیز نہیں۔ ان کی نظر تو آخرت پر رہتی ہے چنانچہ جس وقت وہ کسی گنہگار کو بھی دیکھتے ہیں اور یہ خیال آتا ہے کہ یہ شخص ایک گناہ میں مبتلا ہے اور آخرت میں اس کے لئے بڑی مصیبت ہوگی تو ان کو رحم آجاتا ہے خواہ ان کا دشمن ہی کیوں نہ ہو اور خواہ اس سے کتنی ہی تکلیفیں ان کو کیوں نہ پہنچی ہوں ان کے پیش نظر ہر وقت آخرت رہتی ہے وہاں کی راحت کو راحت اور وہاں کی تکلیف کو تکلیف سمجھتے ہیں۔ دنیا کی راحت ہوئی تو کیا اور تکلیف ہوئی تو کیا مگر وہاں کی تکلیف کسی کے لئے گوارا نہیں کرتے اور وہاں کی تکالیف گناہوں پر مبنی ہیں اس وجہ سے ادنی سا گناہ بھی کسی کے ذمہ لگانا پسند نہیں کرتے چہ جائیکہ کفر کیونکہ کفر کسی کیلئے ثابت کر دینے کے تو یہی معنی ہیں کہ اس کو ابدالآباد کیلئے رحمت خداوندی سے مایوس اور محروم بنا دیا جائے اور ہمیشہ ہمیشہ کی تکالیف اور عذاب اس کے لئے ثابت ہو جائیں یہ ان سے کب ہو سکتا ہے ان کا تو اگر اختیار ہو تو مسلمان کو تو کافر کہنا درکنار کافر کو بھی کافر نہ رہنے دیں غرض کفر بہت بڑا حکم ہے اس کا نام بھی ان کی زبان پر آنا مشکل ہے یہ اور بات ہے کہ کوئی خود ہی کافر بنتا اور رحمت الٰہی سے خارج ہونا چاہے یہ اس وقت بھی دل سے چاہتے ہیں کہ یہ کافر نہ بنے مگر جب وہ خود ہی ڈوبنا چاہتا ہے تو کسی کا کیا بس ہے حکم شرعی کو یہ بدل نہیں سکتے بدرجہ مجبوری فتوی دے دیں گے تو اس وقت انہوں نے کافر نہیں بنایا بلکہ وہ خود ہی کافر بنا انہوں نے صرف بتلا دیا ہے کہ یہ کفر ہو گیا انہوں نے بالکل ہی مضطر ہو کر یہ فتویٰ دیا اگر بعید سے بعید بھی تاویل ان کو مل جاوے تو وہ اس حکم کفر سے بچ دیتے ہیں اللہ والوں کا یہی طریق رہا ہے میرے پاس بہت فتویٰ آتے ہیں لوگ پوچھتے ہیں کہ فلاں شخص نے یہ کلمہ کہا اس سے کفر عائد ہوا یا نہیں میں اکثر یہ جواب دے دیتا ہوں کہ یہ کلمہ گستاخی کا ہے یہ شخص بہت بے ادب ہے اس نے بڑا

گناہ کیا مگر کفر نہیں کفر کا نام لیتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا ہے کیونکہ کسی کو کافر کہنا حق تعالیٰ کی رحمت سے بالکل نکال دینا ہے اور رحمت حق تعالیٰ کی اس قدر وسیع ہے کہ اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔

ضعیف ترین ایمان:

اس کا پتہ اس حدیث سے چلتا ہے بڑی عبرت کی حدیث ہے اور وہ مشہور حدیث شفاعت کی ہے اس سے ہم لوگوں کو سبق لینا چاہیے اور ذرا زبان اور قلم کو قابو میں رکھنا چاہیے وہ حدیث یہ ہے کہ قیامت کے دن جب شفاعت کی اجازت ہوگی تو سب علی قدر مراتب شفاعت کریں گے۔ انبیاء علیہم السلام بھی کریں گے اور امتی بھی، جب سب کی شفاعت ختم ہو جاوے گی تو حق تعالیٰ فرما دیں گے کہ انبیاء بھی شفاعت کر چکے اور ملائکہ بھی کر چکے اب **ارحم الراحمین** باقی ہیں۔ یہ فرما کر دوہتڑ بھر کر دوزخیوں کو جنت میں داخل کر دیں گے۔ (اللہ میاں کی دوہتڑ خدا جانے کتنی ہوگی اس سے یہاں بحث کرنا نہیں ہے کیونکہ یہ لفظ متشابہات میں سے ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو کچھ مراد ہو حق ہے) یہاں مقصود یہ ہے کہ حق تعالیٰ بہت سے ان دوزخیوں کو جہنم سے نکالیں گے جن کو نہ شفاعت امتیوں کی پہنچی نہ ملائکہ کی، نہ انبیاء علیہم السلام کی۔

اور اسی حدیث میں یہ لفظ بھی ہے **اخرجوا من النار من کان فی قلبه مثقال ذرة من ایمان** (اتحاف السادۃ المتقین ۱:۱۳۹) یعنی انبیاء علیہم السلام اور ملائکہ کو یہ حکم ہوگا کہ دوزخ سے اس شخص کو بھی نکالو جس کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان ہو ان دونوں کے ملانے سے صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ شفاعت سے رہ گئے تھے ان میں ذرہ برابر بھی ایمان نہ ہوگا۔

تو اب اس پر اشکال ہوتا ہے کہ یہ لوگ مومن ہوں گے یا کافر؟ اگر کافر ہوں گے تو ان کی مغفرت بعد میں بھی کیسی ہوگی کیونکہ کافر کی مغفرت ممتنع ہے اور اگر مومن ہیں تو کسی شفاعت کرنے والے نے مومنین نے یا ملائکہ نے یا کسی نبی نے کیوں شفاعت نہیں کی۔ جبکہ یہ حکم ہوا تھا کہ جن کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان ہے ان کو بھی نکال لیا جاوے۔

اس اشکال کا جواب یہی ہے کہ یہ شق تو باطل ہے کہ وہ کفار ہوں کیونکہ کافر کی بخشش نہیں ہو سکتی بلکہ وہ مومن ہی ہونگے لیکن ان کا ایمان اتنا ضعیف اور اس قدر مخفی ہوگا کہ انبیاء علیہم السلام کے ادراک میں بھی نہیں آئے گا حالانکہ حق تعالیٰ نے ان کو علم کامل عطا فرمایا ہے۔ خصوصاً آخرت میں کہ وہ تو مقام ہی ہے انکشاف حقائق کا مگر اس پر بھی ان حضرات کو پتہ نہ چلا۔ اتنا ذرا سا ایمان تھا کہ سوائے حق تعالیٰ کے کسی کو علم نہ ہوگا غرض یہ لوگ حقیقت میں ہونگے مومن ہی لیکن ان کا

ایمان اس قدر دھندلا ہوگا کہ انتہا درجہ کی تیز چشم بصیرت کے بھی ادراک میں نہ آئے گا اس سے ثابت ہوا کہ بعض کا ایمان ایسا ضعیف بھی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو بھی اس کا پتہ چلنا مشکل ہے پھر مولویوں کو تو کیسے پتہ چل جاوے گا اور عوام تو کسی شمار ہی میں نہیں اس لئے بات بات میں کسی پر کفر کا فتویٰ لگا دینا کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟

تخصیص رحمت:

یہ تو حق تعالیٰ کی رحمت کو تنگ کرنا ہے اس موقع پر اس اعرابی کا قصہ یاد کیجئے جس نے یہ دعا کی تھی **اللھم ارحمنی ومحمدا ولا ترحم معنا احدا** قصہ اس کا یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک اعرابی مسجد نبوی میں آیا اور نماز پڑھی اور اس کے بعد دعا کی کیا مزے کی دعا ہے وہ کہتا ہے کہ اے اللہ میرے اوپر رحم کرنا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر رحم کرنا اور ہم دونوں کے سوا کسی اور پر رحم مت کرنا۔

یہ بھی خوشامد تھی حضور کی کہ آپ کو شامل کر لیا ورنہ شاید وہ یہی چاہتا ہو کہ ساری رحمت حق تعالیٰ کی مجھ ہی کو مل جاوے خیر جس طرح بھی ہو اس نے آپ کو تو دعا میں شریک کر لیا حضورؐ نے اس کو اپنے پاس بلایا اور فرمایا **لقد تحجرت واسعا** (جامع المسانید۲:۲۹۷) یعنی تو نے ایک بہت بڑی چیز کو تنگ کر دیا مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی رحمت میں کچھ کمی تھوڑا ہی تھی جو تو نے دو ہی آدمیوں پر منحصر کر دیا اللہ تعالیٰ کی رحمت تو وہ ہے کہ تمام دنیا کو محیط ہو جائے اور پھر بھی ختم نہ ہو اس حدیث سے ثابت ہوا کہ حق تعالیٰ کی رحمت کو تنگ نہیں کرنا چاہیے۔

اس قصہ کو سن کر تعجب کریں گے کہ وہ شخص کیسا گنوار تھا کہ ایسی دعا کی کہ بس ساری رحمت دو ہی شخصوں کے حصہ میں آ جاوے۔ میں کہتا ہوں اس کو تو گنوار کہا جاتا ہے لیکن اپنی اس حالت پر تو نظر ڈالیے جو آج کل تعلیم یافتہ جماعت اور اہل علم کی ہو رہی ہے ان کا طرز عمل دیکھئے کہ انہوں نے بس اپنا ایک مسلک قرار دے لیا ہے جو اس سے ذرا خلاف ہوا اسی کو رحمت حق سے خارج کر دیا گیا یہ وہی اعرابی والی حالت نہیں ہے مگر اپنا عیب نظر نہیں آتا ورنہ حالت تو ان تعلیم یافتوں کی بھی اس اعرابی کی سی ہے جس نے رحمت کو تنگ کیا تھا۔ ویسے ہی انہوں نے تنگ رکھا ہے آخر کیا فرق ہے دونوں میں۔ اس نے دو ہی پر منحصر کیا تھا اور یہ دس بیس سو پچاس یا ہزار دو ہزار پر منحصر کرتے ہیں اس میں تو دونوں شریک ہیں کہ یہ واسع کو تنگ کرتے ہیں تو اس کو گنوار کہنا اور اس پر اعتراض کرنا کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے؟

بلکہ اس کی حالت اہون تھی کہ دلائل کا علم نہ ہونے سے اس نے ایسا خیال کیا تھا اور یہاں

بینات کے بعد یہ طرز ہے بہر حال حضرت حق تعالیٰ کی رحمت بہت بڑی چیز ہے کسی کو اپنے تخصیص رحمت کا زعم اور دعویٰ نہیں چاہیے۔

ابوداؤد کی حدیث میں ایک قصہ آیا ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک عابد اور ایک فاسق کا۔ عابد تو دن رات عبادت میں رہتا اور یہ دن رات گناہ اور فسق وفجور میں رہتا تھا وہ عابد اس کو نصیحت کیا کرتا تھا کہ تو یہ حرکتیں چھوڑ دے اس نے کہا کہ میاں تم اپنے کام میں لگو مجھے میرے حال پر چھوڑ دو، میں جانوں میرا خدا جانے۔ غرض ایسا فاسق تھا کہ نصیحت سے بھی باز نہ آتا تھا۔ ایک روز عابد نے اس کو کسی برے عمل میں دیکھا تو غصہ میں آ کر کہا کہ تجھے خدا تعالیٰ ہرگز نہ بخشے گا۔ یہ دعوے کا لفظ تھا۔ اس کے بعد دونوں کی موت آ گئی حکم ہوا کہ عابد کو دوزخ میں لے جاؤ اور فاسق کو جنت میں لے جاؤ اور عابد سے کہا گیا کہ کیا میری رحمت تیرے اختیار میں تھی جو تو نے میرے بندہ پر قطعی حکم لگا دیا کہ تجھ کو خدا تعالیٰ ہرگز نہ بخشے گا اب ہم تجھ کو دوزخ میں لے جاتے ہیں اور اس کو جنت میں اگر تجھ سے ہو سکے تو روک لے۔

یاد رکھو! جو شخص اسلام کا دعویٰ کرتا ہو یعنی زبان سے مسلمان ہونے کا اقرار کرتا ہو تو وہ اس وقت تک کافر نہیں ہوتا جب تک کسی ایسی بات کا انکار نہ کرے جو ضروریات دین میں سے ہے مثلاً نماز کے فرض ہونے کا انکار کرے یا روزہ کی فرضیت کا انکار کرے یا اور جو چیزیں ضروریات دین سے ہیں ان میں کسی کا انکار کرلے تب تو البتہ اسلام سے خروج ہوتا ہے اور جو ضروریات کا انکار نہ کرے، ہاں عمل میں سستی کرتا ہے تو وہ گنہگار ہے اس پر ایسا سخت حکم نہیں لگایا جا سکتا کہ یہ بالکل اسلام سے خارج ہو گیا اور ابدالآباد کیلئے حق تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہو گیا آخر کفر سے پہلے گناہ کا مرتبہ بھی تو ہے اور اس میں دو درجے ہیں صغیرہ اور کبیرہ۔ اہل حق کا عقیدہ ہے کہ گناہ کبیرہ سے بھی خروج عن الاسلام نہیں ہوتا اور اس پر خلود فی النار نہ ہوگا اور یہ بھی عقیدہ ہے کہ شفاعت اہل کبائر کو پہنچے گی۔ بڑے سے بڑا کبیرہ بھی اگر کوئی کرے اور ساری عمر کرتا رہے اور کبھی اس پر نادم بھی نہ ہو، نہ توبہ کرے اور مرتے وقت بھی توبہ نصیب نہ ہو تب بھی اہل حق کا یہ عقیدہ ہے کہ اس کو خلود فی النار نہ ہوگا چاہے اس کو ہزار برس تک دوزخ میں رہنا پڑے اور گناہوں کی سزا میں چاہے کیسا ہی سخت سے سخت عذاب بھگتنا پڑے مگر کبھی نہ کبھی دوزخ میں سے ضرور نکال لیا جاوے گا۔

تعدد ذرائع مغفرت:

یہ بھی اس صورت میں ہے جبکہ فرض کر لیا جاوے کہ اس کو کسی کی بھی شفاعت نہ پہنچے گی اور کوئی ذریعہ مغفرت کا شفاعت کے علاوہ بھی اس کو نصیب نہ ہوگا حالانکہ ایسا ہوگا نہیں۔

کیونکہ حدیث میں آیا ہے **شفاعتی لا ھل الکبائر من امتی** (سنن أبي داؤد: ۴۷۳۹) یعنی فرماتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم میری شفاعت میری امت کے کبیرہ گناہ والوں کو بھی پہنچے گی اور اس کے سوا اور بھی ذرائع مغفرت کے ہیں مثلاً کسی نے اس کے مرنے کے بعد دنیا میں اس کے لئے دعا کی ہو اور وہ دعا قبول ہو گئی ہو۔ یہ ایک چیز ہے کہ گو ساری عمر وہ شخص کسی کبیرہ گناہ میں مبتلا رہا ہو لیکن ایک اللہ کے بندہ کی دعا اس کو پہنچ گئی تو حق تعالیٰ کو سب کچھ قدرت ہے اگر خدا تعالیٰ اس وجہ سے اس شخص کے گناہ معاف کر دیں تو خدا تعالیٰ کو کون روک سکتا ہے غرض ایسے ذرائع بہت ہیں جن سے بڑے سے بڑے گناہ معاف ہو سکتے ہیں ایک کفر و شرک تو ایسی چیز ہے کہ اس کے معاف ہونے کا کوئی ذریعہ نہیں اور اس کے سوا چاہے کسی شخص میں دنیا بھر کے گناہ مجتمع ہوں مگر سب ایک لمحہ میں معاف ہو سکتے ہیں۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں عقیدہ اہل سنت کا یہی ہے اور قرآن شریف میں اس کی تصریح موجود ہے فرماتے ہیں **ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ ویغفر مادون ذلک لمن یشاء** یعنی حق تعالیٰ نہیں بخشیں گے اس کو کہ اس کے ساتھ شرک کیا جاوے اور اس کے سوا جو بھی گناہ ہو بخش دیں گے جس کے واسطے چاہیں گے اور اس مضمون میں بہت سی احادیث بالکل صریح موجود ہیں۔ غرض بڑے سے بڑے کبیرہ کا کرنے والا بھی حق تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہیں ہو سکتا۔ پھر جب حق تعالیٰ نے اپنی رحمت کو اتنا وسیع کیا ہے تو کسی دوسرے کو اس کے تنگ کرنے کا کیا مجاز ہے؟

پھر اول تو گناہوں کے معاف ہونے کے بہت سے ذرائع ہیں اور اگر فرض کر لیا جائے کہ کوئی ذریعہ بھی ایک شخص کو حاصل نہ ہوا اور وہ گناہ اس کے ذمہ رہ گیا تب بھی خلود فی النار نہ ہوگا۔ یہ بھی ان گناہوں میں ہے جو یقیناً گناہ ہیں جن کے گناہ ہونے میں کسی کو کلام ہی نہیں اور جن کے گناہ ہونے میں کلام ہے اس پر تو اس سزا کو بھی یقینی نہیں کہہ سکتے جو اس پر موعود ہے اس صورت میں گنہگار ہونے کا فتویٰ بھی نہیں لگ سکتا چہ جائیکہ کفر کا۔

اختلاف مسائل کی حقیقت:

چنانچہ آج کل جن مسائل میں اختلاف ہے ان میں اکثر جانبین میں گنجائش ہے تو کوئی فریق اپنے مقابل پر کوئی حکم قطعی کیسے لگا سکتا ہے اور حکم بھی کون سا کفر کا۔ لطف یہ ہے کہ ان مسائل میں اختلاف کفر اور عدم کفر کا ہے بھی نہیں بس جو کچھ اختلاف ہے وہ سنت اور بدعت ہونے کا ہے کہ ایک فریق ایک فعل کو سنت اور باعث تقرب کہتا ہے اور دوسرا اس کو بدعت اور معصیت کہتا ہے تو ابھی تو خود معصیت اور عدم معصیت ہی میں اختلاف ہے، کفر اور عدم کفر کا کیا ذکر؟ اگر سنت کہنے والوں

نے بہت زور مارا اور اس فعل کو سنت اور اس کے خلاف کو بدعت ثابت کر ہی دیا تب بھی سنت کے تارک پر اس سے زیادہ کیا حکم لگ سکتا ہے کہ وہ ایک سنت کا تارک ہے اور سنت کے تارک پر خلود فی النار کی وعید کہاں آئی ہے؟ اگر سنت کے ترک پر بھی خلود فی النار کی وعید ہے تو کفر اور شرک پر اس سے زیادہ کونسی وعید ہوگی تارک سنت اور کافر کو برابر کر دینا نا معلوم کہاں تک صحیح ہے۔

آخر اعمال میں باہم فرق مراتب بھی ہے یا نہیں اگر ادنیٰ سے ادنیٰ عمل کے ترک پر وہی حکم مرتب ہوتا ہے جو اعلیٰ گناہ پر ہوتا ہے تو ادنیٰ سے ادنیٰ نیک عمل کے کرنے پر بھی وہی حکم مرتب ہونا چاہیے جو اعلیٰ سے اعلیٰ نیک عمل کے کرنے پر ہوتا ہے۔ سب سے اعلیٰ عمل اسلام ہے اس میں کسی کو اختلاف نہیں تو اگر یہ بات تسلیم ہے کہ ادنیٰ اور اعلیٰ میں کچھ فرق مراتب نہیں تو ایک ادنیٰ عمل کسی میں فرض کیا جاوے مثلاً نرمی سے بولنا کہ یہ بھی کسی درجہ میں نیک عمل ضرور ہے اس کو سب جانتے ہیں تو فرض کیجئے کہ ایک کافر یہ عمل کرتا ہے یعنی وہ ہمیشہ نرمی سے بولتا ہے تو چاہیے کہ وہ مسلمان کے برابر ہو جائے اس قاعدہ کی رو سے تو اسلام کی بھی ضرورت نہیں رہی کیونکہ وہ ادنیٰ عمل والا اور یہ اعلیٰ عمل والا دونوں حکماً برابر ہیں اس سے تو سارا دین کا کارخانہ ہی بگڑا جاتا ہے لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ اعمال میں فرق مراتب ہے پھر تارک سنت کو اور کافر کو برابر کیسے کیا جا سکتا ہے؟ اور دونوں کے واسطے خلود فی النار کا حکم کیسے لگا دیا جاتا ہے؟ ضرور ہے کہ دونوں میں فرق کیا جائے انشاء اللہ اب سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ ہر بات پر کفر کا حکم لگا دینا عقل و شریعت کی رو سے کہاں تک صحیح ہے؟

اور یہ بھی اس وقت ہے جب کسی فعل کی نسبت سنیت کا دعویٰ کرنے والا اپنے دعوے کو ثابت کر دے اور ثابت کر دینے کے بعد بھی اس کے تارک پر وہ ترک سنت کا حکم جاری کر سکتا ہے نہ کہ کفر اور شرک کا۔

فرقہ ناجیہ:

جیسا کہ آج کل لوگوں نے عادت کر لی ہے ذرا اس غلطی کو غور سے دیکھئے۔ سلف نے اس میں بڑی احتیاط کی ہے۔ خصوصاً امام ابو حنیفہؒ نے کہ انہوں نے کسی اسلامی فرقہ کو جب تک وہ ضروریات دین کا منکر نہ ہو کافر نہیں کہا اور یہ قاعدہ مقرر کر دیا ہے **لا نکفر اهل القبلة** حالانکہ اسلامی فرقوں کے باہمی اختلافات اس قدر ہیں کہ ان کے سننے سے وحشت ہوتی ہے۔ لوگوں میں مسلم ہے کہ مسلمانوں میں ۷۳ فرقے ہیں اور ایک کو ان میں سے ناجی کہتے ہیں اور ۷۲ کو ناری اور یہ کچھ لوگوں کا اختراع نہیں ہے بلکہ حدیث کا مضمون ہے مگر لوگ یاد رکھیں (طالب علموں کے کام کی بات ہے) کہ یہ جو حدیث میں آیا ہے کہ میری امت کے ۷۳ فرقے ہوں گے آیا اس سے کفار اور

مسلمانوں کو ملا کر مجموعہ کے فرقے مراد ہیں یا کیا۔ ظاہر ہے کہ مجموعہ اہل اسلام اور کفار کے فرقے تو مراد نہیں ہیں کیونکہ وہ تو اس سے بہت زیادہ ہیں ہر مذہب میں اس سے زیادہ فرقے موجود ہیں۔ ہندوؤں میں ۷۳ سے بہت زیادہ فرقے ہیں، عیسائیوں میں بھی زیادہ ہیں تو سب ملا کر بہت ہی زیادہ ہوں گے۔ بلکہ حدیث میں اسلامی فرقے مراد ہیں تو یہ سب ۷۳ فرقے وہ ہوئے جن کو اسلام سے خارج نہیں کہہ سکتے تو ان کے لئے خلود فی النار کے قائل بھی نہیں ہو سکتے اور ایک مضمون یہ بھی ذہن میں حاضر رکھئے کہ قرآن اور حدیث سب میں یہ مضمون موجود ہے کہ گناہوں پر سزا ہوگی اور دخول فی النار ہوگا مثلاً چور کو بھی دوزخ میں جانا ہوگا اور زانی کو بھی اور قاتل کو بھی دوزخ میں جانا ہوگا اور تارک صلوۃ اور تارک زکوۃ کو بھی وغیرہ وغیرہ۔ تو جو ایک فرقہ ناجی ہے اس کے افراد بھی اگر ان اعمال معصیت کا ارتکاب کریں تو وہ دوزخ میں جائیں گے یا نہیں ظاہر ہے کہ ان اعمال کی سزا میں وہ بھی دوزخ میں جائیں گے گو خلود فی النار نہ ہو اور اوپر یہ بھی ثابت ہو چکا کہ فرقہ ناجیہ کے علاوہ جو ۷۲ فرقے ہیں وہ سب اسلامی فرقے ہیں خلود فی النار ان کے لئے بھی نہیں ہے تو یہ بھی دوزخ میں جائیں گے اور وہ ایک فرقہ بھی جا سکتا ہے جس کو ناجی کہا گیا تھا تو پھر حدیث کے اس جزو کے کیا معنی ہوئے **کلھم فی النار الا واحدۃ** جب دوزخ میں جانے میں دونوں برابر ہوئے تو ایک کے ناجی ہونے اور باقی کے ناری ہونے کے کیا معنی؟

اس شبہ کا حل یہ ہے کہ ۷۲ فرقوں کو جو ناری کہا گیا اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ فساد عقائد کی وجہ سے بھی دوزخ میں جائیں گے اور فساد اعمال کی وجہ سے بھی اور وہ ایک فرقہ جس کو ناجی کہا گیا ہے وہ صرف خرابی اعمال کی وجہ سے دوزخ میں جائے گا۔ خرابی عقائد کی وجہ سے نہ جائے گا اور دونوں کے دخول نار میں قواعد سے اتنا فرق ہوگا کہ عقائد کی غلطی اشد ہے۔ اعمال کی غلطی سے لہذا عقائد کی غلطی پر عذاب بھی سخت ہوگا اور اس کی مدت بھی زیادہ ہوگی بخلاف اس ایک فرقہ کے جو خرابی اعمال کی وجہ سے دوزخ میں جائے گا ان کی غلطی اتنی سخت نہیں ہے جتنی کہ دوسروں کی تھی، لہٰذا عذاب بھی اتنا سخت نہ ہوگا اور نہ اتنا ممتد ہوگا حاصل یہ کہ ۷۳ فرقوں سے مراد مسلمانوں ہی کے فرقے ہیں ان میں سے ایک فرقہ اہل حق ہے وہ خرابی عقائد کی وجہ سے دوزخ میں نہیں جائیں گے۔ ہاں خرابی اعمال کی وجہ سے جائیں گے، جیسے چوری نظر بد وغیرہ۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ ان اعمال پر بھی عذاب موعود ہے۔ آخر وہ کس کے واسطے ہے بس جو کوئی ان کا ارتکاب کرے گا اسی کو عذاب بھگتنا پڑے گا اور گو بمقتضائے قواعد یہ عذاب بہ نسبت اہل باطل کے خفیف ہے اور ممتد بھی کم ہے مگر

خدا بچاوے وہاں کا تو ایک دن بھی دنیا کے ہزار برس کے برابر ہے۔

پھر بلحاظ کیفیت کے بھی دوزخ کا عذاب ایسا ہے کہ اس کی نظیر ہی کہیں موجود نہیں ایک منٹ کے لئے بھی دوزخ کا عذاب ایسا ہے کہ دنیا کا عذاب سو برس کا بھی اس کے برابر نہیں ہو سکتا۔ مگر پھر بھی یہ صحیح ہے کہ اہل باطل کے عذاب سے یہ عذاب ہلکا ہے اور اہل باطل کو عذاب بہت زیادہ ہوگا۔ لیکن خلود ان کو بھی نہ ہوگا آخر میں کبھی نہ کبھی سزا پا کر نجات پا جائیں گے کیونکہ مومن تو وہ بھی ہیں جیسا کہ بیان کیا گیا اور دیکھئے قرآن میں یہ حکم ہے **فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ** یعنی جو کوئی ایک ذرہ کے برابر بھی عمل خیر کرے گا تو اس کو قیامت کے دن دیکھے گا یعنی اس کا نتیجہ پائے گا اور سب جانتے ہیں کہ ایمان عمل خیر ہے (خیر کیا راس الخیرات ہے) تو آیت کے بموجب ضرور ہوا کہ اس خیر کا نتیجہ ان کو ملے اور اس کے ساتھ بہت سے اعمال شر بھی یعنی عقائد باطلہ بھی موجود ہیں تو ان کا نتیجہ پانا بھی ضروری ہے تو دونوں کے نتیجے ان کو دیکھنا ہیں عقاب بھی اور ثواب بھی۔ تو اب دو احتمال ہیں ایک یہ کہ پہلے ان کو ثواب دیا جائے یعنی جنت میں داخل کئے جائیں اور اس کے بعد ہمیشہ کے لئے عذاب دیا جائے مگر یہ صورت نص کے خلاف ہے یہ کسی کے واسطے نہ ہوگا کہ جنت میں جانے کے بعد نکالا جائے تو اب دوسرا ہی احتمال متعین ہو گیا وہ یہ کہ ان کو اول عذاب دیا جائے گا اور جو وقت سزا کے لئے خدا تعالیٰ کے علم میں مناسب ہو چاہے وہ ہزاروں برس کیوں نہ ہوں اس کے گذرنے کے بعد ثواب دیا جائے اور جنت میں داخل کئے جائیں پھر جنت میں خلود ہوگا۔

اس تمام تقریر سے آپ نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ حق تعالیٰ کی رحمت کس قدر وسیع ہے کہ جس میں ذرا سا بھی ایمان ہے اس کے لئے خلود نہیں ہے پھر کسی کی نسبت بات بات پر کفر کا حکم لگا دینا جس کے واسطے خلود لازم ہو کیسے درست ہوگا۔ کیا جو لوگ آپ کے مشرب پر نہیں ہیں ان میں ذرا سا بھی ایمان نہیں ہے کچھ تو انصاف کیجئے ایسا جوش نہیں چاہیے اس کی بناء سوائے اس کے کچھ بھی نہیں کہ آپ نے اپنا ایک مسلک قرار دے لیا اور سمجھ لیا کہ بس ہم ہی ہیں مومن اور کوئی اس کے ذرا بھی خلاف ہو وہ ایمان سے خارج ہے اور جنت اس کے حصہ میں نہیں آ سکتی بس گویا جنت ان کی ملک ہے کہ جس کو یہ دیں اسی کو ملے گی جس کو نہ دیں اس کو نہ ملے گی یہ طریقہ غلط ہے۔

یہ بحث لفظ منافق پر چلی تھی کہ کسی کو منافق اور کافر کہنا کیسا ہے گو اس کو طول ہو گیا مگر اس کے ضمن میں مفید باتیں بیان ہو گئیں گفتگو یہ تھی کہ اب منافقوں کا وجود نہیں اب یا تو کھلم کھلا کافر ہیں یا مسلمان، تو خدا کا شکر ہے کہ ہم لوگ مومن ہیں ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ دوسرے درجہ کے مومن ہیں

یعنی ناقص جیسے بعضے آدمی اندھے ہوتے ہیں یا چوندھے اور بعضے تیز نظر اور دوربین ہوتے ہیں آدمی دونوں ہیں اور ایک مثال میں ادراک مبصرات بھی دونوں کو ہے مگر ایک کو صحیح اور کامل ہے اور ایک کو ناقص ہے حاصل یہ ہے کہ اسلام کے دعویٰ میں تین درجے نکلتے ہیں ایک یہ کہ اس صفت کا بالکل وجود نہ ہو اس صورت میں تو اسلام کا دعویٰ کرنا کذب اور غلط ہے اور اس سے بحمد للہ اہل اسلام بری ہیں دوسرا درجہ یہ کہ اسلام کی صفت تو موجود ہو مگر ناقص اور ادنیٰ درجہ کی ہو اور تیسرا یہ کہ صفت اسلام موجود ہو اور کمال کے ساتھ اسلام کا وجود ان دونوں درجوں میں پایا جاتا ہے مگر ناقص کو اسلام کے ساتھ متصف کہنا ایسا ہے جیسے اس شخص کو مالدار کہا جائے جس کے پاس صرف چار پیسے ہیں کہ باعتبار لغت کے بے شک صحیح ہے کسی کو اس میں کلام کی گنجائش نہیں لیکن پھر یہ کیا بات ہے کہ چار پیسے والے کو کبھی یہ خیال نہیں آتا کہ میں مالدار ہوں اور کسی مالدار سے آنکھ ملانے کی اس کو ہمت نہیں ہوتی۔ ہر صفت میں یہی حالت ہے کہ ناقص کو اس صفت کے ساتھ متصف نہیں کہا جاتا۔ اور اس کے لئے وہ احکام ثابت نہیں کئے جاتے جو اس صفت کے ساتھ کامل متصف ہونے والے کے لئے کئے جاتے ہیں جب ہر صفت کی یہ حالت ہے تو اسلام بھی ایک صفت ہے اس میں بھی یہی تقسیم جاری ہوگی ایک قسم جس میں دعویٰ اسلام کذب اور غلط ہو وہ تو ہماری بحث سے خارج ہے جیسا کہ بیان ہو چکا تو اب دو قسمیں باقی رہ گئیں ناقص اور کامل مگر محاورات کے موافق جس میں اسلام ناقص ہو اس کا دعویٰ اسلام کرنا شرمناک ہے گو لغۃً صحیح ہے مگر یہ دعویٰ ایسا ہی ہے جیسا چار پیسے والا مالدار ہونے کا دعویٰ کرے بلکہ اس دعوی پر ہر شخص ہنستا ہے کہ لو صاحب گانٹھ میں پیسہ نہیں اور مالدار بنتے ہیں حالانکہ پیسہ ہے اور ایک پیسہ نہیں چار پیسے ہیں مگر ان کے وجود کو مالدار بننے کے بارے میں کالعدم مانا جاتا ہے اور کوئی یہ نہیں کہتا کہ لغت کے اعتبار سے یہ دعویٰ صحیح ہے جس کا حاصل یہی ہے کہ صفت ناقص کا عادۃً وجود ہی نہیں مانا جاتا اسی لئے عرف میں نقصان وصف کی صورت میں اس صفت کو صاحب صفت سے سلب کرنا راجح مانا جاتا ہے اور متمول ناقص کو مالدار نہ کہنا ہی اقرب الی الصحت سمجھا جاتا ہے اور یوں ہی کہا جاتا ہے کہ وہ شخص بالکل غریب اور نادار ہے اگرچہ یہ بھی معلوم ہو کہ اس کے پاس چار پیسے ہیں۔

اس کی دوسری مثال یہ ہے کہ ایک شخص کو صرف قل ہو اللہ یاد ہو اس کو حافظ کہنا کسی معنی وضرور صحیح ہے لیکن ایک شخص وہ ہے جو پورے قرآن کا حافظ ہے اور قاری بھی ہے سبعہ جاننے والا بھی ہے اس کی موجودگی میں اگر کوئی شخص حافظ قل ہو اللہ کی نسبت یوں کہے کہ آپ سے بھی ملاقات

کیجئے آپ بھی حافظ ہیں تو بتلایئے اس کی کیا حالت ہوگی یقیناً پسینہ پسینہ ہو جائے گا اور مارے شرم کے گڑ جائے گا اور آنکھ اوپر کو نہ اٹھیں گی اور یہ حالت ہوگی کہ اگر کوئی اس سے پوچھے کہ آپ حافظ ہیں تو وہ یہ بھی نہ کہہ سکے گا کہ جی ہاں تھوڑا سا حافظ ہوں بلکہ یہی کہتے بنے گی کہ استغفر اللہ میں حافظ کہاں سے آیا حالانکہ حافظ وہ بھی ہے گو لغۃً ایک سورت کا ہی سہی مگر پھر بھی وہ اپنے کو حافظ نہیں کہہ سکتا کیوں کہ عرف یہی ہے کہ صفت ناقص لائق اثبات نہیں ہوتی۔

مسئلہ وحدۃ الوجود:

یہاں سے ایک مسئلہ کی بنا بھی معلوم ہوتی ہے وہ مسئلہ وحدۃ الوجود کا ہے یعنی اصل مذکور کی موافق کہ اس کی حقیقت صرف یہ ہے کہ چونکہ وجود کامل سوائے ذات حق کے کسی کے لئے نہیں ہے اور وجود کائنات نہایت ہی ضعیف اور حقیر اور مثل لاشے کے ہے اس لئے بجائے اس کے ثابت کرنے کے نفی کرنا ہی اولیٰ ہے مگر جہل کے سبب اس مسئلہ کو آج کل ایسے عنوان سے شائع کیا ہے کہ اس میں بہت سے لوگ سخت غلطی میں پڑ گئے اور جو حقیقت تھی اس کا بالکل عکس کر دیا یہ لوگ جاہل صوفیوں کا گروہ ہے۔

حقیقت تو یہ تھی کہ اپنے وجود کی نفی کی جاتی اور اپنے کو کچھ نہ سمجھتے مگر انہوں نے یہ کر دیا کہ اپنے آپ کو خدا ہی کہنے لگے اس بناء پر کہ خدا کے لئے بھی وجود ثابت اور ہمارے لئے بھی وجود ثابت اور وجود ہے ایک کیونکہ وحدۃ الوجود کے معنی ہی یہ ہیں تو اس کی صورت کیا ہو کہ وجود ایک ہی رہے اور وہ خدا کے لئے بھی ثابت رہے اور ہمارے لئے بھی سوائے اس کے کہ ہمارا وجود اور خدا کا وجود ایک ہی ہو تو ہم اور خدا ایک ہوئے تو وحدت سے چل کر اتحاد کے قائل ہو گئے وجود کا واحد یا متعدد ہونا یہ تو مسئلہ کلامیہ ہے اور علمی بحث ہے مگر وحدت کو مستلزم اتحاد ماننا یہ تو محض الحاد ہے یہ ان لوگوں کی توحید ہے کہ چلے تھے خدا کو ایک ثابت کرنے اور ثابت ہو گئے ہزاروں خدا، کیونکہ ہر فرد عالم کے وجود میں بھی تقریر ہو سکتی ہے تو سب کا اتحاد لازم ہو گیا یہ کیسی غلطی ہے مسئلہ تو سیدھا سا تھا مگر اس کی ایسی مٹی خراب کی گئی کہ الٰہی توبہ اس کا مقتضاء تو یہ تھا کہ اپنے وجود کو حق تعالیٰ کے وجود کے سامنے لاشے سمجھتے اگر وجود صرف حق تعالیٰ ہی کے لئے ثابت ہو تب تو ممکن کا وجود معدوم ہی ہے اور اگر ممکن کے لیے بھی ثابت ہوا۔۔۔ تو ممکن کا وجود کالمعدوم ہے۔

بہر حال ممکن کا وجود کسی حال میں مستقل نہیں سو مسئلہ کا تو حاصل یہ تھا لیکن ہو گیا یہ کہ اپنے وجود کو خدا کے وجود کے برابر کر دیا۔

اس کا سہل حل اس مثال سے ہوتا ہے کہ قل ہو اللہ کا حافظ یوں سمجھنے لگے کہ سبعہ جاننے والا

بھی حافظ ہے اور میں بھی ایک سورت کا حافظ ہوں تو ہم اور وہ یکساں ہوئے مگر واقعہ یہ ہے کہ قل ہو اللہ کا حافظ تو حافظ سبعہ کی برابری نہیں کر سکتا حالانکہ وہ اس کا ہم جنس ہے اور اس صفت خاص میں برابر نہ سہی لیکن دوسری بہت سی صفات میں اس کا شریک ہے۔ اور یہ ایک ناچیز بندہ خدا کی برابری کرتا ہے جس کے ساتھ کسی صفت میں شرکت تو کیا معتد بہ تشابہ بھی نہیں رکھتا غور کیجئے کس قدر فاش غلطی ہے یہ سب خرابی جہالت کی ہے کسی جاننے والے کے پاس رہتے نہیں، کسی محقق سے پوچھتے نہیں، علم حاصل کرتے نہیں اور ہمت اس قدر کہ پہلی ہی دوڑ خدا پر جا کر ختم ہوتی ہے اور ایک جست میں خدا ہی سے جا ملتے ہیں۔ ایسی ہمت بھی جہالت ہی سے پیدا ہوا کرتی ہے علم کے بعد یہ ہمت نہیں ہو سکتی غرض ان لوگوں نے تو وحدۃ الوجود کے یہ معنی سمجھے اور کفر میں مبتلا ہوئے۔

اور بعض نے دوسری جانب تفریط کی کہ اس مسئلہ کا انکار ہی کر دیا اور صاف کہہ دیا کہ یہ مسئلہ بالکل غلط ہے یہ فریق اپنے دعویٰ پر عقلی اور نقلی دلیل بھی لاتا ہے اور یوں کہتا ہے کہ وجود کا واحد ہونا مشاہدہ سے باطل ہے ہم دیکھتے ہیں کہ ہزاروں چیزیں اپنے اپنے وجود سے موجود ہیں اور مشاہدہ کا انکار بداہت کا انکار ہے اور بداہت سے زیادہ کیا دلیل ہو سکتی ہے اور نقلی دلیل یہ ہے کہ اس میں قرآن کا انکار اور نص کی تکذیب لازم آتی ہے کیونکہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے خالق کل شیئی اس میں حق تعالیٰ نے اپنی صفت بیان فرمائی ہے کہ ہم خالق ہیں ہر شئے کے اور خلق کے معنی ہیں اعطاء وجود، تو معنی یہ ہوئے کہ ہم نے ہر شئے کو وجود عطا فرمایا۔ پس اگر یوں کہا جائے کہ حق تعالیٰ نے اشیاء کو وجود عطا کیا لیکن ان کے واسطے وجود ثابت نہیں ہوا تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ حق تعالیٰ نے اشیاء کا وجود چاہا مگر نہ ہوا اس صورت میں مشیت و ارادۂ الٰہی کا تخلف لازم آتا ہے اور یہ باطل ہے تو ثابت ہوا کہ اشیاء کیلئے بھی وجود ثابت ہے بس جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ سوائے ذات حق کے کسی چیز کے لئے وجود ثابت نہیں ان کا دعویٰ نص قرآنی کے خلاف ہے لہٰذا انہوں نے صوفیہ وجودیہ پر کفر کا فتویٰ لگا دیا دیکھئے کتنا فرق ہو گیا ایک فریق نے مسئلہ کو ایسا صحیح کہہ کہ سب کو خدا بنا دیا اور ایک فریق نے ایسا اڑا دیا کہ اس پر کفر کا فتویٰ لگا دیا اور تحقیق کی نظر سے دیکھئے تو بات ذرا سی تھی مگر

چوں ندانند حقیقت رہ افسانہ زدند (جب حقیقت نہ سمجھی افسانہ کی راہ اختیار کر لی)

ایک نے افراط کی ایک نے تفریط اور مسئلہ چھوٹا سا ہے

اور بالکل صحیح ہے نہ اس میں آیت کی تکذیب ہے اور نہ اس میں سب کو خدا بنایا جاتا ہے نہ اس سے بداہت کا انکار لازم آتا ہے کیونکہ عطاء وجود سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان کو جداگانہ وجود دیا

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حقیقی وجود کے ساتھ ایک قسم کا تلبس دے دیا یہی عطاء وجود ہے تو نقل کے خلاف نہ ہوا اور مشاہدہ صرف آثار وجود کا ہوتا ہے، وجود کی کنہ کا تو نہیں ہوتا مگر یہ بات ہر شخص کی سمجھ میں نہیں آسکتی اس لئے عامہ افہام کے مناسب اس مسئلہ وحدۃ الوجود کا سہل حاصل صرف اتنا کہنا مناسب ہے کہ وجود تمام اشیاء کے لئے ثابت ہے مگر یہ وجود اس قدر ضعیف اور حقیر اور مضمحل اور ناقص ہے کہ وجود حق کے سامنے اس قابل نہیں کہ اس کو وجود کہا جائے بلکہ کالعدم ہے گو کسی درجہ میں ہستی اشیاء کے لئے بھی ثابت ہے جیسا کہ متکلمین نے کہا ہے **حقائق الاشیاء ثابتۃ** مگر یہ ہستی اس قابل ہرگز نہیں ہے کہ اس کو حق تعالیٰ کی ہستی کے سامنے ہستی کہا جائے اس بناء پر کہہ سکتے ہیں کہ ایک ہی ہستی ایسی ہے جس کو ہستی کہا جاسکتا ہے اور دوسری ہستیاں ایسی ہیں کہ گویا ہے ہی نہیں اسی کو عارف شیرازی ایک حکایت کے پیرایہ میں ظاہر فرماتے ہیں۔

یکے قطرہ ازا برنیساں چکید　　　خجل شد چو دریائے پہنا بدید،

یعنی ایک قطرہ پانی کا بادل میں سے ٹپکا وہ نہایت صاف شفاف تھا اس کو دعویٰ ہوا کہ میں پاک صاف ہوں غبار کی آمیزش مجھ میں ذرا نہیں ہے اور طاہر مطہر ہوں اور منور و آبدار ہوں غرض بہت ہی کچھ خودی اس کے دل میں تھی مگر جب نیچے پہنچا اور سمندر کو دیکھا تو خجل شد چو دریئے پہنا بدید۔ (جب گہرے دریا کو دیکھا تو شرمندہ ہوا) بس اب اس کی یہ حالت ہوئی کہ کہتا ہے۔

کہ جائے کہ دریا است من کیستم　　　گر او ہست حقا کہ من نیستم

مارے شرمندگی کے بالکل پانی پانی ہوگیا اور وہ سب دعویٰ بھول گیا کہ میں مدور ہوں، مطہر ہوں۔ منور ہوں یہاں ایسے مدور اور منور اور مطہر سینکڑوں، ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں اور بے تعداد قطرے موجود ہیں اور ایسے ایسے قطرے ہزاروں سے زیادہ جوتیوں میں لگ جاتے ہیں، ظاہر ہے کہ اس قطرہ کے لئے وجود تو ثابت ہے خواہ لغت کے اعتبار سے کہو یا کسی اعتبار سے کہو ان سے انکار نہیں ہوسکتا مگر کیا اس کا وجود سمندر کے سامنے اس قابل ہے کہ اس کا نام وجود رکھا جائے اسی واسطے کہتا ہے گر او ہست حقا کہ من نیستم۔ اس کے سامنے اپنے آپ کو نیست کہتا ہے ظاہر ہے کہ اس جگہ نیست کا لفظ معنی حقیقی میں مستعمل نہیں ہے کیونکہ وہ تو حقیقت میں ہست ہے پھر نیست کیسا لامحالہ یہی معنی ہیں کہ بمقابلہ سمندر کی ہستی کے اس کی ہستی عدم نہ سہی تو کالعدم ضرور ہے پھر شیخؒ خود ہی فیصلہ فرماتے ہیں۔

ہمہ ہر چہ ہستند ازاں کمتر اند　　　کہ با ہستیش نام ہستی براند

یعنی ماسوائے اللہ جو کچھ بھی ہے اس قابل نہیں کہ حق تعالیٰ کی ہستی کے سامنے اپنے ہستی کا

نام لے اس کا حاصل یہی ہے کہ گو کسی معنی کو وجود تمام مخلوقات کے لئے ثابت ہے مگر وہ اس قدر حقیر اور غیر قابل اعتبار ہے کہ اس کو حق تعالیٰ کے وجود کے سامنے وجود ہی نہ کہنا چاہیے۔ شیخؒ نے اس کی ایک اور مثال دی ہے۔

مگر دیدہ باشی کہ درباغ وراغ   بتابد بہ شب کرمکے چوں چراغ
کسے گفتش اے کرمک شب فروز   چہ بودت کہ بیروں نیائی بروز

کہتے ہیں تم نے دیکھا ہے کہ ایک چھوٹا سا جانور درختوں اور جھاڑیوں میں رات کو کیسا چمکتا ہے (پٹ بیجنا مراد ہے جس کو جگنو بھی کہتے ہیں) اس سے کسی نے کہا کہ تو دن کو کہاں رہتا ہے۔ رات ہی میں کیوں نکلتا ہے دن کو کیوں نہیں نکلتا آگے اس کا جواب بیان کرتے ہیں۔

بہیں کاتشیں کرمک خاک زاد   جواب از سر روشنائی چہ داد
کہ من روز شب جز بصحرا نیم   و لے پیش خورشید پیدا نیم

یعنی وہ کہتا ہے کہ میں دن کو بھی کہیں چلا نہیں جاتا۔ کہیں چھپ نہیں جاتا اس جگہ رہتا ہوں جہاں رات کو رہتا ہوں مگر دن کو میری چمک نظر نہیں آتی۔ میری چمک بہت ذرا سی ہے دن کو آفتاب کا نور ہوتا ہے اس نور کے سامنے میری چمک ایسی ماند ہو جاتی ہے کہ مطلق نظر نہیں آتی۔ اس مثال کا حاصل یہ ہے کہ جو نسبت جگنو کو آفتاب کے ساتھ ہے وہی بلکہ اس سے بھی سو حصہ بلکہ بے شمار حصہ کم تمام کائنات کے وجود کو حق جل شانہ کے وجود سے ہے وہ نسبت یہ ہے۔

اگر آفتاب است یک ذرہ نیست   وگر ہفت دریا است یک قطرہ نیست
اگر آفتاب است یک ذرہ نیست   وگر ہفت دریا است یک قطرہ نیست

اگر سورج ہے (تو اسکے وجود کے سامنے) ایک ذرہ کچھ بھی نہیں اگر سات دریا میں (تو انکے سامنے) ایک قطرہ بالکل نہیں ہے۔ اور فرماتے ہیں۔

چو سلطان عزت علم برکشد   جہاں سر بجیب عدم برکشد

جب محبوب حقیقی کی تجلی قلب پر وارد ہوتی ہے تو سب چیزیں فنا ہو جاتی ہیں۔

اور یہ مثال جو جگنو اور آفتاب کی دی جاتی ہے یا ذرہ اور آفتاب یا قطرہ اور دریا کی دی جاتی ہے یہ بھی صرف سمجھانے کے لئے ہے ورنہ کائنات کے وجود کو حق تعالیٰ کے وجود سے کیا نسبت کائنات ممکن اور حق جل شانہ، واجب۔ کائنات فانی اور حق جل شانہ، باقی۔ کائنات کے تمام صفات متناہی اور حق تعالیٰ جل شانہ، کے تمام صفات لا متناہی پھر دونوں میں کوئی نسبت قائم کی

جائے تو کیوں کر کی جائے کوئی نسبت قائم ہی نہیں کی جاسکتی ہاں اگر کی جا سکتی ہے تو وہی عدم اور وجود کی کہ ذات حق کے واسطے وجود کو ثابت کیا جائے اور کائنات کے لئے عدم کو جب ایک جگنو کا وجود آفتاب کے سامنے کچھ نہیں رہتا۔ حالانکہ اس کے لئے آفتاب کے ساتھ کچھ نہ کچھ نسبت قائم کی جاسکتی ہے۔ کیونکہ دونوں متناہی ہیں لیکن باوجود دونوں کے متناہی ہونے کے قوی ضعیف کو ایسا دبالیتا ہے کہ اس کو معدوم ہی کہنا پڑتا ہے تو کائنات کے لئے جو کہ فانی اور ممکن اور متناہی ہے غیر فانی اور واجب اور لامتناہی کے سامنے کیا وجود ہوسکتا ہے؟ یہ بہت ہی موٹی بات ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ کامل کے سامنے ناقص کالعدم ہوتا ہے بس اسی معنی صوفیہ نے وجود کو کائنات سے سلب کیا ہے اور اسکو صرف ذات حق کے واسطے مانا ہے یہ ہے حقیقت وحدۃ الوجود کی کہ حق تعالیٰ کا وجود من کل الوجوہ کامل مکمل ہے اور کائنات کا وجود من کل الوجوہ ناقص اور لاشئی ہے لہٰذا اس وجود کے سامنے اس وجود کو کالعدم کہہ جاتا ہے یہ ہے وہ مسئلہ جس میں ایک دنیا گمراہ ہے حالانکہ یہ مسئلہ تو بالکل سچا ہے اور عین الایمان ہے اس میں کفر کی کیا بات ہے اس پر تو کوئی بھی غبار نہیں نہ اس پر کوئی اشکال عقلی یا نقلی ہے جیسا کہ جہلا نے سمجھ لیا کہ تمام مخلوقات کو خدا بنا دیا۔

غرض یہ مسئلہ بہت ہی سہل اور سمجھ میں آتا ہوا اور ظاہر ہے جیسا کہ آپ لوگوں نے سن لیا اس پر اگر کوئی کہے کہ پھر صوفیہ نے اس مسئلہ کو غامض اور راز کیوں بنادیا یہ تو عقلی مسئلہ ہے اور بہت ظاہر ہے اس کی تو ہزاروں مثالیں موجود ہیں مثلاً کنسٹیبل کو بھی کچھ حکومت حاصل ہے اور وائسرائے بھی حاکم ہے لیکن دونوں کی حکومتوں میں قوت اور ضعف کا فرق ہے جس کا اثر یہ ہے کہ وائسرائے کے سامنے کنسٹیبل کو کبھی یہ خیال بھی نہ آئے گا کہ میں بھی کچھ حاکم ہوں بلکہ وائسرائے کے سامنے یہی کہے گا کہ حضور ہی حاکم اور مالک ہیں حتیٰ کہ اگر کوئی تیسرا آدمی وائسرائے کے سامنے کنسٹیبل کی نسبت یوں کہنے لگے کہ آپ کو بھی تو کچھ حصہ حکومت کا حاصل ہے تو وہ مارے شرمندگی کے گڑ جائے گا اور ڈر جائے گا کہ خدا جانے وائسرائے کیا سمجھے اور میرے اوپر کوئی بلا نازل کردے۔ میں پوچھتا ہوں یہ بات کیوں ہے کیا یہ بات واقع کے خلاف ہے کہ کنسٹیبل کو حکومت حاصل ہے پھر اس کا نام لیتے ہوئے کیوں شرماتا ہے اور کیوں ڈرتا ہے یہ ایسی واضح مثال ہے جس سے یہ مسئلہ بہت ہی سہولت سے سمجھ میں آجاتا ہے جب کنسٹیبل وائسرائے کے سامنے حکومت کا نام لیتے ہوئے شرماتا ہے۔ مخلوق خالق کے سامنے وجود کا نام لیتے کیوں نہ شرماوے اور جب کنسٹیبل وائسرائے کے سامنے اپنی حکومت کی نفی کرتا ہے اور کہتا ہے کہ حضور ہی حاکم اور مالک

ہیں تو مخلوق خالق کے سامنے کیوں نہ کہے کہ حضور ہی موجود ہیں اور کوئی موجود نہیں یہ مسئلہ تو بالکل عقلی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ضعیف کی ہستی کو قوی کی ہستی کے سامنے معدوم کہنا چاہیے جب یہ مسئلہ ایسا صاف اور ظاہر ہے تو اس کے لئے صوفیہ نے ایسے مشکل عنوان کیوں اختراع کیئے کہ اس سے بہت لوگ وحشت میں پڑ جاتے ہیں کوئی کہتا ہے ہمہ اوست اور کوئی کچھ کہتا ہے غرض اس کو چیستاں بنا دیا ہے۔ واقع میں یہ سوال صحیح ہے کہ مسئلہ تو ایسا ظاہر اور سمجھ میں آتا ہوا ہے مگر ایک دنیا اس سے نا آشنا ہے اور اس کو معرکۃ الآراء سمجھتی ہے۔

درجات وحدۃ الوجود:

بات یہ ہے کہ اس مسئلہ کے دو درجے ہیں ایک علم کا اور ایک حال کا۔ تو یہ مسئلہ درجہ علم میں تو عقلی اور بدیہی ہے کوئی شخص بھی اس کا انکار نہیں کر سکتا اور اس درجہ میں یہ مسئلہ تصوف کا نہیں اور نہ معرکۃ الآراء ہے مگر صوفیہ یوں کہتے ہیں کہ اس درجہ میں یہ مسئلہ مقصود نہیں اور نہ کوئی کمال ہے اس درجہ میں تو اس مسئلہ کا علم ایسا ہے جیسے کھانے کا علم پینے کا علم اور سونے جاگنے کا علم کہ یہ سب باتیں ضروری ہیں اور سب کو معلوم ہیں اور ان کا معلوم ہونا کچھ بھی کمال نہیں۔ اور ایک درجہ حال کا ہے صوفیہ کو وہی مقصود ہے وہ کہتے ہیں کہ اے سالک وہ حال حاصل کرے کہ اگر تمام دنیا کو اور تمام کمالات کو حضرت حق کے سامنے دیکھے تو سوائے حضرت حق کے کچھ بھی نظر نہ آوے اور وہ حال ایسا راسخ ہو کہ سوچنے کی ضرورت نہ ہو یہ نہ ہو کہ ایک ایک چیز کو سوچ کر اس کے وجود کی حقارت ذہن میں حاضر کرے بلکہ یہ حالت ہو کہ کسی چیز پر سوائے حضرت حق کے نظر ہی نہ پڑے بس ایک حال طاری ہو جائے پہلا درجہ علم کا تھا یہ درجہ عمل کا ہے وہ درجہ عقلی تھا اور یہ درجہ ذوقی ہے۔ پہلے درجہ میں یہ کچھ کمال نہ تھا اس درجہ میں کمال ہے اور پہلے درجہ میں یہ مسئلہ کچھ مشکل بھی نہ تھا اس درجہ میں بہت مشکل ہے یعنی باعتبار حصول کے اس کے لئے جس قدر مجاہدات چاہئیں ان کے لئے بڑے حوصلہ کی ضرورت ہے یہ کھانے پینے اور سونے جاگنے کی طرح نہیں ہے کہ ہر شخص کو آسانی اس کا علم حاصل ہے اس کا نام لینے کے لئے منہ چاہیے غرض اس درجہ میں یہ مسئلہ عقلی نہیں اس واسطے اس کو اہل حق نے تصوف میں داخل کیا ہے۔

صاحب حال کی خطا:

اب یہاں سے یہ بات بھی نکل آئی کہ جب حال طاری ہوگا تو تعبیر صحیح نہ ہو سکے گی کیونکہ

قاعدہ ہے کہ جس بات کا آدمی پر حال طاری ہوتا ہے اس میں وہ محو ہو جاتا ہے اور اس کے متعلق الفاظ و عنوانات کی طرف التفات نہیں رہتا بس مطلب کو ادا کرتا ہے جس لفظ سے بھی ہو جائے اس کی ایسی مثال ہے ایک شخص بادشاہ پر عاشق ہو جائے تو جب تک عشق کا حال اس پر طاری نہیں تھا اس وقت تک تو ادب کے الفاظ سے بادشاہ کو خطاب کرتا تھا اور سوائے حضور اور جہاں پناہ کے کوئی لفظ نہیں کہہ سکتا تھا اور جب عشق کا حال طاری ہو گیا تو اب خطاب ان الفاظ سے کرے گا۔

جان من جاناں من سلطان من　　اے توئی اسلام من ایمان من

اور یوں کہے گا، میری جان میرے مالک میرے پیارے جو عین گستاخی کے الفاظ ہیں اور عقلا کے نزدیک پسند نہیں ہیں اس پر قاعدہ کی رو سے یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ یہ شخص کیسا عاشق ہے کہ بادشاہ کو بادشاہ نہیں سمجھتا کیونکہ الشئی اذا ثبت ثبت بلوازمہ۔ (جب ایک چیز ثابت ہوگئی اسکے لوازم بھی ساتھ ہی ثابت ہو گئے) بادشاہ تو وہ ہے جس کے واسطے عظمت و شوکت و ہیبت و ادب لازم ہو اس نے یہ سب باتیں اٹھا کر رکھ دیں تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ یہ اس کو بادشاہ اور معظم تسلیم نہیں کرتا لہذا اس کو باغی کہنا چاہیے لیکن انصاف سے کہیے کہ وہ باغی ہے یا مطیع؟ اور دشمن ہے یا دوست؟ واللہ وہ ایسا مطیع ہے کہ اس سے زیادہ کوئی مطیع نہیں ہو سکتا اور وہ ایسا دوست ہے کہ اس سے زیادہ کوئی دوست ہو نہیں ہو سکتا۔ وہ جان و مال سب کو بادشاہ پر قربان کرنے والا ہے۔ یہی حالت ان لوگوں کی ہوتی ہے جن پر وحدۃ الوجود کا حال طاری ہوتا ہے کہ بعض وقت ان کے منہ سے ایسے الفاظ نکلتے ہیں جو خلاف ادب ہوتے ہیں جن کو سن کر کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ کیسے محب ہے جو محبوب کی تعظیم نہیں کرتا یہ ضابطہ کا اعتراض ہے جو عقلاء اس پر کر سکتے ہیں۔ لیکن وہ معذور ہے وہ الفاظ کو بھول گیا ہے اس کی نظر سے تمام چیزیں سوائے ذات محبوب کے غائب ہو گئیں اسے ضابطہ اور قاعدہ کچھ یاد نہیں رہا اسی واسطے کہا ہے۔

ملت عاشق زملت ہا جدا است　　عاشقاں را ملت و مذہب جدا است

عاشق کا مذہب سارے مذہبوں سے جدا ہے اور عاشقوں کا ملک سب سے الگ ہے۔

اور اس کا عذر ظاہر کرتے ہیں۔

گر خطا گوید ورا خاطی مگو　　ور شود پر خوں شہیداں را مشو
خوں شہیداں را ز آب اولی تر است　　ایں خطا از صد صواب اولی تر است

اگر وہ غلط کہے تو اسے غلط مت کہو اور اگر وہ شہید ہو جائے تو اس کا خون مت دھوو، شہیدوں

کا خون آبِ حیات سے بڑھ کر ہے یہ خطا صواب سے افضل ہے۔

ظاہراً اس کے خطبات اور افعال خطا اور خبط معلوم ہوتے ہیں مگر یہ وہ خطا ہے کہ سو صواب سے بہتر ہے اس کو خطا کہنا خود خطا ہے اس کو خود محبوب سے پوچھئے اس کی نظر میں جو وقعت اس خطا کی ہے وہ آپ کے صواب کی نہیں ہے۔

اہل حال کا احترام:

اور یہ خبط وہ خبط ہے کہ خدا ہر شخص کو نصیب کرے اس خبط کی وقعت بھی ادھر ہی سے معلوم کیجئے کہ اس خبطی سے آنکھ ملانے کا حکم نہیں ہے بعض وقت ایسے خبطیوں کی بے ادبی ہو جانے سے عقوبت عاجلہ نازل ہو جاتی ہے ان خبطیوں کا نام مجذوب ہے یہ خدا کے دیوانے ہیں ان کے ساتھ بے ادبی نہ کرو خدا تعالیٰ کی نظر ان پر مہر کے ساتھ پڑی ہوئی ہے ان کا حال بھی ہر شخص کو معلوم نہیں ہوتا درحقیقت ان کے خطابات بے ادبی نہیں ہیں اور ان کے افعال خبط اور قابل ملامت نہیں ہیں کیونکہ بے ادبی کی حقیقت یہ ہے کہ مخاطب کی عظمت دل میں نہ ہو اور یہاں یہ بات نہیں ہے یہاں تو عظمت کا ہیضہ ہو گیا ہے اس عظمت ہی نے تو ان کو محو کر دیا ہے اور الفاظ تک بھلا دیئے ہیں اب ان کے منہ سے جو کچھ نکلتا ہے اس میں سراپا عظمت ہی بھری ہوئی ہے گو صورت ان کی کیسی ہی ہے یہ حقیقت ہے ان کے اقوال کی۔ اور ان کے افعال پر بھی ملامت کرنے کا کس کو حق ہو سکتا ہے جب کہ خود وہی ملامت نہیں کرتے جن کا یہ نام لیتے ہیں۔ انہوں نے ان کو مرفوع القلم فرما دیا ہے ان کے افعال میں بھی محبوب کی عظمت بھری ہوئی ہے پھر وہ خلاف ادب اور قابل علامت کیسے ہو سکتے ہیں رہا یہ کہ ان کے افعال وحرکات جنون اور خبط کے سے معلوم ہوتے ہیں تو یہ واقع کے خلاف ہے اور آپ کی نظر کا قصور ہے آپ اپنی نظر کی اصلاح کیجئے ان کی اصلاح کے پیچھے نہ پڑیئے یہ حالت ہے اہل حال کی۔ اور یہ عذر ہے ان کا۔ مگر یہ حال اہل حال کا ہے نہ اس کا جو کہ مکار ہو اور بناوٹ سے حال دکھلاتا ہو ان کے بارے میں کہتے ہیں۔

ظالم آن قومیکہ چشماں دوختند   از سخن ہا عالمے را سوختند،

وہ قوم ظالم ہے جس نے آنکھیں بند کر لیں اور ناروا باتوں سے ایک عالم کو جلا دیا۔

وہ شخص نہایت ظالم ہے جس نے اہل حال کی سی باتیں کر کر کے لوگوں کو اپنا معتقد بنایا۔ واعظ بن کر بیٹھ گئے پیر بن گئے شیخ بن گئے۔ لوگوں کو طریق کی تعلیم دیتے ہیں مگر درحقیقت وہاں کچھ بھی نہیں جو کچھ ہے بناوٹ ہے۔ ان کی تعلیم کی بھی حقیقت سنئے کہ وہ کیا تعلیم دیتے ہیں اور اس کا نتیجہ کیا ہوتا

ہے اول مطلق تعلیم کو سمجھئے کہ وہ کیا چیز ہوتی ہے۔

اہل حال کی نقالی:

تعلیم کی حقیقت یہ ہوتی ہے کہ **معلم** وہ اثر جو اس کے قلب میں ہے بذریعہ الفاظ کے متعلم پر ڈالتا ہے اسی واسطے ہر تعلیم کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو حال معلم کے قلب میں ہوتا ہے وہی متعلم پر پڑتا ہے الفاظ کا چنداں اثر نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ اہل حال گو کوئی بات معمولی الفاظ میں کہیں مگر وہ اثر کر جاتی ہے اور غیر اہل حال کیسے ہی رنگین اور زوردار الفاظ سے کچھ کہے مگر اثر نہیں ہوتا اب سمجھئے کہ یہ مکار لوگ بھی تعلیم دینے بیٹھتے ہیں اور الفاظ اہل حال کے سے نقل کرتے ہیں مگر دل میں تو حال ہے نہیں بلکہ کچھ اور ہی ہے لہٰذا وہی اثر جو ان کے دل میں ہے متعلم پر پڑتا ہے۔ ان کے دل میں کیا ہے۔ تکبر۔ ترفع۔ تصنع بڑا بننا مقتدا بننا۔ بس وعظ کے پاکیزہ الفاظ کے ذریعہ سے یہ نجاسات اور گندگیاں متعلم کے دل میں پہنچتی ہیں اور اس کا ستیاناس ہوتا ہے اسی کو مولاناؒ نے فرمایا ہے۔ ''از سخن ہا عالمے را سوختند،، اچھی اچھی باتوں سے متعلمین کو غارت کر دیا یعنی اچھی اچھی باتوں کے ذریعہ سے بری بری باتیں ان کے دلوں میں اتار دیں اور امراض قلبی ان میں پیدا کر دیئے جنہوں نے ان کو جا کر خاک کر دیا بعض وقت یہ لوگ اہل حال کے ان اقوال کو بھی نقل کرتے ہیں جو ان سے بحالت سکر نکلے ہیں اور جو ظاہراً ادب سے گرے ہوئے ہیں اور گستاخی میں داخل ہیں۔

سو خوب سمجھ لیجئے کہ غیر صاحب حال کو ان الفاظ کا منہ سے نکالنا ہرگز جائز نہیں بلکہ سراسر گستاخی اور بے ادبی ہے یہ الفاظ حقیقت میں جائز تو کسی کو بھی نہیں کیونکہ گستاخی اور بے ادبی کے الفاظ ہیں اور بے ادبی بھی کس کی حضرت حق کی جو احکم الحاکمین اور قادر مطلق ہے۔ ایک ادنیٰ سے حاکم کے سامنے بھی کوئی شخص تہذیب سے گرا ہوا لفظ یا بے تکلفی کا کلمہ نہیں کہہ سکتا سوا حضور اور عالیجناب کے بلکہ تم اور آپ بھی نہیں کہہ سکتا چہ جائیکہ احکم الحاکمین کی شان میں کوئی لفظ ادب کے خلاف کہہ سکے ان کی تعلیم تو وہ ہونی چاہیے جو کسی کی بھی نہ ہو سکے ان کے واسطے تو وہ لفظ چاہئیں جو کسی کے واسطے بھی نہ ہوں ان کے سامنے تو وہ خشوع و خضوع چاہیے جو کسی کے سامنے بھی نہ ہو بے تکلفی اور گستاخی کے کیا معنی تو اس کی اجازت تو درحقیقت کسی کے واسطے بھی نہیں ہو سکتی لیکن حال والا معذور ہے وہ اپنے ہوش میں نہیں اس کی تو یہ حالت ہے۔

گہہ ترا گوید ز مستی بوالحسن   یا صغیر السن یا رطب البدن

کبھی تجھے مستی سے بوالحسن یا صغیر السن (کم عمر) یا نازک اندام لڑکا کہتا ہے۔

اس کی طرف خطاب بھی امر ونہی کا متوجہ نہیں ہوتا کیونکہ مجنون ہے اور مجنون مرفوع القلم ہوتا ہے اس لئے حال والے پر غیر حال والے کو قیاس نہیں کر سکتے۔ وہ بعض وقت ایسے الفاظ بھی حق تعالیٰ کی شان میں کہہ بیٹھتا ہے جو مخلوق ہی کو کہے جا سکتے ہیں۔

جیسے وہ شبان موسیٰ علیہ السلام کہتا تھا کہ اے خدا تو کہاں ہے مجھے مل جاوے تو میں تجھے روٹی کھلاؤں اور تیرے کپڑے پھٹ گئے ہوں تو سی دوں اور تو تھک جاوے تو بدن دبا دوں مگر چپڑ چپڑ کر روٹی کھلاؤں سر میں کنگھی کروں۔ ساری بکریوں کا دودھ تجھ ہی کو پلاؤں اور جانے کیا کیا فرط محبت میں کہہ رہا تھا یہ صاحب حال تھا حق تعالیٰ کی شان میں وہ باتیں کہہ رہا تھا جو مخلوق سے کہی جاتی ہیں اس کی ریس میں اگر کوئی دوسرا شخص کہے تو اس پر حکم شرعی لگا دیا جاوے گا اور اس چرواہے پر کوئی حکم نہیں لگ سکتا حتی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب اس سے یہ الفاظ سنے تو چونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام صاحب مقام تھے ان الفاظ کو سن کر کانپ اٹھے اور اس کو زجر کیا کہ کیا بک رہا ہے اور کس کی شان میں یہ کہہ رہا ہے وہ بیچارا چپ ہو گیا اس زجر پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خطاب فرمایا گیا کہ تم نے اس کو کیوں روک دیا دیکھئے یہ کلمات گستاخی کے تھے کیونکہ وہ باتیں ہیں جو مخلوق کے واسطے کہی جاتی ہیں تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس شبان نے خالق کو مخلوق کے برابر کر دیا اس سے زیادہ کیا گستاخی ہو سکتی ہے مگر اس بات پر شبان پر تو عتاب نہ ہوا اور اس سے روکنے پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خطاب کیا گیا۔

اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ شبان معذور تھا فرط محبت میں بیہوش ہونے کی وجہ سے اس پر حکم اہل ہوش کا سا نہیں لگایا گیا اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے قصد سے گستاخی اور بے ادبی نہیں کرتا تھا بلکہ جان و مال کو خالق پر فدا کر رہا تھا سوا خالق کے کسی کی طرف اس کی نظر نہ تھی جو کچھ اس کے خیال میں تھا مال اور جان سب کو خالق کے سامنے پیش کرتا تھا۔

ہاں وہ دیہاتی آدمی جنگل کا رہنے والا تھا اس کے خیال میں یہی چیزیں تھیں، گھی چپڑی روٹیاں دودھ دہی بکریاں یہ سب اس نے محبوب کے سامنے پیش کر دیں یہ تو مالی خدمت تھی اور وہ جان سے بھی حاضر تھا اس طرح کہ جو کام اس کو آتے تھے۔ سر میں کنگھی کرنا۔ کپڑوں کی جوئیں دیکھنا۔ پھٹا کٹا کپڑا سی دینا۔ بدن دبا دینا ان سب خدمات کے لئے بھی حاضر تھا تو یہ تو غایت درجہ کی محبت ہوئی کہ جان و مال دونوں سے حاضر ہو گیا اسی واسطے حق سبحانہ، وتعالیٰ کے یہاں اس کی قدر ہوئی۔ جان و مال دو ہی چیزیں ہیں جب یہ دونوں چیزیں کسی نے حاضر کر دیں تو اور کس چیز کا مطالبہ اس سے کیا جائے؟ یہ اور بات ہے کہ اس پیش کرنے کی صورت ذات حق کے شایان

شان نہ تھی تو اس میں اس کو معذور رکھا گیا اس واسطے کہ اس کو اس سے زیادہ اچھی صورت بنانا آتا ہی نہ تھا اگر اس سے زیادہ کا مطالبہ اس سے کیا جائے اور جاہل مدہوش کو طرز کلام میں عقلاء کے اتباع کا مکلّف کیا جائے تو یہ تکلیف مالا یطاق ہوگی جو حق تعالیٰ نے بندوں پر نہیں رکھی غرض حقیقت ان خدمات کے پیش نظر کرنے کی بالکل ٹھیک تھی گو صورت اچھی نہ تھی۔

صاحب حال معذور ہے:

باقی اور لوگ جو اہل حال نہیں ہیں اور اہل حال کی نقل اتارتے ہیں وہ اہل حال کے حکم میں کیسے ہو سکتے ہیں کیونکہ اہل حال میں حقیقت تو ہے صورت نہ سہی اور یہاں تو صورت بھی نہیں اور حقیقت بھی نہیں یہ تو محض گستاخی اور بے ادبی ہے کہ خالق کو صورۃً وحقیقۃً مخلوق کے برابر کیا جاتا ہے کاش ان پر حق تعالیٰ کی عظمت منکشف ہوتی تو نظر آتا کہ ہم کیا کر رہے ہیں یہ بالکل اندھے ہیں حق تعالیٰ کی عظمت منکشف ہوتی تو نظر آتا کہ ہم کیا کر رہے ہیں یہ بالکل اندھے ہیں حق تعالیٰ پر ان کی نظر نہیں پڑی اس وجہ سے ایسے الفاظ منہ سے نکالنے کی جرأت ہوتی ہے اور اہل حال پر حق تعالیٰ کی عظمت اس قدر منکشف ہے کہ وہ اس کے سامنے سب چیزوں کو بھول گئے حتیٰ کہ الفاظ کو بھول گئے ان سے یہ بھی نہ ہو سکا کہ سوچ کر الفاظ زبان سے نکالتے کتنا فرق ہے دونوں کی حالت میں ایک بینا ہے اور ایک نابینا پھر کیسے دونوں کو برابر کر دیا جائے نابینا اگر بینا کی طرح دوڑ کر چلنے لگے تو ضرور چوٹ کھائے گا اور سر پھوڑے گا اور کنویں میں گرے گا اب سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ ہوش کی حالت میں اور بے ہوشی کی حالت میں کتنا فرق ہے۔ غیر اہل حال کو اہل حال کی ریس ہرگز نہیں کرنا چاہیے اس واسطے مولاناؒ مستوں کے لئے ایک جگہ تو کہتے ہیں۔

گہہ ترا گوید زمستی بوالحسن یا صغیر السن یا رطب البدن

کبھی وہ تجھے مستی سے ابوالحسن یا کم عمر یا نازک اندام لڑکا کہتا ہے۔

اور جس میں مستی نہیں ہے تو اس کی طرف سے کہتے ہیں۔

اے بروں از وہم وقال وقیل من خاک برفرق من و تمثیل من

اے وہ ذات جو ہمارے وہم اور قیل وقال سے بہت زیادہ بڑھ کر ہے تو میرے منہ اور میری مثال پر خاک۔

یعنی میری مثال پر خاک اور میرے منہ میں بھی خاک ہو۔ لیکن پھر عذر بیان کرتے ہیں کہ گو یہ مثالیں ناقص ہیں مگر ان کو ایک عذر سے بیان کیا جاتا ہے وہ عذر کیا ہے۔

بندہ نشکیبد ز تصویر خوشت
ہر دست گوید کہ جانم مفرشت

عاشق کو بغیر تصور کے چین نہیں آتا۔ اس لئے وہ آپ کے واسطے اچھی سے اچھی تمثیل بیان کر کے اپنی تسلی کرتا ہے۔

غرض صاحب حال جب ایسے الفاظ کہتا ہے جو بظاہر ادب سے گرے ہوتے ہیں تو وہ مستی کی حالت میں کہتا ہے اس وقت یہ معذور ہے اس کی نظر سوائے ذات حق کے کسی طرف نہیں ہے اس پر وحدۃ الوجود کا حال طاری ہے اور جو صاحب حال نہیں ہے وہ اگر ایسے الفاظ کہے گا تو وہ معذور نہیں ہے اس کی گردن ناپی جائے گی۔

غرض اہل حال اور مکار دونوں کا ایک حکم نہیں ہو سکتا۔ اہل حال تعبیر صحیح پر قادر ہی نہیں اس کے منہ سے جو کچھ نکلتا ہے وہ بے اختیار نکلتا ہے اور مکار کے منہ سے جو کچھ نکلتا ہے وہ اس کے اختیار اور تصنع سے نکلتا ہے پھر اہل تصنع اور غیر اہل تصنع کیسے برابر ہو جائیں گے۔ بہر حال یہ مسئلہ وحدۃ الوجود کا حال کے درجہ میں تصوف کا مسئلہ ہے اور مشکل مسئلہ ہے اس کے حاصل کرنے کے لئے ہمت کی ضرورت ہے اور قال کے درجہ میں یا علم کے درجہ میں عقلی مسئلہ ہے اور بہت واضح اور مسلم مسئلہ ہے یہ حقیقت ہے وحدۃ الوجود کی۔

اس کا ذکر اس مناسبت سے آ گیا تھا کہ ہستی کامل کے سامنے ہستی ناقص ہستی کہنے کے قابل ہی نہیں ہے اس کی بہت سی مثالیں دی گئی تھیں مثلاً یہ کہ شجاعت کامل کے سامنے شجاعت ناقص کو شجاعت کہنا ٹھیک نہیں وغیرہ وغیرہ۔ اصل بیان یہ تھا کہ ہر صفت میں تین درجے ہوتے ہیں ایک عدم اس درجہ میں اس صفت کا نام لینا کذب اور غلط ہوتا ہے اور اس سے یہاں بحث بھی نہیں اور ایک درجہ نقصان کا ہے اس درجہ میں گو اس صفت کا نام کسی اعتبار سے لے سکتے ہیں مگر عرف یہی ہے کہ اس درجہ میں بھی اس کا نام لینا قابل شرم سمجھا جاتا ہے جیسا کہ میں نے اوپر بیان کیا ہے۔

کمال اسلام مطلوب ہے:

اب سمجھئے کہ منجملہ صفات کے اسلام بھی ہے اور ہم اس کے ساتھ متصف کہے جاتے ہیں اور الحمد للہ کہ اس صفت کا اطلاق ہمارے اوپر درجہ کذب میں تو نہیں ہے یعنی ایسا نہیں ہے کہ ہم ظاہر میں مسلمان کہے جاتے ہوں اور دل میں مسلمان نہ ہوں یہ حال تو منافقین کا تھا اور منافقین اس زمانہ میں نہیں ہیں جیسا اوپر تحقیق گذر چکی۔ تو اب دو درجے رہے ایک نقصان دوسرا کمال۔ ظاہر ہے کہ اسلام صفت مطلوب ہے اور متعدد مثالوں اور متعدد عنوانوں سے ابھی ثابت کیا گیا ہے کہ

کوئی صفت درجہ نقصان میں مقصود نہیں ہوتی چنانچہ کوئی شخص جو متمول بننا چاہے وہ ایک پیسہ حاصل کر کے بیٹھ نہیں رہ سکتا اور اس طرح منطقی مقدمات سے اپنے دل کو نہیں سمجھا سکتا کہ متمول کہتے ہیں مالدار کو اور مالدار کے معنی ہیں مال رکھنے والا اور پیسہ مال ہے تو ہم مالدار اور متمول ہو گئے نہیں بلکہ متمول بننے کے معنی ہر شخص یہی سمجھتا ہے کہ اس صفت کو علی وجہ الکمال حاصل کیا جائے اور درجہ نقصان میں کوئی اس صفت کو مقصود نہیں سمجھنا بنا بریں جب صفت اسلام مطلوب ہے تو اس کے ساتھ اس کا کمال بھی مطلوب ہوگا یہ تو عقلی دلیل تھی کمال کے مطلوب ہونے کی۔

اب شرعی دلیل سنئے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں **یا یھا الذین امنوا ادخلوا فی السلم کافة** یعنی حکم ہے کہ اسلام میں پورے پورے داخل ہوں دیکھئے صاف حکم موجود ہے کہ صفت اسلام کو علی وجہ الکمال حاصل کرنا چاہیے حالانکہ اگر یہ امر صریح بھی موجود نہ ہوتا تب بھی اس قاعدہ کے موافق کہ کسی صفت کا اطلاق جب ہوتا ہے تو درجہ کمال ہی میں ہوتا ہے اسلام کامل ہی مطلوب ہوتا چہ جائیکہ امر صریح بھی موجود ہے تو اب کیا کلام ہو سکتا ہے اس بات میں کہ اسلام کامل ہی مطلوب اور مقصود ہے کمال اسلام کا مطلوب اور مامور بہ ہونا تو ثابت ہو گیا گو لفظ اسلام لغۃً ہر اس جگہ صادق آ سکتا ہے جہاں ذرا سا بھی اسلام ہو یعنی کیسا ہی ناقص اسلام ہو تب بھی لغت کے اعتبار سے اس کو اسلام کہہ سکتے ہیں مگر اہل تحقیق کے نزدیک جب ہی صادق آ سکتا ہے جب کہ کمال کے ساتھ ہو جیسا کہ مدلل اور مفصل بیان کیا گیا۔

اسلام کامل کی تعریف:

ہمارے دعوے اسلام کے صحیح ہونے کے لئے ضرورت ہے کمال اسلام کی۔ اور اس کے لئے ضرورت ہے اس علم کی کہ اسلام کامل کیا چیز ہے تا کہ اس کو سمجھ کر حاصل کیا جاوے اسی کو حق تعالیٰ نے اس آیت میں بتلایا ہے جو پڑھی گئی۔ **قل ان صلوتی ونسکی ومحیای ومماتی لله رب العلمین** یعنی کہہ دیجئے کہ میری نماز اور کل عبادتیں اور جینا اور مرنا سب اللہ ہی کے واسطے ہے۔

اس میں سب سے پہلے دیکھنا یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے حضور کو لفظ قل سے امر فرمایا ہے یعنی کہہ دیجئے اور سنا دیجئے حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ اگر یہ امر بھی نہ ہوتا اور قل کا لفظ نہ فرمایا جاتا تب بھی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وحی کو سناتے ہی پھر باوجود اس کے بھی سنانے کا حکم فرمایا گیا تو اس سے مقولہ قل کی شان کا اہتمام پیدا ہوا کہ یہ بات ایسی ہے کہ اس کے سنانے کا خاص اہتمام مقصود ہے اور جس بات کے سنانے کا حکم ہے اس کا حاصل اسلام کامل ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہوئی کہ اسلام کامل قابل اہتمام چیز ہے اسی واسطے بیان کے لئے اس آیت کو میں نے اختیار کیا۔

اب سمجھئے کہ بحمداللہ ہم صفت اسلام کے ساتھ متصف تو ہیں اور اسلام ہم میں موجود ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ وہ کامل ہے یا ناقص؟ تو اب پہلے کامل کو سمجھئے اس سے خود معلوم ہو جائے گا کہ ہم میں وہ درجہ ہے یا نہیں۔ فرماتے ہیں اپنا مسلک ظاہر کر دیجئے کہ **ان صلوتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العلمین لا شریک لہ،** میں اس کا ترجمہ کرتا ہوں کہ (میرا مسلک تو یہ ہے کہ) میری نماز عبادت مرنا جینا سب اللہ کے لئے ہے (وہ کیسے ہیں) وہ رب العلمین ہیں ان کا کوئی شریک نہیں ہے **وبذالک امرت** اور مجھ کو اسی کا حکم کیا گیا ہے **وانا اول المسلمین** اور میں سب سے پہلے اسلام لانے والوں میں ہوں۔ یہ لفظ مسلمین کو خوب مل گیا ہے یہ لفظ دلالت کرتا ہے کہ آیت میں اسلام ہی کی شرح کی گئی ہے کیونکہ مامور بہ باجزائہ بیان کرنے کے بعد اس کی تعمیل کرنے والوں کا لقب مسلمین فرمایا گیا ہے تو اس کے یہی معنی ہوئے کہ اس مامور بہ کے اجزاء جمع کرنے سے یہ لقب مسلم حاصل ہوتا ہے اور مسلم وہی ہے جس میں یہ امور ہوں جن کا یہاں ذکر ہے تو یہ معنی ہوئے کہ یہ مامور بہ کا مجموعہ عین اسلام ہے لیجئے تصریح ہو گئی کہ آیت میں اسلام کامل کی تفسیر بتائی گئی ہے **فالحمدللہ علی ذالک.**

اس کی مثال یہ ہے کہ کسی کو تعلیم کی جاوے کہ کھڑے ہو کر اللہ اکبر کہو پھر الحمد اور سورت پڑھو پھر کمر جھکاؤ پھر کھڑے ہو پھر زمین پر ماتھا رکھو پھر کھڑے ہو جاؤ اور اسی ترکیب سے چار دفعہ ان سب کاموں کو کرو اور بعد میں کہہ دیا جائے کہ جب تم چار دفعہ ایسا کر لو گے تو سمجھ لینا کہ نمازی بن گئے تو اس تعلیم میں گو اس نے شروع سے یہ نہیں کہا کہ میں تم کو نماز سکھلاتا ہوں لیکن اخیر میں یہ لفظ کہہ دینے سے کہ ان افعال کے کرنے سے تم نمازی بن جاؤ گے صاف یہ مطلب نکلتا ہے کہ ان افعال کا کرنے والا نمازی ہے اور ان افعال کا مجموعہ نماز ہے۔ اور یہ سب اجزاء نماز کے ارکان ہیں اسی طرح یہ تعلیم فرما کر کہ اپنا مسلک یہ رکھئے کہ نماز بھی خدا کے لئے ہو اور ہر عبادت بھی خدا کے لئے ہو اور مرنا بھی خدا کے لئے ہو اور جینا بھی خدا کے لئے ہو اس کے بعد یہ فرمانا کہ بس مجھے اسی کا امر ہے اور میں اپنے آپ کو سب سے پہلا مسلم کہتا ہوں یہ بالکل ویسا ہی ہے جیسے مثال میں کہا گیا تھا کہ ان افعال کے کرنے سے تم نمازی بن جاؤ گے تو اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسلک اختیار کرنا مسلم بننا ہے اور یہ مسلک اسلام ہے اور یہ اجزاء اسلام کے اجزاء ہیں اور اول کا لفظ صاف بتلاتا ہے کہ اسلام کامل مراد ہے کیونکہ اولیت سے مراد اولیت زمانی نہیں ہے بلکہ اولیت فی الرتبہ ہے جس کا ترجمہ ہے سب سے بڑھ کر مسلمان ہونا یہی بعینہ ترجمہ ہے اسلام کامل کا جیسا کہ ظاہر ہے لیجئے اب تو میرے مدعا کے لئے بالکل صاف صاف الفاظ مل گئے۔

اسلام کامل کے اجزاء:

اب سمجھئے کہ یہاں اسلام کامل کی حقیقت چار اجزاء میں بیان فرمائی گئی ہے کہ یہ چار چیزیں اللہ ہی کے لئے خالص کردو۔ نماز۔ عبادت۔ موت۔ حیات ان سب کو اللہ ہی کا کردو بس اتنی حقیقت ہے اسلام کامل کی اجمال تو یہ ہے جو بہت ہی ذرا سا ہے مگر اس کی تفصیل کچھ شرح اور طول چاہتی ہے اور تفصیل بھی ایک تو اختصار کے ساتھ ہو سکتی ہے اور ایک طول وبسط کے ساتھ۔ اختصار کے ساتھ تو یہ ہے کہ یہاں جو حقیقت اسلام کامل کی چار اجزاء میں بتلائی گئی ہے کہ ان چار کو یعنی نماز اور عبادت اور موت اور حیات کو اللہ ہی کے لئے خالص کردو اس کے معنی صرف یہ نہیں ہیں کہ ان چاروں کو صرف عقیدہ کے مرتبہ میں اللہ کی سمجھتے رہو کیونکہ اس سے تو کوئی ادنیٰ درجہ کا مسلمان بھی خالی نہیں ہر مسممان ان چار چیزوں کو ہی کیا بلکہ ہر چیز کو اعتقاداً اللہ ہی کی سمجھتا ہے تو پھر کامل اور ناقص میں فرق ہی کیا ہوا؟ بلکہ معنی یہ ہیں کہ ان چار چیزوں کو اعتقاداً اللہ کی سمجھ کر حالاً بھی ان کو ان کے ہی سپرد اور تابع کردو جب اپنے کو اللہ کی ملک سمجھا تو ان کو اعتقاداً بھی تصرف کا مستحق سمجھو اور حالاً بھی منقاد ہو جاؤ یعنی دل سے عقیدہ یہ رکھو کہ یہ سب چیزیں خدا کی ہیں اور حالاً بھی ان کے تصرف کو تسلیم کر کے بالکل منقاد اور مطیع اور فرماں بردار بن جاؤ کہ ان چاروں میں جس طرف چلائیں اسی طرف کو چلو تو حاصل یہ ہوا کہ حق تعالیٰ جو تصرف بندہ کی نماز میں عبادت میں حیات میں موت میں کریں اس کا اعتقاداً وحالاً منقاد اور فرماں بردار ہونا اسلام کامل ہے یہ تفصیل ہوئی اختصار کے ساتھ۔

کمال اسلام کے بارے میں تفصیل:

اب قدرے طوں اور بسط کے ساتھ تفصیل سنیئے وہ یہ ہے کہ یہاں دو باتیں سمجھنے کی ہیں چنانچہ میں نے ابھی کہا ہے کہ حق تعالیٰ کو تصرف کا مستحق سمجھو اور تم انقیاد کرو تو یہ چیزیں دو ہوئیں تصرف اور انقیاد۔ تصرف تو حق تعالیٰ کا فعل ہے اور انقیاد ہمارا فعل ہے اب خدا تعالیٰ کے فعل یعنی تصرف کی حقیقت بھی سمجھنا اور اس کا اعتقاد رکھنا ضروری ہے اور اپنے فعل یعنی انقیاد کی حقیقت معوم کرنا اور اس پر عمل کرنا بھی ضروری ہے تو چار چیزیں ہوئیں۔ تصرف کی حقیقت سمجھنا۔ اور عقیدہ رکھنا تصرف پر۔ اور اپنے فعل یعنی انقیاد کی حقیقت سمجھنا اور عمل کرنا اس پر۔ بس اسی سے اسلام کامل ہوگا ان چاروں کو ترتیب وار سن لیجئے۔ اول حقیقت سمجھنا تصرف حق کی ان چار چیزوں میں یعنی نماز میں عبادت میں موت میں حیات میں۔ اس کی تفصیل عنقریب آتی ہے مگر اس کے قبل اس کے متعلق

ایک بات اور سمجھ لیجئے کہ یہ جو چار چیزیں بتلائی گئیں یہ چار برائے نام ہیں عنوانات چار ہیں ورنہ معنون حقیقت میں تین ہیں یا دو اس طرح کہ صلوٰۃ کے معنی ہیں نماز اور نسک کے معنی ہیں عبادتیں اور نماز بھی عبادت میں داخل ہے تو یہ تعمیم بعد تخصیص ہے اس کے لئے دراصل صرف نسک کا لفظ بھی کافی تھا نماز بھی اس میں آجاتی لیکن نماز کا نام جدا لیا گیا بغرض اہتمام کے تو یہ معنی ہو گئے کہ ساری عبادتیں ملک ہیں اللہ کی، تو اب ان دو جزو میں سے ایک جزو رہ گیا یعنی عبادت جس میں نماز بھی آگئی جب چار جزو میں سے ایک کم ہو گیا تو تین جزو رہ گئے۔ یہ تو تین جزو ہونے کی تقریر ہوئی اور دو جزو ہونے کی تقریر یہ ہے کہ اس کے بعد **ومحیای ومماتی** آیا ہے اس کے معنی ہیں میرا مرنا اور میرا جینا۔ اس میں دو احتمال ہیں ایک تو یہ ہے کہ ان سے حالت حیات اور حالت۔ موت مراد ہو۔ دوسرا یہ کہ حیات وموت کے احکام مراد ہوں اگر حالت حیات اور حالت موت مراد ہو تو پھر یہ دونوں مل کر ایک ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ دونوں غیر اختیاری امور ہیں اور صفت غیر اختیاری دونوں میں مشترک ہے اور پیشتر **صلوتی ونسکی** (میری نماز اور میری عبادت) کا متحد ہونا معلوم ہو چکا ہے تو معنون کے درجہ میں بجائے چار کے دو جز رہ گئے اس طرح کہ موت اور حیات تو حالت غیر اختیاری ہوئی اور عبادت فعل اختیاری ہے تو معنی آیت کے یہ ہو جائیں گے کہ ہمارے تمام حالات اختیاریہ وغیر اختیاریہ اللہ تعالیٰ کے ملک ہیں۔ اور دوسری شق پر یعنی جب کہ حیات اور موت سے مراد احکام حیات اور موت ہوں دو ہونے کی تقریر یہ ہے کہ احکام موت سے مراد میراث وغیرہ وہ احکام ہیں جو بعد موت کے جاری ہوتے ہیں اور احکام حیات تمام ان احکام کو شامل ہے جو زندگی کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں اس میں تمام عبادتیں آگئیں نماز بھی آگئی اور بقیہ احکام متعلقہ حیات بھی آگئے تو اس طرح سے تین چیزیں تو احکام حیات میں آگئیں یعنی نماز اور عبادتیں اور بقیہ احکام متعلقہ حیات۔ اور ایک چیز احکام موت میں آگئی۔ تو پھر بھی دو چیزیں ہو گئیں۔ غرض تین چیزیں کہو یا دو کہو سب کا حاصل یہ ہوا کہ ہمارے حالات اختیاریہ اور غیر اختیاریہ پھر وہ حالات موت کے ہوں یا حیات کے سب ملک اللہ کے ہیں یہ حاصل ہے آیت کا۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ مضمون بہت مختصر الفاظ میں بھی آسکتا تھا مثلاً یوں ہوتا کہ **احوالنا الاختیاریۃ وغیر الاختیاریۃ للہ.** پھر ان سب کو الگ الگ کیوں بیان کیا گیا ایجاز کی جگہ اطناب کو کیوں اختیار کیا گیا۔ اس کی ایک توجیہ تو یہ ہے کہ لوگوں کے مذاق مختلف ہیں اور ان سب مذاقوں پر اصلاح مقصود ہے سو ایک مذاق جو آج کل غالب ہے یہ بھی ہے کہ ان کے خیال میں عبادات تو حقوق اللہ ہیں اور ان

میں ہر طرح اللہ کو اختیار تصرف کا ہے۔ جس فعل کو چاہیں عبادت قرار دے دیں اور جس کیفیت سے چاہیں اس کو مقرر فرما دیں نماز میں چار رکعتیں رکھ دیں تو یہی ٹھیک ہے اور تین رکھ دیں تو وہی ٹھیک ہے اور دو رکھ دیں تو وہی ٹھیک ہے، غرض عبادات میں ہر قسم کے تصرف کا حق حق تعالیٰ کو حاصل ہے۔

احکام تمدن و معاشرت اور مولوی حضرات:

یہ مذاق والے اسی کو دین سمجھتے ہیں ان کو احکام متعلقہ عبادات سے وحشت نہیں ہوتی۔ لیکن ان کو ان احکام سے جو معاشرت کے متعلق ہیں یا حیات اور موت کے انتظام کے متعلق ہیں یعنی جو احکام عادات کے اور تمدن و معاشرت کے متعلق ہیں ان کے سننے سے وحشت ہوتی ہے۔

بعض کو میں نے خود سنا ہے یوں کہتے ہوئے کہ مولویوں نے دین کو خوب بنایا ہے کہ پاجامہ ایسا ہو یہ بھی ایک مسئلہ ہو گیا اور ڈھیلے سے استنجا کرو اور اس کے بعد پانی سے استنجا کرو یہ بھی ایک مسئلہ ہو گیا اسی طرح داڑھی کا بھی ایک مسئلہ ہے اور چلنے پھرنے کا بھی ایک مسئلہ ہے غرض زندگی تنگ کر دی، کپڑا پہنو تو مولویوں سے پوچھ کر ہگو موتو تو مولویوں سے پوچھ کر وضع بناؤ تو مولویوں سے پوچھ کر چلو تو مولویوں سے پوچھ کر پھرو تو مولویوں سے پوچھ کر، غرض کوئی کام بھی کرو پہلے مولوی صاحبان کو سلام کر لو۔ اچھی مطلب کی گانٹھی ہے اس میں مولویوں کو کیا دخل؟ مولوی لوگ تو اللہ کا راہ بتلانے کے لئے اور آخرت درست کرنے کیلئے ہیں۔ دنیا کے کاموں میں خواہ مخواہ ٹانگ اڑاتے ہیں دنیا کی ضرورتیں ہم زیادہ جانتے ہیں اور اسی کے موافق سب کام کر سکتے ہیں ان صاحبوں کو کیا ضرورت ہے تکلیف کرنے کی؟

اتنا غنیمت ہے کہ جو کچھ کہا مولویوں کو ہی کہا۔ انہی کی مخالفت کرتے ہیں شریعت اور شارع کے ساتھ گستاخی کرنا مقصود نہیں ورنہ کفر ہو جاتا اگرچہ یہ بات بھی وہیں تک پہنچ جاتی ہے کیونکہ مولوی تو ان احکام کے بتلانے والے ہیں کہ شریعت میں یوں ہے تو ان کے بتائے ہوئے احکام کا انکار کرنا درحقیقت شریعت ہی کا انکار ہے مگر خیر ان صاحبوں نے اپنے ارادہ سے شریعت کا انکار نہیں کیا بلکہ یوں سمجھا ہے کہ یہ احکام شریعت کے ہیں ہی نہیں یہ مولویوں کا اختراع ہے اس وجہ سے صریح فتویٰ سے بچ گئے غرض ان صاحبوں نے مولویوں کو بیچ میں تختہ مشق بنا لیا اور یوں کہتے ہیں ارے میاں بھلا یہ بھی کوئی مسئلے ہیں کہ یوں کھاؤ یوں پیو یوں رہو یوں لین دین کرو یہ تو ہماری مصلحت اور ہمارے معاملات ہیں جیسا مقتضائے وقت دیکھو کر لو، زمانہ بدلتا جاتا ہے ضرورتیں بھی بدلتی جاتی ہیں جس طرح سے ضرورت پوری ہو وہی کر لینا چاہیے۔ غرض عادات اور تمدن اور

معاشرت کے متعلق ان لوگوں کا خیال یہ ہے کہ شریعت کو ان باتوں سے کوئی تعلق نہیں شریعت تو دین کا نام ہے اور یہ باتیں دنیا کی ہیں اس میں شریعت کو کیوں داخل لیا۔ ہمیں اپنی دنیا کا اختیار ہے جیسے چاہیں ویسے کریں۔ اس بارہ میں ایسے ایسے مقالات ہیں جس میں کسی تاویل کی گنجائش نہیں ان کا صاف مطلب یہی ہے کہ دین اور شریعت منحصر ہے عبادات میں اور عبادات کے سوا کوئی چیز دین میں داخل نہیں یہ گویا مولویوں کی گھڑت ہے کہ سب چیزیں دین میں داخل کر دی ہیں اور ہر کام میں ایسے ایسے فتوے نکال دیئے ہیں اور ایسی ایسی قیدیں لگا دیں کہ آدمی کوئی کام دنیا کا کر ہی نہ سکے دین کا نام لگا کر دنیا کو غارت ہی کر دیا اور قوم کو ترقی سے روک دیا تمام قومیں ترقی کرتی چلی جاتی ہیں اور مسلمان روز بروز تباہ اور غارت ہوتے چلے جاتے ہیں مگر ہمارے پیشواؤں کو اس بات کی حس ہی نہیں کہ قوم کی کیا حالت ہے، بھوکے مرجاؤ، روپیہ مت کماؤ۔

الٰہ آباد میں ایک بیرسٹر نے ایک مولوی صاحب سے کہا تھا کہ حضرت ذرا قوم کی حالت بھی تو دیکھیے سود کو حرام تو کہے جاتے ہو مگر یہ بھی تو دیکھو کہ مسلمان کس حالت کو پہنچ گئے تمام دوسری قومیں اس کی بدولت ترقی کرتی چلی جاتی ہیں اور تم مسئلے ہی بگھارے جاتے ہو اس سود کو تو نظر ثانی کر کے حلال ہی کر ڈالو۔ قرآن میں غور کرو ایسا کیا بالکل ہی حرام ہے۔ مولوی صاحبان غور نہیں کرتے سود کے حرام ہونے کی تو کوئی وجہ ہی نہیں مولوی صاحب نے کہا توبہ کرو توبہ۔ مولوی کیا حرام کرتے اللہ نے حرام کیا ہے۔ قرآن میں صریح حرمت کی آیت موجود ہے، اب بیرسٹر صاحب آہستہ آہستہ منہ پر طمانچے مارنے لگے کہ اللہ توبہ اللہ توبہ، اگر قرآن میں واقعی حرام ہے تو بھائی میں توبہ کرتا ہوں، خدا کی قسم میں تو سمجھتا تھا کہ یہ مولویوں ہی کا فتویٰ ہے یہ صاحب بمبئی کے میمن تھے انہوں نے غنیمت ہے اظہار ندامت تو کیا بہت ایسے موجود ہیں جن کو نصوص سن کر بھی اپنی جہالت پر اصرار ہے اور دیدہ و دانستہ آیات کا انکار ہے حاصل ان سب کا یہی ہے کہ ان لوگوں نے دین نام کہا ہے صرف عبادات کا اور تمدن اور معاشرت اور عادات کے متعلق یوں کہتے ہیں کہ اس میں شریعت کو کیا دخل؟

مسئلہ تشبہ:

کہتے ہیں کہ لیجیے صاحب تشبہ کا بھی ایک مسئلہ نکل آیا ہے کہ ایسی صورت مت بناؤ ایسے کپڑے مت پہنو، ارے میاں! یہ بھی کوئی شریعت کی بات ہوئی یہ بھی کوئی خدا کا کام ہے خدا کو خدا کہنا، رسول کو رسول ماننا یہ تو دل کے متعلق ہے اگر کپڑے کسی نے ایک طرح کے چھوڑ کر دوسری کی طرح کے پہن لیے تو کیا دل سے خدا کو بھلا دیا کیا اسلام نام کپڑوں کا ہے اگر ایسا ہے تو چاہیے کہ کسی مسلمان کو کوئی ننگا

کردے تو بس وہ مسلمان نہ رہے کیونکہ اسلام تو نام کپڑوں کا تھا اور وہ اتر گئے تو اسلام بھی اتر گیا مولویوں نے بھی خوب گھڑی ہے یہ حدیث کہیں سے نکال لی ہے **من تشبه بقوم فهو منهم.** (سنن أبي داود: ۴۰۳۱) (جس نے کسی قوم سے شباہت اختیار کی پس وہ ان میں سے ہے)

میں کہتا ہوں کہ جب جرمن اور برطانیہ میں لڑائی تھی اور برطانیہ کا سپاہی وردی جرمن کی پہن کر لڑائی میں کھڑا ہو تو اس کو برطانیہ کے افسر کس نظر سے دیکھیں گے کیا اس کے فعل کو جائز رکھیں گے یا منع کریں گے اگر منع کریں گے تو میں پوچھوں گا کہ اس کی بناء **من تشبه بقوم فهو منهم** کے سوا کیا ہے معلوم ہوا کہ یہ ایسی بات ہے کہ اہل دنیا کے نزدیک بھی مسلم ہے اور کوئی قوم دوسری قوم کی وضع بنانے کو پسند نہیں کرتی تو یہ مسئلہ عقلی ہوا اگرچہ حدیث بھی اس کے موافق مل گئی تو اس کو نہ ماننا عقل کے بھی خلاف ہے اور نقل کے بھی۔

اب میں کہوں گا کہ افسوس اور حیرت ہے کہ حکام مجازی کو تو یہ کہنے کا حق ہو کہ **من تشبه بقوم فهو منهم** اور حق تعالیٰ کو یہ کہنے کا حق نہ ہو، ذرا تو غور کیجئے یہ ایک تشبہ کے متعلق مختصراً عرض کیا گیا۔ تمام عادات اور معاشرات اور تمدن کے متعلق اسی طرح کہا جا سکتا ہے بہرحال اس فریق کے خیال میں دین منحصر ہے صرف عبادات میں اور موت و حیات میں اس کو کوئی دخل نہیں ہے اس خیال کی تردید کرنے کے لئے آیت میں **محیای ومماتی** کو صراحۃً بڑھا دیا جس کا حاصل یہ ہوا کہ دین کو صرف صلوٰتی اور نسکی میں منحصر مت سمجھو بلکہ محیای اور مماتی یعنی موت اور حیات کو بھی ہمارا ہی سمجھو جیسے عبادات میں ہم کو ہر قسم کے تصرف کا اختیار ہے جس نماز میں چاہا چار رکعت رکھ دیں اور جس میں چاہا تین رکھ دیں اور جس میں چاہا دو رکھ دیں اسی طرح ہم کو اختیار ہے حیات اور موت کے احکام میں بھی تصرف اور دخل دینے کا اختیار ہے پس جس طرح ہم کہیں اسی طرح زندگی بسر کرو اور بعد موت کے بھی جس طرح ہم کہیں اسی طرح عمل کرو یہ توجیہ اس صورت میں ہے کہ محیای ومماتی سے احکام موت اور حیات کے مراد ہوں۔

احکام شرع اور مصالح دنیوی:

اور اگر محیای ومماتی سے مراد موت اور حیات کے احکام نہ ہوں بلکہ خود موت اور حیات مراد ہو تو اس صورت میں ایک دوسرے مذاق کے موافق دوسرا نکتہ ہوگا وہ مذاق یہ ہے کہ بعض لوگ اس خیال کے بھی ہیں کہ موت اور حیات اور جو کچھ بھی دنیا میں ہوتا ہے وہ سب حق تعالیٰ کے حکم سے ہی ہوتا ہے اور ہر طرح کے تصرف کا حق حق تعالیٰ کو حاصل ہے لیکن عبادات اور احکام میں تصرف کا

اختیار حق تعالیٰ کے لئے نہیں سمجھتے۔

اس سے کوئی تعجب نہ کرے، اس خیال کے لوگ بھی موجود ہیں جیسا کہ آگے معلوم ہوگا۔ یہ لوگ وہ ہیں جو احکام کو دبے دبائے مانتے تو ہیں صریح انکار تو نہیں کرتے مگر ان میں تاویل ایسی کرتے ہیں کہ اس کی حقیقت تحریف اور انکار ہے۔ یہ مذاق ان لوگوں کا ہے جو شرعی احکام کی بناء محض دنیوی مصالح پر مانتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے نزدیک اس خیال کو بڑا اچھا خیال سمجھتے ہیں اور دل خوش کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ علیم و حکیم ہیں ان کا ہر حکم مصلحت اور حکمت کے ساتھ ہے کوئی حکم فضول و بے جا نہیں یہ بات بادی النظر میں تو ایسی ہے کہ جو کوئی سنتا ہے ان کا دل دلدادہ ہو جاتا ہے اور ان کی تحریروں اور تقریروں کی تعریف کرنے لگتا ہے کہ دیکھئے وہ حکمتیں بیان کی ہیں، جن سے شریعت کی خوبی دلوں کے اندر اتر جاتی ہے اور نقلی باتوں کو عقلی کر کے دکھا دیا ہے۔ یہ بات ہمارے علماء کو بھی نصیب نہیں ہوئی۔ علماء کوئی شریعت کا حکم بتلاتے ہیں تو لٹھ سا مار دیتے ہیں، مخاطب کی سمجھ میں آوے یا نہ آوے اور یہ لوگ اس کو دل میں اتار دیتے ہیں اور اس کو منوا دیتے ہیں کہ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔

یہ بات صورۃً تو اس قدر اچھی ہے مگر حقیقت اس کی سنئے، حقیقت اس کی سوائے اس کے کچھ نہیں کہ یہ لوگ خدا تعالیٰ کے احکام کو یہ سمجھ کر تسلیم نہیں کرتے کہ حق تعالیٰ احکم الحاکمین اور مالک اور مختار ہیں بلکہ اس وجہ سے ان احکام کے قائل ہوتے ہیں کہ ان احکام میں ان کی بھی کوئی دنیوی مصلحت ہے چنانچہ انہی مصلحتوں کو بیان بھی کرتے ہیں جن کو سن کر بھولے بھالے آدمی عش عش کرتے ہیں اور تعریفیں کرنے لگتے ہیں۔ حاصل ان کے مذاق کا یہ ہے کہ اصل چیز تو دنیوی مصلحت ہے اور اسی قانون فطرت پر احکام مرتب ہیں کیوں کہ فطرت اور طبیعت اپنے مصالح کو خوب جانتی ہے بس خدا کا کام یہ ہے کہ اس کو جاری کر دیا ہے جیسے ایک کلکٹر ضلع میں قانونی احکام کو جو اوپر سے صادر ہوتے ہیں جاری کرتا ہے اور وہ احکام ایسے ہی ہوتے ہیں جو ضلع کی مصلحتوں سے وضع کئے جاتے ہیں لیکن یہ احکام وہ ہیں جن میں کلکٹر کو اختیار ذرا بھی نہیں۔ یہ احکام اوپر سے آئے ہیں کلکٹر اپنے اختیار سے ان میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں کر سکتا اس کو پیش نظر رکھ کر کہہ سکتے ہیں کہ کلکٹر صرف احکام کو جاری کرنے والا ہے احکام کو بنانے والا نہیں ہے۔ بلفظ دیگر محافظ قانون ہے واضع قانون نہیں۔ اور بلفظ دیگر بادشاہ کا نوکر ہے بادشاہ نہیں ان کے اس مذاق پر خدا کی حقیقت بھی یہی رہ جاتی ہے کہ ایک قانون مصالح فطریہ کی موافق معین ہے۔ خدا کا کام اس کا اجراء اور اس کی محافظت ہے خدا کو مخالفت مصالح کا حق نہیں ہے نعوذ باللہ۔

یہی وجہ ہے کہ ان کا طرز عمل یہ ہے کہ اگر ایک وقت تک شریعت کے احکام ان کی مصلحت کے موافق رہے تو ان کو اس طرح تسلیم کیا جس طرح شریعت نے بتلایا تھا اور ایک وقت میں مصلحت کے موافق نہ رہے اور مصلحت بدل گئی تو ان کو بھی بدل دیا اور اسی اصل پر لے آئے جس پر ان کے نزدیک احکام مبنی تھے یعنی مصلحت پر۔۔۔۔۔ صاحبو! خدا کلکٹر کی طرح بے اختیار نہیں ہے بااختیار اور مختار مطلق ہے اور خود بادشاہ اور شہنشاہ ہے کسی کا محکوم نہیں ہے بلکہ حاکم اور احکم الحاکمین ہے۔

اب معلوم ہو گیا ہوگا کہ ان کا وہ جملہ کہ خدا علیم وحکیم ہے اس کا کوئی حکم حکمت سے خالی نہیں اس کی حقیقت کیا ہے۔ صورت اس کی اس قدر اچھی مگر حقیقت اس قدر بری کہ اس سے خدا خدا ہی نہیں رہتا۔ اب یہ بات سچ ہو گئی یا نہیں کہ ان کی تاویل نہیں ہے بلکہ تحریف ہے ان لوگوں کا احکام کو ماننا برائے نام ہے حقیقت میں حکم الٰہی کو ماننا نہیں بلکہ اپنی رائے کا اتباع ہے اور ہوا پرستی ہے۔

اور یہ بالکل اس آیت کا مصداق ہے ارأیت من اتخذ الٰهه' هواه یعنی اس شخص کی حالت دیکھیے جس نے اپنی خواہش اور رائے کو خدا بنا لیا۔ سب کو معلوم ہے کہ دنیا میں کوئی فرقہ اور کوئی گروہ ایسا آج تک نہیں ہوا جس نے کہا ہو کہ میرا خدا میری رائے ہے۔ دنیا میں پتھر پوجنے والے بھی ہوئے آتش پرست بھی ہوئے مگر رائے پرست اور ہوا پرست کسی فرقہ کا نام آپ نے نہیں سنا ہوگا پھر اس آیت میں یہ کس کو فرمایا گیا ہے کہ اس نے اپنی رائے کو خدا بنایا سوا اس کے اور کون مراد ہو سکتا ہے جو اپنی رائے کو خدا کے برابر یا نعوذ باللہ اس سے بھی بڑھ کر سمجھے۔ برابر اور بڑھ کر سمجھنے کے اور کیا معنی ہیں یہی تو معنی ہیں کہ اپنی رائے کو خدا کے حکم کے برابر سمجھے یا اپنی رائے کو خدائے حکم سے بھی مقدم رکھے۔ اب اس گروہ کی حالت کا خود اندازہ کر لیجیے۔ ان کے اقوال بطور جزئیات سنیے۔ یہاں تک نوبت آ گئی ہے کہ مثلاً نماز کا حکم شریعت میں ہے مگر یہ لوگ کہتے ہیں کہ نماز جیسی مولوی بتاتے ہیں یہ مقصود نہیں یہ کیا کہ کبھی کھڑے ہوں، کبھی جھک جاؤ، کبھی سر زمین پر رکھ دو، کبھی بیٹھ جاؤ، کبھی داہنے بائیں منہ پھیر دو۔ یہ مولویوں کی ظاہر پرستی ہے یہ نماز کی صورت تھی بس مولویوں نے اسی کو لے لیا حقیقت کچھ اور تھی اس کو چھوڑ دیا بس ایک لکیر کے فقیر ہو کر رہ گئے وہ حقیقت کیا تھی اصلاح اخلاق کہ ابتدا اسلام میں لوگ وحشی تھے اخلاق کو جانتے ہی نہ تھے۔ عرب کے لوگ بڑے لڑنے والے اور تکبر کے پتلے تھے ان کو اخلاق سکھلانے اور تکبر توڑنے کے لئے نماز کی تعلیم کی گئی تھی اور اس میں ایسے ہی حرکات رکھے گئے تھے جو تکبر کے خلاف ہیں، جھکنا سر زمین پر رکھ دینا ادب اور عاجزی کی صورت بنانا یہ سب تکبر کے خلاف افعال ہیں اس سے

ان میں انسانیت اور اخلاق اور تواضع پیدا ہوگئے۔ بس اصل مقصود یہ تھا اس وقت میں یہ مقصود ان ہی افعال سے حاصل ہو سکتا تھا اس واسطے ان کی تعلیم کی گئی اور اب زمانہ بدل گیا اب تعلیم کا زمانہ ہے اب لوگ وحشی نہیں رہے، اچھے برے کو سمجھنے لگے اخلاق اور تواضع عادت انسانی میں داخل ہوگئے۔ حقیقت شناس کو چاہیے کہ نظر اصل مقصود پر رکھے جب تواضع اور اخلاق داخل عادت ہوگئے ہیں تو اب ان افعال کی کیا ضرورت رہی کیونکہ وہ افعال ذریعہ تھے اور اصلاح اخلاق مقصود تھا سو جب مقصود حاصل ہوگیا تو ذریعہ کی کیا ضرورت باقی رہی۔

اس کی مثال یہ ہے کہ آلو بخارا بخار والے کو قطع صفرا کے لئے دیا جاتا ہے جب صفرا کا قلع قمع ہوگیا تو آلو بخارا کی کیا ضرورت رہی یہ ہم نے کسی کو نہیں سنا کہ صفرا دور ہونے کے بعد تندرستی کی حالت میں بھی آلو بخارا کھائے جاؤ مگر کیا کیجئے کہ مولوی صاحبان نے طبیب کو آلو بخارا دیتے ہوئے دیکھا تھا وہ اب تک برابر دیئے جاتے ہیں اس سے کچھ بحث نہیں کہ طبیب نے کس وقت دیا تھا اور کس ضرورت سے دیا تھا۔ لکیر کا فقیر اسی کو تو کہتے ہیں۔

علی ہذا روزہ کو لیجئے کہ اس سے مقصود قوت بہیمیہ کا توڑنا تھا اور وہ بھوکے رہنے سے ٹوٹتی تھی اس واسطے یہ صورت اختیار کی گئی تھی کہ صبح سے شام تک پیٹ میں ذرہ برابر چیز بھی نہ جانے پائے بی بی سے مطلق نہ بولو عرب کے لوگ اس وقت ایسے ہی سخت مزاج تھے جن کے سختی بدوں اس قدر تشدد کے جا ہی نہیں سکتی تھی اب لوگ کمزور ہیں اور تعلیم کی وجہ سے بھلے برے کو سمجھتے ہیں تعلیم یافتوں کی صحبت میں رہتے ہیں اب قوت بہیمیہ کا غلبہ کہاں اور یوں کسی گنوار غیر تعلیم یافتہ میں ہو تو اس کے توڑنے کے لئے وہی پرانی ترکیب سہی مگر تعلیم یافتوں کو تو اس کی ضرورت نہیں کہ اسی طریق سے روزہ رکھوایا جائے ان کو روزہ کا حکم دینا ہلاک کرنا ہے۔ قویٰ بے چاروں کے تعیم ہی میں ختم ہو چکے اب اور ان کو بھوکا مارو تا کہ جلدی تمام ہو جائیں، خلاصہ یہ کہ روزہ کی حقیقت کیا ہوئی قوت بہیمیہ کا توڑنا اور وہ تعلیم وغیرہ سے حاصل ہے تو روزہ کی حقیقت حاصل ہے لہٰذا لطریق متعارف روزہ کی ضرورت نہیں رہی یہ ان کا روزہ کا حکم ماننا ہے۔

علیٰ ہذا جماعت کی فلاسفی بیان کی جاتی ہے (ان کی فلاسفی ہر چیز میں چلتی ہے) وہ کیا ہے آپس میں میل جول ایک دوسرے کی خبر رکھنا تعلقات پیدا کرنا اس سے تمدن میں ترقی ہوتی ہے ایسی خرافات پیش کر کے کہتے ہیں کہ دیکھئے اسلام نے کیسے کیسے طریقے بتلا دیئے ہیں ترقی کے۔ اور اس پر بڑے بڑے مضامین لکھے جاتے ہیں تقریریں کی جاتی ہیں اپنے نزدیک اس کو دین سمجھتے ہیں۔

اسلام کے نادان دوست:

اور یہ درحقیقت دین کو غارت کرنا ہے اور ہلاک کرنا۔ یہ ان کی خدمت دین اور خیر خواہی ایسی ہے جیسے ایک ریچھ نے اپنے مالک کی خدمت کی تھی۔ قصہ اس کا یہ ہے کہ ایک شخص نے ریچھ پالا تھا اور اس کو یہ تعلیم دی تھی کہ جب وہ سوتا تو ریچھ مکھیاں اڑایا کرتا تھا وہ بے تکلف سوتا اور ریچھ مکھیاں اڑاتا رہتا۔ حسب عادت ایک روز وہ شخص سو رہا تھا اور وہ معتمد علیہ خادم اپنی خدمت پر تعینات تھا کہ ایک مکھی کو اس نے کئی مرتبہ اڑایا مگر بعضی مکھی ضدن ہوتی ہے اڑائے جاؤ مگر وہ دفع ہی نہیں ہوتی وہ لوٹ لوٹ کر اس کی ناک پر آ کر بیٹھتی تھی ریچھ کو غصہ آ گیا اور کہا اب کی مرتبہ آ کر بیٹھ تو تجھ کو ٹھیک کروں اور ایک بڑا پتھر لا کر منتظر بیٹھا جیسے ہی وہ آ کر ناک پر بیٹھی اس نے وہ پتھر پوری طاقت سے کھینچ مارا مکھی تو اڑ گئی پتھر ان کی ناک پر لگا ناک بھی اڑ گئی اور سر کا بھیجا بھی اڑ گیا پس سرٹیفکیٹ تعلیم کا حاصل ہو گیا۔ یہی حالت ان خادمان اسلام کی ہے کہ اپنے نزدیک تو اسلام کی خدمت اور خیر خواہی کرتے ہیں مگر درحقیقت اسلام کی ذبح کنی اور بدخواہی ہوتی ہے جیسے ایک ریچھ نے اپنے نزدیک تو مالک کی خیر خواہی اور خدمت ہی کی تھی کہ اس مکھی کو مارنا چاہا تھا مگر ہو گئی بدخواہی اور دشمنی۔

دوستی بے خرد چوں دشمنی است
حق تعالیٰ زیں چنیں خدمت غنی است

بے عقل کی دوستی دشمنی کی مانند ہے حق سبحانہ وتعالیٰ ایسی خدمت سے غنی ہے۔

ریچھ نے بھلا کرنا چاہا تھا مکھی کا اور ہو گیا بھلا مالک کے سر کا اسی طرح یہ حضرت بزعم خود حق تعالیٰ کے احکام پر سے مخالفین کے اعتراضات کو رفع کرنا چاہتے ہیں کہ یہ احکام خلاف عقل و مصلحت ہیں اور رفع ہو جاتی ہے خدا کی خدائی تو کیا اچھی خدمت ہے کہ مخدوم کی مخدومیت ہی نہیں رہتی اور احکام ہی منہدم و منعدم ہوئے جاتے ہیں۔

ارکان اسلام کی فلاسفی:

چنانچہ اس وقت جس جزئی کا بیان کر رہا ہوں اسی میں دیکھ لیجئے۔ یہ کہتے ہیں کہ جماعت کی فلاسفی یہ ہے کہ حضرت شارع علیہ السلام کو اس سے مقصود یہ ہے کہ مسلمانوں میں پانچ وقت باہم اختلاط ہو ایک دوسرے سے تعلقات بڑھیں اور تبادلہ خیالات ہو اور علوم کی ترقی ہو اور جانے کیا کیا الفاظ ہیں جو اس کی غایت میں بیان کئے جاتے ہیں۔ ہمیں تو ان کے الفاظ یاد بھی نہیں ہوتے (اور خدا کا شکر ہے کہ یاد نہیں ہوتے) ایک محلہ کے اختلاط کے لئے پانچ وقت کی جماعت مقرر ہوئی اور تمام

شہر کے اختلاط کے لئے آٹھ دن میں جمعہ کی نماز مقرر ہوئی اور گاؤں والوں اور شہر والوں کے اختلاط کے لئے عیدین کی نماز مقرر ہوئی جس سے سال بھر میں دو دفعہ تبادلہ خیالات ہو سکتا ہے اور تمام دنیا کے مسلمانوں کے باہم اختلاط کے لئے حج مقرر ہوا تا کہ ایک دفعہ تمام عالم کو تبادلہ خیالات کا موقع ملے اور ہر قسم کے علوم اور فنون جاننے والے آپس میں ملیں اور علوم کو ترقی ہو بس ترقی کی ہوا سر میں ہے وہی ہر جگہ نظر آتی ہے، حج کرنے والے جانتے ہوں گے کہ وہاں کیسا تبادلہ خیالات ہوتا ہے اور کیسی ہمدردی ہوتی ہے ایک کو دوسرے کی خبر بھی نہیں ہوتی وہ سفر ہی ایسا دشوار ہے کہ سب کو اپنی اپنی پڑی ہوتی ہے کوئی ایک دوسرے کے کام نہیں آتا اور کسی کو اپنے ہی قصوں سے فرصت نہیں ہوتی۔

اور یہ عجیب بات ہے کہ حج میں ایسی عبادات رکھی گئی ہیں جن کی وجہ سے کسی سے بات کرنے ہی کا موقع نہیں مل سکتا کچھ تو مشغلے سفر کے رہتے ہیں اور جو وقت ان سے بچے اور فرصت ملے تو اس میں تلبیہ تکبیر تہلیل تسبیح ادعیہ طواف نماز۔ عرفات کو جانا مزدلفہ میں پہنچنا۔ منٰی میں آنا اور وہاں ٹھہرنا۔ قربانی۔ حلق۔ رمی جمار۔ پھر مکہ آنا۔ طواف کرنا وغیرہ، یہ اجزاء حج کے ایسے ہیں کہ جنہوں نے حج کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ ان سے کون سا وقت بچتا ہے جس میں تبادلہ خیالات اور علوم اور فنون کی ترقی کا موقع مل سکے حج کے لئے ان اجزاء کو مقرر کرنا خود ہی بتلا رہا ہے کہ حق تعالیٰ کو مقصود ہی کچھ اور ہے۔ تبادلہ خیالات اور اختلاط مقصود نہیں، وہ مقصود صرف ایک طرف خیال کا مجتمع کرنا اور سب کو ایک جگہ حاضر ہو کر بہیت اجتماعی ایک وحدہ لاشریک لہ کے دھیان میں لگنا ہے تمام اجزاء حج کے اسی پر ہیں۔ انہوں نے اس میں غور ہی نہیں کیا اور خیالی بندشیں کر کے حج کا موضوع لہٗ تبادلہ خیالات کو بنا دیا۔

یہ تو شیخ چلی کا سا قصہ ہو گیا کہ اس نے ذرا سی دیر میں گھر آباد کر لیا تھا۔ قصہ اس کا یہ ہے کہ ایک شیخ چلی تھے مزدوری کیا کرتے تھے ایک روز ایک شخص کا تیل کا گھڑا دو پیسہ مزدوری کے بدلے سر پر رکھ کر لے چلے راستہ میں آپ نے خیال باندھا کہ دو پیسے مزدوری کے ملیں گے تو ان سے دو انڈے خریدیں گے اور ان کو مرغی کے نیچے رکھیں گے۔ اس میں سے ایک مرغی اور مرغا نکلے گا۔ مرغی انڈے دے گی تو بچے نکلواویں گے بس بہت سے مرغی مرغے ہو جاویں گے پھر ان سے انڈے بچے ہوں گے اور بہت مرغی مرغے ہو جاویں گے پھر ان کو بیچ کر ایک بکرا بکری لیں گے پھر ان کی نسل چلے گی ان کو بیچ کر بھینس لیں گے اس کا دودھ گھی بیچ کر بہت سا روپیہ جمع کریں گے۔ ایک مکان بنائیں گے اور وزیرزادی سے شادی کریں گے پھر اس سے لڑکا ہوگا اسے کھلایا کریں گے پھر وہ ذرا بڑا ہو جائے گا ہمارے ساتھ ساتھ پھرا کرے گا پھر وہ ہم سے پیسہ مانگے گا تو ہم کہیں

گے ہشت۔ بس یہ کہنا تھا کہ سر جو ہلا تو گھڑا گر کے ٹوٹ گیا اور تیل والے کا تیل بھی بہہ گیا وہ بہت بگڑا کہ واہ بے یہ کیا کیا میرا ایک روپیہ کا نقصان کر دیا کہنے لگے میاں جاؤ بھی اپنے ایک روپیہ کو لئے پھرتے ہو میرا سارا کنبہ غارت ہو گیا وہ میں کس سے لوں۔ تو جیسا انہوں نے ذرا دیر میں دو پیسہ سے روپیہ اور مال و دولت اور اولاد اور کنبہ سب کچھ بنا لیا تھا اسی طرح ان حضرات نے خیالی بندش کر کے حج میں تبادلہ خیالات بھی خیال کر لیا اور علوم اور فنون اور صنعت اور حرفت اور جانے کس کس چیز کی ترقی کر لی حالانکہ وہاں نہ تبادلہ خیالات ہوتا ہے نہ کچھ بلکہ وہاں تو تبادلہ جنگ وجدال ہوتا ہے کہ وہ اس سے لڑ رہا ہے اس کو اپنی پڑی ہوئی ہے اس کو اپنی پڑی ہوئی ہے۔

دیکھئے عجیب بات ہے کہ حق تعالیٰ نے بھی جن باتوں سے حج میں خاص طور سے ممانعت فرمائی ہے اس میں جدال کا لفظ بھی ہے یعنی حج میں لڑو جھگڑو مت۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حج میں یہ ضرور ہوگا۔

مصالح شرعیہ حکمت ہیں نہ کہ علت:

حضرت یہ سب خیالی بندشیں ہیں نہ نماز اس واسطے ہے جس واسطے آپ نے سمجھ رکھی ہے نہ جماعت اس کے لئے ہے اور نہ حج کی غرض یہ ہے جو آپ نے قرار دے رکھی ہے ان سب کی غرض تو عبادت ہے اور یہ سب اللہ کے راضی کرنے کے لئے ہیں نہ اور کسی کام کے لئے۔

اگر کوئی کہے کہ یہ، مانا کہ یہ سب کام اللہ کے راضی کرنے کے لئے ہیں مگر یہ بھی تو ہے کہ حق تعالیٰ کے احکام دنیا کی مصلحتوں سے بھی تو خالی نہیں۔ تو ان مصلحتوں کو اگر کسی نے بیان کر دیا تو اس میں کیا حرج ہوا ایسا علماء نے بھی تو کیا ہے اور اس بات میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں ان پر تو کوئی اعتراض نہیں کیا جاتا۔۔۔ اور آج کل ایسا کیا جاتا ہے تو اس پر اعتراض ہے۔ اگر نو تعلیم یافتہ ترغیب کے لئے ایسا کرتے بھی ہیں تو کیا حرج ہے؟ میں کہتا ہوں حرج یہ ہے کہ مصلحتوں کے ایسے پیچھے پڑے ہیں کہ بعض وقت کلب میں جانے کو ترجیح دی جاتی ہے نماز اور روزہ پر، نماز کا وقت قضا ہو جائے مگر کلب کے جانے کا وقت قضا نہ ہو اور روزہ نہ رکھا جائے مگر کلب کی شرکت ضرور ہو کیونکہ کلب میں مجمع ہوتا ہے وہاں تبادلہ خیالات ہوتا ہے اور ہر قسم کے علوم و فنون کو ترقی ہوتی ہے اور یہی مقصود تھا ان کے نزدیک نماز اور روزہ سے اور یہ کلب میں بہت سہولت اور آرام و عیش سے تنعم کے ساتھ حاصل ہوتا ہے پھر نماز روزہ کی ان کو کیا ضرورت ہے جس میں بہت سے بکھیڑے کرنے پڑیں پانی لاؤ جا نماز لاؤ سب کو چھوڑ کر ایک طرف کھڑے ہو کر نیند چھوڑو بھوکے مرو اس سے وہی صورت کیوں نہ اختیار کرو جس میں بہت سے مزے ہیں اور کوئی تکلیف نہیں اور اصل مقصود بھی حاصل ہے حضرت یہ

حرج ہے ان مصالح کے بیان کرنے میں۔ علماء کی ریس تو کی جاتی ہے مگر علماء نے کلب کے لئے کون سے دن نماز چھوڑی تھی انہوں نے تو صف قتال میں بھی نماز نہیں چھوڑی۔ علماء نے احکام کی مصلحتیں ضرور بیان کی ہیں اور اس مضمون میں کتابیں لکھی ہیں لیکن انہوں نے مصلحتوں کو حکمت کے درجہ میں رکھا ہے نہ علت کے درجہ میں۔ اور آپ نے ان کو علت قرار دیا ہے یہ فرق ہے آپ کے اور ان کے فعل میں تو اپنے فعل کو ان کے فعل پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے انہوں نے احکام کی بنا مصالح پر نہیں رکھی جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ جہاں وہ مصلحت ہو حکم بھی ہو اور جہاں نہ ہو حکم بھی نہ ہو بلکہ ان مصالح کو حکمت کے درجہ میں رکھا جس کے معنی یہ ہیں کہ اصل بناء تو حق تعالیٰ کے حکم پر ہے۔ ہمارا نفع ہو یا نقصان لیکن چونکہ حق تعالیٰ حکیم ہیں ہر حکم میں کوئی تو حکمت بھی ضرور ہوتی ہے اسی لئے ممکن ہے کہ اس میں فلاں فلاں حکمت ہو مگر اس کے ساتھ اس پر بھی کوئی دلیل نہیں کہ ہر حکم میں وہی حکمت ہو جو ہماری سمجھ میں آوے ممکن ہے کہ کوئی حکمت ایسی ہو جو ہماری سمجھ میں نہ آئی ہو ہم کیا اور ہمارا علم کیا۔ خدا تعالیٰ کی حکمتوں کو سمجھنے کا دعوی وہ کرے جو علم میں بھی نعوذ باللہ خدا کی برابری کا دعوی کرے علم میں تو ہم کچھ بھی نہیں اور حوصلہ رکھیں خدا تعالیٰ کے احکام کی حکمتیں معلوم کر لینے کا یا ان سے حکم کی وجہ پوچھنے کا، حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے ان کاموں کی حکمت بھی ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ جو ہمارے ہی جیسے آدمیوں کے تجویز کئے ہوئے ہیں بہت سے قانونی احکام ایسے ہیں جن کی وجہ ہم کو معلوم نہیں اور ظاہراً ہماری مصلحت کے خلاف بھی ہیں اور بسا اوقات ان سے ہم کو نقصان بھی پہنچ جاتا ہے مگر ان کی وجہ پوچھنے کا کبھی حوصلہ نہیں ہوتا بلکہ دل میں اطمینان ہوتا ہے کہ گو ظاہراً یہ حکم خلاف مصلحت معلوم ہوتا ہے اور ہم کو اس سے کچھ نقصان پہنچا مگر واقع میں اس میں کوئی مصلحت ہوگی اور کوئی ضرورت ہوگی جس کی وجہ سے عقلاء کی ایک جماعت نے اس قانون کو پاس کیا ہے۔

قانون الٰہی کے سامنے حجت:

حیرت کی بات ہے کہ آدمیوں کے بنائے ہوئے احکام پر تو اطمینان ہو اور ان میں کسی تعلیل اور حجت کی ضرورت نہیں حالانکہ ان کے نقصان بھی خود مشاہدہ کر لئے اور خدا تعالیٰ کے احکام پر اطمینان نہ ہو حالانکہ ان کا علیم و حکیم ہونا بھی تسلیم ہے اور ساتھ ہی اس کے ان کا ماں باپ سے زیادہ مہربان اور رؤف و رحیم ہونا بھی مسلم ہے جس کا مقتضا یہ ہے کہ کوئی حکم غیر حکیمانہ ہرگز نہ ہوگا کیونکہ علیم اور حکیم ہیں اور ہمارے واسطے خلاف مصلحت بھی نہ ہوگا کیونکہ مہربان اور رحیم ہیں مگر غضب ہے کہ ان احکام کو ایسی بے قدری کی نظر سے دیکھا گیا کہ کسی اپنے برابر والے کے حکم کو بھی اس نظر سے نہیں

دیکھ سکتے ہر حکم کی وجہ پوچھی جاتی ہے اور اس کی حکمت خود تراش کر اس پر حکم کی بنا کی جاتی ہے اور ایسی تراش خراش کی جاتی ہے کہ وہ حکم بالکل ہی اڑ جاتا ہے اور اس کو کہا جاتا ہے اسلام کی ہمدردی اور طرفداری اور خدمت۔ اگر یہی خدمت اور طرفداری اور ہمدردی ہے تو بس سلام ہے۔

اصل یہ ہے کہ اس ہمدردی کی آڑ میں نفس ان احکام سے آزادی چاہتا ہے اس واسطے نفس نے ان لوگوں کو یہ سمجھایا ہے کہ احکام مقصود نہیں بلکہ مصالح مقصود ہیں بس ان مصلحتوں پر نظر رکھو۔ جس صورت میں وہ پوری ہو جائیں اسی کو حکم الٰہی اور دین سمجھو۔ اب آپ کی سمجھ میں اچھی طرح آ گیا ہوگا کہ آج کل بعض مسلمانوں میں یہ مذاق بھی موجود ہے کہ حق تعالیٰ کو جن تصرف صرف موت وحیات ہی میں ہے احکام میں نہیں احکام اسی قانون کا نام ہے جس کی بنا مصالح پر ہے پس اس کی تردید فرمائی ہے حق تعالیٰ نے لفظ **محیای ومماتی** (میری زندگی اور میری موت) میں اس طرح کہ اول حکم دیا نماز اور عبادات کا جو افعال اختیاریہ ہیں پھر اس کے ساتھ حالات غیر اختیاریہ کو بیان فرمایا تاکہ اس سے ان کی سمجھ میں آ جائے کہ ان کے اختیار کو کہاں تک دخل ہے وہ حالت غیر اختیاری موت اور حیات ہے **محیای ومماتی** کے یہی معنی ہیں اس میں بتلا دیا ہے کہ تم اپنے حالات اختیاریہ میں تصرف کرنا چاہتے ہو تو دیکھ لو کہ تمہاری دو حالتیں غیر اختیاری اور بھی ہیں۔

تکوینیات میں حق تعالیٰ کا تصرف:

اے آزاد لوگو! اس میں غور کرو کہ تم کو ان دونوں حالتوں میں کسی قسم کا اختیار ہے۔ معلوم ہوگا کہ ان میں ذرا بھی اختیار نہیں ہے ان دونوں میں پورا اختیار اور تصرف حق تعالیٰ ہی کو حاصل ہے تو اس نظیر سے سمجھ لو کہ دوسری حالت میں بھی اختیار ہم ہی کو ہونا چاہیے کہ ہم جو چاہیں حکم دیں اور جس چیز سے چاہیں منع کریں۔ دیکھو وہ حالت غیر اختیاری یعنی موت اور حیات کس طرح ہمارے قبضہ میں ہے کہ کسی تمہاری مصلحت اور مضرت کے تابع نہیں ایسے ہی اس حالت اختیاریہ کو بھی سمجھو۔ اور اس میں تعلیلیں اور تاویلیں مت نکالو حالت تکوینی اور تشریعی دونوں ہم نے اپنے قبضہ میں رکھی ہیں اگر تم حالت تشریعی میں آزادی چاہتے ہو تو تکوینی میں بھی کر کے دکھاؤ لیکن وہاں آزادی نہیں چلتی تو امور تشریعیہ میں کیوں آزادی کا دم بھرتے ہو ہمارے اختیار دینے پر مت بھولو ہم نے تم کو فی الجملہ اختیار امتحان کے لئے دیا ہے دیکھیں کون ہمارا حکم اپنے قصد سے بے چون وچرا مانتا ہے اور کون اس میں تاویلیں کرتا ہے اختیار دینے کا یہ مطلب نہیں کہ تم کو ہمارا حکم بدل دینے کا بھی اختیار ہے تم اس درجہ کے فاعل مختار نہیں ہو۔

اس کے ثبوت کے لئے اپنے اختیار کو اس حالت میں دیکھو جس میں ہم بالجبر حکومت کرتے ہیں اس میں غور کر کے تم کو معلوم ہو جائے گا کہ تم بالکل بے بس ہو ذرہ برابر تم کو اپنے اوپر اختیار نہیں کبھی ہم ایک شخص کو مارتے ہیں ایسی حالت میں کہ اس کی صدہا مصلحتیں فوت ہو جاتی ہیں اس نے کیا کیا منصوبے دل میں گانٹھ رکھے تھے کہ یوں کروں گا اور یوں کروں گا جب ہمارا حکم پہنچا ان سب کو ناتمام چھوڑ کر اور ایک دم قطع کر کے چل دینا پڑا ہزاروں آدمی روتے اور کلیجہ پھاڑتے رہ گئے کسی سے یہ نہ ہو سکا کہ ایک لحہ کی بھی مہلت دلا دے بچے روتے رہ گئے بی بی سر پیٹتی رہ گئی احباب منہ تکتے رہ گئے اور ہم نے انہی سب کے ہاتھوں بدلیا اے انسان تو اس سے سمجھ لے کہ تجھ کو اپنے اوپر قبضہ نہیں تو بالکل دوسرے کے قبضہ میں ہے۔

لائی حیات آئے قضا لے چلی، چلے   اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

یہ موت کی حالت ہے زندگی میں دیکھئے کہ انسان کو اپنے اوپر اتنا بھی اختیار حاصل نہیں کہ جو چیز بھول جائے اس کو پھر اپنے اختیار سے یاد کر لے یا جو چیز یاد ہو اس کو اپنے قصد سے بھلا دے جب اپنے کسی تکوینی حالت پر اتنا بھی قبضہ اور اختیار نہیں تو دوسری حالت پر یعنی تشریعی پر کیوں اختیار سمجھتے ہو اور اس میں کیوں آزادی ڈھونڈتے ہو اس میں بھی اپنے آپ کو ہمارے تصرف میں سمجھو اور جو کہیں بے چون وچرا مان لو۔ یہ نکتہ محیای ومماتی کے اضافہ میں کہ ایک ایسی نظیر بتلا کر کہ جس میں آزاد نہ ہونا مسلم اور مشاہد ہے سمجھا دیا کہ دوسری حالت میں بھی اپنے آپ کو آزاد نہ سمجھو اور احکام شرعیہ میں تعلیلیں اور حجتیں نہ نکالو اور مصلحتیں نہ تراشو جیسا کہ احکام تکوینیہ میں تمہاری تراشی ہوئی کوئی مصلحت نہیں چلتی اور نہ کسی تعلیل اور حجت سے کام نکلتا ہے۔

آیت کی بلاغت:

حاصل یہ کہ مقصود بیان کرنا اس بات کا ہے کہ ہمارے حالات اختیاریہ وغیر اختیاریہ سب اللہ تعالیٰ کی ملک ہیں اس کے واسطے اتنے لمبے الفاظ کو کیوں اختیار کیا۔ **ان صلوتی ونسکی ومحیای ومماتی** (بیشک میری نماز، میری عبادت، میری زندگی اور میری موت) کیوں کہ اس کے لئے کوئی مختصر لفظ بھی ہو سکتا تھا۔ مثلاً کوئی ایسا لفظ جس کے معنی یہ ہوتے کہ ہمارے حالات اللہ کے ملک ہیں کافی ہو جاتا تو اس کو اتنا طول کیوں دیا اس کے لئے دو توجیہیں بیان کی گئی ہیں۔ خلاصہ ان کا یہ ہے کہ لوگوں کے مذاق مختلف ہیں ایک مذاق یہ ہے کہ عبادات تو حقوق اللہ ہیں اور ان میں حق تعالیٰ کو تصرف کا اختیار ہے اور اس کے احکام کا نام دین ہے رہے احکام موت وحیات یعنی

معاشرت اور تمدن تو ان سے دین کو کچھ علاقہ نہیں اس مذاق کی تردید کے لئے لفظ **محیای ومماتی** بڑھایا۔ اس صورت میں **محیای ومماتی** سے مراد احکام حیات وموت ہوں گے اور دوسرا مذاق یہ ہے کہ موت اور حیات میں تو تصرف حق تعالٰی کا مانتے ہیں کیونکہ مشاہدہ ہے اور یہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ اس صورت میں **محیای ومماتی** سے نفس حیات اور موت مراد ہے احکام حیات وموت مراد نہیں مگر یہ لوگ احکام اور عبادات میں حق تعالٰی کے تصرف کو نہیں مانتے اور اس کے معنی میں نے بیان کر دیئے ہیں کہ گو زبان سے اس تصرف کا انکار نہیں کرتے اور حق تعالٰی کو حاکم مانتے ہیں مگر ان احکام کی بنا اپنی اختراعی مصالح پر مانتے ہیں جس سے نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ حق تعالٰی کو کسی حکم کا اختیار نہیں ہے بلکہ حکم ہمیشہ مصلحت کے موافق ہوتا ہے اور مصلحت ہی پر احکام کی بناء ہے اس مذاق کی تردید کے لئے **صلوتی ونسکی** کو بڑھایا تو ایک توجیہ پر **محیای ومماتی** کو بڑھایا اور ایک توجیہ پر **صلوتی ونسکی** بڑھایا تو کیا مزہ کا مضمون ہو گیا جس کے ہر جملہ سے ایک ایک مذاق فاسد کی تردید ہو رہی ہے یہ بات اختصار میں حاصل نہ ہوتی اس واسطے ایجاز کو چھوڑ کر اطناب کو اختیار کیا گیا۔ حاصل یہ ہے کہ ان چاروں اجزاء میں حق تعالٰی کو تصرف کا حق ہے ان چاروں کے نام یہ ہیں **صلوتی** اور **نسکی** اور **محیای** اور **مماتی**۔ اس کا خلاصہ دو لفظوں میں بھی آ جاتا ہے وہ دو لفظ یہ ہیں حالات اختیاریہ وغیر اختیاریہ۔ اختیاریہ میں نماز وغیرہ آ گئیں اور موت وحیات غیر اختیاریہ میں غرض ہمارے تمام حالات حق تعالٰی کے قبضہ میں ہیں اور ان کو ہر قسم کے تصرف کا حق حاصل ہے میں نے بیان کیا تھا کہ اسلام کامل کے دو جزو ہیں، ایک یہ کہ ان چاروں باتوں میں حق تعالٰی کے تصرف کو ماننا یہ تو فعل حق تعالٰی کا ہے دوسرے اس تصرف کو ماننے کا حق ادا کرنا جس کا نام انقیاد ہے یہ فعل بندہ کا ہے اس کے لئے ضرورت تھی دونوں اجزاء کی حقیقت سمجھنے کے سو اب تک ان چاروں چیزوں کو بیان کیا گیا ہے جن میں حق تعالٰی کا تصرف ماننے کی ضرورت ہے ابھی حقیقت تصرف کا بیان نہیں ہوا جس کا وعدہ اوپر اس جملہ میں کیا گیا ہے کہ اس کی تفصیل عنقریب آتی ہے۔

حق تعالٰی کی تصرف کی حقیقت:

اب حسب وعدہ اس کے بیان کرنے کی ضرورت ہے تب ایک جزو پورا ہوگا اس کے بعد دوسرے جزو کو جو کہ انقیاد ہے اور وہ بندہ کا فعل ہے بیان کیا جائے گا۔

اب اس تصرف کی حقیقت کو سمجھئے کہ حق تعالٰی نے ان چار چیزوں میں تصرف کیا کیا؟ ان

چاروں کا خلاصہ دولفظ میں ہے یعنی حالت تکوینی اور تشریعی، سو اب سمجھئے کہ حق تعالیٰ نے تکوینی میں کیا تصرف کیا اور تشریعی میں کیا تصرف کیا تکوینی میں تو یہ تصرف کیا ہے کہ موت اور حیات اور صحت اور مرض کو اور جو کچھ ان کے اسباب ہیں مثلاً گرمی سردی بارش وغیرہ ان سب کو اپنے قبضہ میں رکھا ہے ان میں جو چاہتے ہیں تصرف کرتے ہیں جس کو چاہتے ہیں موت دے دیتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں زندہ کرتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں تندرستی دیتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں مرض دیتے ہیں جب وہ چاہتے ہیں گرمی ہو جاتی ہے اور جب وہ چاہتے ہیں سردی ہو جاتی ہے اور جب وہ چاہتے ہیں بارش ہو جاتی ہے اور جب وہ چاہتے ہیں بارش نہیں ہوتی۔ غرض جتنی تکوینیات ہیں سب میں تصرف ان ہی کا ہے انسان کو ان میں کوئی حق تصرف کا حاصل نہیں۔

لوگ یہ سن کر تعجب کرتے ہوں گے کہ کیا ان امور میں ہم کو کسی قسم کا تصرف حاصل نہیں اور خصوصا آج کل کے عقلاء تو اس بات کو مانتے ہی نہیں کہ ہم کو تکوینیات میں تصرف کا اختیار نہیں کیونکہ آج کل ایجادوں کی کثرت ہے ان میں کامیابی دیکھ دیکھ کر عقلاء کو یہ خیال ہو گیا ہے کہ کوئی تصرف ایسا نہیں جو ہمارے اختیار میں نہ ہو چنانچہ دیکھا بھی جاتا ہے کہ بہت سے وہ کام جو انسانی قوت سے باہر سمجھے جاتے تھے آج کل ذرا اشارہ میں ہو جاتے ہیں پھر کیسے مان لیا جائے کہ ہم کو کسی قسم کے تصرف کا اختیار نہیں۔

تصرف انسانی کی حقیقت:

اس کا جواب سنئے آپ نے غور نہیں کیا جو تصرفات آپ کے اختیار میں ہیں اور جن کاموں کو آپ بزعم خود ذرا اشارہ میں کر لیتے ہیں ان میں آپ نے تصرف کیا کیا اور آپ کی قدرت کو کتنا دخل ہے آپ کا تصرف ان میں صرف ترکیب وتحلیل کا ہے ایک چیز کو ایک چیز کے ساتھ ملا دیا اور ایک اثر پیدا ہو گیا یا ایک چیز کو دوسری چیز سے الگ کر دیا اور وہ اثر جاتا رہا اس میں آپ کا کام صرف ملا دینا یا الگ کر دینا ہے باقی اثر کا پیدا ہو جانا یا اثر کا جاتا رہنا یہ آپ کے اختیار سے نہیں ہوتا جیسا کہ میں بیان کروں گا اس میں دھوکہ اس وجہ سے ہوا ہے کہ ترکیب اور تحلیل پر اثر کا ترتب دائمی دیکھا جاتا ہے چنانچہ ہم کسی سے یہ کہیں کہ آگ بجھانا تیرے اختیار میں نہیں تو ہرگز نہیں مانے گا اور کہے گا کہ لاؤ میں ابھی بجھا کر دکھا دوں اور لا کر پانی ڈال دے گا فوراً آگ بجھ جائے گی تو چونکہ ہمیشہ یہی دیکھا ہے کہ پانی ڈالنے سے آگ بجھ جاتی ہے اس واسطے عام طور پر ذہنوں میں یہ سما گیا کہ آگ بجھانا ہمارے اختیار میں ہے حالانکہ یہ دھوکا ہے۔

میں اس کو ثابت کرتا ہوں کہ آگ بجھانا آپ کے اختیار میں نہیں کیونکہ عقلی مسئلہ ہے، القدرۃ

تعلق بالضدین یعنی قدرت کی حقیقت یہ ہے کہ اس کا تعلق مقدور کی دونوں طرفوں سے ہوتا ہے عدم سے بھی وجود سے بھی یعنی کسی کام پر قدرت جب کہہ سکتے ہیں کہ وہ اور اس کی ضد دونوں ہمارے اختیار میں ہوں جب یہ حالت ہو تو کہا جائے گا کہ ہم کو اس کام پر قدرت ہے مثلاً آنکھ کھول کر دیکھنا یہ ہماری قدرت میں ہے کہ اس کے دونوں جانب یعنی دیکھنا اور نہ دیکھنا ہمارے اختیار میں ہیں ہم چاہیں تو دیکھیں اور نہ چاہیں تو آنکھ بند کرلیں اس وقت کہا جائے گا کہ ہم کو دیکھنے پر قدرت ہے یا پیسہ سائل کو دینا کہ ہم کو اس پر اور اس کی ضد پر دونوں پر قدرت ہے چاہیں دیں اور چاہیں نہ دیں اس صورت میں کہا جائے گا کہ ہم کو پیسہ دینے پر قدرت ہے غرض قدرت کے لئے شرط یہ ہے کہ مقدور اور اسکی ضد دونوں کے ساتھ اس کا تعلق ہو۔

اب سنئے ہم یہ مانتے ہیں کہ آگ پر پانی ڈالنے سے آگ بجھ جاتی ہے اور آپ اس طرح آگ کو بجھا سکتے ہیں مگر آپ کو یہ دیکھنا چاہیے کہ آگ پر پانی ڈالنے سے آگ کا بجھ جانا یہ درحقیقت دو کام ہیں ایک پانی ڈالنا اور ایک آگ کا بجھ جانا۔ پانی ڈالنا بے شک آپ کا فعل اختیاری ہے اور اس پر آپ کو ضرور قدرت ہے کیونکہ اس کا تعلق ضدین سے ہوسکتا ہے کہ چاہیں آپ پانی ڈالیں اور چاہے نہ ڈالیں۔ اور دوسرا کام یعنی آگ کا بجھ جانا یہ آپ کا فعل اختیاری نہیں ہے کیوں کہ قدرت کے معنی اس پر صادق نہیں آتے قدرت کے معنی اس پر جب صادق آتے جبکہ آپ کو اتنا اختیار ہوتا کہ پانی ڈالنے کے بعد اگر آپ چاہیں تو آگ بجھے اور اگر نہ چاہیں تو باوجود پانی ڈالنے کے بھی نہ بجھے اور ایسا ہے نہیں کیونکہ پانی ڈالنے کے بعد آگ بجھ ہی جاتی ہے خواہ آپ چاہیں نہ چاہیں تو قدرت کا اطلاق اس پر کیسے ہوگا اور یہ کیسے کہا جاسکے گا کہ آگ کا بجھنا آپ کا فعل اختیاری ہے ذرا غور سے کام لینا چاہیے جس کام کو آپ تحقیق کی نظر سے دیکھیں گے اس سے زیادہ نہیں پائیں گے کہ آپ کو اختیار ترکیب وتحلیل اور اسباب کے جمع کرنے کا ہے ہاں عادت اللہ یوں جاری ہے کہ ترکیب وتحلیل اور اسباب کے جمع کرنے کے بعد اس کام کو وہ اپنی قدرت سے پورا کردیتے ہیں چونکہ اس کو ہمیشہ دیکھتے ہیں اس واسطے سمجھ لیا ہے کہ تحلیل وترکیب کا نتیجہ بھی ہمارے اختیار میں ہے اور اسباب پر مسببات کا ترتب بھی ہمارے قبضہ میں ہے حالانکہ یہ غلط ہے جیسا کہ دلیل سے ثابت کیا گیا۔

اسباب کی حقیقت:

یہ ایسا دھوکہ ہے جیسے کوئی شخص چوکیدار کو سرخ جھنڈی دکھاتے ہوئے اور اس سے ریل کو رک

جاتے ہوئے بار ہا بلکہ علی الدوام دیکھ کر یہ سمجھ لے کہ سرخ جھنڈی میں خاصیت ہے ریل کو روک لینے کی اور یہ ایسی زبردست چیز ہے کہ ریل جیسی زوردار چیز بھی اس کے سامنے کچھ نہیں تو کیا اس کا یہ سمجھنا صحیح ہے ہرگز نہیں بس یہی حالت ہے اسباب کی کہ ان پر ترتب اثر کو دس بیس دفعہ دیکھ کر ان کے معتقد ہو گئے ہیں اور چونکہ وہ اسباب اپنے اختیار میں ہیں لہٰذا اس اثر کو بھی اپنے اختیار میں سمجھ لیا ہے اور یوں کہتے ہیں کہ ہم اس فعل کے فاعل ہیں اور ہم آگ بجھانے والے ہیں اور یہ خبر نہیں (ع) کوئی معشوق ہے اس پردہ زنگاری میں۔ آپ کا اختیار صرف اسباب کو جمع کرنے تک ہے آگے اس کام کا ہو جانا دوسرے کے فعل واختیار سے ہے چوکیدار کا کام صرف سرخ جھنڈی دکھا دینا ہے باقی ریل کا رکنا یہ اس وجہ سے کہ ڈرائیور نے اصطلاح مقرر کر رکھی ہے کہ جب چوکیدار سرخ جھنڈی دکھائے گا تو میں ریل کو اپنے ہاتھ سے اور اپنے اختیار سے روک لوں گا۔ سرخ جھنڈی ایسی زوردار چیز نہیں ہے جو ریل جیسی چیز کو روک دے اور آگے چلنے نہ دے بلکہ یہ زور ڈرائیور کے ارادے اور اختیار کا ہے حتی کہ اگر کسی وقت ڈرائیور غلطی سے یا شرارت سے نہ روکے تو سرخ جھنڈی تو کیا چیز ہے چوکیدار خود بھی سامنے آ جائے تو ریل سے پستا ہوا چلا جائے گا۔ ریل کا روکنا اور چلانا یہ کام سب اس کے ہیں جو ریل کے اندر ہے ہم نے اس طرف نظر نہیں اٹھائی اور یہ سمجھ لیا کہ سرخ رنگ میں کچھ طاقت یا خاصیت ہے۔

اسی طرح دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے اس ذات واحد کے تصرف وارادہ سے ہوتا ہے جو ہر چیز کے خالق اور مالک ہیں اور دنیا والوں نے اپنی کوتاہ نظری سے اسباب میں اثر سمجھ لیا ہے۔

عشق من پیدا ومعشوقم نہاں   یار بیروں فتنہ او در جہاں
ماہمہ شیراں ولے شیران علم   حملہ شاں از باد باشد دمبدم
حملہ شان پیدا وناپیدا است باد   آنکہ ناپیدا است ہرگز کم مباد

میرا عشق ظاہر اور میرا محبوب پوشیدہ ہے یار تو جہان سے باہر ہے مگر اس کا تصرف جہان کے اندر ہے اور وہ خود نظر نہیں آتا۔ ہم ایسے شیر ہیں جیسے جھنڈے پر شیر کی تصویر ہوتی ہے اور وہ ہر وقت ہوا سے ادھر ادھر اڑتا ہے۔ ان کا حملہ نظر آتا ہے لیکن حملہ کرنے والی ہوا نظر نہیں آتی۔

اس تقریر سے یہ سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ اسباب کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ حق تعالیٰ نے گویا یہ اصطلاح مقرر کر رکھی ہے کہ جب تم پانی ڈالو گے تو ہم اپنی قدرت مستقلہ سے آگ کو بجھا دیں گے چنانچہ وہ ہمیشہ ایسا ہی کرتے ہیں تمام اسباب کی یہی حقیقت ہے کہ حق تعالیٰ گویا ایک اصطلاح

مقرر کردی ہے کہ فلاں سبب کی مباشرت کی جاوے گی تو فلاں چیز کا وجود یا فلاں چیز کا عدم مرتب کردیا جائے گا ہم اس کو دیکھ کر سمجھ گئے کہ اس سبب میں یہ اثر ہے کہ اس سے وہ چیز موجود یا معدوم ہو جاتی ہے اس کا نام خاصیت رکھا ہے اور کہتے ہیں پانی میں خاصیت ہے آگ کے بجھانے کی اور آگ میں خاصیت ہے جلا دینے کی اور خاصیت کے معنی یہی لیے جاتے ہیں کہ ان میں ذاتی اثر ہے اس کی طرف کبھی توجہ نہیں ہوتی کہ ان میں ذاتی اثر کہاں سے آیا اگر اس اثر کو اسی حد تک رکھتے جتنا جھنڈی کا اثر ریل کے رک جانے میں سمجھتے ہیں تو مضائقہ نہ تھا کیونکہ اس نظیر میں جھنڈی کو فاعل یا موثر کوئی نہیں سمجھتا۔ پانی اور آگ کے بارہ میں اس کے خلاف عکس ہے کہ عام طور سے ذہنوں میں یہی بات بیٹھی ہوئی ہے کہ پانی میں آگ کو بجھا دینے کی خاصیت ہے اور جب یہ لفظ کہتے ہیں کہ پانی نے آگ کو بجھا دیا یا آگ نے فلاں چیز کو جلا دیا تو ذہن میں متبادر معنی یہی آتے ہیں کہ ان میں خاصیت اور اثر ذاتی ہی ہے اس کی طرف ذہن کم جاتا ہے کہ یہ کام کسی اور کے کرنے سے ہوتا ہے اگرچہ بحمداللہ مسلمان یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ کوئی کام بلا اذن حق تعالی کے نہیں ہوسکتا۔

خوارق اور اسباب:

اور یہی وجہ ہے کہ جب ان کے سامنے کسی خرق عادت کا ذکر ہوتا ہے تو ان کا انکار نہیں کرتے اور دل سے اقرار کرلیتے اور مان لیتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ خدا کی بڑی قدرت ہے لیکن اب ایک جماعت مدعیان اسلام کی ایسی بھی موجود ہے جو زبان سے تو گو خدا کی قدرت کا اقرار کرتے ہیں مگر اسباب کے موثر ہونے کا خیال ان کے ذہنوں میں اس درجہ مرکوز ہے کہ یہ کہنا کچھ بیجا نہیں کہ وہ اسباب کو موثر بالذات مانتے ہیں اور اس درجہ میں ہرگز نہیں سمجھتے جس درجہ میں جھنڈی کو ریل کے رک جانے میں دخیل سمجھتے ہیں۔

اس خیال کا پتہ ان کے الفاظ سے اور برتاؤ سے چلتا ہے جھنڈی کے بارہ میں تو کبھی یہ لفظ نہیں کہتے کہ اس نے ریل کو روک دیا اور اسباب کے بارہ میں یوں ہی کہتے ہیں فلانے نے یوں ترقی کی اور یوں عزت حاصل کی اس وقت اگر کوئی ان کے سامنے یوں کہہ دے کہ وہ کیا ترقی کرتا بلکہ اس کو خدا تعالی نے ایسی ترقی اور ایسی عزت دی ہے گو زبان سے انکار تو نہ کریں گے کیونکہ آخر مسلمان ہیں اور خدا کو مانتے ہیں لیکن اس لفظ سے ان کو کچھ بشاشت نہ ہوگی بلکہ گونہ انقباض ہوگا اس کی وجہ کیا ہے سوائے اس کے کہ ان کی نظر اسباب پر ہے قدرت پر نہیں۔

اور اس کی نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ یہ لوگ خوارق و معجزات انبیاء کا بھی انکار کرنے لگتے

ہیں اور ان میں ایسی بعید بعید تاویلیں کرتے ہیں جو بیچ مچ تحریف ہے اس کی بناء سوا اس کے کیا ہو سکتی ہے کہ اسباب کے لئے مسببات کو لازم لاینفک مانتے ہیں۔ دنیا کے اسباب کی تاثیرات کو دیکھ کر حق تعالیٰ کی طرف خیال نہیں جاتا بلکہ اس طرف خیال جاتا ہے کہ اس سبب میں یہ خاصیت اور یہ اثر ہے میں پوچھتا ہوں کہ اگر آگ میں ذاتی خاصیت ہے جلا دینے کی تو اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کیوں نہ جلایا؟ اس وقت یہ خاصیت کہاں چلی گئی تھی۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آگ اپنی ذات سے جلانے والی چیز نہیں ہے بلکہ جلانے والی چیز کوئی اور ہے اور آگ کا وجود صرف علامت ہے اس بات کی کہ اب وہ فاعل جلانے کا فعل کرے گا جیسے کہ سرخ جھنڈی خود روکنے والی نہیں بلکہ سرخ جھنڈی کا دکھائی دینا علامت ہے اس بات کی کہ اب ڈرائیور ریل کو روک دے گا چنانچہ ادھر جھنڈی ہلی ادھر ریل رک گئی ایسے ہی ادھر آگ روشن ہوئی اور ادھر جلانے کا اثر ظاہر ہوا بس دیکھنے والوں نے سمجھ لیا کہ آگ میں خاصیت ہے جلا دینے کی حالانکہ جس طرح ریل کا رکنا ڈرائیور کے ارادہ سے ہوا ہے اسی طرح آگ سے جل جانا خالق نار کے ارادہ سے ہوا ہے۔

دوام ترتب تاثیر کی حقیقت:

یہ دھوکہ دوام مرتب مسبب علی السبب سے ہوا ہے مگر یہ کوئی بات نہیں ہے کیوں کہ دوام وجود شی مع الشی مستلزم صدور فعل عن غیر الفاعل کو نہیں ہے ایک شخص ایک مکان میں بیٹھ کر کوئی کام ہمیشہ کرتا ہو تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کام کی نسبت مکان کے دیواروں اور اینٹوں کی طرف کی جائے حالانکہ دوام یہاں بھی ہے جب تک وہ فعل ہوا ہے دیواریں اور اینٹیں برابر موجود رہی ہیں لیکن کسی بے وقوف سے بے وقوف کو بھی یہ خیال کبھی نہیں آتا کہ شاید یہ کام اینٹوں نے کیا ہو کیونکہ ان میں قابلیت ہی نہیں بلکہ کام کے بارہ میں جب خیال کیا جائے گا تو اسی طرف جائے گا کہ کسی فاعل مختار ذی ارادہ نے یہ کام کیا ہے چاہے کسی فعل کا پتہ نہ چلے مگر یہ کوئی نہ کہے گا کہ ان اینٹوں نے یہ کام کیا ہے بہت سے بہت بعض دفعہ حیران ہو کر رہ جائے گا کہ معلوم نہیں کس نے کیا ہے غرض دوام سے دھوکہ نہ کھانا چاہیے اور خوب سمجھ لینا چاہیے کہ سب تصرفات اللہ تعالیٰ کے ہیں تمام تکوینیات موت و حیات صحت و مرض اور ان کے تمام اسباب جیسے گرمی سردی بارش وغیرہ سب کو حق تعالیٰ نے اپنے قبضہ میں رکھا ہے آپ کو صرف ترکیب و تحلیل کا اختیار دیا ہے جب آپ ترکیب یا تحلیل کرتے ہیں فوراً حق تعالیٰ اس فعل کو موجود کر دیتے ہیں اس وقت بس وہی مثال یاد رکھئے کہ جھنڈی والے کا اختیار صرف جھنڈی دکھا دینا ہے اور ریل کا رک جانا یہ اس کی طاقت سے نہیں ہے بلکہ جھنڈی دکھاتے ہی ریل کا

چلانے والا اس کو روک دیتا ہے اور مجازاً کبھی روکنے کی نسبت جھنڈی کی طرف کر دینا بھی درست ہے سو اس طرح برائے نام اگر افعال کی نسبت اسباب کی طرف بھی کبھی کر دی جاوے تو مضائقہ نہیں مگر دل میں یہی ہونا چاہیے کہ سبب اصلی کوئی چیز نہیں یہ سب تصرفات اللہ تعالیٰ کے ہیں۔

تشریعیات میں حق تعالیٰ کا تصرف:

یہ تو اس تصرف کا بیان ہوا جو حق تعالیٰ نے تکوینیت میں کیا ہے اب تشریعیات میں تصرف سنئے وہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے تمام افعال کے متعلق جیسے نشست برخاست، اکل و شرب۔ چلنا چلنا۔ بات کرنا وغیرہ۔ غرض تمام افعال کے متعلق احکام مقرر کئے ہیں آدمی کو چاہیے کہ ان تصرفات کو حق تعالیٰ کے سپرد کر دے اور ان میں بھی ان کو حاکم مطلق سمجھے کسی حکم میں وجہ نہ پوچھے جیسا کہ آج کل مذاق ہو گیا ہے کہ ہر حکم کی وجہ اور فلاسفی پوچھی جاتی ہے ایک شخص نے مجھ سے کہا کہ نماز پانچ وقت کیوں مقرر ہوئی میں نے کہا تمہاری ناک سامنے منہ پر کیوں لگی ہوئی ہے۔ پیچھے گدی پر ہوتی کیا حرج تھا بس خاموش ہی تو ہو گئے اس جواب سے میری مراد یہ تھی کہ جب تم کو تکوینیت میں اور اپنی پیدائش میں کسی قسم کا دخل نہیں ہے جیسے خدا تعالیٰ نے بنا دیا بن گئے تو ان کے احکام تشریعیہ میں دخل دینے کا کیونکر اختیار ہے؟

بعض لوگوں نے تکوینیات میں بھی کچھ وجوہات تراشے ہیں اس پر مجھ کو یاد آیا کہ کسی سے پوچھ گیا کہ چیتا گلدار کیوں ہوتا ہے جو توحید کے قائل ہیں اور خدا تعالیٰ ہی کو متصرف مانتے ہیں ت سے تو ایسا سوال ہو ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ وہ سیدھا سا جواب دے دیں گے کہ گلدار ہونے کی وجہ کیا ہوتی اللہ نے اس کو ایسا ہی بنانا چاہا بس ایسا ہی بن گیا اور عقل والوں نے جو ہر بات کی فلاسفی ڈھونڈا کرتے ہیں اس کی وجہ گھڑی وہ یہ کہ چیتوں کا جد امجد جس کی اولاد میں یہ سب چیتے ہیں کسی وقت میں ایک کافی زمانہ تک ایسی جگہ بیٹھا کرتا تھا کہ کہیں سایہ تھا اور کہیں دھوپ یعنی کسی درخت کے نیچے اس سے یہ دورنگی اور گل پیدا ہو گئے دھوپ کی جگہ سفیدی ہو گئی اور سایہ کی جگہ سیاہی خوب رں کو سمجھایا ان سے کوئی پوچھے کہ اگر گل اس سے پیدا ہوتے ہیں تو ایک کپڑے کو اسی طرح کہ اس پر کہیں سایہ ہو اور کہیں دھوپ اور دو برس تک اسی طرح رکھا رہنے دو۔ دیکھیں تو کیسے گل پیدا ہو جاتے ہیں سے اور دروغ گو را حافظہ نباشد (جھوٹ بولنے والے کو یادداشت نہیں رہتی) ان کو یہ بھی یاد نہ رہا کہ سایہ اور دھوپ تو متحرک چیزیں ہیں، یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ جس جگہ ایک دفعہ دھوپ پڑی تھی اور جس جگہ پہلی دفعہ سایہ پڑا تھا ہمیشہ دونوں اسی جگہ پڑتے رہے دھوپ بھی سرکتی رہی اور سایہ بھی سرکتا رہا پھر اس صورت میں ایک جگہ سیاہی اور ایک جگہ سفیدی کہاں سے آئی کیونکہ

دھوپ اور سایہ کو ایک جگہ قیام ہوا ہی نہیں جس سے سفیدی اور سیاہی کا اثر قائم ہو۔ قیام اثر کیلئے سبب کا کچھ تو قیام چاہیے اور یہاں تو سبب ہر آن میں منتقل ہے۔

اگر یہ کہا جاوے کہ وہ چیتا بڑا ہوشیار تھا وہ بھی سایہ اور دھوپ کی حرکت کے ساتھ حرکت کرتا رہتا تھا روزانہ دھوپ اور سایہ میں ایک ہی دن کی طرح بیٹھتا تھا تو وہ چیتا کیا ہوا وہ تو بڑا ریاضی داں انجینئر ہوا۔ بات بنائی تو مگر بنتی نہیں۔ افسوس ان تک بندیوں سے تو ان کا اطمینان ہو جاتا ہے اور دلیل سے نہیں ہوتا۔ مگر یہ تک بندیاں کہاں کہاں چلیں گی یہ ساری خرابی دین کو چھوڑنے سے پیدا ہوئی کہ ہر چیز کی وجہ تراشنی پڑتی ہے اس لئے چیتے کے گلدار ہونے کی وجہ گھڑنی پڑی ورنہ دیندار اور توحید کے ماننے والے کو سیدھا سا جواب ہر بات کا یہ کافی ہے کہ سب اللہ تعالیٰ نے بنا دیا۔ چیتا گلدار کیوں ہے اللہ تعالیٰ نے بنا دیا اور گھوڑا سفید یا سرخ وغیرہ کیوں ہے اللہ تعالیٰ نے بنا دیا یا ہاتھی کالا کیوں ہے اللہ نے بنا دیا۔

اسی طرح تشریعیات میں بھی یہی جواب کافی ہے کہ پانچ نمازیں کیوں ہوئیں اللہ نے مقرر کر دیں اور چار رکعت کیوں ہوئیں۔ دو رکعت کیوں ہوئیں اور تین رکعت کیوں ہوئیں سب اللہ نے مقرر کر دی ہیں یہ ہے حقیقی جواب جو ہر جگہ چل سکتا ہے تکوینیات میں بھی تشریعیات میں بھی اور جو اس جواب کو چھوڑ کر دوسرے جواب اور وجوہ اور فلسفی نکالتے ہیں وہ ہر جگہ ٹھوکریں کھاتے ہیں کہ چیتا تو دھوپ سایہ میں بیٹھا تھا اس لئے گلدار ہو گیا اور ہاتھی کالا شاید اس واسطے ہو گیا ہو کہ ساری عمر تیز دھوپ میں رہا ہوگا کھال جل کر کالی پڑ گئی اور گھوڑا سفید اس واسطے ہوگا کہ ساری عمر برف میں رہا ہوگا مگر بعض کالے بھی ہوتے ہیں وہ شاید کسی ایسے گھوڑے کی نسل میں ہوں گے جو دھوپ میں بند رہا ہوگا لیکن یہ مشاہدہ کے خلاف ہے ایک ہی گھوڑی کے پیٹ سے ایک بچہ سفید رنگ پیدا ہوتا ہے اور ایک سیاہ رنگ پیدا ہوتا ہے تو یہ گھوڑی کب برف میں دبی تھی اور کب دھوپ میں بندھی تھی پھر لطف یہ ہے کہ اس گھوڑی پر تو برف کا یا دھوپ کا اثر ہوا نہیں یہ تو جیسی تھی ویسی ہی ہے سفید تھی تو سفید ہی ہے اور سیاہ تھی تو سیاہ ہی ہے اور بچہ پر اثر ہو گیا یہ کیا خرافات ہے۔ نعوذ باللہ۔

فلاسفہ کی سوچ:

یہ آج کل کے فلاسفر ہیں ان کو تو یہ بھی خبر نہیں کہ فلسفہ کیا چیز ہے کس علم کا نام ہے اور اس کا موضوع کیا ہے اور ثبوت کیا چیز ہے اور اس کے لئے کسی قسم کی دلیلوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ آج کل کے فلسفہ کے دلائل قطعی تو کیا ظنی بھی نہیں ہوتے اور اقناعی بھی نہیں ہوتے۔ دیکھ لیجئے یہ بھی کوئی دلیل ہے کہ چیتا اس واسطے گلدار ہو گیا کہ دھوپ چھاؤں میں بیٹھا تھا اس کو اقناعی بھی جب کہا جائے

کہ اس کے علاوہ کسی ایک مادہ میں تو اور چلے لیکن یہ تو ایک مادہ میں بھی نہیں چلتی بس یہ وجہ کچھ انہی کی سمجھ میں آتی ہوگی۔ یہ آج کل کے فلاسفروں کے دماغ ہیں کہ فلسفی تو دریافت کرتے ہیں ہر بات کی مگر جو وجہ خود گھڑتے ہیں وہ ایسی لچر ہوتی ہے کہ مدعا کو ایک مادہ میں بھی ثابت نہیں کر سکتی۔ ہاں فلسفہ یونان کچھ کچھ فلسفہ کہلانے کا مستحق ہے گو ان کے جواب بھی اخیر میں جا کر آج کل کے فلاسفروں کے جواب سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے لیکن اتنا فرق ضرور ہے کہ آج کل کے فلاسفروں کا جواب ایک قدم بھی نہیں چلتا اور ان کا جواب دو چار قدم چل جاتا ہے گو اس کے بعد وہ بھی گر پڑتا ہے وہ ایسے موقعوں پر یوں کہتے ہیں کہ چیتا گلدار کیوں ہوا اور گھوڑا یا ہاتھی گلدار کیوں نہیں ہوا کہ چیتے میں مادہ اسی قسم کا تھا جس سے گل پیدا ہونے چاہئیں تھے لہٰذا مبدا فیاض کی طرف سے اس پر یہ صورت فائض ہوئی کیونکہ مبدا فیض میں بخل نہیں اور ترجیح بلا مرجح ہو نہیں سکتی اس لئے جو مادہ جس صورت کا مقتضی تھا مبدا فیاض کی طرف سے وہی صورتیں فائض ہو گئیں۔

یہ جواب آج کل کے فلاسفروں کے جواب سے کچھ چلتا ہوا معلوم ہوتا ہے انہوں نے مادہ اور اثرات کا سلسلہ ملا کر حساب تو پورا کر دیا گو وہ حساب بھی ایسا ہی ہے جیسے ایک منیب جی حساب جوڑ رہے تھے کہ چار اور چھ دس۔ دس اور دو بارہ کے دو ہاتھ لگا ایک اور اسی طرح ہزاروں لاکھوں کی جمع کر رہے تھے اور بار بار کہتے جاتے تھے ہاتھ لگے اتنے ہاتھ لگے اتنے۔ ایک سائل کھڑا سن رہا تھا اس نے کہا منیب جی کچھ ہمیں بھی دلوا دو کہا آگے جاؤ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔

اس نے کہا ابھی میرے سامنے آپ کے ہاتھ میں تو بہت آ چکے ہیں اور پھر آپ کہتے ہیں کہ میرے پاس کچھ نہیں ہے انہوں نے کہا بھائی یہ تو کاغذی حساب کتاب اور زبانی جمع خرچ ہے اس میں کچھ ملتا تھوڑا ہی ہے بس جیسا کہ ان منیب جی نے گھنٹہ بھر مغز مارا مگر زبانی ہی دل خوش کرتے رہے کہ ہاتھ لگے اتنے اور ہاتھ لگا کچھ بھی نہیں اسی طرح ان یونانی فلاسفروں نے بھی مادہ اور اثرات کا سلسلہ ملا کر حساب پورا کر دیا لیکن ہاتھ کچھ بھی نہیں آیا سوائے اس کے کہ مغز خالی کیا اور تقریر کو طول دیا اور اخیر میں دیکھو تو ہاتھ خالی نتیجہ وہی ہے جو اس سائنس جدید کی تقریر کا تھا کہ چیتا گلدار اس واسطے ہے کہ دھوپ چھاؤں میں بیٹھا تھا جیسا یہ لغو ہے ایسے ہی یونانی فلاسفروں کی یہ تقریر بھی لغو ہے فقط اتنا فرق ہے کہ اس میں الفاظ بھی معمولی تھے اور اس میں ذرا معقولی اور اصطلاحی الفاظ ہیں اور پہلے قدم پر گر پڑا تھا اور یہ ایک دو قدم چل کر گر پڑے ورنہ حاصل دونوں کا ایک ہے کیونکہ انہوں نے کہا کہ چیتے میں کوئی مادہ ایسا تھا جس کی وجہ سے مبدا فیض کی طرف سے

گلوں کی صورت فائز ہوئی اور یہ وجہ اس واسطے تراشی کہ ترجیح بلا مرجح لازم نہ آوے ان سے کوئی پوچھے کہ چیتے میں وہ مادہ کیوں آیا دوسرے جانوروں میں کیوں نہ آیا کہ مبدأ فیاض سے ان پر بھی گل فائز ہو جاتے یہ پھر ترجیح بلا مرجح ہوگئی اور جس الزام سے بچنے کے لئے وہ وجہ تراشی تھی وہ بجنسہٖ قائم رہا تو اس تقریر میں اور اس تقریر میں کیا فرق ہوا جیسے وہ بیکار تھی ایسے ہی یہ بھی بیکار ہے۔

اہل توحید کا فکر:

اور ماشاء اللہ اہل توحید پر کوئی بھی اشکال نہیں پڑتا یہ شروع سے وہ وجہ بیان کرتے ہیں جو سب کو اخیر میں اختیار کرنی پڑتی ہے وہ یہ کہ خدا تعالیٰ نے ایسا کر دیا کوئی کتنی ہی لمبی چوڑی تقریریں کرے مگر اخیر میں اسی پر آنا پڑے گا چنانچہ یونانی فلاسفروں نے پہلے تو مادہ نکالا اور اس کی وجہ سے گلوں کی صورت کا کو مبدأ فیاض سے فائض مانا لیکن جب یہ سوال ہوا کہ وہ مادہ دوسرے جانوروں میں کیوں نہیں ہے اب اگر وہ اس کے لئے کوئی اور وجہ بھی تراشیں۔ تب بھی سوال بدستور رہے گا کہ وہ وجہ اور جانوروں میں کیوں نہیں پائی گئی اگر اس کے لئے بھی کوئی اور وجہ نکالیں اس پر بھی یہی سوال رہے گا اب یا تو کہیں یہ سلسلہ ختم کریں گے یا تسلسل لازم آئے گا تسلسل کو خود ہی محال مانتے ہیں لامحالہ ختم کرنا پڑے گا اور ختم کہیں پر ہو نہیں سکتا بدون اس کے کہ یوں کہا جاوے کہ اس مادہ کو یا اور کسی چیز کو جس کو وہ وجہ قرار دیتے ہوں خدا تعالیٰ نے چیتے میں پیدا کیا جس سے گل پیدا ہوئے اور اس کو کسی اور جانور میں پیدا نہیں کیا اور یہ وہی لفظ تو ہے جس کو اہل توحید نے کہا تھا اتنا فرق رہا کہ انہوں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا اور انہوں نے جھک مار کر کہا تمام اشکالوں سے اگر بچنا ہے تو اسی جواب سے بچ سکتے ہیں جس کو اہل توحید نے اختیار کیا ہے اور رہی ترجیح بلا مرجح تو اس کا جواب یہ ہے کہ مرجح باری تعالیٰ کا ارادہ ہے اس کے سوا کوئی مرجح نہیں ہو سکتا اور جو کوئی کسی اور مرجح کی تلاش کرتا ہے اس کو ہیر پھیر کر کے اسی پر آنا پڑتا ہے جیسا کہ بیان کیا گیا۔

اور اگر یہ سوال ہو کہ ارادہ ایک کے ساتھ کیوں ہوا اور دوسرے کے ساتھ کیوں نہیں ہوا تو اس کے دو جواب ہیں ایک تو یہ کہ یہ سوال صرف ہم سے کیوں ہے تم نے بھی تو ابتدا میں یا انتہا میں اسی کو اختیار کیا ہے جیسا ابھی بیان ہوا اگر ہمارے ذمہ اس کا جواب ہے تو تمہارے ذمہ بھی ہے اور دوسرا جواب یہ ہے کہ حق تعالیٰ فاعل مختار ہیں ان کے افعال اور ارادہ کیلئے کسی وجہ کی ضرورت نہیں وجہ ہر چیز کی ان کا ارادہ اور حکم ہے ان کے ارادہ اور حکم کے لئے کوئی وجہ نہیں اور حقیقت اس کی یہ ہے کہ ارادہ کی ذات میں یا اس کے لوازم میں یہ داخل ہے کہ ترجیح لمنشأ منشأ اور ذات اور ذاتیات کے

درمیان میں اسی طرح ملزوم ولوازم کے درمیان تخلل جعل کا نہیں ہوتا لہٰذا اس ترجیح کی علت دریافت کرنا عقلاً باطل ہے اور عامہ افہام کی موافق اس کو دوسری طرح سمجھو کہ چونکہ ہم نے فاعل مختار کی کوئی ایسی نظیر نہیں دیکھی جس کے ارادہ اور حکم کے لئے کوئی وجہ نہ ہو اس واسطے حضرت جن کو انہی چیزوں پر قیاس کر کے یہ سوال کیا جاتا ہے بے شک ہم نے جن کو دیکھا ہے وہ سب ایسے ہی ہیں جن کے افعال کیلئے وجہ ہوتی ہے لہٰذا ہم نے یہی حکم فاعل مختار پر بھی جاری کر دیا اس کو قیاس الغائب علی الشاہد کہتے ہیں مگر یہ طریقہ ہی بالکل غلط ہے۔

یہ ایسا ہی ہے جیسے اس بھولے بھالے شبان نے فرط محبت میں باری تعالیٰ کے واسطے ہاتھ پاؤں اور کپڑا اور بھوکا ہونا اور تھک جانا سب کچھ ثابت کیا تھا۔ اس قیاس الغائب علی الشاہد کو کسی عقلمند نے جائز نہیں رکھا دیکھو تمام دنیا اپنے افعال میں آلات کی محتاج ہے کوئی کام بلا آلات یعنی ہاتھ پیر وغیرہ کے نہیں ہو سکتا اور حق تعالیٰ کے لئے کوئی صاحب ملت یا عاقل اس بات کا قائل نہیں کہ وہاں بھی ہاتھ پیر اور آلات کی ضرورت ہے حالانکہ اس کی کوئی نظیر دوسری موجود نہیں مگر دلیل کی وجہ سے قائل ہونا پڑتا ہے عقول سافلہ سے یہ بات باہر ہے کہ بلا آلات کے کوئی کام کر سکے مگر ذات باری تعالیٰ کے واسطے یہی ثابت ہے ورنہ احتیاج لازم آئے گی جو ذات واجب الوجود اور الوہیت کے خلاف ہے دیکھئے یہاں قیاس الغائب علی الشاہد کو منع کیا گیا۔

اسی طرح اس مسئلہ میں بھی سمجھو کہ گو اس کی کوئی نظیر موجود نہیں اور کوئی فرد کائنات میں سے ایسا نہیں جس کے افعال کے لئے وجہ کی ضرورت نہ ہو مگر اس حکم کو ذات باری تعالیٰ تک مت پہنچاؤ اور ان کو کائنات پر مت قیاس کرو کیونکہ کائنات میں کوئی فاعل مختار مطلق نہیں ہے اور وہ فاعل مختار مطلق ہیں فاعل مختار مطلق کہتے ہی اس کو ہیں جس کے فعل کے لئے کسی وجہ کی ضرورت نہ ہو۔ ہماری سمجھ میں یہ مضمون پوری طرح اس لئے نہیں آتا کہ اس کی کوئی نظیر ہم نے نہیں دیکھی باقی مختار مطلق تو وہی ہے جو کسی بات سے بھی مجبور نہ ہو اور وہ صرف ایک ذات وحدہٗ لاشریک ہے اس کے افعال واحکام کے لئے وجہ کی ضرورت ماننا احتیاج کو ثابت کرنا ہے اور یہ الوہیت کے منافی ہے اس دلیل سے تو آلات کے احتیاج کی نفی کی گئی ہے۔ یہاں تک بقدر کفایت اس بات کا بیان ہوا کہ ارادہ باری تعالیٰ نے ایک جگہ ایک وصف کو کیوں ترجیح دی اور دوسری جگہ کیوں نہیں دی پہلا جواب الزامی تھا اور یہ تحقیقی ہے حاصل یہ کہ ارادہ باری تعالیٰ کا خود مرجح ہے اب وہ اشکال نہ رہا کہ ترجیح بلا مرجح لازم آتی ہے پس اہل توحید پر کوئی اشکال نہیں پڑتا بلکہ فلاسفروں کا اعتراض ترجیح بلا مرجح کا انہیں پر لوٹ کر

پڑتا ہے کیونکہ یہ کہہ کر انہوں نے ایک دفعہ تو دل کو سمجھا لیا کہ ایک جگہ میں مادہ ایسا موجود تھا جس میں خاص قابلیت تھی اس واسطے مبدأ فیاض نے اس صورت کو اس کے واسطے ترجیح دی اور دوسری جگہ یعنی کسی اور حیوان میں ایسا مادہ موجود نہ تھا اس واسطے یہ صورت اس پر فائض نہ ہوئی لیکن جب یہ پوچھا جائے کہ ایسا مادہ ایک ہی حیوان میں کیوں تھا دوسرے کسی حیوان میں کیوں نہ تھا کیونکہ وہ مادہ بھی تو از قسم ممکنات ہے جو مرجح کا محتاج ہے اب یہاں وہی سوال ان پر عائد ہوتا ہے کہ ذات واجب الوجود یا مبدأ فیاض نے اس مادہ کو ایک میں کیوں پیدا کیا اور دوسرے میں کیوں پیدا نہیں کیا یہ وہی ترجیح بلا مرجح کا سوال ہے غرض اس قسم کے اشکالوں سے سوائے اہل توحید کے کوئی بچ نہیں سکتا تاہم پرانے فلاسفروں نے کچھ وجہ گھڑ گھڑا کر حساب کی خانہ پری کر کے تو دکھلا دی گو ان کا حساب واقع میں ایسا ہی ہے جیسے غیب جی کہہ رہے تھے ہاتھ لگے اتنے اور ہاتھ لگا کچھ بھی نہیں تاہم پرانے فلاسفر ایک دو قدم چلے تو سہی اور آج کل کے فلاسفر تو ایک دو قدم بھی نہ چلے۔

اس چیتے کی مثال سے پتہ چلتا ہے کہ آج کل جو لوگ وجوہ تلاش کرتے ہیں ان کی عقلیں ایسی بھدی ہیں کہ ایسی مہمل باتیں ان کے ذہن میں آتی ہیں ان سے تو پرانے فلاسفر پھر غنیمت تھے کہ کسی درجہ تک تو بات ڈھنگ کی کہہ سکتے تھے گو منزل مقصود تک ایک بات بھی نہیں پہنچتی تو دونوں کی مثال ایسی ہے جیسے دو گھوڑے ہیں ایک دس کوس چلنے کی طاقت رکھتا ہے اور ایک بیس کوس کی اور فرض کیا جائے کہ منزل سو کوس ہے تو اگرچہ بیس کوس کی طاقت رکھنے والا گھوڑا دس کوس والے سے دو چند طاقت رکھتا ہے مگر بے کار دونوں ہیں منزل مقصود تک ایک بھی نہیں پہنچا سکتا منزل مقصود تک پہنچانے والی ریل ہی ہے تو کیا یہ عقل کی بات ہے کہ ان دونوں گھوڑوں میں سے کسی کو اختیار کیا جاوے کہ ایک دس کوس پر چھوڑ دے گا دوسرا بیس کوس پر چھوڑ دے گا مقصود تک پہنچنا کسی سے بھی میسر نہ ہوگا لہذا شروع سے ریل ہی کو کیوں نہ اختیار کیا جائے دس کوس والا گھوڑا تو آج کل کا فلسفہ ہے اور بیس کوس والا فلسفہ یونان ہے وہ اس سے دو چند طاقت رکھتا ہے مگر منزل مقصود تک وہ بھی نہیں پہنچتا اور ریل دین ہے یہ سو کوس بھی پہنچا سکتا ہے اور ہزار کوس بھی پہنچ سکتا ہے جو اس کو چھوڑے گا ان میں کوئی تو دس کوس پر گر جائے گا اور کوئی بیس کوس پر گر جائے گا دیکھ لیجئے ایک ذرا سے چیتے کے گلدار ہونے کے بارہ میں ایک فلسفی ایک ہی قدم پر چل کر رہ گئے دوسرے فلسفی نے ایک قدم رکھا کہ مادہ ثابت کیا اور دوسرے قدم پر گر گئے یہ سب خرابی عقل پر چلنے اور دین کو چھوڑنے سے ہوئی دین سیدھا منزل پر پہنچاتا ہے اور اول ہی سے یہ جواب سکھلاتا ہے کہ سب

اللہ تعالیٰ نے بنایا اس کے سوا جو وجہ بھی کوئی تراشے گا وہ سب نہ چلنے والی اور بیکار ہوں گی۔

حق تعالیٰ اور بندے میں تعلق:

اس طویل بیان سے آپ کی سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ تکوینیات میں بھی کسی کو دخل نہیں جب تکوین کی یہ حالت ہے کہ اس کی وجہ تمہاری سمجھ میں نہیں آتی اور تم کو اس میں کچھ دخل نہیں تو تشریعیات میں کیوں دخل دیتے ہو؟ اس واسطے میں نے اس شخص سے کہا جس نے سوال کیا تھا کہ نمازیں پانچ کیوں مقرر ہوئیں کہ تیری ناک آگے کیوں لگی؟ جب اس کی وجہ عقل سے نہیں معلوم کر سکتے تو اس عقل کو تشریعیات میں کیوں دخل دیتے ہو۔ بس سمجھ لو کہ جیسے حق تعالیٰ کو تکوینیات میں ہر قسم کے تصرف کا حق حاصل ہے کوئی کام تکوینیات کے متعلق تم سے پوچھ کر نہیں کرتے اور جو کرتے ہیں وہی ٹھیک ہو جاتا ہے ایسے ہی تشریعیات میں بھی ہر قسم کے تصرف کا حق ہے کسی حکم میں تم سے پوچھنے اور رائے لینا کی ضرورت نہیں جو چاہیں حکم دیں اور جو حکم دیں وہی ٹھیک ہے۔

حضرت کچھ خدا ہی کو سستا پالیا ہے کہ اس کے متعلق سوالات کی ہمت کرتے ہو ذرا غور تو کیجئے کہ آپ کا ایک باورچی ہو اور آپ اسکو حکم دیں کہ پچاس آدمی کا کھانا پکاؤ اور اس وقت پانچ آدمی موجود بھی نہ ہوں تو اس کو یہ خیال ہو سکتا ہے کہ آدمی تو پانچ بھی نہیں پچاس کا کھانا کیوں پکوایا جاتا ہے لیکن اس کی یہ مجال نہ ہوگی کہ آپ سے اس حکم کی علت دریافت کرے کہ اس میں کیا مصلحت ہے کھانے والے تو موجود ہیں نہیں پھر پچاس آدمیوں کا کھانا کیوں پکوایا جاتا ہے اگر وہ ایسا کرے گا تو آپ اس کو علت اور حکمت سمجھانے نہیں بیٹھیں گے بلکہ ایک دھول اس کے سر پر لگائیں گے کہ نالائق تیرا کیا منہ ہے وجہ پوچھنے کا ہم کسی کو کھلائیں یا کہیں بھیجیں یا فرض کر لو کہ ہم پھینک ہی دیں گے تو تیرے باوا کا کیا آتا ہے تو جس کام کا نوکر ہے وہ کر جب آپ کو اپنے ایک ہم جنس پر یہ اختیار ہے کہ بلا بیان علت کے آپ اس کو حکم دے سکتے ہیں اور اس پر آپ کی حکومت کا یہ اثر ہے کہ وہ علت نہیں پوچھ سکتا تو خداوند جل جلالہٗ کو کیوں بندوں پر ایسا اختیار نہیں حالانکہ ان کے اختیار میں اور آپ کے اختیار میں بڑا فرق ہے آپ اپنے باورچی کے مالک نہیں خالق نہیں آپ کو جو کچھ اس پر اختیار ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ آپ اس کو کچھ پیسے دے دیتے ہیں اور وہ بھی جب ہے، جب اس نے ان پیسوں کو لینا اپنی خوشی سے منظور ہی کر لیا ہو گویا اپنی زبان کی وجہ سے وہ خود مجبوری میں پڑ گیا ہے ورنہ اس سے پہلے آپ کو یہ حق نہ تھا کہ اس کو نوکری پر مجبور کرتے اور حق تعالیٰ کو تم پر پورا اختیار حاصل ہے کیوں کہ وہ مالک ہیں اور خالق ہیں وہاں آپ کو خوشی کا سودا

نہیں کہ اگر چاہیں ان کے پابند رہیں اور چاہیں نہ رہیں جیسے باورچی کو تھا کہ چاہے نوکری کرے اور چاہے نہ کرے اور چاہے کرنے کے بعد چھوڑ دے آپ ان کی پابندی اور طاعت سے کسی وقت باہر نہیں ہو سکتے نہ ابتداء نہ انتہاء کیونکہ ان کی پابندی اور طاعت آپ کی زبان دینے سے آپ کے ذمہ نہیں ہوئی بلکہ یہ جبر ہوئی ہے آپ ان کی مٹھی میں ہیں جس طرح چاہیں آپ کو رکھیں جب آپ کو باورچی کا علت دریافت کرنا اتنے سے اختیار کی بدولت جو آپ کو چار پیسے کی بدولت اس پر حاصل ہے ناگوار ہوتا ہے تو حق تعالیٰ کو آپ کا ان کے احکام میں لم پوچھنا باوجود ان اختیارات کاملہ کے جو ان کو بوجہ خالق اور مالک ہونے کے حاصل ہیں کیوں ناگوار نہ ہوگا ذرا تو غور کیجئے اور ہوش سے کام لیجئے۔ صاحب مسلمان کا مذہب تو یہ ہونا چاہیے۔

زبان تازہ کردن باقرار تو
نہ انگیختن علت از کار تو،

آپ کی ربوبیت کا اقرار کرنا آپ کے کاموں میں علتیں نکالنے کو مانع ہے۔

اور یہ مذہب ہے مومن کا۔

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو
جاں شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

زندہ کریں آپ کی عطا ہے اور اگر قتل کریں آپ پر فدا ہوں۔ دل آپ پر فریفتہ ہے جو کچھ کریں میں آپ سے راضی ہوں۔

ہر حال میں منقاد اور فرمانبردار رہے ان کے حکم کے سامنے آنکھ نہ اٹھا دے سر جھکا کر مان لے وجہ اور علت کیا چیز ہوتی ہے اور حکمت کس کو کہتے ہیں ان کا حکم ہی ہر چیز کی علت ہے اور وہی حکمت ہے اصل مذہب یہی ہے۔

نماز پنجگاہ کی حکمت:

اور یوں تسکین خاطر کے لئے دو چار علل اور حکمتیں سمجھ بھی لیں تو کیا ہوا وہ کوئی علت تھوڑا ہی ہیں یا حکمت یقیناً تھوڑا ہی ہے۔ خدا جانے حقیقی حکمت کیا ہو ہمارا علم کیا اور فہم کیا مثلاً پانچ نمازوں کی وجہ کوئی یوں بیان کرے کہ صبح کو تفریح کا وقت ہوتا ہے خدا تعالیٰ کی نعمت ہے کہ رات بھر سلایا اور یہ وقت تفریح کا نصیب کیا لہٰذا اس کا شکریہ چاہیے فجر کی نماز اس کا شکریہ ہے ظہر کو بھی یہی حالت ہے کہ دوپہر کو قیلولہ کیا آرام پایا دوپہر ختم ہونے کے بعد اس کا شکریہ چاہیے یہ ظہر کی نماز ہے مغرب کے وقت دن ختم ہوتا ہے دن خیریت سے گذرا اس کا شکریہ چاہیے عصر کا وقت دونوں کے درمیان میں ہے یعنی ظہر اور مغرب کے دنیا کے اکثر کاموں کا وقت یہی ہے بازار اسی وقت لگتے ہیں۔ ممکن ہے کاروبار

میں زیادہ مصروفیت ہو جاوے اور خداوند تعالیٰ کی طرف سے ذہول ہو جاوے اس واسطے بیچ میں ایک مختصری عصر کی نماز بھی رکھی گئی کہ بندہ کی یاد کا امتحان ہے رات کو سونے کے وقت تمام کام ختم ہو جاتے ہیں دن بھر خیر و عافیت سے گذرا کھایا پیا سارے کام انجام کو پہنچے اب اخیر وقت ہے نیند مشابہ موت کے ہے خدا جانے سونے کے بعد اٹھنا نصیب ہوگا یا نہیں اس واسطے ضرور ہوا کہ خدا کا نام لیکر سوئیں یہ عشاء کی نماز ہے پانچوں نمازوں کی حکمتیں ہو گئیں یہ حکمتیں کتابوں میں لکھی بھی ہیں اور تقریب الی الفہم کے لئے کچھ نہ کچھ مفید بھی ہیں اور اسی غرض سے علماء نے کتابوں میں لکھی بھی ہیں مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پانچوں نمازوں کی بناء ایسی حکمتوں پر ہے بایں معنیٰ کہ اگر یہ حکمتیں کسی دوسری طرح بھی حاصل ہو جاویں تو نماز کی ضرورت نہ رہے گی بلکہ مطلب یہ ہے کہ احکام الٰہی بسر و چشم منظور ہیں اور اصل بناء ان کی امر خداوندی پر ہے لیکن ان میں یہ فائدے بھی ہیں۔

بناء احکام اور مصلحت:

اس کی مثال یہ ہے کہ ہم کو بازار جانا ہے گیہوں لینے کے لئے اور گیہوں کی ہم کو ضرورت ہے کیونکہ بقاء حیات اسی پر موقوف ہے لیکن جانے میں یہ بھی فائدہ نکل آیا کہ چہل قدمی بھی ہو گئی اور کھانا ہضم ہو گیا اب اگر کوئی یہ سمجھ لے کہ بازار جانے کی بنا چہل قدمی اور کھانا ہضم کرنا ہی ہے اور یہ بات بجائے بازار کے جنگل کی طرف جانے میں بھی حاصل ہو سکتی ہے لہٰذا بازار کو نہ جایا کرے اور جنگل ہو آیا کرے تو فرمایئے کیا یہ خیال اس کا صحیح ہے اور اس صورت میں بغیر روٹی کے کیسے زندہ رہے گا ہمارے بھائیوں نے یہی کیا ہے کہ احکام الٰہی کی ان ان مصلحتوں کو جو ان میں تبعاً و ضمناً آ گئی ہیں اصل اور بناء قرار دے دیا ہے لیکن سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ اسی طرح غلطی پر ہیں جیسے بازار کو چھوڑ کر جنگل کو چہل قدمی کے لئے جانے والا کہ اس صورت میں چہل قدمی تو واقعی ہو جائے گی لیکن اناج ہاتھ نہیں آئے گا اور بھوکوں مر جائے گا کتابوں میں جو مصلحتیں احکام الٰہی کی لکھی ہیں وہ ضمنی ہیں ان کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ انہی کی وجہ سے وہ احکام مقرر ہوئے ہیں نہ کسی کتاب میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے۔

اسی واسطے کتابوں میں حکمتوں کے بیان کے ساتھ یہ لفظ بھی لکھے جاتے ہیں واللہ اعلم جس کا یہ مطلب ہے کہ ذرا وہ اس میں تو زبان چلاوے کہ صبح کی رکعتیں دو کیوں ہیں اور مغرب کو تین کیوں ہیں کہاں تک ذہانت سے کام لے گا اگر یہاں بھی کوئی وجہ گھڑ دی تو ہم آگے چلیں گے کہ زکوٰۃ میں چالیسواں حصہ کیوں ہے اور دو سو درہم کا نصاب کیوں مقرر ہوا اس سے کمی بیشی میں کیا مضرت اور کیا نقصان تھا۔ اور آگے چلئے حج ذی الحجہ میں کیوں مقرر ہوا شوال یا ذیقعدہ یا اور کسی مہینے

میں کیوں نہیں رکھ گیا اور مکہ ہی میں کیوں ہوتا ہے بمبئی کلکتہ وغیرہ میں کیوں نہیں ہو جاتا؟ کم از کم اتنا تو ہوتا کہ جن کے پاس روپیہ کم ہے یا سفر زیادہ نہیں کر سکتے وہ تو بمبئی وغیرہ جا کر کر لیا کرتے۔

یہاں بیچ میں ایک لطیفہ یاد آ گیا مجھ سے ایک شخص نے پوچھا کہ گاؤں میں جمعہ کیوں نہیں ہوتا میں نے کہا بمبئی میں حج کیوں نہیں ہوتا بس اب بالکل خاموش ہو گئے۔ غرض کہاں تک ہر حکم کی عت چھانٹی جائے گی ہر جگہ رائے نہیں چلتی اور عقل سے کوئی ایسی وجہ نہیں نکل سکتی جو یقینی ہو بس اس سے زیادہ کوئی بات نہیں پیدا ہوتی کہ گونہ تقریب الی الفہم ہو جاتا ہے اور اخیر میں یہی کہنا پڑتا ہے کہ اصل وجہ تو معلوم نہیں ہاں ظاہر میں ایک حکمت یہ سمجھ میں آتی ہے اس لفظ کو پہلے ہی سے کیوں نہ کہہ دو۔ عقل احکام الٰہی میں کب تک چل سکتی ہے ی واسطے کہتے ہیں۔

آزمودم عقل دوراندیش را
بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

میں نے دور اندیش کو کئی بار آزمایا۔ بعد میں اپنے آپ کو دیوانہ بنایا۔

مغیبات اور عقل نارسا:

حقیقت میں عقل بہت محدود چیز ہے اور مخلوق ہے وہ خالق کے اسرار میں کیسے حکم کر سکتی ہے ان حضرات نے عقل کی ماہیت کو خوب سمجھ لیا۔ اسی واسطے اس کو چھوڑا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ عقل نکمی چیز ہے اور سب اس کو چھوڑ کر بے عقل اور پاگل دیوانے بن جاویں۔ یہ تعلیم کسی نے نہیں دی بلکہ مطلب یہ ہے کہ احکام الٰہی کے دریافت کرنے میں عقل کافی نہیں عقل کی رفتار اور رسائی محدود ہے جہاں تک اس کی رسائی ہے وہاں تک بڑے کام کی چیز ہے اس سے ضرور کام لینا چاہیے اور جہاں اس کی رسائی نہیں ہے وہاں اس کے بھروسہ رہنا غلطی ہے۔

اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک پہاڑ کی اونچی چڑھائی ہے اور چوٹی تک چڑھنا ہے ایک شخص نے تو یہ کیا کہ گھوڑے کو گھر ہی سے چھوڑ دیا اس خیال سے کہ آخر چھوڑنا پڑے ہی گا لہٰذا پہلے ہی سے الگ کیا اور پیدل چلنا شروع کیا پیروں میں چھالے پڑ گئے اور دامن کوہ تک بھی پہنچنا مشکل ہو گیا اور چڑھائی ساری باقی رہ گئی یہ بھی حماقت ہے اور ایک ایسے زور میں آئے کہ چوٹی تک گھوڑے ہی پر جانا چاہتے ہیں زور سے جو گھوڑا مارا تو بس اڑائے چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ بالکل کھڑی چڑھائی پر بھی دوڑائے چلے جاتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گھوڑا کھڑی چڑھائی سے رپٹا اور یہ حضرت کسی کھڈ میں گر پڑے اور دنیا و دین دونوں سے گئے اور ایک تیسرا شخص وہ ہے کہ دامن کوہ تک تو گھوڑا کو لے گیا اور جب کھڑی چڑھائی شروع ہوئی تو وہاں گھوڑے کو چھوڑ دیا اور

پیدل ہولیا اس کا طریقہ بالکل صحیح ہے نہ اس نے گھوڑے کو بالکل بیکار سمجھا جس سے پیر ٹوٹتے اور نہ ایسا کارآمد سمجھا کہ کھڑی چڑھائی پر بھی لے جاتا اور کھڈ میں گرتا یہ شخص منزل مقصود پر پہنچے گا اور بے خطر پہنچے گا سمجھ لیجئے کہ غیبیات پہاڑ کی چوٹی کی مانند ہیں اور عقل گھوڑا ہے اس گھوڑے سے چوٹی پر چڑھنے کا کام مت لو ورنہ کھڈ میں گروگے جہاں تک اس کی رسائی ہے یعنی کھڑی چڑھائی سے نیچے نیچے وہیں تک اس سے کام لو اور ضرور لو ورنہ تھک جاؤ گے اور پیروں کو تکلیف ہوگی۔

حاصل یہ ہے کہ عقل نا تو بیکار چیز ہے کہ اس کو بالکل چھوڑ دیا جائے اور نہ اتنی کام کی ہے کہ ہر جگہ اس سے کام لیا جائے اس کو یاد کر لیجئے یہ بالکل صحیح فیصلہ ہے۔

عقل سے کام لینے کا صحیح طریقہ:

عقل سے معاش میں کام لیجئے اور دین کے بارہ میں بھی اتنا کام لیجئے کہ یہ بات عقل سے معلوم کر لیا کیجئے کہ یہ بات دین کی ہے یا نہیں جب یہ معلوم ہو جائے کہ یہ بات دین کی ہے تو عقل کو وہیں سے رخصت کر دیجئے یہ دامن کوہ ہے عقل کے گھوڑے نے آپ کو یہاں تک پہنچا دیا اب چڑھائی شروع ہوتی ہے اس گھوڑے کی دوڑ ختم ہو چکی اب اس کو چھوڑ دیئے اور پیروں سے چلئے ورنہ کھڈ میں گرے گا۔

لیکن آج کل لوگوں نے عقل کو ایسا سمجھا ہے کہ بس جو کچھ ہے عقل ہی ہے اور یہ سمجھتے ہیں کہ عقل ایسی چیز ہے کہ کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں اس کی رسائی نہ ہو حالانکہ غور کر کے دیکھیں تو معلوم ہو جاوے گا کہ اس کی دوڑ تو بہت ہی تھوڑی ہے ان باتوں میں بھی اس کی رسائی نہیں جو بہت ہی معمولی ہیں اور روزمرہ ہمارے نظروں کے سامنے موجود ہیں مگر غور کرنے کی عادت ہم لوگوں نے چھوڑ دی ہے ورنہ بخوبی سمجھ میں آجائے کہ ہر روز کے متعاد کارخانے بھی عقل میں نہیں آتے مثلاً دانہ کی کاشت کہ یہ اپنے ہاتھوں سے کرتے ہیں اور اپنی نظروں سے اس کا درخت دیکھ لیتے ہیں اور اس کو کاٹ بھی لیتے ہیں اور دانہ بھی نکال لیتے ہیں اور کھا بھی لیتے ہیں یہ روزمرہ کا حکم ہے اسی پر دنیا کی بسر ہے اور ایسا موٹا کام ہے جسے گنوار لوگ کرتے ہیں جو بالکل بے عقل اور وحشی ہوتے ہیں اور ہم ان کو عوام کالانعام یعنی جانوروں کے مانند سمجھتے ہیں ایسے لوگوں کے ہاتھوں یہ کام ہوتا ہے لیکن کبھی غور تو کیا ہوتا کہ دانہ جب ہم نے زمین میں ڈالا تو وہ پھوٹتا ہے اس عقل سے ذرا یہاں تو کام لیجئے اور پوچھئے کہ اس کو کسی نے پھوڑا معلوم ہو جائے گا کہ عقل کی رسائی کہاں تک ہے اتنی سی بات تک بھی رسائی نہیں ہے۔

جو لوگ عقل کے پیرو ہیں وہ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ مادہ میں طبیعت نوعیہ نے یہ کام کیا ہے کہ دانہ کو پھوڑا اور اب اس میں سے شاخیں اور پتے اور پھول نکالے گی اور دانے بنائے گی۔

عجائبات قدرت:

میں کہتا ہوں کہ انہوں نے طبیعت نوعیہ کے لفظ سے دل کو سمجھا تو لیا مگر ذرا یہ تو دیکھا ہوتا کہ یہ سب کام کس قدر باریک ہیں دانہ پھوٹتا ہے تو اس کا پھوٹنا ایسا نہیں ہے جیسے ایک پتھر مار دیا کہ اچھل کر پھٹ گیا بلکہ ایک قاعدہ کے ساتھ ہے جس کو پھوٹنا نہ کہیے بلکہ کھل جانا کہیے کہ نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ اس کا منہ کھلا یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اندر بیٹھا ہوا ایک اندازے اور ناپ کے ساتھ اور اتنے ہی مقدار سے کھولتا ہے۔ جس سے اس کے اندر سے ایک شاخ نکل آوے۔ اب شاخ نکلتی ہے تو اس کو دیکھئے کہ کس اتار چڑھاؤ کی ہے رنگ اس کا کیسا مناسب ہے کہیں بدرنگی نہیں کہیں دھبہ نہیں پڑا زردی اور سبزی ہے تو نہایت مناسب کہ آنکھوں کو اچھی معلوم ہوتی ہے۔ اس میں سے پتیاں نکلتی ہیں تو کس قدر باقاعدہ ان کی نوک پلک کیسی درست ہوتی ہے ہر درخت کی پتی علیحدہ۔ رنگت علیحدہ ذائقہ علیحدہ بو باس علیحدہ۔ صورت علیحدہ۔ شکل علیحدہ بعض پتیاں ایسی باریک ہوتی ہیں کہ ان کو شمار کرنا بھی مشکل ہے مگر ان کو ایک ایک کو دیکھ لیجئے کہ بنانے والے کا کہیں ہاتھ نہیں چوکا کوئی پتی چھوٹی بڑی نہیں ہوئی رنگ کسی کا خراب نہیں ہوا ذائقہ کسی کا نہیں بدلا خاصیت کسی کی نہیں بدلی موٹے پتلے ہونے میں فرق نہیں ہوا اگر پچاس پودے ایک قسم کے ہیں تو سب کی پتیاں یکساں ہیں بنانے والا بناتے بناتے تھکا بھی نہیں۔ نوک پلک صورت شکل کو بھولا بھی نہیں۔ کس قدر عجیب کام ہے۔

پھر آگے چل کر پھول کو لیجئے شاخ کیسی تھی پتیاں کیسی تھیں پھول ان میں سے کیسا نکلا نہ ٹہنی اور پتی کی سی رنگت ہے نہ ویسی بو ہے بعض نباتات کی شاخ اور پتیوں میں بدبو اور ذائقہ میں تلخی ہوتی ہے لیکن ان میں جو پھول نکلتا ہے تو کیا کہا جائے بس سبحان اللہ رنگت ایسی کہ اس کو دیکھا کیجئے خوشبو ایسی کہ سونگھا کیجئے۔

غرض پھول ایک علیحدہ چیز پیدا ہوئی ٹہنی میں نہ یہ رنگ تھا نہ یہ خوشبو تھی نہ یہ صورت تھی نہ یہ شکل تھی خدا جانے ایسی چیز میں سے ایسی خوشرنگ اور خوشبودار چیز کیسے نکل آئی اور یہ اس کے اندر کہاں رکھی ہوئی تھی اور کس طرح رکھی ہوئی تھی ٹہنی اور پتیاں سبز رنگ تھیں اور ان میں رطوبت اور تری بھی تھی یہ چیز پٹی لپٹائی اس کے اندر رکھی رہی اس پر ہری چیز کے اندر سرخ رنگ کیسے چڑھ گیا اور اس ہری چیز کی سبزی کا ایک دھبہ بھی اس پر نہ آیا۔ کس قدر حیرت کی بات ہے۔ اب آگے پھل کو لیجئے اس میں بھی ہزاروں باریکیاں اور صنعتیں ہیں۔

عقل پرستوں کی بے عقلی:

کہاں تک بیان کروں اور کوئی ضرورت بھی بیان کی نہیں ہے یہ وہ کام ہیں جو ہر روز اپنے ہاتھوں میں ہوتے ہیں اور ہر وقت نظروں سے گذرتے ہیں مقصود میرا یہ ہے کہ یہ کس قدر باریک کام ہیں ان کا فاعل کس کو قرار دیا ہے طبیعت نوعیہ کو جس کی صفت خود ہی بیان کرتے ہیں کہ وہ غیر ذی شعور ہے یعنی اس میں کسی قسم کا حس اور سمجھ نہیں ہے حیرت کی بات ہے کہ ایک غیر ذی شعور چیز ایسا کام کرے جو کسی ذی شعور سے بھی نہ ہو سکے تمام دنیا کے ذی شعور اگر جمع ہو کر ایک پتی گھانس کی بھی بنانا چاہیں تو ہرگز نہیں بنا سکتے پھر کیا یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ جو کام ذی شعور اور بڑے بڑے حکماء اور عقلاء اور کاریگروں سے نہ ہو سکے وہ ایک غیر ذی شعور چیز کر دے یہ تو ایسا ہوا جیسے کہیں کہ ریل کو کون چلاتا ہے ایک مٹی کا ڈھیلا جو ریل کی سڑک پر پڑا رہتا ہے کیونکہ طبیعت نوعیہ بھی ذی شعور بلفظ دیگر جماد ہے ایسے ہی ڈھیلا بھی جماد ہے جب طبیعت نوعیہ سے ایسے باریک کام ہو سکتے ہیں تو ایک ڈھیلے سے ریل کے چلانے کا کام کیوں نہیں ہو سکتا جس کی عقل ایسی بھدی بات تسلیم کر لے وہ جانے ہمارے سمجھ میں تو یہ بات آتی نہیں۔

یہ ایسا ہے جیسے کہیں کہ یہ گھڑی کس نے بنائی ہے ایک بے شعور جانور چیز نے۔ سبحان اللہ کون سی طبیعت ایسی ہے جو اس بات کو مان لیگی کہ بے شعور چیز نے گھڑی بنائی ہے واقعہ تو یہ ہے کہ ہم لوگوں نے گھڑی کے بنانے والے کو دیکھا بھی نہیں اس جگہ کو بھی نہیں جانتے جہاں وہ رہتا ہے لیکن گھڑی کے کیل پرزوں اور اس کی ساخت کو دیکھ کر بے ساختہ دل کہتا ہے کہ جس نے یہ گھڑی بنائی ہے بڑا صناع اور بڑا سمجھدار اور بڑا سائنسداں اور بڑا تجربہ کار ہے کہ ہر چیز ایسے تناسب کے ساتھ رکھی ہے کہ اس میں حرکت پیدا ہو گئی اور وقت بتلانے لگی اگر دنیا بھی ایک طرف ہو کر یوں کہے کہ اس گھڑی کو ایک جانور یا پتھر نے بنایا ہے تو دل اس کو ہرگز قبول نہیں کرے گا حیرت اور صد حیرت ہے کہ ایک گھڑی تو بے شعور چیز سے نہ بن سکے اور اتنے لمبے چوڑے ہزاروں اور لاکھوں درخت جن میں اس قدر باریک کام ہیں جن کا احاطہ بھی عقل اب تک نہیں کر سکی وہ بے شعور چیز سے بن جاویں۔

پھر حفظ اس کا ایسا صحیح ہے کہ دانے کو پھوڑتا ہے تو اوپر ہی کو نکالتا ہے ادھر ادھر کو جھکا ہوا اور ٹیڑھا نہیں نکالتا۔ دانہ مٹی کے اندر دبا دیا گیا تھا پھر اس میں سے ذرا سی سبز شاخ زمین کو توڑ کر نکلی جس کی ضعف کی حالت یہ ہے۔ اگر اس کو ہم اپنے ہاتھ میں لے کر زمین میں چبھوئیں تو وہ زمین میں گڑ نہیں سکتی کیونکہ نہایت نرم و نازک ہے حالانکہ اس وقت ہمارے ہاتھ کی طاقت بھی اس کے چبھونے میں

شریک ہے مگر اس پر بھی وہ مٹی کو نہیں توڑ سکتی خدا جانے اس نے دانہ میں سے نکلتے وقت زمین کو کیسے توڑا کیا یہ بات عجیب نہیں ہے جو کوئی عقل سے کام لے اور غور کرے وہ تو حیرت میں رہ جاتا ہے۔

پھر یہ کہ وہ جسم ثقیل ہے اس کا میلان تو مرکز کی طرف ہونا چاہیے یعنی نیچے کو یہ اوپر کو نکلنا کیسا؟ آپ اس کو توڑ کر اپنے ہاتھ میں لے لیجئے پھر کوشش کیجئے کہ اوپر کو جائے دیکھیں کیسے جاتا ہے اب تو اوپر کو جانا کیسا وہ ایک جگہ ٹھہرے گا بھی نہیں جب چھوٹے گا نیچے ہی کو جائے گا کیا یہ حیرت کی بات نہیں ہے کہ ایسا جسم جو طالب مرکز ہے اوپر کو چلا جاتا ہے اور کس قوت کے ساتھ کہ درخت کا تنا ذرا موٹا ہو جائے پھر اس کو کوئی اوپر کو جانے سے روک تو لے یہ سب باتیں کس قدر حیرت انگیز ہیں اور ایک اوپر کو میڈن کیا اور طرح طرح کی صنعتیں ہیں جو فہم سے بالکل باہر ہیں یہ نباتات کی حالت ہے جس میں عقل حیران ہے کیسے مانا جا سکتا ہے کہ یہ کام طبیعت نوعیہ کے ہیں ایک گھاس کی پتی کے بننے میں بھی یہ بات قابل تسلیم نہیں کہ اس کو طبیعت نوعیہ نے بنایا ہے۔

غضب ہے کہ عقل پرستوں نے تمام دنیا کے کاروبار کو طبیعت نوعیہ کے سپرد کر دیا ہے انسان جس طرح پیدا ہوتا ہے کیا سمجھ میں آتا ہے کہ کیسے بن جاتا ہے یہاں بھی عقلاء زمانہ نے یہی کہہ دیا ہے کہ رحم کی قوت طبعیہ بچے کو بناتی ہے اور اسی سے اس کا گوشت پوست ہڈی سب بن جاتی ہے اور اس سے اس میں جان پڑ جاتی ہے اور جب اس کی خلقت پوری ہو جاتی ہے تو اسی کے اثر سے بچہ باہر آ جاتا ہے میں کہتا ہوں کہ یہ صرف دل کو سمجھ لینے کی باتیں ہیں۔

تکرار مشاہدے کا اثر:

اور اصل اس کی صرف اتنی ہے کہ دن رات پیدائش دیکھنے اور سننے سے استبعاد رفع ہو گیا ہے اور اس کو ایک معمولی کام سمجھ لیا گیا ہے اگر یہ کام اس کثرت سے نہ ہوتا اور کہیں سے اتفاقیہ ایک واقعہ ایسا نہ ہوتا کہ کسی عورت کے پیٹ میں سے جیتا جاگتا بچہ پیدا ہوا ہے تو آپ ہی مارے تعجب کے انکار کر دیتے میں دعویٰ کرتا ہوں کہ ایک بچہ کی جس وقت سے وہ ہوش سنبھالے اس بات کی پوری نگرانی کرو کہ ولادت کا طریقہ کبھی اس کے کان میں نہ پڑنے پاوے یہاں تک کہ وہ بڑا ہو جائے اور تمام علوم و فنون اور صنعت و حرفت اور سائنس کی تعلیم پا لے اور کالج کا پروفیسر بھی ہو جائے اس وقت اس سے ایک دن یوں کہو کہ ایک بات عجیب سنی ہے کہ ایک عورت کے بچہ اس طرح پیدا ہوا تو میں دعویٰ کے ساتھ کہتا ہوں کہ وہ اس کے جواب میں فوراً یہی کہے گا کہ یہ بات عقل کے خلاف ہے اور ایسا ہونا ناممکن ہے۔

اور واقعی یہ بات دراصل ہے ہی عقل سے باہر لوگوں کی عقلیں دیکھتے دیکھتے عادی ہوگئیں ہیں اور جس چیز کا بار بار مشاہدہ ہوجاتا ہے اس سے استبعاد جاتا رہتا ہے سمجھ میں تو نباتات کی بھی پیدائش نہیں آتی تھی مگر بار بار دیکھنے سے استبعاد رفع ہوگیا۔ اب یہ انسان کی پیدائش اس سے بھی عجیب ہے جس میں ان تمام صنعتوں کے ساتھ جو کہ نباتات میں تھیں یعنی نوک پلک رنگ روغن صورت شکل نشوونما وغیرہ وغیرہ ایک صفت متحرک بالارادہ ہونا یعنی جاندار ہونے کی بھی موجود ہے جو ان سے بدرجہا بڑھی ہوئی اور حیرت انگیز ہے اور نرا متحرک بالارادہ بھی نہیں بلکہ عاقل اور سمجھدار اور سمیع اور بصیر ہونا بھی ہے جس کی وجہ سے انسان تمام متحرک بالارادہ چیزوں (حیوانوں) سے بھی ممتاز ہے۔ نباتات ہی کی صنعتیں حیرت میں ڈال دیتی ہیں چہ جائیکہ اس میں ارادہ پیدا ہونا اور ارادہ کے ساتھ عقل وفہم ادراک کلیات وجزئیات فلسفہ کی کتابوں میں حواس کی بحث دیکھئے۔ عقلاء حیران ہوگئے ہیں اور یہ کہہ اٹھے ہیں کہ ان کی ماہیت اور کیفیت معلوم نہیں سوائے اس کے کہ یہ حواس انسان میں موجود ہیں جن چیزوں کی ماہیت عقلاء کی بھی سمجھ میں نہ آوے ان کی نسبت یوں کہنا کہ ان کو بے عقل اور بے ارادہ والی چیز نے پیدا کیا ہے ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح صحیح ہے یہ روزمرہ کے کارخانے ہیں جن کو برابر دیکھتے ہیں یہ بھی ہماری سمجھ سے باہر ہیں عقل اتنی بھی کام کی نہیں جو ان کو ہی سمجھ لے۔

قوت عقل کی حد:

اس سے معلوم ہوا کہ عقل کی طاقت بہت محدود ہے تو صحیح طریقہ یہی ہوگا کہ اس کی طاقت کو محدود سمجھا جائے اور جہاں تک اس سے کام لینا چاہیے وہیں تک کام لیا جانے اس کی طاقت کی حد یہ ہے کہ احکام الٰہی کو سمجھ لے اور اس کی تعمیل کرے اور یہ اس کی طاقت سے باہر ہے کہ ان کی لم کو سمجھ لے جیسا کہ تکوینیات میں بھی عقل کو اتنا ہی دخل ہے کہ اسباب کو سمجھ کر ان کو استعمال کرتی ہے جس سے اس پر نتائج مترتب ہوجاتے ہیں اور اگر ان کی لم دریافت کرنے کو چلے تو ایک قدم بھی نہیں چل سکتی اور نتیجہ اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ اسباب کے استعمال سے بھی رہ جاتے اور مسببات سے منقطع نہ ہوسکے اس طرح دنیا کا کوئی مقصود بھی حاصل نہیں ہوسکتا۔ مثلاً آگ سے کھانا پکتا ہے تو اتنا دخل تو عقل کو ہے کہ آگ جلانے کی ترکیب کو سمجھے اور اس کے موافق عمل کرے اس سے کھانا پک جائے گا اور مقصود حاصل ہوجائے گا اور اگر اس میں دخل دے کہ اس کی لم کیا ہے اور آگ سے کھانا کیوں پک جاتا ہے اور یوں چاہے کہ جب تک لم معلوم نہ ہوگی اس وقت تک آگ کا استعمال نہ کروں گا تو اس لم کے دریافت کرنے میں سارا وقت بلکہ ساری عمر ختم ہوجائے گی اور لم

معلوم نہ ہو سکے گی اور جو مقصود ہے یعنی کھانا تیار ہونا وہ کبھی حاصل نہ ہوگا۔

غرض عقل کو اس کی حد تک رکھنے کی ضرورت ہے تو ثابت ہوا کہ عقل بے کار چیز تو نہیں ہے اس سے کام لینا چاہیے مگر جب تکوینیات میں اس کی یہ حالت ہے کہ ایک حد تک کام دے سکتی ہے اور اس سے آگے کام نہیں دے سکتی تو تشریعیات میں اسکی طاقت غیر محدود کیسے ہوگی تو صحیح طریقہ یہی ٹھہرا کہ تشریعیت میں بھی اس کو ایک حد تک تو خاص دخل دیئے دو اور اس سے آگے معطل سمجھو وہ حد یہی ہے کہ احکام شرعی کو سمجھو کہ کس طرح ادا ہو سکتے ہیں اور اس کے موافق ادا کرو پھر اس نتیجے کے منتظر رہو جو اس پر موعود ہے حق تعالیٰ اس نتیجہ کو ضرور مرتب کریں گے جیسے تمہارے آگ جلانے اور ہانڈی چولہے پر رکھ دینے پر نتیجہ مرتب کر دیتے ہیں کہ کھانا پک جاتا ہے نہ آپ کو آگ کے گرم ہونے کی اور اس سے کھانا پک جانے کی لم دریافت کرنے کی ضرورت ہے اور نہ احکام الٰہی میں علت نکالنے اور مصالح دریافت کرنے کی حاجت ہے اور اگر علت چھانٹو گے تو ان مقاصد سے ایسے ہی رہ جاؤ گے جیسے آگ کے گرم ہونے کی لم دریافت کرنے میں کھانا نصیب ہونے سے رہ جاتے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب حق تعالیٰ نے تکوینیات میں آپ کو تصرف نہیں دیا تو تشریعیات میں بھی یہی سمجھ لو کہ تصرف نہیں دیا دونوں باتوں میں تصرف کا حق صرف حق تعالیٰ ہی کے واسطے سمجھو بس آپ کا کام تو محض انقیاد ہے۔ یہ بیان ہوا اس کام کا جو حق تعالیٰ کا ہے یعنی تصرف۔

مومن کا کام:

اب اس کام کا بیان سنو جو تمہارا ہے وہ انقیاد ہے اور یہ انقیاد دو طرح کا ہوتا ہے ایک اضطراری اور ایک اختیاری۔ اضطراری تو یہ ہے کہ جتنے کام دنیا میں ہو رہے ہیں ان سب میں ہم مجبور ہیں اور جیسا حق تعالیٰ چاہتے ہیں ویسا ہی ہوتا ہے موت حیات صحت مرض کوئی چیز ہمارے اختیار میں نہیں اور نہ وہ اسباب ہمارے اختیار میں ہیں جو ان میں موثر ہیں جیسے گرمی سردی بارش وغیرہ ان سب میں ہم کو انقیاد زبردستی کرنا پڑتا ہے کہ جو وہ چاہتے ہیں ویسا ہی ہوتا ہے ہمارے ارادہ کے موافق کچھ بھی نہیں ہوتا پس جیسا یہ اضطراری انقیاد ہم کو کرنا پڑتا ہے ایسے ہی انقیاد اختیاری بھی کرو اور وہ یہ ہے کہ ان تکوینیات پر جزع فزع ناشکری بے صبری مت کرو۔ موت ہو تو اس میں حدود شرعیہ سے نہ بڑھو حیات ہو تو اس میں بھی احکام حدود شرعیہ کا خیال رکھو بیماری ہو تو تب بھی بیہودہ کلمات مت بکو صبر کرو۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ بیماری میں صبر کرنا اختیار سے خارج ہے یہ غلط ہے صبر یہ نہیں کہ اس تکلیف کا کوئی اثر ہی ظاہر نہ ہو یہ بے شک اختیار سے خارج ہے اسی حد تک آدمی

صبر کا مکلف ہے جہاں تک اس کا اختیار ہے مثلاً اگر شدت تکلیف میں کراہے یا بضرورت اپنا حال ظاہر کرے یا بے اختیار تڑپے تو اس میں کچھ حرج نہیں لیکن اس حالت میں بھی آدمی خدا تعالیٰ کی شان میں بیہودہ کلمات منہ سے نکالنے پر مجبور نہیں یہ فعل اس کا فعل اختیاری ہوگا اگر ایسا کرے گا تو گناہ ہوگا یہ شخص انقیاد اختیاری کا ایسے وقت بھی مکلف ہے۔

مثلاً کسی کے گردہ میں درد ہے تو اس کو چاہیے کہ صبر کرے اور قضا وقدر پر راضی رہے اور جو افعال اس سے بے اختیار سرزد ہوں مثلاً تڑپنا چلانا یہ خلاف رضا کے نہیں یہ فعل طبعی ہے خلاف رضا یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی شکایت دل میں ہو مثلاً یوں سمجھے کہ مجھ ہی کو اس مصیبت کا ساتھ خاص کیوں کیا کچھ میں نے ہی خطا کی تھی اور لوگ بڑے بڑے گناہ کرتے ہیں اور کچھ بھی نہیں ہوتا یا زبان سے شکایت کے کلمات کہے یہ باتیں بے شک رضا کے خلاف ہیں جن میں طبعاً انسان مجبور نہیں باقی تڑپنا اور چلانا طبعی بات ہے یعنی طبعاً انسان اس میں مجبور ہے۔ غرض مصیبت میں صبر کرنا اور حدود شرعیہ کا خیال رکھنا یہ انقیاد اختیاری ہے اور عقل کی بات بھی یہی ہے کیونکہ اگر کوئی مر گیا یا کوئی چیز جاتی رہی تو جو چیز گئی وہ تو گئی وہ تو لوٹ نہیں سکتی لیکن اس کے جانے کے ساتھ ایک چیز ایسی وابستہ ہے جو اب بھی ہمارے اختیار میں ہے وہ رضا حق ہے اگر ہم صبر کریں گے اور یہ سمجھیں گے کہ یہ جو کچھ ہوا حق تعالیٰ کے حکم سے ہوا اور ان کے حکم کو دل سے راضی ہو کر تسلیم کر لیں گے تو ان کی رضا ہم کو حاصل ہوگی اس کا حاصل کر لینا ہمارے اختیار میں ہے تو اس کو بھی کیوں کھویا اور اگر بے صبری کی اور جزع فزع کیا اور حق تعالیٰ کے حکم کو خوشی سے تسلیم نہ کیا تو وہ چیز تو لوٹنے کی نہیں یہ بھی ہاتھ سے گئی دنیا کا بھی نقصان ہوا اور آخرت کا بھی۔ ظاہر ہے کہ یہ بات عقل کے بالکل خلاف ہے۔

پھر اکثر یہ بھی ہے کہ جو کوئی صبر کرتا ہے اس کو اس چیز کا نعم البدل مل جاتا ہے اور اگر دنیا میں نہ بھی ملا تو آخرت کا وعدہ تو ہے ہی آخرت میں جب آدمی اس بدل کو دیکھے گا تو آنکھیں کھل جائیں گی کیونکہ اس وقت وہ چیز ملے گی جس سے اس گمشدہ چیز کو کچھ بھی نسبت نہیں ہوگی۔

نیم جاں بستاند وصد جاں دہد
انچہ در وہمت نیاید آں دہد

فانی اور حقیر جان لیتے ہیں اور اس کے بدلے میں باقی جان عطا کرتے ہیں جو خواب وخیال میں نہیں آتا وہ عطا کرتے ہیں۔

جب عقل کی بات بھی یہی ہے اور حق تعالیٰ کا حکم بھی یہی ہے تو آدمی ہمت کر کے اس کو کیوں نہ اختیار کرے اور یوں سمجھے کہ انقیاد اضطراری تو کرنا ہوتا ہی ہے انقیاد اختیاری بھی کیوں نہ

کریں تا کہ آخرت کا سامان ہو جائے۔

یہ انقیاد تو تکوینیات میں ہوا ہے، رہے تشریعیات یعنی احکام تو اس میں انقیاد اضطراری ہوتا ہی نہیں کیونکہ انسان احکام شرعیہ میں کسی عمل پر مجبور نہیں ہے جیسے کہ تکوینیات میں تھا کہ کوئی واقعہ تکوینی انسان کے اختیار سے نہیں ہوتا تشریعیات میں یہ بات نہیں ہے یہاں انسان کو اختیار دیا گیا ہے کیونکہ امتحان مقصود ہے اسی لئے اس کو خیر وشر بتلا دیا گیا لیکن ساتھ ہی اختیار بھی دیا گیا ہے کہ چاہے وہ خیر کو اختیار کرے اور چاہے شر کو، تو یہاں صرف انقیاد اختیاری ہو سکتا ہے انقیاد اضطراری یہاں نہیں ہے اور وہ انقیاد اختیاری، تشریعیات میں یہ ہے کہ احکام کو بے چون وچرا بجالاؤ ہمت کرو اور کسی کی ملامت سے مغلوب مت ہو بعض احکام تو اس قسم کے ہیں جن پر خلق کی طرف سے عادۃً ملامت نہیں ہوتی جیسے نماز وروزہ وزکوٰۃ وغیرہ اور بعض احکام اس قسم کے ہیں جن پر ملامت بھی ہوتی ہے وہ شادی غمی کے احکام ہیں۔

آیت میں لفظ محیای ومماتی کا نکتہ:

آیت میں موت وحیات کا لفظ صلوٰۃ ونسک کے بعد جو خصوصیت سے لایا گیا ہے اس سے بھی اشارۃً معلوم ہوتا ہے کہ حیات وموت کے متعلق احکام میں کوئی خاص بات ہے۔ وہ بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ ان کی تعمیل سے ایک مانع موجود ہے اس واسطے ان کو خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا گیا لہٰذا ان کے احکام میں انقیاد زیادہ اہم ہوا اور ہمت کی زیادہ ضرورت ہوئی ان میں خاص اہتمام سے انقیاد کرو۔ یعنی ملنے جلنے میں شادی بیاہ میں موت میں خاص طور سے خیال رکھو کہ کوئی کام خلاف شریعت نہ ہونے پائے ان میں جس قدر گڑبڑ ہو رہی ہے محتاج بیان نہیں خصوص موت کے احکام میں اور اسی طرح میراث کے احکام میں جو کہ موت ہی کے احکام کا ایک جزو ہے بڑی بے احتیاطی ہو رہی ہے مثلاً میت کے وصیت کی پرواہ نہیں کی جاتی حالانکہ جہاں تک شریعت نے وصیت کا حق قائم کیا ہے یعنی ایک ثلث وہ اس کی ملک ہے وصیت کرنے کے بعد کسی کو اس میں مداخلت کا حق نہیں اگر اس کے خلاف کیا گیا تو اس کی حق تلفی ہوگی اور حق العبد رہ جائے گا علیٰ ہذا ورثہ کے حقوق کی پرواہ نہیں کی جاتی بعضوں کو تو محروم ہی مان لیا گیا ہے جیسے بہنیں کہ ان کو تو کوئی حصہ ہی دیتا نہیں اور جن کو محروم بھی نہیں مانا گیا ہے ان پر بھی تقسیم نہیں کرتے جس کے قبضہ میں جو مال ہے وہی اس کا مالک ہے جو چاہتا ہے تصرف کرتا ہے اس غلطی میں پڑھے لکھے لوگ بھی گرفتار ہیں اور یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ہم سب ایک ہی ہیں باہم ایک دوسرے کو تصرف کی اجازت بھی ہے پھر تقسیم کی کیا ضرورت ہے یہ تاویل وہی شخص کرتا ہے جو قابض ہے کیونکہ اس کا اس میں نفع ہے اس کو چاہے کہ زمین جائیداد

پر قبضہ دوسرے کو دے دے اور جب اس کو ہر قسم کا تصرف حاصل ہو جاوے اس وقت اس کے تصرف کی نسبت یہ کہے کہ ہم سب ایک ہی ہیں یا ہم ایک دوسرے کو تصرف کی اجازت ہے اس نے اگر فائدہ اٹھایا گویا ہم ہی نے اٹھایا ایک ہی بات ہے ایسے کوئی کرے تو ہم جانیں۔ صاحبو! حقوق کا معاملہ ہے باوجود قدرت کے کوئی اپنا ایک پیسہ کا حق چھوڑنے پر بھی راضی نہیں ہوتا اس کو اس معیار سے دیکھ لیجئے کہ آپ خود تصرف نہ کیجئے دوسرے کو تصرف کرنے دیجئے پھر دیکھئے آپ کا دل اس کو گوارا کرتا ہے یا نہیں ہرگز گوارا نہیں کرے گا اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ گو دوسرے وارث شرما شرمی سے کچھ نہ کہیں مگر دل سے اجازت کوئی نہیں دیتا ہے۔ تو یہ اجازت بطیب خاطر نہیں ہوتی پس ایک وارث کا قبضہ کل مال میں حرام ہوا خصوصاً اس صورت میں کہ بعض ورثہ نابالغ بھی ہوں کہ اس صورت میں تو اگر وہ زبان سے تصریحاً بھی اجازت دیں اور طیب خاطر بھی ہو تب بھی یہ اجازت معتبر نہیں کیونکہ نابالغ کا کوئی تبرع کا تصرف صحیح نہیں۔ یہ سب حقوق العباد ہیں ان میں بڑی احتیاط چاہیے خلاصہ یہ کہ ہمارا ضروری کام انقیاد ہے ہم کو تمام احکام تشریعیہ و تکوینیہ اور موت و حیات کے احکام میں انقیاد چاہیے ذرا بھی کوتاہی نہ ہو اور جتنی کوتاہی ہوگی اتنا ہی اسلام ناقص ہوگا۔

اس لئے ضرورت ہے کہ ایک ایک شعبہ کو لیا جائے اور اس میں دیکھا جائے کہ ہماری حالت کیا ہے آیا وہ شعبہ ہم کو علی وجہ الکمال حاصل ہے یا نہیں؟ احکام تشریعیہ کو ہم پورا پورا بجا لاتے ہیں یا نہیں؟ اور احکام تکوینیہ کے محل میں ہمارا اختیاری انقیاد پورا ہے یا نہیں؟ ورموت کے احکام کی تعمیل ہم پوری کرتے ہیں یا نہیں پھر اس کے لئے ضرورت ہوگی علم دین کی۔ کیونکہ کسی حکم کی تعمیل جب تک اس کا علم نہ ہو کیسے ہو سکتی ہے اور مجموعہ احکام کا نام دین ہے تو علم دین کی ضرورت ہوئی۔

معیار اسلام کامل:

اس تقریر سے اسلام کامل کا معیار نکل آیا وہ معیار یہ ہے کہ تمام حالات ہمارے حق تعالیٰ کے حکم کے موافق یعنی شریعت کے مطابق ہوں ہم احکام تشریعیہ اور تکوینیہ اور احکام موت اور حیات میں سب میں شریعت کے موافق کام کریں اب اس معیار سے دیکھا جائے کہ اسلام ہمارا کامل ہے یا نہیں لیکن جب ہم اس میں غور کرتے ہیں تو حالت یہ نظر آتی ہے۔

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

سارا بدن داغ داغ ہے مرہم کہاں کہاں رکھیں۔

احکام تشریعیہ کو دیکھتے ہیں تو ان کی تعمیل نہیں اور تکوینیہ کو دیکھتے ہیں تو ان کی تعمیل نہیں موت ہماری

شریعت کے موافق نہیں حیات ہماری شریعت کے موافق نہیں پھر کیسے یہ خیال کیا جائے کہ ہمارا اسلام کامل ہے اور ہم کس بات پر بھولے ہوئے ہیں اور امید لگائے بیٹھے ہیں کہ ثمرات کامل ملیں گے۔

اگر اس کے ماننے میں کچھ شک ہو تو میں اس کے جاننے کی ایک سہل ترکیب بتلاتا ہوں جس سے یہ شک رفع ہو جائے گا وہ یہ ہے کہ ایک کتاب فقہ کی لیجئے اور ایک کتاب حدیث کی لیجئے اور اپنے حالات کو ان سب پر منطبق کرتے جایئے اس وقت یہ شک رفع ہو جائے گا اور آنکھوں سے نظر آ جائے گا کہ ہمارا کوئی حال بھی صحیح نہیں سب سے اول تو یہی معلوم ہوگا کہ ہم بہت سے احکام کی تعمیل ہی نہیں کرتے پھر جن کی تعمیل بھی کرتے ہیں ان کے اجزاء بھی ناقص اور ادھورے نظر آئیں گے چنانچہ بعض جزئیت کو لے لیجئے مثلاً نماز کہ اس کے جس جزو کو لے لیجئے وہی صحیح نہیں قیام ہے وہ ٹھیک نہیں قعود ہے وہ ٹھیک نہیں سجود ہے وہ ٹھیک نہیں تو جس چیز کے اجزاء ٹھیک نہیں وہ مجموعہ بھی ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ ثابت ہوا کہ ہماری نماز ٹھیک نہیں۔ نماز عبادات کا ایک فرد اکمل ہے بطور مثال کے میں نے اس کو بیان کر دیا۔ جب اس کی یہ حالت ہے تو اور باقی عبادات کی حالت اس سے بھی گری ہوئی ہوگی غرض عبادات کا ایک فرد تو ناقص ثابت ہوا اور صلوتی اور نسکی میں ہم قاصر ثابت ہوئے۔

اب آگے چلئے محیای ومماتی (میری زندگی اور میری موت) میں زندگی کے احکام دیکھئے شادی بیاہ میں تمام بدعات موجود ہیں شریعت کے موافق ایک کام بھی نہیں تو محیای ومماتی میں بھی ہم قاصر ثابت ہوئے غرض زندگی اور موت کا ہر کام ہمارا اپنے نفس کے موافق ہے صورت ہماری شریعت کے موافق نہیں لباس ہمارا شریعت کے موافق نہیں اٹھنا بیٹھنا ہمارا شریعت کے موافق نہیں۔ لین دین ہمارا شریعت کے موافق نہیں۔ اخلاق کو دیکھئے عجب ہم میں موجود ریا ہم میں موجود دوسرے کی تحقیر ہم میں موجود غرض اخلاق ذمیمہ ہم میں سب موجود ہیں۔ اور اخلاق حمیدہ میں سے ایک بھی نہیں صبر نہیں شکر نہیں تسلیم نہیں رضا نہیں جس وقت آپ کتابوں سے اپنے حالات کو ملائیں گے تو آنکھیں کھل جائیں گی اور معلوم ہو جائے گا کہ ہم کس دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں، ور کس بات پر ہم نے خیال جما رکھا ہے کہ ہم کو ثمرات آخرت ملیں گے۔ غرض ہمارا ظاہر اور باطن اور اخدق اور اعمال کچھ بھی درست نہیں۔ ہماری حالت یہ ہے کہ سر سے پیر تک ہم گناہوں ہی میں ملوث رہتے ہیں۔ ہاتھ ظلم میں مشغول ہے زبان غیبت میں آنکھ نظر بد میں دل نیز اللہ میں اٹکا ہوا ہے کس حالت کو کہا جائے کہ درست ہے اسی سے متاثر ہو کر حکیم سنائیؒ کہتے ہیں۔

اے بہ سرا پردہ یثرب بخواب   خیز کہ شد مشرق ومغرب خراب

اے وہ ذات اقدس جو مدینہ منورہ میں آرام فرما ہے اٹھیے کہ مشرق و مغرب خراب و خستہ ہو چکے۔

آج کا تمدن اور ہمارا مذاق:

اور معاشرات تو ہمارے اس قدر گندے ہیں کہ بیان نہیں ہو سکتا لوگ تمدن پکارتے پھرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آج کل زمانہ تمدن کا ہے آج کل تمدن کو بہت ترقی ہے۔ اس کی ہر قسم کی اصلاح ہو گئی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ مذاق ہی الٹے ہو گئے ہیں ان کو یہی نہیں معوم ہے کہ صحیح تمدن کا ہے سے حصل ہوتا ہے اور کس چیز سے اس کی اصلاح ہوتی ہے۔ مختصر اس لیجئے کہ تمدن کی بنا تمام تر تواضع اور انکسار پر ہے کیوں کہ تمدن کی روح یہ ہے کہ آرام سے بسر ہو کسی کو کسی سے تکلیف نہ پہنچے اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے جب ہر شخص دوسرے کو آرام پہنچانے کی کوشش کرے اور یہ بات جب حاصل ہو سکتی ہے کہ دوسرے کو یا دوسرے کے حق کو اپنے آپ یا اپنے حق سے بڑا سمجھے اور اپنے آپ کو یا اپنے حق کو اس سے یا اس کے حق سے کمتر سمجھے اسی کا نام تواضع ہے پس تمدن کی بنا تواضع پر ہوئی اور آج کل کا یہ مذاق اور تعلیم ہے کہ آدمی کے لئے خودداری بھی ضروری چیز ہے یعنی اپنے آپ کو بڑا ثابت کرنا ہر بات میں اسی کی کوشش کی جاتی ہے افعال میں حرکات و سکنات میں بول چال میں غرض سر سے پیر تک ہمہ تن خودداری بنے ہوئے ہیں اس کا دوسرا نام کبر ہے یہ ضد ہے تواضع کی جس پر تمدن کی بنا تھی افسوس تمدن کا نام لیا جاتا ہے اور اس کے لئے وہ چیز اختیار کی جاتی ہے جو اس کی ضد ہے ماشاء اللہ کیسا صحیح مذاق ہے حیرت کی بات ہے کہ آج کل تمدن اس کا نام رکھا گیا ہے کہ ہر شخص اپنے آپ کو بڑا سمجھے اور دوسرے کے نظر میں اپنے آپ کو بڑا ثابت کرے جب ہر شخص میں یہی مادہ ہوگا تو وہ صرف اس بات کی کوشش کرے گا کہ مجھ کو آرام پہنچے خواہ دوسرے کو تکلیف ہو یا کچھ ہو پھر تمدن کی روح یعنی آرام کی زندگی کیسے میسر ہو گی۔ میری سمجھ میں تو یہ بات نہیں آتی۔

یہ تو ایسا ہے جیسے کسی کو اپنے صحت منظور ہو اس کے لئے وہ چیز استعمال کرے جو ضد ہے صحت کی، یعنی سنکھا کھائے تو اس سے جیسی صحت حاصل ہو گی معلوم ہے۔ مگر کچھ ایسے مذاق بگڑے ہوئے ہیں کہ تمدن کے لئے وہ چیز استعمل کی جاتی ہے جو اس کی ضد اور اس کی جڑ کاٹنے والی ہے یعنی کبر اگر سنکھیا کھا کر صحت ہو سکتی ہے تو کبر سے تمدن بھی حاصل ہو سکتا ہے لیکن ایک زمانہ ہے جو اس بات پر متفق ہو رہا ہے کہ تمدن کی ترقی جو کچھ بھی ہو سکتی ہے وہ خودداری اور تکبر سے ہو سکتی ہے اور علی قدر و مراتب تقریباً ہر شخص اس میں مبتلا ہے کوئی دوسرے سے چھوٹا بننا نہیں چاہتا سبھی چاہتا ہے کہ میں ہی بڑا بنوں کسی بات میں دوسرے سے پیچھے نہ رہوں اور اس کی یہاں تک نوبت ہے کہ اگر دوسرا کسی

بات میں آگے بڑھنے لگےتو اس کے روکنے کی تدبیر کی جاتی ہے کہ یہ ہم سے نہ بڑھ جائے اگر چہ ہم کو بھی بڑھنا نصیب نہ ہو مگر یہ بھی نہ بڑھنے پائے کسی کی خوشی عیشی تمول فارغ البالی عزت دیکھ کر چین نہیں آتا اور یہی جی چاہتا ہے کہ یہ نعمت اس سے چھن جائے یہ اسی بڑے بننے کے نتائج ہیں۔

اور یہ دوسرا مرض پیدا ہوا اس کا نام حسد ہے تمام عقلاء نے ان اخلاق کو اخلاق ذمیمہ میں شمار کیا ہے مگر آج کل یہ اخلاق اخلاق فاضلہ میں شمار ہیں اور انہی پر ترقی وتمدن وجملہ فضائل کی بنا کی گئی ہے۔

اخلاق ذمیمہ کے دنیوی نتائج:

صاحبو! ذرا ہوش سے کام لو حسد اور کبر تو وہ چیزیں ہیں جو تمام برائیوں کی جڑ ہے ان سے نتیجہ کبھی اچھا نہیں نکل سکتا شرعاً تو یہ گناہ ہیں ہی، دنیا کے نتائج بھی جو ان سے پیدا ہوتے ہیں وہ بھی ایسے ہیں جس سے ایک مخلوق کی زندگی تلخ ہو جاتی ہے سب جانتے ہیں کہ انسان کی طبیعت میں تمدن ہے یعنی مل جل کر رہنا اور انسان دوسرے حیوانات کی طرح نہیں ہے جن کو مل جل کر رہنے کی ضرورت نہیں ان کے کھانے پینے کی چیز ہر جگہ موجود ہے صبح کو اٹھے اور جنگل میں چر کر پیٹ بھر لیا اور شام کو اپنے ٹھکانے میں آ کر آرام کرنے لگے انسان میں یہ بات کہاں اس کی تمام ضروریات ایک دوسرے کی اعانت سے مہیا ہوتی ہیں اسی کا نام تمدن ہے بدون اس کے انسان کی زندگی نہیں ہو سکتی جب اس کو ضرورت ہے تمدن کی تو دوسرے سے بھی ملنے کی ضرورت ہے دو باتوں کے لئے ایک اپنا کام نکالنے کے لئے کیونکہ اس کا کام دوسرے پر موقوف ہے۔ دوسرے اس دوسرے شخص کو مدد دینے کے لئے کیونکہ وہ بھی اس کا محتاج ہے یہ حقیقت ہے تمدن کی اور یہ جب ہو سکتا ہے کہ دوسرے کو نفع پہنچانے کا خیال بھی ہو اور یہ خیال حسد کی ضد ہے اور حسد اس کی ضد ہے کیونکہ حسد کے معنی ہیں دوسرے کی نعمت کی زوال کی تمنا کرنا اور تمدن میں ضرورت تھی کہ دوسرے کو فائدہ پہنچانے اور اس کے حصول کے لئے نعمت کی کوشش کرنے کی تو ثابت ہو گیا کہ حسد ضد ہے تمدن کی۔

اسی طرح اس کا کام بھی جب ہی نکل سکتا ہے کہ دوسرے کے سامنے اپنی احتیاج لے جائے اور یہ مقتضی ہے اس بات کو کہ اس کے سامنے بڑا بن کر نہ جایا جائے ورنہ وہ التفات کیوں کرے گا یہ حقیقت ہے تواضع کی جو ضد ہے کبر کی اور کبر اس کی ضد ہے تو ثابت ہوا کہ کبر اس کی ضد ہے۔ لیجئے عقلاً ثابت ہو گیا کہ حسد اور کبر تمدن کے منافی ہیں سو یہ ان میں عقلی خرابیاں ہیں قطع نظر اس سے کہ یہ شرعی گناہ بھی ہیں۔ شریعت مطہرہ کی خوبی دیکھئے کہ ہر کام میں وہ بات سکھلائی جو تمام خوبیوں کی جڑ ہے اور ان باتوں سے منع کیا ہے جو برائیوں کی جڑ ہیں۔ شریعت ایک ایسی چیز ہمارے ہاتھ میں دی گئی

ہے کہ آنکھیں بند کر کے اس کے ساتھ چلے جائیے۔ کہیں کوئی خرابی پیش نہ آئے گی دنیا کی بھلائی بھی اس میں ہے اور آخرت کی بھلائی بھی۔ مگر ہم لوگوں نے اس کو ایسا چھوڑا ہے کہ ہمارے کسی کام میں بھی اس کا دخل نہیں رہا ہمارا ظاہر شریعت کے موافق نہیں ہمارا باطن نہیں ہمارے اخلاق نہیں ہمارے اعمال نہیں ہماری معاشرت نہیں پھر اس کے نتائج سامنے آتے ہیں جس کو فرماتے ہیں **ظهر الفساد في البر والبحر** تمام عالم فساد سے پر ہو رہا ہے اسی فساد عام کو حکیم سنائی ؒ کہتے ہیں۔

اے بہ سرا پردۂ یثرب بخواب　　　خیز کہ شد مشرق و مغرب خراب

اے وہ ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جو مدینہ منورہ میں آرام فرما ہے اٹھئے کہ مشرق و مغرب خرابی سے معمور ہو گئے۔ ہماری حالت یہ ہے۔

چوں گرسنہ میشوی سگ میشوی　　　چونکہ خوردی تند و بدرگ میشوی

جب بھوکا ہوتا ہے کتا بن جاتا ہے اور جب شکم سیر ہوتا ہے تو تندرو اور ظالم بن جاتا ہے۔ نہ ہمارے عیش کی حالت درست اور نہ مصیبت کی درست۔ دو ہی حالتیں انسان پر آتی ہیں عیش یا مصیبت اور دونوں درست نہیں تو مطلب یہ ہے کہ کوئی حالت بھی درست نہیں اور یہ حالت صرف عوام کی نہیں بلکہ اکثر خواص کی بھی قریب قریب یہی حالت ہے۔

مصلحین قوم کی حالت:

اور لطف یہ ہے کہ ہر فرد کی اپنی حالت تو یہ ہے اور اس پر دوسروں کی اصلاح کرنے کا خیال ہے۔ جب خود اپنی ہی اصلاح نہیں کرتے تو دوسروں کی اصلاح کیا خاک کریں گے۔

یہی وجہ ہے کہ اصلاح کرنے چلے تو ایسی اصلاح کی جیسے کوئی شخص طبیب بن گیا تھا اس کو تمام دواؤں میں صرف جمال گوٹہ یاد تھا ہر مریض کو یہی دیتا تھا قصہ اس کا یہ ہے کہ ایک طبیب کے یہاں ایک شخص رہتا تھا جو دوائیں گھوٹا پیسا کرتا تھا کبھی اس نے حکیم صاحب کے حکم سے جمال گوٹے کی گولی بنائی تھی وہ گولی مطب میں اکثر ایسے لوگوں کو دی جاتی تھی جن کو مسہل کی ضرورت ہوتی تھی۔ انہوں نے دو چار مرتبہ جو بنائی تو نسخہ یاد ہو گیا۔ حکیم صاحب کا انتقال ہو گیا کوئی ان کا جانشین تھا نہیں ان کی نوکری جاتی رہی تو انہوں نے سوچا کہ حکیم صاحب یہ گولی اکثر دیا کرتے تھے اس کا نسخہ ہم کو یاد ہے لاؤ ہم بھی یہ کام شروع کر دیں چنانچہ حکیم بن بیٹھے اب جو آتا ہے دیدو گولی دو چار جگہ اتفاقی صحیح موقع پر کامیابی ہوئی اس واسطے شہرت ہو گئی اور ان کا دماغ چڑھ گیا اور سمجھے کہ جمال گوٹہ ہی ہے جو کچھ ہے اب ہر مریض پر اسی کی مشق ہونے لگی کوئی آیا کہ حکیم صاحب میرا گدھا کھویا گیا ہے کہا

دیدو گولی کسی عورت نے کہا میرا خاوند مجھ سے ناراض رہتا ہے کہا دے دو گولی غرض جو کچھ تھا جمال گوٹہ تھا ایک مریض آیا اس کے لئے آپ نے تجویز کیا کہ مادہ بہت بڑھ گیا ہے اس واسطے تنقیہ کی ضرورت ہے۔ دے دو گولی۔ گولی اتفاقاً کچھ تیز بنی ہوئی تھی۔ اور کچھ مریض کا معدہ ضعیف تھا بہت کثرت سے دست آئے ضعیف بہت ہو گیا خبر آئی کہ حکیم صاحب دست بہت آ گئے ہیں کمزوری زیادہ ہو گئی کہا آنے دو مادہ نکلتا ہے تھوڑی دیر میں پھر خبر آئی کہ اس کا برا حال ہے دستوں کے بند کرنے کی تدبیر کیجئے کہا نہیں مادہ رہ جائے گا تو برا ہو گا نکلنے دو پھر خبر آئی کہ جناب وہ مرا جاتا ہے کہا کوئی ڈر نہیں۔ مادہ نکل رہا ہے نکلنے دو حتیٰ کہ تھوڑی دیر میں خبر آئی کہ وہ مر گیا تو آپ اس کو دیکھنے گئے اور کہنے لگے اللہ رے مادے جس کے نکلنے پر یہ حال ہوا اگر وہ رہ جاتا تو کیا ہوتا۔ ہوتا کیا موت سے آگے بھی کوئی درجہ باقی رہا ہو گا وہ بھی حاصل ہو جاتا۔ یہی حالت ہماری ہے کہ قوم کا علاج کرنے چلے تو کیسا خوبصورت علاج کیا ہے ہم خود اپنے امراض تک تو جانتے نہیں مگر دوسروں پر مشق شروع کر دی ہمارے اندر نہ لحاظ ہے نہ شرم ہے نہ ادب ہے۔ نہ عقل ہے۔ نہ انجام بینی ہے بس اتنی لیاقت ہے کہ جس نے ہمارا کہنا نہ مانا اس پر فتویٰ لگا دیا کہ کافر ہے مشرک ہے دشمن دین ہے، بددین ہے تمام قوم میں فرقہ بندی کرا دی اور قوم کی قوت رہی سہی بھی کھو دی۔ بس یہی ایک فتویٰ یاد ہے جیسے اس شخص کو جمال گوٹہ (یا جلال گوٹہ) یاد تھا۔ آپس میں لڑ لڑا کر سب کی قوت کو کھو دیا یہ علاج کیا قوم کا کہ جتنے امراض قوم میں پہلے نہ تھے وہ بھی سب پیدا ہو گئے عداوت بغض کینہ حسد غیبت تحقیر وغیرہ وغیرہ۔ جس طبیب کا علاج ایسا خوبصورت ہو جس سے ایسے مہلک امراض پیدا ہوتے ہوں تو اس کی بدپرہیزی تو خدا جانے کیسی ہو گی کیا کہا جائے۔

خرابی کی جڑ:

ساری وجہ یہ ہے کہ طبیعت کو رائے کے تابع بنا لیا اور اہل رائے ہو گئے (بلکہ گپت رائے) صاحبو! ہماری آپ کی رائے کیا چیز ہے حق تعالیٰ کے حکم کے سامنے۔ بس رائے کو چھوڑیئے اور اطاعت وانقیاد اختیار کیجئے اطاعت اور انقیاد اور بندگی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ جس کے ساتھ اس تعلق کا دعویٰ کیا جاوے اس کے حکم کے سامنے اپنی رائے بھی باقی رہے اس کو اہل تحقیق سے پوچھو، کہتے ہیں۔

فکر خود رائے خود در عالم رندی نیست
کفر است دریں مذہب خود بینی و خود رائی

اپنی رائے اور فکر کو راہ سلوک میں کچھ دخل نہیں اس راہ میں خود بینی اور خود رائی کفر ہے۔

اس شعر میں رائے کی کس قدر مذمت ہے کہ اس کو کفر کہا ہے جو مقابل ہے ایمان کا معلوم ہوا کہ

رائے کے اتباع کرنے سے کسی درجہ میں ایمان بھی جاتا رہتا ہے۔

اور واقعی اتباع رائے کے بعض مراتب وہ بھی ہیں جن میں ایمان نہیں رہتا دیکھو شیطان کو سجدہ کا حکم ہوا تو اس نے اس میں رائے کی ٹانگ اڑائی اور کہا انا خیر منہ اس کی سمجھ میں یہ آیا کہ ادنی کو اعلیٰ کے سامنے سجدہ کرنا چاہیے نہ کہ الٹا اعلیٰ سجدہ کرے ادنیٰ کو اور میں اعلیٰ ہوں آدم سے کیونکہ میں آگ سے پیدا ہوا ہوں جو نورانی ہے اور وہ خاک سے پیدا ہوئے ہیں جو ظلمانی، یہ اس کی رائے تھی جس کا اس نے حکم الٰہی کے مقابلہ میں اتباع کیا پھر دیکھئے اس پر کیا حکم لگایا گیا کہ اس کو کافر اور ملعون کہا گیا۔ ثابت ہو گیا کہ خودرائی کی انتہا کفر تک پہنچ جاتی ہے تو یہ حکم بالکل صحیح ہو گیا جو اس شعر میں ہے۔

کفر است دریں مذہب خود بینی و خودرائی

اس راہ میں خود بینی اور خودرائی کفر ہے۔

صاحبو! مسلمان کے لئے رائے کیا چیز ہے تمہارا مذہب تو یہ ہونا چاہیے۔

رشتہ درگردنم افگندہ دوست   میبرد ہرجا کہ خاطر خواہ اوست

انہوں نے یہ حرکات پیدا کر رکھی ہیں جس طرف چاہتے ہیں متحرک کر دیتے ہیں۔

اپنی رائے کو فنا کر کے حکم الٰہی کے پیچھے پیچھے چلنا چاہیے اس کا مطلب یہ نہیں کہ عقل کو بالکل چھوڑ دیا جائے بلکہ یہ مطلب ہے کہ عقل سے صرف اتنا کام لیا جائے کہ اس سے حکم الٰہی کو سمجھ لیا جائے اور بس اس کے آگے عقل کو دخل نہ دیا جائے اور بعد علم احکام کے پھر حکم میں چون و چرا اور حیل و حجت نہ نکالی جائے۔

توضیح انقیاد:

اس کی ایک مثال ہے جس سے بخوبی یہ مضمون واضح ہو جاتا ہے کہ بچہ کو استاد پڑھانے بیٹھتا ہے اور قاعدہ سامنے رکھتا ہے اس میں کچھ حرف بنے ہوئے ہیں پہلے حرف پر انگلی رکھواتا ہے اور بچے سے کہتا ہے کہو الف اور دوسرے حرف پر انگلی رکھواتا ہے اور کہتا ہے کہو ب سب جانتے ہیں کہ بچہ کے ذمہ استاد کا انقیاد ہے یہاں انقیاد کی دو صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ بچہ اپنی عقل اور سمجھ کو بالکل چھوڑ کر بے سمجھی سے استاد کے الفاظ کی بعینہ نقل اتار دے مثلاً استاد کہتا ہے کہ اس حرف کو کہو الف تو بچہ بھی کہتا ہے اس حرف کو کہو الف، اور ایک صورت انقیاد کی یہ ہے کہ اتنا کام اپنی عقل اور سمجھ سے لے کہ ان پورے الفاظ کی نقل تو نہ اتارے بلکہ صرف اتنا کہے الف اور ب یہ دو صورتیں ہوئیں اور ایک تیسری صورت یہ ہے کہ لڑکا افراط کے درجہ میں عقلمندی سے کام لے اور استاد سے پوچھے کہ آپ جو اس حرف کو الف اور اس

حرف کو ب کہلواتے ہیں اس کی کیا وجہ ہے اس کا الٹا کیوں نہ کہا جائے کہ پہلے حرف کو ب کہا جائے اور دوسرے کو الف، اب میں پوچھتا ہوں کہ ان تینوں صورتوں میں سے صحیح صورت کون سی ہے آیا یہ صحیح ہے کہ بالکل عقل اور سمجھ سے کام نہ لے اور بے عقلی سے استاد کی نقل اتارے جائے یا یہ صحیح ہے کہ اتنی عقلمندی بگھارے کہ استاد سے الف کو الف کہنے کی وجہ پوچھے اور ب کو ب کہنے کی۔

میں خود ہی اس کا جواب دیئے دیتا ہوں کہ یہ دونوں شقیں غلط ہیں اور صحیح شق وہی درمیانی ہے کہ نہ تو استاد کی نقل اتارے اور نہ اس کے حکم میں حیل وحجت کرے کہ اس سے الف کو الف کہنے کی اور ب کو ب کہنے کی وجہ پوچھنے لگے ان دونوں باطل شقوں میں کیا غلطی ہے یہی غلطی تو ہے کہ ایک شق میں تو عقل کو بالکل چھوڑ دیا گیا اسی واسطے اگر کوئی بچہ ایسا کرے تو استاد اور سب سننے والے یہ کہیں گے کہ ابھی یہ بچہ بالکل ناسمجھ ہے بات کو سمجھتا ہی نہیں ابھی اس کو پڑھانا فضول ہے اور دوسری شق میں یہ ہوا کہ عقل اور ذہانت سے اتنا کام لیا گیا کہ بچہ کی عقل کا وہ کام نہ تھا پس عقل سے بالکل کام نہ لینا بھی برا اور حد سے زیادہ کام لینا بھی برا، اس وقت اس کو چاہیے تھا کہ بے قیل وقال استاد کا انقیاد کرتا اور الف کو الف اور ب کو ب کہتا۔ چند روز کے بعد انکشاف خود ہو جاتا کہ استاد جو کچھ بتلاتا تھا وہ صحیح اور واقع کے مطابق تھا یہ استاد کی زبردستی نہ تھی کہ ایک حرف کو الف اور دوسرے کو ب کہلواتا تھا وہ وہی بات کہلواتا تھا جو واقع میں ہے۔

اسی طرح جو لوگ احکام شرعیہ میں علتیں نکالتے ہیں بس وہ اس بچہ کے موافق ہیں جو حد سے زیادہ عقل سے کام لیتا ہے اس لئے ان سے یہی کہتا ہے کہ اس طریقہ کو چھوڑ کر چند روز شریعت کا انقیاد بھی اختیار کیجئے اور اس کو درجہ حال میں لے آئے اس کے بعد آپ کو خود اس بات کا انکشاف ہو جائے گا کہ احکام شرعی حکمتوں سے خالی نہیں ہیں اور واقع کے اور فطرت اور عقل کے بالکل موافق ہیں اس وقت یہ حالت ہوگی کہ آپ کے رگ وپے سے یہی آواز نکلے گی۔

ہرچہ آں خسرو کند شیریں بود

جو کچھ محبوب کی طرف سے ہو شیریں ہے۔

بس صحیح طریقہ یہ ہے اور جس طرح آپ چاہتے ہیں احکام کی حکمتیں معلوم کرنا اس طرح قیامت تک بھی نہیں معلوم ہوں گی یہ چال ہی غلط ہے۔ بچہ والی مثال سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ عقل سے کام لینے کے کیا معنی ہیں اور کہاں تک اس کی ضرورت ہے اور عقل کو چھوڑنے کے کیا معنی ہیں اور اس کی ضرورت کہاں ہے اس سے وہی تیسری درمیانی شق پیدا ہوتی ہے جو صحیح ہے اور جو حصول

علم وانکشاف حقائق کی منتج ہے بچہ اسی طریقہ سے علم حاصل کر سکتا ہے کہ نہ تو استاد کی نقل اتارے اور نہ اس سے الف کو الف کہنے کی وجہ پوچھے بلکہ اپنی عقل سے اتنا سمجھ جائے کہ استاد کا یہ مطلب نہیں کہ اس کی نقل اتاری جائے اور کہو الف کہو ب کہا جائے بلکہ الف اور ب کہے اور جس حرف کا جو نام بتلاتا جائے وہی لیتا جائے اس میں حیلہ وحجت اور قیل وقال نہ کرے یہاں عقل کو چھوڑ دے۔ دیکھئے اس بچے نے صحیح حد تک تو عقل سے کام لیا اور اس حد کے آگے چھوڑ دیا اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دن بدن اس کے معلومات بڑھتے جائیں گے اور عالم ہوتا جائے گا حتیٰ کہ ایک دن وہ بھی آئے گا کہ حقائق کا اس پر انکشاف ہو جائے گا یہی طریقہ آپ کو بھی احکام الٰہی کے متعلق اختیار کرنا چاہیے کہ نہ تو اتنے بیوقوف بنئے کہ عقل سے کام ہی نہ لیجئے اس کا نتیجہ تو یہ ہوگا کہ غیر شریعت کو بھی شریعت سمجھ لوگے اور اس وقت آپ کی حالت اسی بچہ کی سی ہو جائے گی جس کو استاد کہتا ہے کہو الف اور کہو ب تو وہ بھی کہتا ہے کہو الف کہو ب کہ اس نے اس بات کو جو داخل امر نہ تھی یعنی لفظ کہو کو بھی داخل سمجھ لیا اور نہ عقل سے اتنا کام لیجئے کہ احکام الٰہی کی حکمتیں اور علتیں پوچھئے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ علم اور معرفت سے کورے رہ جائیں گے اس بچے کی طرح جو استاد سے پہلے ہی دن پوچھتا ہے کہ الف کو الف کیوں کہوں اور ب کو ب کیوں کہوں یہ مرتبہ عقل کو چھوڑ دینے کا ہے۔ یہاں چھوڑ دینا ہی اچھا اور ضروری ہے اسی کو کہا گیا ہے۔

آزمودم عقل دور اندیش را
بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

میں نے عقل دور اندیش کو بار بار آزمایا پھر اپنے آپ کو دیوانہ بنا لیا۔

اس مثال سے صدہا اشکالات رفع ہو جاتے ہیں۔ البتہ مجتہدین کو احکام کی علتیں نکالنے کی اجازت ہے دو وجہ سے ایک ضرورت دوسرے اہلیت باقی اہل رائے کو علت نکالنے سے ممانعت جس کا آج کل غلبہ ہو رہا ہے اور اس کو دین کی خیر خواہی سمجھا جاتا ہے کہ فلاں شخص نے احکام کی علل وحکم خوب بیان کئے ہیں۔

صاحبو! شریعت کی یہ خیر خواہی نہیں ہے محض ہوا پرستی ہے اس کو چھوڑیئے آپ کے لئے صحیح طریقہ یہ ہے کہ ہر حال میں حکم الٰہی کے سامنے انقیاد ہو اور شریعت پر عمل ہو۔ سب حالات عبادات۔ عادات۔ اخلاق۔ معاملات۔ معاشرات سب شریعت کے موافق ہوں اپنی عقل سے صرف اتنا کام لیجئے کہ ہر کام میں یہ تحقیق کر لیا کیجئے کہ اس میں شریعت کا حکم کیا ہے جب شریعت کا حکم معلوم ہو جاوے تو اس کو تسلیم کیجئے اور اس کے موافق عمل کیجئے اور اس میں تعلیلیں نہ نکالئے۔

رائے کی شریعت:

مگر میں ضرورت سمجھ کر یہ بھی بتلائے دیتا ہوں کہ شریعت سے مراد کون سی شریعت ہے۔

میری مراد وہ شریعت ہے جو اغراض کے تابع نہ ہو آپ سوال کریں گے کہ کیا شریعتیں دو ہیں؟

تو میں کہتا ہوں کہ جی ہاں آج کل دو ہی ہیں اصل میں تو ایک ہی تھی مگر آج کل دو ہو گئی ہیں اس زمانہ میں ایک نئی شریعت ایجاد ہوئی ہے وہ ایسی سہل ہے کہ جو چاہو کرتے رہو اس شریعت کے خلاف کوئی کام ہوتا ہی نہیں۔ برے سے برا کام کرتے رہو اور گناہ نہ ہو اور دین ہاتھ سے نہ جائے اور جنت کی میراث قائم رہے اور یہ میری کوئی خیالی بندش نہیں ہے بلکہ واقعی آج کل ایسے قصے ہو رہے ہیں ابھی حال کا واقعہ ہے وہ فتویٰ میں نے بھی دیکھا ہے ایک صاحب اپنی ساس پر مفتون ہوئے کیسا زمانہ آ گیا کہ آدمی انسان سے گدھے گھوڑے بن گئے اجنبی عورتوں سے تو پردے کو اس لئے کہا جاتا ہے کہ ان میں فتنہ کا احتمال ہے اور محرمات سے پردہ کو اس لئے نہیں کہا جاتا کہ وہاں فتنہ کا خوف نہیں کیونکہ حرمت شرعی موجود ہے جو مسلمان کے لئے یقیناً مانع ہو سکتی ہے اور اگر طبیعت سلیم ہو تو محرمات سے کراہت طبعی بھی موجود ہے مگر کیا کیا جاوے کہ دین اور شریعت کا تو ذکر ہی کیا ہے آجکل طبیعتیں بھی انسانی طبیعتیں نہیں رہیں بلکہ گدھے اور بندر کی سی طبیعتیں ہو گئیں اس کا تو مقتضیٰ یہی معلوم ہوتا ہے کہ ساس سے بھی پردہ کا حکم دیا جائے بلکہ ایک ساس ہی کیا تمام محرمات سے پردہ کرایا جائے کیونکہ جب بھلے برے کی تمیز باقی نہیں رہی تو کیا عجب ہے کہ بہن بیٹی اور ماں کی طرف بھی میلان ہونے لگے بلکہ ایسے واقعات ظہور میں آنے لگے ہیں (معاذ اللہ معاذ اللہ)

غرض وہ صاحب ساس پر مفتون تھے مگر بدنامی کے خیال سے یہ فکر ہوئی کہ ناجائز تعلق نہ رکھیں بلکہ جائز کر کے رکھیں لہذا ایک دین فروش نام کے مولوی کے پاس گئے یہ مولوی تھے ایسے نالائق بیہودہ کو مولوی کیسے کہوں ایسے لوگوں نے تو مولوی کے نام کو بھی بدنام کر دیا۔

غرض تھے کوئی نام کے مولوی، نام کے مولوی اس لئے کہا کہ ظاہر میں پڑھے لکھے تو تھے مگر افعال ایسے تھے کہ جاہل کے بھی نہ ہوں چنانچہ اس نے ساس جیسی محرمہ موبدہ کو بھی حلال کر دیا چنانچہ آگے آتا ہے غرض اس جاہل نے اس دین فروش سے اپنی خواہش ظاہر کی کہ ساس پر میری طبیعت آ گئی ہے اور کھلم کھلا ناجائز کام کرنا منظور نہیں کیونکہ بدنامی بہت ہوگی۔

لہذا کسی طرح جائز کر کے تم اس سے میرا نکاح کر دو اس نے کہا ساس سے بھلا نکاح کس طرح ہو سکتا ہے دنیا جانتی ہے کہ ساس ماں کے برابر ہے، کہا کوئی صورت بھی ہے کہنے لگے تم مجھ سے ایسا مشکل کام لینا چاہتے ہو مگر خیر سوچیں گے لیکن اس میں بہت دماغ خرچ ہوگا اس لئے ایک ہزار روپیہ فیس لیں گے اس کی تو طبیعت آئی ہوئی تھی ایک ہزار روپیہ کیا بڑی بات تھی۔ افسوس کی

نے سچ کہا ہے زلۃ العلم زلۃ العلم۔ (عالم کی لغزش پوری دنیا کی لغزش ہے) ایک گناہ تو جاہل کا ہوتا ہے وہ تو اس کی ذات تک محدود رہتا ہے وہ اس کا نتیجہ بھگتے گا دوسرے تک اس کا اثر نہیں پہنچتا اور ایک گناہ عالم کا ہوتا ہے یہ متعدی ہوتا ہے اس کی ذات تک محدود نہیں رہتا بلکہ دوسروں تک اس کا اثر پہنچتا ہے کیونکہ وہ اس کو جائز بنا کر کرتا ہے جس سے جہلا حرام کو حلال سمجھنے لگتے ہیں یہ دین فروش خود تو ڈوبا ہی دوسرے کو بھی ڈبویا اور اس کیلئے ساس کو کھینچ تان کر جائز کر ہی دیا اور زبردستی نہیں بلکہ دلیل سے اور شرعی فتوی سے، اسی واسطے تو میں نے کہا تھا کہ شریعتیں دو ہیں۔

اس کی دلیل سنئے فرماتے ہیں کہ ساس کی حرمت آیت کے اس لفظ سے ثابت ہے **وامہات نساء کم** اس کے معنی ہیں کہ تمہاری بیبیوں کی مائیں بھی حرام ہیں بی بی کی ماں کو ساس کہتے ہیں اس سے ساس کی حرمت ثابت ہوئی اس میں اس جاہل نے ایک مقدمہ قائم کیا وہ یہ کہ ساس کہتے ہیں بی بی کی ماں کو اور بی بی کس کو کہتے ہیں جس سے نکاح ہوا ہو اور سب جانتے ہیں کہ نکاح سے مراد نکاح واقعی ہے لفظی نہیں اب یہ دیکھو کہ بیوی سے تمہارا نکاح واقعی ہوا تھا یا نہیں بس اس میں کلام ہے کیونکہ واقعی نکاح جب ہوتا ہے کہ مرد اور عورت دونوں مسلمان ہوں اور بیوی تمہاری جاہل ہے (یہ پہلے سے معلوم کر لیا تھا کہ بیوی جاہل ہے اور یہ بھی پوچھ لیا تھا کہ نکاح کے وقت کلمے پڑھائے گئے تھے یا نہیں، معلوم ہوا کہ نہیں پڑھائے گئے) بس اب کام بن گیا اور گنجائش نکل آئی کہ جاہل بسا اوقات کفر کے کلمے بکا کرتے ہیں تو جاہل آدمی کے ایمان ہی کا کیا ثبوت ہے اور نکاح کے وقت بھی کلمے نہیں پڑھائے گئے جس سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ پہلے سے وہ مومن نہ ہو مگر اس وقت تو مومن ہو گئی غرض بیوی کا ایمان ثابت نہیں اور نکاح کے لئے ایمان شرط ہے جب یہ شرط نہیں پائی گئی تو نکاح صحیح نہیں ہوا تو وہ منکوحہ نہیں ہوئی اور اس کی ماں ساس نہیں ہوئی بلکہ ایک اجنبی عورت ہے لہٰذا نکاح جائز ہے باقی حرمت مصاہرت وہ مختلف فیہ مسئلہ ہے کچھ ضرور نہیں کہ امام صاحب ہی کا قول لیا جاوے۔

دیکھئے سب موانع مرتفع ہو گئے اور ساس کا نکاح دلیل سے جائز ہو گیا اور دین کے اندر بھی داخل ہو گیا اور اس سے کتنا بڑا کام نکل آیا کہ ایک شخص کا دل خوش ہو گیا اور جہلاء کے نزدیک وہ گناہ سے بھی بچ گیا۔ سو حضرت ایک شریعت تو یہ ہے اس شریعت سے تو خدا بچائے اس کے انقیاد کی ضرورت نہیں یہ شریعت وہ ہے جو رائے کے تابع ہے۔

شریعت حقہ:

اور ایک وہ شریعت ہے جو رائے کے تابع نہ ہو اس کا انقیاد کرو اور اپنے اغراض کو بیچ میں سے نکال

دو اس بات پر پکے ہو جاؤ کہ شریعت کو ہر چیز پر مقدم رکھیں گے چاہے زمینداری رہے یا نہ رہے اولاد مرے یا زندہ رہے خدا اور رسول کا حکم مانیں گے زمینداری میں کوئی حق شریعت کے خلاف نہیں رکھیں گے چاہے ساری زمین بھی نکل جاوے اولاد کے لئے کوئی ٹونکا ٹونا خلاف شروع نہ کریں گے چاہے اولاد سب مر جاوے، یہ ہے شریعت اس کا انقیاد چاہے راہ حق اس طرح ملتا ہے کہ اپنے اغراض وغیرہ سب کو چھوڑ کر شریعت ہی کو اصل غرض قرار دو پھر وہ کوئی چھپی ہوئی چیز نہیں ہے اور اس میں کچھ کھینچ تان کی ضرورت نہیں اور نہ وہ ایک ہزار دینے سے پیدا ہوتی ہے یہ شریعت نہیں ہے کہ حلت نکاح کو غرض قرار دے کر حکم تلاش کیا گیا اور شریعت کو اس کے مطابق کیا گیا ایسی ہی شریعت کے لئے ضرورت ہے کھینچ تان کی اور ایک ہزار روپیہ کی۔ ایک ہزار کا مسئلہ تو کہیں نہ کہیں سے اپنی خواہش کے موافق مل ہی جائے گا مگر وہ حق نہ ہوگا نہ خدا اور رسول کا حکم ہوگا بلکہ اپنا حکم ہوگا خوب کہا ہے۔

چوں غرض آمد ہنر پوشیدہ شد صدحجاب از دل بسوئے دیدہ شد

جب غرض آئی ہنر پوشیدہ ہوا، اور سینکڑوں پردے دل کی طرف سے آنکھوں پر پڑے۔

غرض اور رائے کو آگے رکھ لینے کے بعد انکشاف حقیقت نہیں ہو سکتا اور حق کا پتہ نہیں چل سکتا اس وقت جس چیز کا پتہ چلے گا وہ شریعت نہیں ہوگی بلکہ نفس اور شیطان کا حکم ہوگا، شریعت وہ ہے جو ہمارے تابع نہ ہو۔

اتباع شریعت کی پہچان:

شریعت کی اتباع کے یہ معنی ہیں کہ دو شخصوں میں ایک مکان پر جھگڑا ہو تو دونوں عزم کر لیں کہ اگر شریعت کا حکم ہمارے خلاف نکلا تو ہم اس پر بالکل راضی ہیں اگر شریعت سے ہمارا حق مکان میں نکلا تو لیں گے ورنہ بالکل چھوڑ دیں گے اس بات پر پکے ہو کر حکم معلوم کرو اب جو حکم نکلے گا وہ شریعت ہوگی اور ایک یہ صورت ہے کہ پہلے سے یہ قرار دے لیا کہ مکان ہم کو مل ہی جاوے اور یہ دل میں ٹھان کر مسئلہ معلوم کرنے کو چلے اور مولوی صاحب سے فرمائش کی گئی کہ کسی طرح ایسا مسئلہ نکال دو کہ ہم کو مکان مل ہی جاوے اگر مولوی صاحب بھی آپ کے کہنے میں آگئے تو مسئلہ ایسا مل ہی جاوے گا (دیکھئے اس طرح ساس جائز ہو ہی گئی جس کی حرمت متفق علیہ اور منصوص اور آیت میں صراحۃً موجود ہے۔ اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا ہے) مگر وہ مسئلہ شریعت الٰہی کا نہ ہوگا شریعت شیطانی کا ہوگا۔ اس طریقے کو چھوڑو اور اپنے اغراض بالائے طاق رکھ کر شریعت کا حکم معلوم کرو اور ہمت سے کام لو مگر آج کل یہ بلا طبیعتوں کے اندر ایسی گھس گئی ہے کہ رگ و پے میں سرایت کر گئی اور بہت

کہ طبیعتیں اس سے خالی ہیں جو لوگ شریعت پر عمل کرنے کے لئے آمادہ ہیں وہ بھی اس کی تلاش ضرور کر لیتے ہیں کہ کسی طرح شریعت کا مسئلہ اپنے موافق نکل آئے تو اچھا ہے اور اپنی غرض اور دنیا ہاتھ سے نہ جائے ایک جگہ سے ہمارے مدرسہ میں میت کے کچھ کپڑے آئے تحقیق کرنے سے معلوم ہوا کہ ان میں نابالغوں کا بھی حصہ تھا لہٰذا واپس کر دیئے گئے اس وقت کوئی سیح مولوی وہاں وارد ہو گئے وہ کپڑے ان کے سامنے بھی پیش کئے گئے اور مدرسہ والوں کا واپس کر دینا بھی سنا دیا گیا مگر انہوں نے قبول کر لئے اور فرمایا کہ آخر نابالغوں کو ان کی شادیوں کے وقت تو ان کے حصہ سے زیادہ دے دیا جائے گا یہ سب اس میں لگ جاوے گا یہ انہوں نے بڑی ذہانت کا کام کیا غرض جو چیز آجائے وہ ہاتھ سے نہ جانے پائے آج کل ذہانت کا ایسا استعمال بہت ہو رہا ہے سو یہ شریعت نہیں ہے اور اس میں برکت نہیں ہو سکتی شریعت یہ ہے کہ آدمی اس بات کے لئے آمادہ ہو کہ چاہے میرا نفع ہو یا نقصان اور میری مرضی کے موافق ہو یا مخالف، وہی کروں گا جو شریعت کا حکم ہو گا۔

ناخوش تو خوش بود بر جان من	دل فدائے یار دل رنجان من،

محبوب کی جانب سے جو امر پیش آئے تو وہ طبیعت کو ناخوش ہی کیوں نہ ہو مگر وہ میری جان پر خوش اور پسندیدہ ہے جو میری جان کو رنج دینے والا ہے میں اس پر اپنا دل قربان کرتا ہوں۔

یہ نیت پکے طور سے کر کے استفتاء کرو اور ہر شخص سے استفتاء بھی نہ کرو ایسے شخص سے استفتاء کرو جو عالم ہو اور متدین ہو اور کسی سے دبنے والا نہ ہو اور لوگوں کی رائے سے متاثر ہونے والا نہ ہو تب شریعت کا اصلی حکم معلوم ہو گا پھر ہمت کرو اور اس کے موافق عمل کرو یہ ہے صحیح طریقہ شریعت کے انقیاد کا۔

حاصل یہ کہ اپنے حالات میں غور کرتے رہو جو حالت اختیاری ہو اس میں شریعت پر عمل کرو اور جو غیر اختیاری ہے اس میں تفویض تام کرو اور کچھ چون و چرا مت کرو جو تصرف بھی حضرت حق تمہارے اندر کریں کرنے دو بس اس کو اپنا حال بنا لو تو تب یہ کہہ سکو گے ان صلوتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العلمین. (بیشک میری نماز، میری ساری عبادت اور میرا جینا اور میرا مرنا یہ سب خالص اللہ تعالیٰ ہی کا ہے جو پروردگار ہے سارے جہان کا)

لفظ رب العالمین کا نکتہ:

اور دیکھئے قرآن شریف کی بھی کیا بلاغت ہے۔ اللہ اکبر۔ یہاں رب العلمین کا لفظ کیا موقع سے بڑھایا ہے جس کے معنیٰ ہیں تمام جہاں کا پالنے والا۔ اس میں یہ بتلا دیا کہ ہمارے احکام میں وسوسہ بھی نہ لاؤ ہم نے ربوبیت اور تربیت کے لئے احکام مقرر کئے ہیں تم کو نقصان پہنچانا مقصود نہیں ہے ہم تم کو

پرورش کرنے والے ہیں اگر کسی حکم میں کچھ تکلیف بھی معلوم ہوتی ہو۔ تو اس کی ایسی مثال ہے۔

طفل مے لرزد زنیش احتجام   مادر مشفق ازاں غم شاد کام

ایک بچے کے پھوڑا نکلتا ہے اور سب جانتے ہیں کہ ماں سے زیدہ کوئی اس کے واسطے بھی خواہ اور مہربان اور مشفق نہیں ہے اپنی تکلیف کو ماں گوارا کر لے مگر بچے کی تکلیف کو گوارا نہیں کر سکتی مگر اس پھوڑے کا آپریشن اپنی آنکھوں کے سامنے کراتی ہے بچہ چیخ رہا ہے مگر وہ رحم نہیں کرتی بلکہ دل میں خوش ہوتی جاتی ہے کہ اب میرے بچے کو آرام ہوگا کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ بے رحمی ہے، نہیں عین رحم ہے کیونکہ وہ جانتی ہے کہ اگر آپریشن نہ ہوگا تو یہ پھوڑا دو چند سہ چند ہو کر ناسور بن جائے گا پھر علاج بھی نہ ہو سکے گا اور ساری عمر کو زندگی تلخ ہو جائے گی۔ اس ساری عمر کی تکلیف سے بچانے کے لئے وہ بچہ کا آپریشن کراتی ہے اسی واسطے خوش ہوتی ہے تو یہ تکلیف سے بچانا رحم ہے یا بے رحمی؟

اسی طرح حق سبحانہ، تربیت کرتے ہیں کہ گناہ سے بچنے کے لئے بندوں کو احکام کی تکلیف دیتے ہیں کیوں کہ گناہ کا انجام دوزخ ہے اگر اس وقت اس سے بچنے کی تکلیف نہ دی جاوے تو آخر میں دوزخ میں جانا ہوگا اور ممکن ہے کہ ابدالآباد کی زندگی تلخ ہو جائے اس لئے وہ ہم کو احکام کا مکلف کر کے اس تلخی سے بچاتے ہیں یا دنیا کی کوئی مصیبت نازل کر دیتے ہیں تو اس کے ذریعہ سے معاصی کا کفارہ کرتے ہیں گویا مادہ فاسدہ کا آپریشن کرتے ہیں مگر مرہم بھی اس کے ساتھ ساتھ ہے۔

درد از یار است ودرمان نیز ہم   دل فدائے او شدہ جان نیز ہم

درد دوست کی طرف سے ہے اور علاج بھی اسی کی طرف سے ہے میرا دل اس پر قربان اور جان بھی قربان ہے۔

تکلیف بھی وہی دیتے ہیں اور اس کی جزا بھی وہی دیں گے ناگوار حالت آپریشن ہے اور گوارا حالت مرہم ہے اصل مرہم تو آخرت میں ملے گا اور دنیا میں بھی تھوڑا سا مرہم ملتا ہے وہ مرہم کیا ہے دل کی راحت اور چین، جو شخص احکام الٰہی کا اتباع کرتا ہے اور گناہ سے بچتا ہے اور اپنی حالت اختیاری وغیر اختیاری کو حق تعالیٰ کے سپرد کر دیتا ہے اس کے قلب میں وہ اطمینان و راحت پیدا ہوتی ہے کہ اس کے سامنے ناگوار حالت اور مصیبت کچھ بھی اثر نہیں کر سکتی ان کے واسطے مصیبت بھی صرف صورۃً مصیبت ہوتی ہے اور حقیقت میں راحت ہوتی ہے جنہوں نے اس حقیقت کو سمجھ ان سے پوچھیے بعض وقت عین کلفت میں ان پر وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے انہی کی حالت اس طرح بیان کی گئی ہے۔

خوشاوقت شوریدگان غمش اگر ریش بینند وگر مرہمش
گدایا نے از بادشاہی نفور بامیدش اندر گدائی صبور
دمادم شراب الم درکشند وگر تلخ بینندوم درکشند

اس کے غم میں پریشان لوگوں کا کیا اچھا وقت ہے خواہ اپنے زخموں پر نظر پڑے یا اس کے زخموں پر مرہم۔ وہ لوگ تو ایسے فقیر ہیں جن کو بادشاہت سے نفرت ہے اور اسی کی امید میں گدائی پر صبر کئے ہوئے ہیں۔ دمادم رنج کی شراب پیتے ہیں اگر تلخ دیکھتے ہیں تو خاموش ہو جاتے ہیں) ان کی حالت ناگواری میں بھی وہی ہوتی ہے جو خوشی میں ہوتی ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ ان کی نظر ہر وقت ہر حالت میں حق تعالیٰ پر ہوتی ہے اور ہر چیز کو حق تعالیٰ کی طرف سے سمجھتے ہیں اور حق تعالیٰ محبوب ہیں تو جیسا کہ راحت محبوب کا عطیہ ہے ایسے ہی مصیبت کو بھی اسی محبوب کا عطیہ سمجھتے ہیں لہٰذا جس طرح وہ راحت کو سر آنکھوں پر لیتے ہیں ایسے ہی مصیبت کو بھی سر آنکھوں پر لیتے ہیں جب دونوں کا تعلق محبوب سے ہے تو دونوں میں فرق کرنے کی کیا وجہ؟ سبحان اللہ، ان لوگوں کی کیسی پاکیزہ زندگی ہے کہ ناگواری ان کے پاس ہی نہیں آتی اور کسی حالت میں وہ ناخوش نہیں ہوتے اگر موت بھی آجائے تو وہ یہی کہیں گے۔

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

دشمن کا ایسا نصیب نہ ہو کہ تیری تلوار سے ہلاک ہو تیری خنجر آزمائی کیلئے دوستوں کا سر سلامت رہے۔

اور وہ موت پر اس طرح راضی ہوں گے جس کو عارف شیرازیؒ کہتے ہیں۔

خرم آنروز کزیں منزل ویراں بردم راحت جاں طلبم وزپے جاناں بردم
نذر کردم کہ گر آید بسرایں غم روزے تا در میکدہ شاداں وغزل خواہ بردم

وہ دن بہت اچھا ہوگا جبکہ اس ویرانہ مکان (دنیا) سے جاؤں گا۔ جان کو آرام مل جائے گا اور محبوب کے دیدار کیلئے چلا جاؤں گا۔ میں نے نذر کی ہے کہ اگر یہ دن نصیب ہو جائے تو خوش وخرم اور غزل پڑھتا ہوا چلا جاؤں گا۔

اس کی وجہ وہی ہے کہ ان کے قلب میں یہ بات مرکوز ہے کہ ہر چہ از دوست میرسد نیکوست حیات بھی ہے تو ادھر ہی سے ہے اور موت بھی ہے تو ادھر ہی سے ہے اور درد بھی ہے تو ادھر ہی سے ہے اور درمان بھی ہے تو ادھر ہی سے ہے؟ جب ہر چیز محبوب کے یہاں کی ہے تو وہ ہر چیز بھی محبوب

ہے حق تعالیٰ یہ حالت نصیب کریں کہ حقیقت سمجھ میں آجائے اور ہر وقت یہ امر منکشف ہوتا رہے کہ ہر چیز حق تعالیٰ کی طرف سے ہے اور وہ رب العلمین ہیں ہمارے بدخواہ نہیں ہیں جو کچھ امر تکوینی کرتے ہیں یا تشریعی وہ سب ہمارے لئے خیر ہی خیر ہے اگر اس حقیقت کا انکشاف ہو جاوے تو آدمی دل وجان سے کہہ اٹھے گا **ان صلوتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العلمین** (بیشک میری نماز اور میری ساری عبادت اور میرا جینا اور میرا مرنا یہ سب خالص اللہ تعالیٰ ہی کا ہے جو پروردگار ہے سارے جہان کا) اور تشریعیات کو بہت خوشی سے سر پر رکھے گا اور تکوینیات میں بھی دل وجان سے تفویض کرے گا یہ فائدہ ہوا لفظ رب العلمین کا۔ اب ایک وسوسہ یہ ہو سکتا ہے کہ کیا کسی اور بادشاہ کی سلطنت بھی ایسی ہے جس میں عنایت ہی عنایت ہو اس کے متعلق فرماتے ہیں۔

لفظ لاشریک لہٗ کی حکمت:

لاشریک لہ ان کا کوئی شریک نہیں کسی بات میں کوئی ان کا مماثل نہیں تو اس صفت ربوبیت میں بھی جس کا مقتضی رافت اور رحمت اور بہی خواہی تھا کوئی ان کی برابر نہیں بلفظ دیگر یوں کہیے کوئی بھی ہمارے واسطے اتنا رؤف ورحیم اور بہی خواہ نہیں ہو سکتا جتنے حق تعالیٰ ہیں جب یہ بات ہے تو ان کے تجویز کردہ احکام کے ماننے میں کیا تامل ہو سکتا ہے۔ اب سارے شبہات دور ہو گئے اور کوئی داعیہ ایسا نہ رہا جو مانع عن الانقیاد ہو۔

آگے فرماتے ہیں **وبذلک امرت** (اور اسی کو مجھ کو حکم دیا گیا ہے) الخ **قل ان صلوتی** (آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما دیں بیشک میری نماز) الآیۃ میں تو بیان تھا مشرب کا اس میں تصریح ہے اس کے مامور بہ ہونے کی حاصل یہ ہے کہ پہلے ارشاد فرمایا کہ لوگوں سے کہہ دیجئے کہ میرا مشرب اور طریقہ یہ ہے کہ میں اپنے تمام حالات اختیاریہ اور غیر اختیاریہ کو حق تعالیٰ کی ملک سمجھتا ہوں مومنین کو تحریض کے لئے یہی بات کافی تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مومنین کو تعلق عشق ومحبت کا ہے ان کو صرف اتنا معلوم ہو جانا ہی کافی ہے کہ یہ بات حضور کو پسند ہے اور یہ وہ طریقہ ہے کہ حضور نے اس کو خود بھی اختیار کیا ہے محبت کا مذاق رکھنے والوں کے لئے تو اس سے زیادہ کسی چیز کی ضرورت نہیں لیکن بہت سے آدمی ضابطہ کے متبع اور قانونی بھی ہوتے ہیں ان کے واسطے تصریح بھی کر دی کہ اس مشرب کا رکھنے کا مجھ کو حکم بھی ہوا یعنی میں نے از خود یہ مشرب اختیار نہیں کیا بلکہ بامر خداوندی اختیار کیا ہے۔

اور ظاہر ہے کہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ حضور کو حکم ہو اور ہم کو نہ ہو کیونکہ آپ محبوب تھے جب محبوب سے احکام میں تخفیف نہیں کی گئی تو ہم سے کیسے ہو سکتی ہے؟

اول مسلم کا مطلب:

وقت زیدہ ہو چکا ہے اس واسطے میں ختم کرتا ہوں اور بیان میں اختصار کر کے تھوڑی ہی دیر میں تمام کرتا ہوں اس کے آگے ارشاد ہے وانا اول المسلمین، ترجمہ، اور میں سب سے پہلا مسلمان ہوں۔ ظاہر ہے کہ اپنے دور میں سب سے پہلے مسلمان آپ ہی ہیں دوسرا جو کوئی بھی مسمان ہوا وہ آپ ہی کی بدولت ہوا اس قول پر تو حضور کے لئے اولیت فی الاسلام اس امت میں ثابت ہوئی جس کو اولیت زمانی اضافی کہنا چاہیے۔

اور اہل طائف کا قول یہ ہے کہ حضور کو اولیت فی الاسلام بالمعنی الحقیقی بھی حاصل ہے کیونکہ روز الست میں جب ارشاد ہوا الست بربکم تو سب سے پہلے حضورؐ ہی نے جواب دیا بلٰے تو حضورؐ تمام اولین وآخرین سب سے اول ہوئے اسلام میں اور یہ تو اولیت ہے اسلام تشریعی میں، اور یہ بھی دلائل سے ثابت ہے کہ حضور تکوین میں بھی سب سے یعنی سب انسانوں سے بلکہ تمام کائنات سے اول ہیں کیونکہ سب سے پہلے حق تعالیٰ نے حضور ہی کے نور کو پیدا کیا اور تمام کائنات کو حضور ہی کے نور سے بنایا اور ہر مکون کے لئے انقیاد تکوینی لازم ہے تو سب سے پہلے اسلام وانقیاد تکوینی کے ساتھ بھی حضورؐ ہی متصف ہوئے یہ اولیت ہے اسلام تکوینی میں آپ اول ہیں اسلام تشریعی میں بھی اور اسلام تکوینی میں بھی۔ بلفظ دیگر درجہ حال میں بھی آپ اول ہیں اور درجہ قال میں بھی آپ ہی اول ہیں اور جملہ انا اول المسلمین (میں سب سے پہلا مسمان ہوں) کے لانے سے یہ مقصود نہیں کہ تم بھی اس اولیت فی الاسلام میں میری تقلید کرو کیونکہ اس میں تو تقلید ہو ہی نہیں سکتی بلکہ تحریض مقصود ہے۔

یہ ایسا ہے جیسا چندہ مانگنے کے وقت کوئی بڑا آدمی کہے کہ پہلے میں دیتا ہوں کہ اس سے تحریض مقصود ہوتی ہے دوسروں کو اور اس سے ایک عام تحریک پیدا ہو جاتی ہے یا جیسے ایک فوج کو کوئی حکم ہوتا ہے اور اس کا سردار بول اٹھے کہ اس حکم کی تعمیل کے لئے سب سے پہلے میں تیار ہوں تو اس سے یہ اثر ہوتا ہے کہ اس حکم کو سب خوشی سے قبول کر لیتے ہیں۔ آیت میں ایسے بلیغ عنوان سے یہ تعیم دی گئی ہے کہ کوئی پہلو نظر انداز نہیں ہوا۔

اصلی دولت:

مختصر یہ ہے کہ اسلام کامل یہ ہے کہ ہر حال میں آدمی حق تعالیٰ کا منقاد و مطیع رہے اغراض سے

قطع نظر کر کے اتباع اختیار کرے نہ مال کی پرواہ کرے نہ جاہ کی نہ حکومت کی نہ بڑے ہونے کی بس اس کا یہ حاصل ہو جاوے کہ۔

دلارا میکہ داری دل درو بند دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

جب محبوب سے تم نے دل لگایا تو پھر تمام دنیا سے آنکھیں بند کرلو۔

بس ایک اللہ پر نظر ہو اس پر کچھ دنیا بھی عطا ہو جاوے تو رحمت ہے ورنہ اصلی دولت وہی ہے وہ ضرور ملے گی۔ اس دولت کی قدر ہم لوگ کیا جانیں اس کی قدر ان سے پوچھئے جن کو یہ دولت حاصل ہوئی ہے ایک صاحب فرماتے ہیں کہ جو چیز ہم کو حاصل ہے سلاطین دنیا کو اس کی خبر نہیں اگر ان کو خبر ہو جاوے تو ہمارے اوپر اس کے چھیننے کے لئے فوج اور ہتھیار لے کر چڑھ آویں۔

ہمارے سمجھنے کے لئے ایک موٹی دلیل یہ کافی ہے کہ اہل اللہ کے حالات پڑھتے ان حضرات نے اکثر تنگی سے گذر کی ہے اور دنیا ملتی رہی تب بھی اس پر نظر نہیں اٹھائی اور اپنے اللہ ہی سے تعلق بڑھایا آخر کوئی بات تو وہ اپنے پاس پاتے تھے جس کی وجہ سے دنیا کی طرف نظر نہیں اٹھاتے تھے وہ وہی بات تھی جس کو میں نے اصلی دولت کہا ہے اب میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ پھر دنیا عطا نہ ہو۔ اس سے میری مراد یہ نہیں ہے کہ جو اللہ کا نام لینے والا ہے وہ مالدار ضرور ہو جائے گا یا اس کو بادشاہی دنیا کی ضرور مل جائے گی بلکہ مطلب یہ ہے کہ جو مالداری اور بادشاہت اور عزت اور جاہ اور تمام دنیا کا حاصل اور روح ہے یعنی راحت اور اطمینان یہ اس کو ضرور حاصل ہوگا اس کو روح اس لئے کہا کہ دنیا کے ان تمام بکھیڑوں اور ساز و سامان کی جو کوشش کی جاتی ہے وہ صرف ایک چیز کے واسطے ہے جس کا نام راحت ہے اس بیان کو میں طول نہیں دیتا ہوں اس واسطے کہ اس وقت موضوع بحث یہ نہیں ہے اس پر میرے مستقل (وعظ راحت القلوب میں اس کا مستقل و مفصل بیان ہے۔) بیان ہو چکے ہیں غرض راحت اور اطمینان اس کو ضرور حاصل ہوگا۔

میں یہ نہیں کہتا کہ اس کو رنج پیش نہیں آئے گا یا اس پر حوادث نہیں آئیں گے بلکہ یہ کہتا ہوں کہ کیسا ہی رنج پیش آئے اور کیسے ہی حوادث پڑیں لیکن وہ متزلزل نہ ہوگا اگر اس پر کوئی مقدمہ قائم ہو گیا تب بھی اس کا دل پریشان نہ ہوگا یہ ضرور نہیں کہ وہ تدبیر بھی نہ کرے وہ تدبیر بھی کرے گا کیونکہ دنیا کو حق تعالیٰ نے عالم اسباب بنایا ہے مگر حالت یہ ہوگی کہ ظاہر میں تدبیر ہے اور دل میں رضا بالقضاء کہ اگر تدبیر سے کامیابی نہ بھی ہوئی تب بھی دل سے اس پر راضی ہے۔

اس کا راز یہ ہے کہ وہ تمام تعلقات کو فنا کئے ہوئے ہوتا ہے۔ اس کو نہ دنیا کی خوشی سے تعلق

رہتا ہے نہ رنج سے اور خوشی اور رنج آنے جانے والی چیزیں ہیں اگر ان سے تعلق ہوتا تو خوشی کی بات پیش آنے سے خوش ہوتا اور اس کے زوال سے ناخوش ہوتا اس کو ان چیزوں سے تعلق تو ہے ہی نہیں پھر اس کی حالت میں ان تغیرات سے تغیر کیوں ہو اس کو اس چیز سے تعلق ہے جو غیر متغیر ہے اور ہر حالت اور ہر وقت میں یکساں باقی ہے تو اس کو تغیر کیوں ہو۔

اس واسطے میں کہتا ہوں کہ حق تعالیٰ کے انقیاد میں دنیاوی بھی راحت ہے اہل دنیا ذرا سے تغیر میں متغیر ہو جاتے ہیں کیونکہ ان کو دنیا سے تعلق ہے اور دنیا ہر وقت متغیر ہے برخلاف اس کے جو اللہ کا نام لینے والا ہے کہ اس کا تعلق متغیر چیز یعنی دنیا سے ہی نہیں اس کا تعلق ایسی ذات سے ہے۔ جس میں تغیر نہیں لہٰذا اس کو بھی کسی حال میں تغیر نہیں ہوتا اور اس کی راحت دائمی ہے دنیا میں بھی راحت میں ہے اور عقبیٰ میں بھی اور ظاہری راحت بھی اس کو حاصل ہے اور باطنی بھی۔

نسخہ برائے معالجہ:

صاحبو! اس راحت کے حاصل کرنے کی کوشش کرو اور اس کے لئے ضرورت ہے علم کی یعنی یہ معلوم کیا جائے کہ وہ کیا چیزیں ہیں جن سے یہ راحت حاصل ہوتی ہے کیوں کہ جب تک کسی چیز کے اسباب کا علم نہ ہو اس وقت تک وہ کیسے میسر ہو سکتی ہے اور نرا علم بھی کافی نہیں علم کے بعد ضرورت ہے عزم کی یعنی ہمت کی کیونکہ اگر ایک چیز معلوم بھی ہو گئی اس سے فائدہ جب ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ جب کہ فائدہ حاصل کرنے کا ارادہ کیا جائے۔

مثلاً ایک شخص کے سامنے کھانا رکھا ہے اور اس کو معلوم بھی ہے کہ کھانا رکھا ہے تو نرے اس معلوم ہونے سے مقصود حاصل نہ ہوگا مقصود جب ہی حاصل ہوگا جب ارادہ بھی کرے یعنی کھالے اب مقصود یعنی پیٹ بھرنا حاصل ہوگا اور علم حاصل کرنے سے یہ مطلب نہیں کہ سب کے سب مولوی بن جاؤ بلکہ جو فکر معاش سے فارغ ہیں وہ مولوی بنیں اور جو فارغ نہیں ہیں وہ ہر بات کو مولویوں سے پوچھ لیا کریں ان کے پاس آمد و رفت رکھیں ان سے تعلق پیدا کریں۔ جو لوگ کچھ لکھے پڑھے ہیں وہ اردو یا فارسی میں دین کی کتابوں کو دیکھتے رہیں مگر یہ خوب سمجھ لیجئے کہ یہ کتابیں وہ ہوں جن کا دیکھنا علماء تجویز کر دیں ہر ایک کتاب بھی دیکھنے کے قابل نہیں ہے علماء سے اپنی حالت اور علمی لیاقت بیان کر کے پوچھو کہ ہم کو کون کون سی کتاب دیکھنی چاہیے جو وہ بتلا دیں وہ کتاب دیکھو بعض لوگوں کو کسی اچھی کتاب کے دیکھنے سے بھی منع کیا جاتا ہے نہ اس وجہ سے کہ وہ کتاب دیکھنے کے قابل نہیں ہے بلکہ اس وجہ سے کہ ان میں قابلیت اس کے دیکھنے کی نہیں ہے

چنانچہ عوام کو تصوف کی کتابیں دیکھنے اور قرآن شریف کا ترجمہ از خود پڑھنے سے اسی وجہ سے منع کیا جاتا ہے۔ غرض جن کو پڑھنا آتا ہے وہ اپنی لیاقت کے موافق علماء سے پوچھ کر دین کی کتابوں کو پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھاویں اور سناویں اس طرح سب عالم بن سکتے ہیں۔ اصطلاحی مولوی بننا سب کے لئے ضروری نہیں۔ غرض کمال اسلام کیلئے ضرورت ہے علم اور ہمت کی۔

اور تیسری چیز ایک اور ہے جس سے علم و ہمت میں قوت ہوتی ہے وہ اہل اللہ کی صحبت ہے یہ عجیب چیز ہے جس سے اس مردہ جسم میں روح پڑ جاتی ہے اسی کو کہا ہے۔

مقام امن و مے بے غش و رفیق شفیق
گرت مدام میسر شود زہے توفیق

مقام امن اور خالص شراب محبت اور شفیق رفیق اگر تم کو ہمیشہ میسر ہو تو بہت اچھی توفیق ہے' جو زمانہ (کی صحبت بابرکت) سے خالی ہو تو اس میں اسکے مکتوبات اور ملفوظات سے مستفید ہو۔ اگر ہمیشہ میسر نہ ہو تو گاہے گاہے سہی جب بھی موقع ہو اور ایک چیز اس کی قائم مقام بھی ہے کیونکہ جب مروارید میسر نہ ہوں تو صدف سے ہی کام نکال لیا جاتا ہے اس کا بیان اس شعر میں ہے۔

دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل است
صراحی مے ناب و سفینہ غزل است

یعنی بزرگوں کے تذکرے اور حالات جن میں برقی اثر ہے کہ کیسا ہی کم ہمت آدمی ہو ان کو پڑھ کر ایک دفعہ تو مستعد ہو ہی جاتا ہے ان میں بھی صحبت کی سی برکت ہے اگر صحبت میسر نہ ہو تو اسی کو اختیار کرو بہت کام دے گی پس یہ تین جزو کا نسخہ ہے۔ علم اور ہمت اور صحبت اہل اللہ۔

پرہیز: بس یہ نسخہ معالجہ کے لئے کافی ہے مگر معالجہ میں پرہیز کی بھی ضرورت ہوتی ہے وہ معاصی ہیں جن سے پرہیز ضروری ہے اور اس کا سہل طریقہ یہ ہے کہ محاسبہ کی عادت ڈالئے اس طرح کہ سوتے وقت پندرہ بیس منٹ کا وقت اس کے لئے مقرر کر لیجئے اس میں یہ سوچا کیجئے کہ آج ہم سے کیا کیا معصیت ہوئی اس سے توبہ کیجئے اور عزم کر لیجئے کہ کل کو یہ معاصی نہیں کریں گے جب صبح کو اٹھئے تو اس عہد کو یاد کیجئے کہ رات فلاں فلاں معاصی سے توبہ کی تھی اور عہد کیا تھا کہ آج یہ کام نہ کریں گے اور دن بھر اس کا خیال رکھئے جس سے وہ معاصی تو ہرگز نہ ہونے پائیں اور ہمت کیجئے کہ اور کوئی معصیت بھی نہ ہو اگر آج وہ پرانی معصیت یا کوئی نئی معصیت ہو گئی تو سوتے وقت اس کو شمار میں لائے اور اس سے پھر توبہ کیجئے اور عمر بھر یہی سلسلہ جاری رکھئے دیکھئے گا کہ کتنی جلدی معاصی چھوٹ جاتے ہیں اور پرہیز مکمل ہو جاتا ہے پھر دیکھئے گا کہ معالجہ سے کتنا نفع ہوتا ہے وہ نفع

یہ ہوگا کہ آپ کی عبادت اور حیات وموت سب خدا کی مرضی کے موافق ہو جائیں گے یہی کمال اسلام ہے جس کا ہر مسلمان طالب ہے اور اسی کا بیان اس آیت میں مذکور ہے اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ فہم اور علم اور ہمت اور حقیقت شناسی عطا فرما دیں۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام
علی سیدنا ومولانا محمد وعلی الہ واصحابہ اجمعین
برحمتک یا ارحم الراحمین

التماس از جانب کاتب وعظ ہذا

احقر محمد مصطفےٰ عرض کرتا ہے کہ یہ وعظ میں نے اپنے والدین کے ایصال ثواب کے لئے لکھا ہے جو کوئی اس کو مطالعہ کرے وہ میرے اور میرے والدین کے لئے دعائے خیر کرے۔ جس کے لئے بہترین الفاظ یہ ہیں۔

رَبِّ ارْحَمْ هُمَا كَمَا رَبَّيَانِيْ صَغِيْرًا رَبَّنَا اغْفِرْلِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ۔ رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ آمَنُوْا رَبَّنَا اِنَّكَ رَؤُوْفٌ رَّحِيْمٌ۔

اور سب سے زیادہ حضرت مولانا صاحب مدظلہ کے لئے دعا کریں کیونکہ یہ جو کچھ ہے وہ حضرت ہی کا فیض ہے اور منشی ولی محمد صاحب کے لئے بھی دعا کریں جنہوں نے کتابت وعظ میں بہت مدد دی۔ والسلام

اشرف علی

۲۵؍ رجب المرجب ۱۳۵۳ھ

تم بحمد اللہ